اِمدادُ الاحکام

امداد الفتاویٰ کا تکملہ جو ۱۳۴۰ھ کے بعد کے فتاویٰ پر مشتمل ہے

تالیف

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عُثمانی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ نگرانی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

امداد الاحکام

امداد الفتاویٰ کا تکملہ

جو ۱۳۴۰ھ کے بعد کے فتاویٰ پر مشتمل ہے

تالیف

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عبد الکریم گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر نگرانی

حکیم الامت مجدد الملّت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی

پوسٹ کوڈ : ۷۵۱۸۰

طبع جدید............محرم الحرام ۱۴۳۰ھ
جنوری 2009ء

باہتمام............محمد قاسم گلگتی

ملنے کے پتے

- مکتبہ دارالعلوم کراچی
احاطۂ جامعہ دارالعلوم کراچی
فون نمبر
021-5042280
021-5049455
ای میل
mdukhi@cyber.net.pk

- مکتبہ معارف القرآن، احاطۂ جامعہ دارالعلوم کراچی
- ادارۃ المعارف، احاطۂ جامعہ دارالعلوم کراچی
- دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- ادارہ اسلامیات، اُردو بازار کراچی
- بیت القرآن، اردو بازار کراچی
- بیت الکتب، بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

امداد الاحکام

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (القرآن)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔ (بیان القرآن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست امداد الاحکام جلد چہارم

کتاب الهبة

صفحہ

عنوان	صفحہ
کتاب الإکراہ	
اکراہ علی التوکیل بالنکاح باطل ہے۔	۵۹
کتاب الامارۃ و السیاسۃ	
حضرت تھانویؒ کی تحریر بابت حمایت خاکساران و مسلم لیگ۔	۶۲
کتاب الدعوی و الشھادات و القضاء	
مجلس قضاء کے بغیر شہادت شرعاً معتبر نہیں۔	۶۳
دو گواہ عورتوں کے درمیان تفریق کرنے کا حکم۔	۶۵
شاہدان طلاق اگر مدت طویل گزر جانے کے بعد گواہی دیں تو ان کی شہادت معتبر نہیں۔	۶۶
حَکَم کے فیصلہ کردینے کے بعد کسی ایک فریق کو رجوع کرنا جائز نہیں۔	۶۹
مشرک عورت ایک مرد مسلمان کے پاس رہی دونوں سے بچے بھی پیدا ہوئے اور عورت نے اسلام بھی بظاہر قبول نہ کیا ہو اب عورت اپنے مسلمان ہونے اور مسلمان کی بیوی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔	۷۰
زوجہ کی وفات کے بعد اسکے ورثاء اور زوج میں ایک قطعہ زمین پر اختلاف ہونے کا حکم، جبکہ وہ قطعہ زوجہ کے نام پر ہو	۷۳
زوجہ کی وفات کے بعد اسکے ورثاء اور زوج میں ان زیورات پر اختلاف کا حکم جو شوہر نے نکاح کے وقت بیوی کو دیئے تھے	۷۴
زوجین کے منکر طلاق ہونے کی صورت شہادت طلاق معتبر ہے یا نہیں اور شہادت میں گواہوں کی تاخیر کرنے کا حکم	۷۵
باوجود بینہ کے مدعی علیہ کا قسم کھانا۔	۷۸
دعویٰ کے اندر شاہد اور مدعی میں تاریخ کے اندر اختلاف یا تردد ہو جانے کا حکم۔	۸۰
نکاح خواں کی شہادت قبول کرنے میں تفصیل ہے۔	۸۱
جو احکام تحت القضاء داخل نہیں انکا حوالہ۔	۸۲
زوجہ ثانیہ کا اس رقم کا دعویٰ کرنا جو اول کے گھر کے دور ہونے کی وجہ سے کرایہ میں صرف ہوئی ہے۔	۸۲

عنوان	صفحہ

کتاب القصاص والدیات

کتاب الحدود والتعزیرات

کتاب الاقرار والصلح

کتاب الوکالة والکفالة

کتاب الشفعة

کتاب المزارعة و المساقاة

عنوان	صفحہ

کتاب الصید والذبائح والاضحیۃ والعقیقہ والختان

کتاب الخظر و الا باحۃ
باب الرّشوۃ و الھدایا و الضیافات

باب الأكل و الشرب

باب التداوی

صفحہ	عنوان

کتاب اللباس و الزینۃ

عنوان	صفحہ

باب اللعب و الغناء و التصاویر

عنوان	صفحہ

صفحہ	عنوان

مسائل متفرقہ

عنوان	صفحہ

کتاب المتفرقات

کتاب الوصیة

کتاب الھبۃ

ھبہ میں عوض لینے کے بعد اس کی بیع کرنا صحیح نہیں، اور رجوع عن الھبہ کے لئے قضاء قاضی شرط ہے

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ مندرجہ ذیل میں کہ ـــ زید شش قطعہ مکانات کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، بوجہ ملکیت خود زید نے اپنے رشتہ داروں کو شش قطعہ مکانات زبانی ھبہ کر دیئے، اور اسی وقت مبلغ پانچ سو روپیہ بعوض ھبہ زید کے رشتہ داروں نے زید کو دیا، اور زید نے اس کو قبول ومنظور کر لیا، اور تقسیم کر کے مکانات قبضہ مالکانہ میں دے دیئے، بعد وفات یکے از موہوب لہما جائیداد موہوبہ اس کے ورثہ کے قبضہ میں آگئی، ورثہ نے اپنے اپنے حصص ایک دوسرے سے تبدیل کر لئے اور بانتقال جائیداد واہب کی حیات میں ہوا شہادت کافی مشمولہ مثل موجود، بعد چند روز زید نے تائید دستاویز ہبہ نامہ مرتب کرادی، اور دستاویز کے مضمون اول میں یہ عبارت ہے (بصحت ہوش وحواس وثبات عقل بلا اکراہ واجبار غیرے مع اس کے تمامی حقوق داخلی وخارجی شرعیہ کے ھبہ کر دیئے یعنی بخش دیئے)۔

مضمون دوم میں یہ عبارت ہے۔

(تاحیات خود من مقر قابض ودخیل ہوں، اور بعد فوتی میری مسماتان کے قبضہ مالکانہ میں رہیں گے۔)

آخری دستاویز کی یہ عبارت ہے۔

(یہ ھبہ صحیح وشرعی جائز ونافذ خالی شروط مفسدہ سے بتراضی متعاقدین واقع ہوئی، اور مکانات موھوبہ کو قبضہ مالکانہ میں دے دیئے، اب میں یا میرے کوئی بھی وارثان وقائم مقامان وجانشیناں نسبت مکانات موھوبہ کچھ کسی قسم کا حق ودعویٰ کریں تو باطل و

ناجائز ونا مسموع متصور ہو)

دستاویز ھبہ نامہ میں معاوضہ پانچ صد روپیہ و تقسیم مکانات موھوبہ کا تذکرہ نہیں ہے، اول زبانی ھبہ ہوا، اس پر اعتبار کیا جائے گا یا دستاویز ھبہ نامہ پر؟ جو بعد چند روز بنا بر تایید معاہدہ زبانی مرتب ہوئی، اگر دستاویز ھبہ نامہ تحریر ہو یا نہ ہو، تو زبانی ھبہ جو پہلے ہو چکا ہے وہ با اثر ہے، تو زید ایسی صورت میں مکانات موھوبہ کو قبل استرداد عمل قانونی وشرعی کے بیع کر سکتا ہے، یا بعد استرداد؟ اگر حسب عمل قانونی وشرعی زید نے ھبہ نامہ کو مسترد نہ کرایا تو ایسی صورت میں زید مکانات موھوبہ ومقبوضہ موھوب الیھا کو کس خریدار کے نام بیع کر سکتا ہے یا نہیں؟

محمد عبد اللہ خان، بھوپال

الجواب

قال فی العالمگیریۃ: لیس لہ حق الرجوع بعد التسلیم فی ذی الرحم المحرم، وفیما سوی ذلك لہ حق الرجوع إلا أن بعد التسلیم لا یتفرد الواھب بالرجوع، بل یحتاج فیہ إلی القضاء او الرضاء، وقبل التسلیم یتفرد الواھب بذلك، ھکذا فی الذخیرۃ،

وفیہ ایضا، أما العوارض المانعۃ من الرجوع فانواع؛ ومنھا خروج الموھوب عن ملك الموھوب لہ بأی سبب کان من البیع والھبۃ ونحو ھما، وکذا بالموت، لأن الثابت للوارث غیر ما کان ثابتاً للمورث، إلی أن قال: ومنھا العوض اھ وفیہ أیضاً، ولا یرجع فی الھبۃ من المحارم بالقرابۃ، کالآباء والأمھات وأن علوا، والاولاد وإن سفلوا، وأولاد البنین وابنات فی ذلك سواء، وکذا الأخوۃ والأخوات والاعمام والعمات الخ (ج ۵ ص ۲۳۵)

صورت مسئولہ میں زید نے جن رشتہ داروں کو اپنے مکانات ھبہ کئے ہیں اگر وہ ذی رحم محرم عـــہ ہیں، تو اس صورت میں خود محرمیت رجوع فی الھبہ سے مانع ہے بعد تسلیم

عـــہ ذی رحم محرم میں اصول وفروع اور اولاد ذکور واناث کی اولاد، اور بھائی بہن، اور ان کی اولاد، اور چچا پھوپھی سب داخل ہیں، مگر چچا پھوپھی کی اولاد محرم نہیں ۱۲ منہ

کے، اور اگر وہ ذی رحم محرم نہیں ہیں، تو جب بھی زید کو اس ھبہ میں رجوع کا حق نہیں، کیونکہ اس نے پانچ سو روپے بعوض ھبہ کے موھوب لہم سے قبول کئے ہیں، اور عوض لے لینا اجنبی سے بھی مانع رجوع ہے، رشتہ داروں سے بطریق اولیٰ۔

باقی اس عوض کا تذکرہ دستاویز میں نہ ہونا کچھ مضر نہیں، جبکہ شہادت سے کافی ثبوت ہو، اور اگر موھوب لہم محارم بالقرابت بھی نہیں، اور پانچ صد روپیہ بعوض ھبہ دیئے جانے کا بھی ثبوت شرعی نہیں، تو اس وقت یہ حکم ہے کہ جو موھوب لہ فوت ہو گیا ہے، اور اس کا حصہ اس کے ورثہ کو پہنچ گیا ہے، اس میں تو زید کو کسی طرح حق رجوع نہیں، اور جو موھوب لہ زندہ ہے، اس کے حصہ میں بھی زید خود رجوع نہیں کر سکتا، بلکہ قضاء قاضی، یا موھوب لہ کی تراضی ضروری ہے، لیکن اگر درحقیقت اس نے ھبہ کا عوض وصول کیا ہے، گو ثبوت بہم نہ پہنچ سکے، تو اس صورت میں دیانۃً زید کو رجوع فی الھبہ حرام اور باعث گناہ شدید ہے۔ واللہ اعلم

۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۱ھ

ھبۂ فرضی اور ھبہ مشاع کا حکم

سوال ۱:- کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ عمر نے ایک مشترکہ جائیداد غیر منقسمہ کہ جس میں (برادر بزرگ اور ہمشیرہ اور پھوپی کا حصہ شریک تھا) ۱۸۹۴ء میں اپنے ذاتی اغراض ومصالح وقتی کی وجہ سے فرضی طور پر چند روز کے لئے دفع الوقتی کے طریقہ پر حصہ ۸ ر کا داخل خارج سرکاری کاغذات تحصیل میں، جس کو زمانہ اکتیس ۳۱ سال کا ہوا، بذریعۂ ھبہ زبانی اپنے نابالغ پسر زید کے نام بولایت خود کرا دیا، جبکہ اس کارروائی داخل خارج کا حال سن کر شرکاء مذکور الصدر معترض ہوتے، تو عمر نے جملہ شرکاء سے اس کارروائی کا راز صاف طور پر ظاہر کر کے (کہ یہ چند روزہ فرضی طریقہ پر کارروائی داخل خارج عمل میں لاتے گئے ہیں، محل اعتراض میں ہے، اور اگر کوئی اندیشہ آپ شرکاء کو اس کی بابت ہے تو اب جلد سے جلد میں اپنی اس فرضی کارروائی داخل خارج کو واپس کئے لیتا ہوں چنانچہ عمر نے دوسرے سال ۱۸۹۵ء میں جس کو تیس ۳۰ سال کا ہوا، بذریعۂ درخواست محکمہ تحصیل سے کارروائی داخل خارج واپس لے کر، پھر اپنے مشترکہ جائیداد

کا داخل خارج بدستور سابق اپنے نام کرالیا، اور مالکانہ قابض ومتصرف جیساکہ ہمیشہ سے تھا رہا، اور تاایں دم ہے، بعد واپسی داخل خارج فوراً ہی ہردو برادران خالد وعمر میں باصرار گفتگو تقسیم جائیداد مذکور شروع ہوگئی (چونکہ پھوپی بیوہ اور لاولد تھیں، اور بجز مذکورہ برادر زادگان خالد وعمر کے کوئی وارث شرعی ان کا نہ تھا، اور خورد ونوش بھی پھوپی موصوفہ کے ہردو برادرزادگان خالد وعمر کے ساتھ ہمیشہ سے شریک تھا، بروقت تقسیم جائیداد اپنا حصۂ شرعی خالد وعمر کے حق میں بخوشی چھوڑ کر دست کش ہوگئیں، بعد اس کے ہمشیرہ ہندہ نے بھی اپنا شرعی حصہ جائیداد مذکور کا بلاکسی داب کے بطیب خاطر خود اپنے برادران خالد وعمر کو دے دیا، اور وہ بھی دست کش ہوگئیں، آخر کار ۱۸۹۸ء میں خالد وعمر نے جائیداد مذکورہ باہم نصفا نصف بذریعۂ عدالت تقسیم کرکے مالکانہ قابض ومتصرف ہوگئے، چنانچہ اس عرصہ تیس ۳۰ سال میں بہت سے انتقالات رہے، وبیع جائیداد مذکور ظہور میں آئے، تاایں دم ہوتے رہے، تقریباً سات آٹھ انتقالات رہے، وبیع جائیداد مذکور اس وقت سے آج تک عمر کے مالکانہ طریق پر بلاشرکت غیرے ومساہمت احدے کے، حتیٰ کے واقع ۱۶؍اکتوبر ۱۹۲۲ء جس کو زمانہ ایک سال نوماہ کا ہوا، اسی جائیداد سے ایک موضع بضرورت خود، اور بغرض ادائے قرضۂ ذاتی فروخت کیا، کوئی مخالفت اور کسی قسم کا کوئی عذر زید کی جانب سے نہیں ہوا، اب عمر کے بسبب اپنی پیرانہ سالی اپنی جائیداد مذکور کو وقف لوجہ اللہ کرکے اپنے ورثۂ شرعی کا حسب حصص شرعی گذارہ مقرر کیا عمر کے ورثۂ شرعی دو پسر اور ایک دختر ہے، زوجۂ اولیٰ متوفیہ کے بطن سے زید اور ہندہ ہیں، اور زوجۂ ثانیہ متوفیہ کے بطن سے بکر ہے، اور اس وقت زید کی عمر چالیس سال کی ہے، اب تحریر وقف لوجہ اللہ کے وقت بسبب اغواء چند برادران یوسف زید عذر دار ہے کہ جائیداد مذکورہ کا داخل خارج ۱۸۹۴ء میں جو ایک سال کے لئے زید کے نام رہا خواہ وہ کسی نوع پر رہا، لہٰذا جائیداد مذکورہ سب مجھ زید کو ملنا چاہیئے بجز برادر مختلف البطن کو گذارہ نہ دیا جائے، کیونکہ جائیداد مذکورہ میں صرف مجھ زید کا حق ہے، زید کا مقصد اصلی اس عذر سے صرف اس قدر ہے کہ بکر کو گذارہ نہ دیا جائے۔ اور وہ محروم کیا جائے، پس اس بارے میں محقق علماء کرام احکام شرع شریف کے موافق جیسا حکم فرمائیں گے اس کی تعمیل کی جائے گی۔ بینوا توجروا؟

الجواب

چونکہ عمر نے اس بات کا اقرار شرکاء کے سامنے کرلیا تھا کہ اس نے جو داخل خارج بذریعۂ ھبہ اپنے پسر زید کے نام کیا ہے، وہ کارروائی محض فرضی تھی، اس لئے وہ ھبہ قابل اعتبار نہیں۔

فقد صرح فی شرح الأشباہ، أن الھزل مبطل للھبة للاصح لوصدق الموھوب له، (ص ۲۵) وقلت: وقد وجد تھا التصدیق من الموھوب له بسکوته عند بیع عمر أرضاً من الموھوب لأداء دینه، والسکوت فی مثل ذلك اقرار، کما صرح فی الشامیة نقلاً عن الأشباہ، سکوته عند بیع زوجته أو قریبه عقاراً إقرار، بأنه لیس له علی ما افتی به مشایخ سمرقند، خلافاً لمشایخ بخارا، قال: لکن المتون علی الأول اھ (ج ۳ ص ۶۸۹)

دوسرے وہ ھبہ اس حالت میں ہوا تھا کہ عمر کا حصہ دوسرے شرکاء کے حصہ سے ممتاز نہ تھا، اور وہ داخل خارج زمین مشترک پر واقع ہوا تھا، جس میں دوسرے شرکاء کا حصہ بھی ھبہ ہوگیا تھا، اس لئے بھی وہ ھبہ قابل اعتبار نہیں۔

قال فی الھندیة فی شرائط صحة الھبة وأن یکون الموھوب مقسوماً إذا کان مما یحتمل القسمة، وأن یکون الموھوب متمیزاً عن غیر الموھوب، ولا یکون متصلاً ولا مشغولاً بغیر الموھوب، ومنھا أن یکون مملوکاً للواھب، فلا تجوز ھبة مال الغیر بغیر إذنه، لاستحالة تملیك ما لیس بمملوك للواھب، بدائع اھ ج ۵ ص ۲۲۸،

لہٰذا زید کی عذر داری بناء بر اس ھبۂ سابقہ کے محض لغو ہے، البتہ اس واقعہ میں یہ بات قابل تنبیہ ہے کہ پھوپی اور ہمشیرہ اپنے حق سے عمر اور خالد کے حق دست کش ہوئی تھیں اس دست کشی سے ان کا حق ساقط نہیں ہوتا بلکہ بدستور باقی رہتا ہے۔

قال فی الاشباہ: ولو قال الوارث ترکت حقی لم یبطل حقه، إذا لملك لا یبطل بالترك،

پس پھوپی اور ہمشیرہ کا حق خالد و عمر کی ملک جب ہوسکتا ہے جبکہ انہوں نے ان کے

ہاتھ اپنا حصہ بیع کر دیا ہو، یا ھبہ کر دیا، مگر صحت ھبہ کے لئے تقسیم املاک شرط ہے، ھبہ مشاع درست نہیں، اور صورت مذکورہ میں اول تو ھبہ نہیں ہوا، صرف دست کشی ہوتی ہے جو لغو ہے اور ھبہ بھی ہوا تو متاع کا ہوا جو درست نہیں۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۳۴۸ھ

تحقیق ھبۂ مکان وچھت وغیرہ وھبۂ علو بدون سفل؟

سوال:۔ حضور والا مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، عریضۂ سابق میں جو مکان بنوانے کی بابت دریافت کیا تھا، اسی کے متعلق یہ عرض ہے کہ جس جگہ پر میرا قصد کمرہ بنوانے کا ہے، وہ دالانوں کی چھت ہے، درصورت ھبہ قبضہ کی کیا صورت ہوگی، جب تک کہ اس پر کچھ عمارت نہ بن جائے اور ھبہ کرنے کا طریقہ یہی ہے، یا کچھ اور، کہ مالک زمین جناب والا صاحب قبلہ یہ فرمادیں، کہ فلاں فلاں زمین میں تجھ کو ھبہ کرتا ہوں، اور میں منظور کرلوں۔ اور اس پر قبضہ کرلوں، اس کی ضرورت نہیں کہ ھبہ تحریری ہو، محض زبانی بھی کافی ہے، اگر اس زمین کو خرید اجائے، تو بھی ایک بیع نامہ لکھنا ضروری ہے یا صرف دو چار مردوں اور عورتوں کے سامنے زبانی بیع بھی کافی ہوگی، چونکہ یہ زمین دالانوں اور کوٹھریوں کی چھت ہوگی، اور ان دالانوں اور کوٹھریوں کی اندرونی چھت میں جو کڑیاں پڑی ہیں، وہ بعض یا کل جب ناقابل استعمال ہوجائیں، تو ان کی مرمت اور درستی کس کے ذمہ ہوگی، جو زمین ھبہ یا بیع ہوگی وہ چھت کا محض اوپری حصہ ہوگا اور دراصل تمام چھت پر اوپر رہنے سہنے کا اثر ہوگا، یہ تفصیلات اس لئے دریافت کرتا ہوں، کہ معاملہ میں کسی جزو میں شرعاً گنہگار نہ ہوں، اور نہ کوئی نقصان مالی ہوجائے، جب تک پورا اطمینان نہ ہوجائے ہاتھ نہ ڈالا جائے، عریضۂ سابق بھی ہمراہ اس عریضہ کے ارسال خدمت ہے۔

راقم

ثامن علی سیتاپور

۴؍ رمضان المبارک

۱۳۴۳ھ

الجواب

قال فی الدر: وصح بیع حق المرور تبعاً للأرض بلاخلاف ومقصود اوحدہٗ فی روایۃ وبہ اخذ عامۃ المشائخ، شمنی اھ قال الشامی قال السائحانی: ھوالصحیح وعلیہ الفتوی، مضمرات، والفرق بینہ وبین حق التعلی، حیث لایجوزھوان حق المرورحق یتعلق برقبۃ الارض، وھی مال ھوعین، فمایتعلق بہ لہ حکم العین اماحق التعلی فمتعلق بالھواء، وھولیس بعین مالٍ اھ فتح (ج ۳ ص ۱۸۳)

وفی الدر ایضًا: فی أخرکتاب الحقوق، نعم ینبغی ان تکون الھبۃ و النکاح، والخلع، والعتق علی مال کالبیع، والوجہ فیھما لایخفی، اھ

صورت مسئولہ میں حق تعلّی کی بیع نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ حق مجرد ہے، جس کا تعلق عین سے نہیں، بلکہ ہوا سے ہے، اور اگر حق تعلّی کی بیع مع السقف ہو، تو گو بظاہر یہ مثل بیع الطریق مع الارض ہے، مگر پھر بھی دونوں میں فرق ہے، کیونکہ بیع الطریق مع الارض میں زمین مستقل چیز ہے، اور سقف مستقل چیز نہیں، بلکہ متعلق بالجدران ہے، جو بدون ضرر کے ممکن التسلیم نہیں،

قال فی الھدایۃ: وبیع جذع فی السقف لأنہٗ لایمکن تسلیمہ إلا بضرر، (أی فیفسد ۱۲)

لہٰذا سقف کی بیع نہیں ہوسکتی، لیکن درمختار کے ایک جزئیہ سے جواز ھبہ مفہوم ہوتا ہے۔

فانہ قال: تجوزھبۃ حائط بین دارہ ودارجارہٖ لجارہٖ وھبۃ البیت من الدار، فھذا یدل علی أن کون سقف الواھب علی الحائط، واختلاط البیت بحیطان الدار لایمنع صحۃ الھبۃ، مجتبیٰ اھ (ج ۴ ص ۷۱۶ مع الشامی)

میں کہتا ہوں کہ جب سقف واھب کے جدار پر ہونا مانع ھبۂ جدار نہیں، تو جدار واھب کا تحت السقف ہونا مانع ھبۂ سقف بھی نہ ہوگا، لإشتراك العلۃ، بلکہ صورت ثانیہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہونی چاہیئے، کیونکہ جدار مشغول ہے اور سقف شاغل ہے اور ھبۂ المشغول میں تو ظاہر روایت عدم جواز ہے اور ھبۃ الشاغل کے جواز کو فقہاء تصریحاً لکھتے ہیں،

قال فی الدر: والاصل أن الموهوب ان مشغولاً بملك الواهب منع تمامها وان شاغلاً لا، اھ (ج ۴ ص۷۷۹ مع الشامی)

پس اگر باپ محض حق تعلّی کو ھبہ نہ کرے، بلکہ سقف کو ھبہ کردے، توھبہ صحیح ہو جائے گا۔ اور اس صورت میں کڑیوں کی مرمت موھوب لہ کے ذمہ ہوگی، اور ھبہ کی صورت ایجاب وقبول اور قبض ہے، اور قبض کے لئے چھت پر کچھ سامان ڈالدینا کافی ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۱/ شوال، ۱۳۴۳ھ

بیوی نے مرنے سے تیرہ دن قبل جبکہ وہ دق کی مریضہ تھی، اپنی تمام جائیداد شوہر کے نام بذریعہ رجسٹری بیع کردی اور پوری قیمت شوہر کو معاف کردی تو یہ معاف کرنا صحیح ہے یا نہیں، اور بیوی کے ورثاء کو اس جائیداد میں سے مل سکتا ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین، اس مسئلہ میں کہ ھندہ نے اپنی کل جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ شوہر کے نام بذریعہ رجسٹری بیع کردی پوری قیمت پر لیکن زرثمن اس کا شوہر کو معاف کردیا، یہ بیع ھندہ نے حالت علالت بعارضۂ دق جو سالوں سے آرہا تھا کی ہے، بوجہ عارضہ کمزوری روز بروز بڑھتی گئی اور چلنے پھرنے سے مجبور ہوگئی، لیکن بعد کرنے بیع کے چلنا پھرنا موقوف ہوگیا، لیکن زندگی سے ناامیدی نہ تھی گو مرض مہلک ضرور تھا، بعد ہونے بیع ھندہ کو ولادت ہوئی، جو بچہ چھٹے مہینہ پیدا ہوا، چونکہ بچہ پورے دن گزرے نہ پیدا ہوا، اس وجہ سے دو گھنٹہ زندہ رہ کر قضا کر گیا، لیکن اس کچے دن میں ولادت ہونے کی سبب ھندہ کو سرسام کا عارضہ پیدا ہوا، جو کہ تین دن جنون کی کیفیت طاری رہی آخرش اسی حالت میں انتقال کیا، بیع انتقال کے قبل ۱۳ دن ہوئی اور ولادت انتقال کے قبل ۳ دن ہوئی اب ھندہ کے اور وارثان اس کی جائیداد کے مستحق ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

آپ کا خادم
عبد الرؤف

الجواب

صورت مسئولہ میں معاف کرنا کل زرثمن کا صحیح ہے۔

کما فی الدر المختار، والمقعد والمفلوج والمسلول إذا تطاول ولم یقعدہ فی الفراش کالصحیح، مجتبی۔ ثم رمز حد التطاول سنۃ (شامی ج ۵ ص ۶۷۶)

وفی العالمگیریۃ (ج ۷ ص ۷۷) والمقعدۃ والمفلوج والأشل والمسلول إذا تطاول ذلك فصار بحال لایخاف منه الموت فهو کالصحیح، حتی تصح هبته من جمیع المال، فلو صار صاحب فراش بعدہ صار بمنزلة حدوث المرض۔

پس وارثان اس جائیداد میں کوئی استحقاق وراثت نہیں رکھتے، واللہ اعلم

الجواب صحیح

احقر عبد الکریم عفی عنہ — ظفر احمد عفا عنہ

خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون — ۲۸ جمادی الاولی ۱۳۴۴ھ

جن افعال یا الفاظ سے ھبہ یا بیع کا مفہوم ہونا مشکوک ہو ان سے ھبہ اور بیع کا ثبوت نہیں ہو سکتا،

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں ا۔ زید نے اپنی بہن و پھوپی کو مع ان کے شوہروں کے بوجہ قلت آدمیوں کے کہ ان کے پاس کوئی رہنے والا ایسا نہ تھا جس سے انس و تقویت ہو، اور زمین بہت سے افراط سے تھیں، مگر اس زمانے میں زمین کی قدر نہ تھی، یہاں تک جمع سرکاری بھی مشکل سے ادا ہوتی تھی ان رشتہ دار مذکور بالا کو زید نے اپنے پاس بلالیا، اور شامل ہی اپنا کاروبار چلاتے رہے، اور کھاتے پیتے رہے، اور زید نے اپنی زندگی ہی میں خواہ اپنے مورث اعلی کی جائیداد میں شریک سمجھ کر، یا دوست اور انیس جان کر اپنی کچھ مزروعہ زمین اور کچھ بنجر ان بہنوں کے شوہروں کے نام سگان سرکاری پر موروثی کرادی، اور یہ موروثیت ایسے وقت میں کرائی گئی کہ جب زید اور زید کے متعلقین خوب اپنے کاروبار میں ہوشیار ہوگئے،

اور اپنی جائیداد پر قابض ہو گئے، اس وقت ان بہنوں نے اور ان کے شوہروں نے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی تو زید نے کہا کہ ہم تمہارے نام یہیں جائیداد اور گھر موروثی کے دیتے ہیں، وہاں جانے کی ضرورت نہیں، لڑکیاں اور ان کے شوہر راضی ہو گئے، اور سگان سرکاری پر زمین موروثی پر کرادی گئی، اور اس زمانہ میں لوگ بوجہ جہالت کے ھبہ وغیرہ کے مسائل سے ناواقف تھے، اور اب بھی اس خطہ میں ناواقفیت ہے، اور اور بیع وغیرہ کا خرچ بھی گوارا نہیں کر سکتے، بوجہ نقد کی قلت کے،

اب ایسی صورت میں دریافت طلب امر یہ ہے، کہ یہ صورت بیع یا ھبہ یا وراثت کے قائم مقام ہو سکتی ہے یا نہیں جبکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ معطی کے ذہن میں ھبہ کا لفظ یا معنی تھے یا نہیں؟ اور لڑکیوں میں سے کوئی اپنے مورث کے مال میں حصہ کے مستحق ہوئی یا نہیں؟ چونکہ یہ پتہ نہیں کہ انتقال کس کا کب ہوا؟ اور اس ملک میں اکثر اس قسم کی موروثی بیع اور رھن کا حق بھی معطی اور معطی کے ورثہ جائز رکھتے ہیں، چنانچہ اس صورت میں بھی جس کے متعلق خاص سوال کیا گیا ہے، کئی پشتوں کے بعد اب لب کشائی کی گئی ہے ورنہ پہلے سے جیسے اصلی مالک کو زمین کا مالک سمجھا جاتا ہے ان کو بھی زمین کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

عبدالمجید بچھرایونی

الجواب

چونکہ ھبہ یا بیع عقود میں سے ہیں، جن کے لئے الفاظ موضوعہ للھبۃ والبیع کا ہونا شرط ہے، اور ایسے الفاظ یا افعال ثبوت ھبہ یا بیع کے لئے کافی نہیں جن سے ھبہ وغیرہ کا مفہوم ہونا مشکوک ومحتمل ہو۔ اور جو لفظ اور عمل سوال میں مذکور ہے، اس کی دلالت ھبہ پر صریح نہیں، بلکہ نہایت مشکوک ہے، اس لئے اس سے ھبہ یا بیع کا ثبوت نہیں ہو سکتا، پس ضروری ہے کہ معطی کے ورثہ کو یہ جائیداد واپس کی جاتے، یا کچھ دے دلا کر صلح کے ساتھ ان کو راضی کر کے اس زمین کو حاصل کیا جائے، بدون اس کے کوئی صورت نہیں، فان الیقین لا یزول بالشك، واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون، ۱۷ جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ

ھبہ کی ایک خاص صورت کا حکم

سوال :۔ معروض خدمت والا آنکہ : والدہ صاحبہ کو پندرہ سو روپیہ کی جائیداد والد صاحب کے ترکہ میں سے ملی ہے، اور ایک ہزار کی جائیداد اور ایک مکان نانا صاحب کے ترکہ میں سے ملا ہے اور ہم لوگ چار بھائی اور دو بہن ہیں، مکان کی قیمت کم از کم اگر چھ سو روپے لگائی جائے، تو اس طرح کل جائیداد مع مکان کی قیمت اس وقت اکتیس سو روپیہ کی ہوئی، فرائض کی رو سے ہر بہن کا حصہ دس سہم میں ایک سہم قرار پاتا ہے، اس لئے ہر بہن کا حصہ سہ ۳۱۰ روپیہ کا ہوا، اب دریافت طلب یہ امر ہے، کہ والدہ صاحبہ چاہتی ہیں کہ محی الدین پور کی جائیدادیں جو خود والد صاحب کے ترکہ میں سے ان کو ملی ہے اس کو ہم لوگوں کو ھبہ کر دیں، تاکہ اس میں ان کے بعد بہنیں نہ لے سکیں، جس کا اندیشہ بھی ہے، اور چائل کا مکان اس لڑکی کو دے دیں جو چائل میں منسوب ہے، اور یہ بھی چاہتی ہیں کہ گو ہم تملیکاً تم لوگوں یعنی لڑکوں کو جائیداد دے دیں، مگر تبرعاً اس کی آمدنی سے ہماری خدمت کرتے رہو جس کی قوی امید ان کو اپنے لڑکوں سے ہے لیکن لڑکیوں سے نہیں ہے، کیونکہ وہ اختیار میں اپنے شوہر کے ہیں اس لئے دریافت فرماتی ہیں کہ اگر شرعاً کسی قسم کا مواخذہ نہ ہو تو محی الدین پور کی کل جائیداد، اور چائل کی دو تہائی جائیداد لڑکوں کو ھبہ کر دی جائے، اور مکان چائل کا، اور ایک تہائی جائیداد چائل کی، اپنے نام باقی رکھی جائے، تاکہ میرے بعد لڑکیاں اپنا حصہ لے سکیں، بلکہ مکان تو ایک بہن کو دے بھی دیا، اور یہ جائیداد ان کے شرعی حصہ سے کہیں زائد ہے، کیوں کہ دونوں لڑکیوں کا حصہ شرعاً سہ ۶۲۰ " روپیہ کا ہوتا ہے، اور مکان اور ایک تہائی جائیداد جو چھوڑی جاتی ہے، اس کی قیمت تخمینی نو سو تینتیس روپیہ تک ہے، ایک بہن کو کل مکان دینے کے بعد بھی دوسری بہن کا حصہ شرعی یعنی ۳۱۰ روپیہ بلکہ زائد کی جائیداد باقی رہتی ہے۔ والسلام مع الاکرام

از خادم احقر محمد عیسیٰ

تنقیح

جو جائیداد وہ اپنے نام رکھنا چاہتی ہیں، وفات کے بعد اس میں لڑکوں کا حق بھی ثابت ہوگا، حیات میں لڑکوں کو ھبہ کرنے سے ان کا حق اس متروکہ سے ساقط

نہ ہوگا، جو وفات کے وقت ان کی ملک رہے گا، اور اس صورت میں لڑکیوں کو بہت کم ملے گا، اور خلاف عدل لازم آئے گا، اور والدین پر اولاد کے ھبہ میں تسویہ، یا للذکر مثل حظ الانثیین مامور بہ ہے، اس لئے یہ صورت مناسب نہیں، بلکہ جس طرح وہ لڑکوں کو اسی وقت ھبہ کر رہی ہیں، اسی طرح لڑکیوں کو بھی ھبہ مع القبض کر دیں اور ان کی اجازت سے مکان وجائیداد کی آمدنی سے منتفع ہوتی رہیں، یا کل جائیداد مکانات کو وقف علی الاولاد للذکر مثل حظ الانثیین بشرط انتفاع واقف وقف کر دیں، اس میں کوئی خدشہ نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۱۷/ شعبان ۱۳۴۷ھ

ھبہ مشاع کا حکم

سوال:۔ جب والد صاحب مرحوم کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنی زرعی اور سکنی جائیداد، یعنی گاؤں اور مکانات کے پانچ وارث چھوڑے، (۱) جلیل احمد (۲) سعید احمد (۳) ابو القاسم (۴) اتقیا بیگم، (۵) احمدی بیگم۔ جلیل احمد اور سعید احمد حقیقی بھائی، اور ابو القاسم ستیلا بھائی یہ تینوں بھائی متوفی کے پسر تھے اور اتقیا بیگم متوفی کی زوجہ ہیں جن کے بطن سے ابو القاسم مذکورہ بالا تھا، احمدی بیگم متوفی کی والدہ تھیں، اور جلیل احمد وسعید احمد وابو القاسم کی دادی تھیں۔

بعد انتقال متوفی یعنی والد صاحب مرحوم مسمّی حافظ مصلح الدین احمد خان صاحب یہ جائیداد مشترکہ تھی تقسیم نہیں ہوئی، اور نہ بٹوارہ ہوا، بلکہ یکجائی رہی، اور اس جائیداد کا کام یعنی تحصیل ووصول کا میں (یعنی جلیل احمد) اور سعید احمد کرتے تھے، والد صاحب کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد ہمارے سوتیلے بھائی یعنی ابو القاسم کا انتقال ہوگیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد ہر شخص کا حصہ جائیداد میں اس کا نام قانونی طریقہ سے پڑگیا تھا، موافق شرعی سہام کے جب ابو القاسم کا انتقال ہوا، تب بھی شرعی اور قانونی اصول سے اس میں تبدیلی ہوگئی، یعنی ابو القاسم کا نام کاٹ دیا گیا۔ اور اس کے بجائے اس

کے ورثہ کا نام لکھا دیا گیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد جب ابوالقاسم کا انتقال ہوچکا اور جائیداد اب بھی یکجائی اور مشترک تھی، اور ہم دونوں بھائی یا ہم دونوں بھائیوں سے ایک اس جائیداد کا کام کرتا تھا، باقی نام ہر وارث کا اس کے حصۂ جائیداد میں پڑا ہوا تھا، کہ اسی زمانہ میں ہم دونوں بھائیوں کی دادی جواب بھی ہیں مسمّٰی احمدی بیگم جو کہ والدہ اور شرعی وارثہ تھیں، متوفی کی انہوں نے (اپنی جائیداد کا) یہ کیا کہ موضع ایواڑہ ضلع بلند شہر میں اور موضع قطب پور ضلع علی گڑھ (ان کی کل) زرعی جائیداد کا، اور خاص شہر علی گڑھ میں ان کی سکنی جائیداد کا جو کچھ حصہ تھا وہ کل کا کل ہم دونوں بھائیوں کے نام یعنی جلیل احمد اور سعید احمد کے نام (اس وقت ابوالقاسم کا انتقال ہوچکا تھا، البتہ ابوالقاسم کی والدہ زندہ تھیں، انہوں نے دادی صاحبہ کے اس فعل پر کچھ اعتراض نہیں کیا، کیونکہ دادی صاحبہ نے اپنا ہی حصہ ہم کو ھبہ کیا تھا) ھبہ کردیا، بذریعہ ھبہ نامہ رجسٹری شدہ، اور وہ دادی صاحبہ اب بھی زندہ ہیں، اس ھبہ کو سات سال کے قریب ہوچکے، ان کے حصہ کی ہم ہی تحصیل کرتے اور اپنے خرچ میں لاتے ہیں، تو اب یہ ھبہ صحیح ہوا یا نہیں؟ اور ہم ان کی جائیداد کے مالک ہوئے یا نہیں؟ اور جو کچھ روپیہ ان کی جائیداد سے اس ھبہ کے بعد ہم نے وصول کیا آیا ہم اس روپیہ کے مالک ہیں یا نہیں؟ شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید جائیداد زرعی کا ھبہ بغیر تقسیم کے صحیح نہیں ہوتا، اگر ھبہ صحیح نہیں ہوا تو اس کی صحت کی کیا صورت کی جائے؟ کیونکہ تقسیم میں تو بڑی دقت اور کچھ نقصان بھی ہے، یعنی تقسیم کے اندر خرچہ کافی پڑے گا، اور کسی وارث کو اس ھبہ پر اعتراض بھی نہیں۔

اگر یہ ھبہ صحیح نہیں ہوا تو اب تک جتنا روپیہ کل مشترکہ جائیداد میں سے بقدر دادی صاحبہ کی حصہ کے ہم نے وصول کیا ہے، کہ ہم اس کے دَین دار ہیں دادی کو بعد اس ھبہ کے؟

اب قابل غور یہ امر ہے کہ دادی صاحبہ نے اپنے حصہ کو ہم دونوں بھائیوں کے نام ھبہ کیا، اور ہم دونوں بھائی دوسری جائیداد میں شریک ہیں اور غالباً دادی صاحبہ کے جائز وارث بھی ہیں اور ھبہ سے پہلے بھی، اور ھبہ کے بعد بھی اس کل جائیداد پر متصرف ہیں، اگر یہ ھبہ صحیح نہیں ہوا تو کیا یہ ترکیب ہوسکتی ہے کہ ہم دونوں بھائی ایک قلیل رقم مثلاً دس روپیہ کی دادی صاحبہ کو دے کر کہیں کہ آپ اپنا حصہ ان دس روپوں میں ہم کو بیع کردیجئے کیونکہ بیع تو بغیر تقسیم کے صحیح نہیں ہے؟

الجواب

اصل مذہب ھبۃ المشاع المنقسم میں (یعنی ایسی چیز کے ھبہ جو قابل تقسیم ہے، اور تقسیم کر کے ھبہ نہیں کئے گئے) یہی ہے کہ ھبہ فاسد ہے مگر ایک روایت یہ ہے کہ فساد ھبہ اس وقت ہے جبکہ اجنبی کو ھبہ کیا جائے، اور شریک جائیداد کو ھبہ بدون تقسیم کے بھی صحیح ہے، اور بعض نے اس کو مختار بھی کہا ہے۔

قال فی الدر: وفی الصیرفیۃ عن العتابی، وقیل یجوز لشریکہ، وھو المختار اھ ج ۴ صـ ۷۸۰،

مگر یہ قول ظاہر مذہب کے خلاف ہے، اس لئے بدون مجبوری کے اس پر عمل درست نہیں، اور غالباً آج کل تقسیم جائیداد میں جس قدر خرچ اور پریشانی ہوتی ہے وہ مجبوری اور دشواری کی حد میں داخل ہے، اس لئے اس صورت میں اگر اس روایت پر عمل کر کے شریک کے لئے ھبہ بدون تقسیم کے صحیح کہا جائے تو گنجائش ہے، اور قبضہ کے بعد اس کو مفید ملک کہا جائے گا، لیکن بہتر یہ ہے کہ آئندہ کے لئے یا تو جائیداد تقسیم کر لی جائے، یا اس کا بیع نامہ کر لیا جائے اور بیع زبانی بھی کافی ہے، تحریری کی ضرورت نہیں، اور واھب زر ثمن کو معاف کر دے، یا زر ثمن اس قدر قلیل رکھا جائے جس کا ادا کرنا دشوار نہ ہو، اور گذشتہ آمدنی وصول کردہ سے بھی واھبہ کی معافی و برأت حاصل کر لی جائے۔ تاکہ احتیاطاً روایت مشہورہ کے موافق بھی سبکدوش ہو جائے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

۲۲ ر شوال ۱۳۴۷ھ

ملک غیر کا ھبہ درست نہیں اور مرض الموت میں بدون قبض موھوب لہ ھبہ کی ایک صورت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسمیان عبدالرحیم خان و عبدالعزیز خان" ساکنان قصبہ کیرانہ" باہم علاتی بھائی تھے، اور اپنے باپ پیر خان کے مرنے پر اس کے ترکہ کے وارث ہوئے تھے، ان میں سے عبدالرحیم خان نے جو معماری

کا کام سیکھ گیا تھا، اس نے باپ کے متروکہ احاطہ خام میں ایک پختہ مکان تیار کر لیا، اور عبدالعزیز خان بدستور سابق اُسی احاطہ کے ایک کچے مکان میں سکونت پذیر رہا، کچھ عرصہ بعد عبدالرحیم خان مذکور فوت ہوگیا، جس کی زوجہ اس کی زندگی ہی میں فوت ہو چکی تھی، صرف ایک بیٹا "اللہ دے خان" اس نے چھوڑا تھا جو اس کا وارث ہوا، مگر اس کی شادی تھانہ بھون میں ہوئی تھی، اور وہاں ہی اس کی ملازمت کا سلسلہ ہوگیا تھا، اس لئے وہ اپنے باپ کا بنا ہوا مکان اپنے چچا عبدالعزیز خان کی تحویل میں دے کر تھانہ بھون ہی رہتا رہا، جہاں اس کا انتقال ہوگیا۔

وارث ایک بیوہ (بہار افزا خانم) دو لڑکے (شریف احمد کمال و صغیر احمد خان) اور ایک لڑکی (شریفہ خانم) اس نے چھوڑے ہیں، بچے تینوں نابالغ ہیں، اور ان کی والدہ بہار افزا خانم ان کی پرورش کر رہی ہے۔ اب عبدالعزیز خان بھی لاولد فوت ہوگیا ہے، زوجہ اس کی حیات ہی میں مر چکی تھی، اللہ دے خان کی اولاد کے سوا کوئی عزیز قریب اس کا نہیں تھا، مگر اس نے مرض الموت میں مبتلا ہونے پر ایک غیر شخص عمر خان کو اپنا پروردہ ظاہر کیا۔ اور ایک دستاویز ھبہ نامہ اس کے حق میں لکھ کر رجسٹری کرا دی، جس میں صرف اپنا ہی حصہ ھبہ نہیں کیا، بلکہ اللہ دے خان کے باپ کا بنایا ہوا مکان بھی عمر خان کو دے دیا، مگر رجسٹری کے بعد جب تک وہ زندہ رہا بدستور سابق اسی مکان میں اس کی سکونت رہی، اور اسی میں فوت ہوا، اور رجسٹری کے لئے وہ اپنے پاؤں سے تحصیل جانے کا قابل نہ تھا اور اسی مرض میں ان کا انتقال بھی ہوا، اس کے علاوہ مرنے سے کچھ دیر پہلے اس کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی، اور اس نے چند اشخاص سے استدعا کی کہ اس دستاویز سے اصل وارثوں کی حق تلفی ہوتی ہے، اور مجھ کو لوٹ لیا گیا ہے، لہٰذا وہ دستاویز عمر خان سے واپس دلا دی جائے، لیکن عمر خان کے آنے کے پیشتر انھیں الفاظ کے تکرار کرتے کرتے اس کی جان نکل گئی۔ اب عمر خان خود کہتا ہے کہ اگر شرعاً کوئی حق اللہ دے خان کے بچوں کا ہو تو وہ ان کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتا، ایسی صورت میں امور ذیل کے متعلق حکم شرعی سے آگاہی بخشی جائے۔

(۱) عبدالعزیز خان کی متذکرۃ الصدر کارروائی کا اثر صرف اسی کے ذاتی حصہ پر عائد ہوگا یا عبدالرحیم خان کے حصہ پر بھی؟ جس کی اولاد موجود ہے؟

۲۔ اگر صرف عبدالعزیز خان ہی کے حصہ پر اس کارروائی کا اثر پڑے گا تو وہ دستاویز ھبہ نامہ جو حالت مرض الموت میں رجسٹری کرائی گئی، عبدالعزیز خان کے پورے حصّہ میں مؤثر ہوگی یا اس کے کسی جزو پر؟

۳۔ اگر عبدالعزیز خان کی اس دستاویز کا اثر عبدالعزیز خان کے حصہ کے کسی جزو پر پڑے گا، تو اس کو چھوڑ کر ما بقی ترکہ عبدالعزیز خان کے جائز حقدار کون اشخاص ہوں گے۔

بینوا توجروا اجرکم اللہ

الجواب

ملک غیر کا ھبہ کسی طرح بھی درست نہیں، نہ شرعاً، نہ عرفاً، نہ قانوناً، پس عبدالرحیم خان کے حصہ کو عبدالعزیز خان کا عمر خان کے نام ھبہ کرنا بالکل لغو و باطل ہے ہاں! عبدالعزیز کا یہ ھبہ اس کی مملوکہ میں ثلث کے اندر صحیح ہو جاتا، اگر موھوب کو ھبہ کے وقت تقسیم کر کے موھولہ کے قبضہ میں دے دیا جاتا، اور جب عمر خان نے عبدالعزیز خان کی حیات میں قبضہ نہیں کیا۔

کیونکہ موھوب مقسوم و مفرز نہیں، تو یہ ھبہ نامہ عبدالعزیز خان کے حصہ میں بھی صحیح نہیں ہوا، بلکہ اب یہ سب مکانات اللہ دے اور عبدالعزیز کے ورثہ کے ہیں، یعنی اللہ دے کی اولاد کے، کیونکہ اس کے بعد وارث کوئی نہیں۔

قال في الدر: وهبته ووقفه كل ذلك لحكم وصية فيعتبر من الثلث

قال الشامي: وهبته أي إذا اتصل بها القبض قبل موته، أما إذا مات ولم يقبض، فتبطل الوصية، لان هبة المريض هبة حقيقة، وإن كانت وصية حكمًا، صرح به قاضيخان وغيره اھ (ج ۴ ص ۶۶۸)

واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۸ / ربیع الأول ۱۳۴۸ھ

ھبۂ فاسدہ کی ایک صورت

سوال:۔ کسی نے اپنے پوتے کو اپنی زمین ھبہ کر دی بعوض اس کے کہ جب تک واھب یا واھب کی بیوی یا ان میں سے کوئی ایک زندہ رہیں، کل سالانہ غلہ اس موھوبہ کا انھیں کو ملے گا۔ کیا

یہ ھبہ صحیح ہوا ؟ اور عوض کا دینا موھوب لہ پر واجب ہوگا ؟ کیا اس پر قاضیخان کی یہ عبارت "رجل وهب لرجل أرضًا، وسلمها إليه، وشرط أن ينفق الموهوب له على الواهب من الخارج، كانت الهبة فاسدة"۔ صادق آئے گی؟ واضح رہے کہ اس ھبہ میں بشرط العوض کا ذکر ہے۔

سائل ....

الجواب

ہاں : یہ ھبہ فاسد ہے، جیسا کہ قاضی خان کے قول سے معلوم ہوا، بشرطیکہ یہ باغ کی زمین نہ ہو، بلکہ زراعت کی زمین ہو، عالمگیریہ ج ۵ ص ۲۴۲، اور اس کو ھبہ بشرط العوض الصحیح کہنا غلط ہے، کیونکہ عوض معدوم ومجہول ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ۔ از تھانہ بھون

۱۱ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ

بیٹے کو تعمیر مکان کے لئے زمین دینا ظاہر عرف میں اس کو ھبہ کرنا ہے دلیل ھبہ نہیں،

سوال :۔ مسئلہ ذیل میں حکم شرعی سے مطلع فرمایا جائے :۔ ۱۸۹۴ھ سے کچھ عرصہ قبل والد صاحب مرحوم کا زیور طلائی ونقرہ چوری ہوگیا، اور بعد کو پتہ چلا کہ ایک شخص نے عزیزوں ہی میں سے لے لیا تھا، چوری کرنے والے کے والد سے جب کہا سنا یا گیا، تو انہوں نے اپنا مکان اس کے عوض میں دینے کو کہا، چوری شدہ زیور قیمت میں مکان سے بہت زیادہ تھا، لیکن چونکہ ان کے پاس اور کچھ تھا ہی نہیں، اس لئے والد صاحب مرحوم نے اسی کو منظور کر لیا، اور صورت اس کی یہ قرار پائی کہ مکان کا رھن نامہ بالعوض کچھ روپیوں کے لکھ دیا جائے، اور بعد ختم میعاد ادائیگی دین اس پر قبضہ تحریر کر دی جائے۔ جیسا کہ نقل رھن نامہ سے ظاہر ہوگا، رجسٹری سرکاری ہوگی، یہ دستاویز والد صاحب نے میرے نام لکھوائی، میری عمر اس وقت چار برس کی ہوگی، اور مضمون رہن نامہ محض فرضی تھا محض روپیہ وصول کرنے کی ایک صورت تھی، چنانچہ مالک مکان نے کئی برسوں کے بعد سکونت اس مکان کی طرف کر دی، اور اس پر والد صاحب کا قبضہ رہا، اور مالک مکان کے وارثوں میں سے کسی نے کبھی دعویٰ نہیں کیا، بڑے ہو کر مجھ کو

اس کا علم ہوا کہ مکان میرے نام سے ہے، لیکن تاحیات دستاویز رھن نامہ والد صاحب نے اپنے ہی پاس رکھا، اور اس کو اپنی ہی ملک سمجھتے رہے، امور دریافت طلب یہ ہیں :۔

۱۔ منشی رجب علی صاحب جنہوں نے رھن نامہ لکھا تھا، مکان شرعی تقسیم کی رو سے نہیں پایا تھا، اور نہ اس زمانہ میں اس خاندان میں مکانات کی شرعی تقسیم ہوئی تھی، جس نے جہاں بنالیا وہیں رہنے لگے، اور وہی اس کے حصہ میں آگیا، چنانچہ ان کو یہی اجازت دے دی گئی تھی کہ اپنے رہنے کے لئے مکان بنالیں، رجب علی صاحب کے والد نے جو زمین کے مالک تھے رجب علی کو اجازت مکان بنانے کی دی تھی، اور جب رہن نامہ کی رجسٹری ہوئی تب کسی دوسرے عزیز نے عذرداری بھی نہیں کی کہ یہ زمین ان کی ملکیت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان کو حق اس بات کا تھا یا نہیں کہ اس مکان کو علیحدہ کرسکیں؟ خواہ رھن یا بیع کے ذریعہ سے؟

۲۔ یہ مکان ملک جناب والد صاحب مرحوم کی ہوگی یا میری؟ دستاویز میں نام میرا ہی ہے، لیکن ۱۹۲۷ء تک جب تک والد صاحب زندہ رہے، مکان سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں رہا؟

۳۔ عرصہ دس بارہ سال سے یہ مکان بالکل گر گیا ہے، صرف زمین باقی رہ گئی ہے دوسرے اعزاء جن میں رجب علی صاحب مرحوم کی اولاد شامل نہیں ہے، یہ دعوی کرتے ہیں کہ رجب علی صاحب کو مکان بنانے کی اجازت دی گئی تھی، اور مکان اب رہا نہیں، لہٰذا یہ زمین تمام عزیزوں میں تقسیم ہونا چاہئے، رھن نامہ میں مکان مع زمین تحریر ہے اور تحریر و رجسٹری کے وقت یہ اعزاء موجود تھے، کسی نے بھی عذرداری نہیں کی تھی ایسی صورت میں رھن نامہ میں زمین شامل سمجھی جاتے گی یا نہیں؟

"نقل رھن نامہ رجسٹری شدہ سرکاری"

منکہ شیخ رجب علی ولد شیخ خادم علی ساکن: قصبہ سندیلہ، محلہ مھتوانہ، ضلع ہردوی کا ہوں جو کہ فی الحال ضرورت خود، یعنی کدخدائی دختر خود ایک منزل مکان پختہ وخام مع اراضی متعلقہ آن موقوعہ محلہ مہتوانہ مسکونہ ومملوکہ ومقبوضہ خود بحدود ذیل بالعوض مبلغ پچاس روپیہ نصف جس کے مبلغ پچیس روپیہ ہوتے ہیں، بلا سود پاس شیخ ثامن علی والد شیخ ضامن علی حقانی، ساکن قصبہ سندیلہ، محلہ مہتوانہ ضلع ہردوی، رھن رکھ کر یک مشت مرتھن سے وصول پاکر اپنے تحت وتصرف میں لایا، اقرار یہ کہ بمدت پانچ سال روپیہ مذکورہ خواہ بدفعات، خواہ یک مشت حوالہ مرتھن کرکے مکان اپنا فک رھن کرلوں گا،

اور در صورت خلاف وعدہ کے مرتھن کو اختیار ہے کہ بعد انقضاء میعاد مذکور الصدر مکان مرھونہ پر دخل وقبضہ اپنا کرلیں گے، مجھ راھن کو کچھ عذر نہ ہوگا، حد شرقی (مرور مکان مرھونہ) حد غربی (مرور کوچہ نافذہ) حد جنوبی (مرور مکان مرھونہ) حد شمالی (مکان شیخ حسن عطا)۔ لہٰذا یہ چند کلمات بطور رھن نامہ لکھدیئے کہ سند رہے، بروقت کام آئے۔

المرقوم ۹/ اکتوبر ۱۸۹۴ء بقلم حسن عطار ہوازی، ساکن سندیلہ، ضلع ہردوی

العبد:- رجب علی بقلم خود۔

گواہ شد:- سید محمد ذکی ولد سید بشارت علی مخدوم زادہ

گواہ شد:- طالب علی بقلم خود۔

گواہ شد سید محمد تقی بقلم خود

احقر شیخ ثامن علی

۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ

الجواب

۱۔ باپ جس زمین میں بیٹے کو مکان بنانے کی اجازت دیتا ہے، ظاہر عرف یہ ہے کہ یہ زمین بیٹے کو ھبہ کردیتا ہے، اس لئے جب تک اس کے خلاف کوئی صریح دلیل نہ ہو اس زمین ومکان کو رجب علی مرحوم ہی کی ملک مانا جائے گا۔

۲۔ کسی کے نام رھن نامہ لکھدینا دلیل ھبہ کی نہیں، اس لئے جب تک اس کے علاوہ کوئی دلیل ھبہ کی نہ ہو، اس مکان کو والد کی ہی ملک مانا جائے گا۔

۳۔ محض ان اعزّہ کا قول دلیل نہیں ہوسکتا، جب تک اس کا کوئی ثبوت نہ دیں کہ رجب علی کے باپ نے زمین ان کو ھبہ نہ کی تھی۔ فقط

ظفر احمد عفاعنہ

از تھانہ بھون

۶/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ

رجوع فی الھبہ کی ایک صورت کا حکم

سوال:- مسماۃ ربل نے اپنا مشترکہ مشاع حصہ زمین مزروعہ کا اپنی ماں کو جوکہ اس

ملکیت میں حقدار بھی ہے ھبہ کیا، اور سرکار میں رجسٹری کرا کر دفتر میں اس کا نام داخل کرادیا چند برس وہ موھوب لہ اس حصہ کی پیدائش پر قابض رہی، پھر اس موھوب لہ نے وہ حصہ اپنے باپ کو فروخت کرکے سرکار میں نام داخل کرادیا، چند برسوں سے وہ مشتری بھی فوت ہوگیا ہے، اس کی اولاد اس حصہ پر قابض و متصرف ہے کہ مشاع پیدائش سے حصہ اٹھاتے رہتے ہیں، اب وہ واھبہ مسماۃ ربل رجوع کرنا چاہتی ہے، کیا اس کا رجوع صحیح ہے یا نہیں؟

غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ھبۂ مشاع فاسد ہے، مگر قبض سے مفید بملک ہوجاتا ہے جیسا کہ بیع وغیرہ" اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ اور لائق فتویٰ وعمل ہے یا نہیں؟ اور ایک روایت میں یہ بھی لکھا ہے کہ ھبۂ مشاع شریک کو صحیح ہے، یہ بھی مفتی بہ ہے یا نہیں؟

اگر مسماۃ ربل کا ھبۂ مشاع فاسد ہے تو چونکہ قبض اور تصرف اس میں چند برسوں سے جاری ہوگیا ہے، تو اب اس کو حسب الفتوی حق رجوع ہے یا نہیں؟ اور موھوب لھا اس کی محرم ماں ہے، اور خود اس ملکیت شریک بھی ہیں، اگر اس کا رجوع صحیح ہے تو اتنے برسوں کی پیدائش جو موھوب لہ اس کی ماں اور پھر مشتری اس کے نانا، اور اب مشتری کی اولاد لڑکے جو اب پیدائش اٹھاتے رہتے ہیں، ان میں سے کسی سے لے سکتی ہے یا نہیں؟ اور مشتری نے جو قیمت دی تھی، اب وہ مشتری کی اولاد کس سے لیویں یعنی واھبہ سے جو رجوع کرتی ہے یا موھوب لہ سے جس نے مبلغ لئے، اور حصہ فروخت کیا، یا جو اتنے سال جو پیدائش اٹھائی ہے، اس قیمت میں محسوب ہوگی، اور چونکہ پیدائش انہوں کے یعنی مشتری کے خرچ اور سعی سے ہوتی تھی، کیا وہ حق ان کا ہے یا اب تک واھبہ کا ہے؟ یا اس میں بھی غصب کی طرح حکم ہے کہ مشتری اپنا خرچ اور حق کمائی کا لے کر باقی صدقہ کرے، اور رجوع کی صورت میں قیمت بھی موھوب لہ یا واھبہ سے لے؟

جیسا حکم ہو تحریر فرمائیں۔

الجواب الاول من جامع امداد الاحکام

صورت مسئولہ میں واھبہ کو حق رجوع نہیں ہے، کیونکہ قبض سے وہ حصہ موھوب لہ ملک میں آگیا ہے، اور اس کے بعد جب اس نے بیع کردی، اور اپنی ملک سے نکال دیا تو

ھبہ کا حق رجوع باطل ہوگیا ہے۔

فان من موانع الرجوع تصرّف الموھوب لہ فی الموھوب بھبۃ أو بیع ونحوھما، کما فی العالمگیریۃ۔ ص۱

اور ھبۃ المشاع للشریک میں بعض کا فتویٰ صحت ھبہ پر ہے۔ اور یہ احقر بھی بعض دفعہ اس پر فتوی دیدیتا ہے، واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

ازتھانہ بھون

۱۴ / رجب ۱۳۴۸ھ

نوٹ:۔ سائل نے مسئلہ مذکورالصدر کو مکرر دوسری جگہ سے زبان فارسی میں دریافت کیا، وہ سوال وجواب بعینہ مذکور ہے۔

۔ استفتاء ۔

مسماۃ ربل حصہ مشترکہ خود از زمین برائے مادر خود ھبہ کرد و مادرش نیز در آں زمین حصہ می داشت، و دفتر سرکار انگریزی بنام مادر واھبہ ثبت شد، چند سال موھوبہ لھا آز آن حصہ منافع می گرفت، و قابضہ بود، و اولاد مشتری برزمین موھوب قابض و متصرف شدند، بعد از آں واھبہ مسماۃ ربل رجوع را خواہش دارد، آیا در ایں صورت رجوع واھبہ درست است یانہ؟ بینوا توجروا

الجواب الثانی من مولوی غلام نبی
مدرس مدرسہ قاسم العلوم گھوٹکی

مسماۃ ربل در ایں صورت رجوع می تواند، بلکہ ایں درحقیقت رجوع نیست، زیرآنکہ رجوع صحت ھبہ می خواہد، وھبہ در ایں صورت صحیح نیست، نزد امامنا الاعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ وتصرف موھوب لھا کہ بطریق بیع وھبہ واقع شدہ ہمہ غیر صحیح واقع شدہ ومثل ایں چنیں تصرفات مانع از رجوع نمی شود، وآں چہ در فتاوی ھندیہ آمدہ است۔

"فان من موانع الرجوع تصرف الموھوب لہ فی الموھوب بھبۃ أو بیع اونحوھما"۔ درھبہ صحیحہ است، و در ایں صورت استفتاء ھبہ فاسد ست، زیرا کہ ھبہ مشاع فیما یقسم است، وکتب ظاہر روایت مشحون ست، بفساد ھبۃ مشاع فیما یقسم

ص۱ ھندیۃ ج ۴ ص ۳۸۶، باب الخامس فی الرجوع فی الھبۃ ۸ افتی

چنانچہ در ہدایہ گفتہ۔

ولا تجوز الهبة فيما يقسم الا محرزة ومقسومةً، ولو وهب شقصا مشاعًا فالهبة فاسدة۔

ودر کنز الدقائق کہ مشتمل بر ظاہر الروایۃ ست، وردہ است، وتصح في محرز مقسوم ومشاع فيما لا يقسم، لا فيما يقسم"۔

وصاحب بحر در تحت ایں عبارت نوشتہ:۔

وقيد المشاع بما لا يقسم لأن هبة المشاع الذي تمكن قسمته لا يصح واطلقها، فشمل الهبة من الشريك مشاعاً،

ونیز صاحب بحر آوردہ است در تحت ایں عبارت کنز،

فان قسمه وسلمه صح، افاد أنه لو قبضه مشاعاً لا يملكه لئلا ينفذ تصرفه فيه، لأنها هبة فاسدة مالاً، وهي مضمونة بالقبض، ولا تفيد الملك للموهوب له، وهو المختار، فلو باعه الموهوب له لا يصح،

وہمچنیں در فتوی خیریہ آوردہ:۔

ولا تفيد الملك في ظاهر الرواية، قال الزيلعي: ولو سلمه شائعًا لم يملكه، حتى لا ينفذ تصرفه فيه، فيكون مضمونًا عليه، وينفذ فيه تصرف الواهب، ذكره الطحاوي، والقاضي خان اه مختصراً،

وامام محمدؒ در مبسوط کہ از کتب ظاہر الروایۃ ست تصریح کردہ:

لو وهب نصف داره من اخر، وسلمه إليه، فباعها الموهوب له لم يجز،

ایں عبارت امام محمدؒ دلالت واضحہ دارد کہ موہوب لہ مالک نمی گردد، زیرا کہ بیع بعد القبض، غیر جائز گفت، حاصل ایں کہ نقول در باب بسیار ست کہ ایں اصل مذہب ست وآنچہ در بعض روایت آمدہ کہ مشاع مفید ملک ست، فتوی بعض مشایخ ست، نہ اصل مذہب امام صاحب رحمہ اللہ علیہ پس چگونہ بفتوی بعض مشایخ اصل مذہب را گذاشتہ شود، وعمل بفتوی بعض مشایخ کردہ شود؟ باوجودیکہ اصحاب فتوی اکثر ایں شاں، نیز فتوی باصل مذہب دادہ، وظاہر روایت را معمول بہا ساختہ، چنانچہ صاحب ھدایہ و قاضی خان وطحاوی کہ صاحبان ترجیح اند، وصاحب فتوی خیریہ، وزیلعی وصاحب بحر کہ

از محققین حنفیہ ست، وصاحب نور العین المرام این کہ فتوی بفتوی معارض شد، واصل مذہب باقی ماند بلا معارض۔

پس فتوی باصل مذہب مقلد امام صاحب را لازم ست در این چنیں صورتیکہ فتوی اہل فتوی مختلف باشد۔ و در توافق اصل مذہب کبار و محققین حنفیہ باشد،

والله اعلم وعلمه اتم۔ فقط

حررہ غلام نبی جلال آبادی

مدرس اول مدرسہ قاسم العلوم

واقع گھوٹکی ــــ ۱۲

الجواب الثالث

من مولوی محمد قاسم، متوطن گڑھی، من مضافات ست سندھ

قال فی رد المختار فی کتاب الھبۃ تحت قول الدر، "وسلمه شائعًا لا یملکه فلا ینفذ تصرفه فیه"۔ قال فی الفتاوی الخیریۃ: ولا تفید الملك فی ظاهر الروایۃ، قال الزیلعی: ولو سلمه شائعًا لا یملکه، حتی لا ینفذ تصرفه فیه، فیکون مضمونًا علیه، وینفذ فیه تصرف الواهب ذکره الطحاوی وقاضی خان، وروی عن ابن رستم مثله، وذکر عصام أنها تفید الملك، وبه أخذ بعض المشایخ الخ۔ ومع افادتها الملك عند هذا البعض، اجمع الکل علی أن للواهب استردادها فی الموهوب له، ولو کان ذا رحم محرم من الواهب قال فی جامع الفصولین رامزا لفتوی الفضلی، ثم إذا هلکت افتیت بالرجوع للواهب هبۃ فاسدۃ لذی رحم محرم منه، إذ الفاسدۃ مضمونۃ علی ما مر، فاذا کانت مضمونۃ بالقیمۃ بعد الهلاك کانت مستحقۃ الرد قبل الهلاك الخ وکما یکون للواهب الرجوع فیما یکون هبۃ فاسدۃ، فلو رثته نقضه، لأنه مستحق الرد، ومضمون بالهلاك، ثم فی المقرر أن القضاء یتخصص، فأذا ولی السلطان قاضیًا لیقضی بمذهب أبی حنیفۃ۔ لا ینفذ قضائه بمذهب غیره لأنه معزول عنه بتخصیصه، فالتحق فیه بالرعیه،

نص علی ذلك علمائنا رحمهم الله تعالیٰ اھ ما فی الخیریة، وافتی به فی الحامدیة ایضًا، والتاجیة، وبه جزم فی الجوهرة والبحر، ونقل عن المبتغی (بالغین المعجمة) أنه لو باعه الموهوب له لا یصح۔

وفی نور العین عن الوجیز، الهبة الفاسدة مضمونة بالقبض، ولا یثبت الملك فیها إلا عند أداء العوض، نص علیه محمدؒ فی المبسوط، وهو قول أبی یوسفؒ، إذ الهبة تنقلب عقده معاوضة اھ وذکر قبله هبة المشاع فیما یقسم لا تفید الملك عند أبی حنیفةؒ، وفی القهستانی، لا تفید الملك، وهو المختار، کما فی المضمرات، وهذا مروی عن أبی حنیفةؒ وهو الصحیح اھ فحیث علمت أنه ظاهر الروایة نص علیه محمدؒ، وروی عن أبی حنیفةؒ ظهر أنه الذی علیه العمل، وإن صرح بأن المفتی به خلافه ولا سیما أن یکون ملکًا خبیثًا، کما یأتی، ویکون مضمونًا، کما علمته، فلم یجد نفعًا للموهوب له، فاغتنمه، وإنما اکثرت النقل فی مثل هذه لکثرة وقوعها، وعدم تنبیه اکثر الناس للزوم الضمان علی قول المخالف، ورجاء لدعوة نافعة بالخیر انتهی۔

وایضًا قال فی رد المحتار تحت قوله فی البزازیة، ونص فی الاصل أنه لو وهب نصف دار من آخر، وسلمها إلیه، فباعها الموهوب له لم یزول أنه لا یملك، حیث ابطل البیع بعد القبض، ونص فی الفتاوی أنه هو المختار الخ هذا هو ظهر لی فی هذا الباب، والله اعلم بالصواب،

حرره الفقیر محمد قاسم

المتوطن فی گڑھی یٰسین مهر

الجواب الرابع ثانیًا من جامع امداد الأحکام

میں اپنے پہلے جواب سے جو شعر اس کا ہے کہ واھب ہبۂ فاسدہ کو بعد تصرف موهوب لہ ظاہر روایت میں بھی حق رجوع نہیں، رجوع کرتا ہوں، اصل مذہب اور ظاہر روایت کے موافق واھب ہبۂ فاسدہ کو ہمیشہ حق رجوع حاصل ہے، البتہ اس

روایت کی بنا پر جس میں ھبۃ المشاع للشریک جائز قرار دیا گیا ہے، اور اس کو بھی صاحب درنے ہوالمختار سے تعبیر کیا ہے، جو جواز افتاء کے لئے عند الضرورت کافی ہے، صورت مسئولہ ھبہ فاسدہ ہی نہیں تو قبض و تصرف کے بعد واہب کو رجوع کا حق نہ ہوگا، هذا هو الذي اردت به الافتاء في الجواب، ولكن لم أصرح به كما ينبغي ولم أذكره أول الباب، فتبادر من كلامي انقطاع حق الرجوع على ظاهر الرواية۔

اس کے بعد تمام مفتیوں کو اس باب میں غور کرنا چاہیئے کہ جائیداد مزروعہ پر قبضہ کی حقیقت کیا ہے، میرے خیال میں کسی شخص کو یہ معلوم ہوجانا کہ فلاں فلاں نمبر زمین کا میرا ہے اور اس کے نام داخل خارج کاغذات مال میں ہوجانا قبض عقار کے لئے کافی ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، ورنہ اراضیٔ مقبوضہ کا تحقق بہت کم ہوگا۔ وفيه من الحرج ما لا يخفى۔ پس جن اصحاب فتوی نے صورت مسئولہ میں فساد ھبہ کا فتوی دیا ہے، ان کو یہ تحقیق کرلینا چاہیئے کہ صورت مسئولہ میں واہب اور موہوب لہ کے نمبر ہائے زمین ممتاز ہوکر موہوب لہ کے نام ان نمبروں کا داخل خارج ہوگیا تھا یا نہیں؟ اگر ہوچکا تھا تو یہ موہبہ ظاہر روایت پر بھی موہبہ فاسدہ نہیں۔ ولم انقح عن ذلك لعدم الحاجة إليه فتأتى بالرواية الثانية،

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

۱۰ر شعبان ۱۳۴۸ھ

مسئلہ ھبہ | **سوال**:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ:-

۱ زید نے اپنے انتقال پر اپنے وارثوں دو لڑکے ایک لڑکی نابالغاں، اور باپ اور بیوی کو چھوڑا، باپ نے کل اپنا حصہ جو کہ زید کے ترکہ میں اس کو پہنچتا تھا، زید کے بقیہ حصہ داروں کو دے دیا، اور یہ بات چند آدمیوں کے علم میں بھی آگئی۔ چنانچہ تقسیم جائیداد ثالث نے زید کے باپ کا حصہ بقیہ وارثوں میں لگا کر سرکاری کاغذات میں درج کرادیا، اور اس بات کا زید کے باپ نے بارہا اقرار بھی کیا۔

۲: لیکن جو مال بصورت نقد تھا تالث سے تقسیم ہونے سے رہ گیا، بلکہ جہاں بقیہ وارثوں کا روپیہ تجارت میں لگا ہوا تھا وہیں لگا رہا، اور اس بات کا کسی کو علم بھی نہ ہوا، چنانچہ اس واقعہ سے پانچ برس بعد زید کا باپ حج بیت اللہ کو جاتا ہے چلتے وقت بھی کہہ جاتا ہے کہ میں نے اپنا کل حصہ تم سب کو دیا، لیکن اب گیارہ برس کا عرصہ گذر جانے کے بعد جب اس کو علم ہوتا ہے کہ جو روپیہ نقد تھا، وہ سب وارثوں کو نہیں پہنچا بلکہ صرف دو وارثوں کے پاس ہے، تو وہ اپنا کل حصہ جو نقد روپیہ کا تھا واپس لینا چاہتا ہے سب وارثوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہے لہٰذا جواب مرحمت فرمایا جائے۔ کہ اس کو واپس لینے کا شرعی حق حاصل ہے یا نہیں؟

السائل: انوار

الجواب وھو الموافق للصواب

۱: جائیداد کا ہبہ مشہور قول پر تو صحیح نہیں ہوا، مگر امام عتابی کے قول پر صحیح ہو گیا، لما فی الدر (فان قسمه وسلمه صح) لزوال المانع: وقال العلامة الشامی رحمه الله تحت قوله (فان قسمه) أی الواهب بنفسه، او نائبه أو امر الموهوب له بأن یقسم مع شریکه کل ذلك، تتم به الهبة، کما هو ظاهر لمن عنده أدنی فقه، تأمل رملی (ج ۴ ص۷۸)

قلت: زوال الشیوع من بین الأملاك الموهوب لهم، وأما الشیوع بین الواهب والموهوب لهم فهو باق، وهو أیضا مانع من الهبة، ولکن فیه اختلاف، فی الصیرفیة عن العتابی[۱]

وهذ القول وإن کان خلاف المشهور، ولکن مولانا العلامة التهانوی مدظلهم العالی سوغ لأخذ هذه الروایة بعذ التسلیم شائعا

---

[۱] (وهو الامام العلامة الزاهد المنعوت زین الدین، أحد من سار ذکره من تصانیفه الکبار شرح الزیادات المشهور رواه عنه جماعة، منهم حافظ الدین وشمس الائمة الکردری وغیرهما الخ جواهر المضیة ۲ ا منہ) وقیل یجوز لشریکه، وهو المختار (در ص۷۸)

للضرورۃ وکثرۃ ابتلاء الناس، وفی قلعھم عن العادۃ حرج کما ھو الظاھر۔

۲؎: اور نقد کا ھبہ صحیح نہیں ہوا، اور زید کے والد کو حق ہے کہ وہ کل روپیہ خود وصول کرے اور خود رکھے۔ جن کے پاس وہ روپیہ ہے ان کو کہنا جائز نہیں۔

کما فی الدر المختار، وأما تملیك الدین من غیر من علیه الدین فان أمر بقبضه صحت لرجوعها الی هبة العین۔ وفی رد المختار تحت جواب عن سوال مقدر وهو أن تقییده بالعین مخرج لتملیك الدین من غیر من علیه الدین، مع أنه هبة، فیخرج عن التعریف۔ فأجاب بأنه یکون عینًا مآلاً، فالمراد بالعین فی التعریف ما کان عینًا حالاً أو مآلاً، قال بعض الفضلاء، ولهذا لا یلزم إلا إذا قبض. وله الرجوع قبله، فلو منعه حیث کان بحکم النیابة عن القبض اھ (ج ۴ ص۶۷۷)

قلت والقبض فی الواقعة المسئولة عنها کان شائعًا، فلم یصح القبض، لما هو مصرح فی الدر المختار، ونصه هذا:۔ (ولو سلمه شائعًا لا یملکه) الخ

تنبیہ:۔ جائیداد کے متعلق اس صورت میں ہے جبکہ تقسیم جائیداد حسی طور پر ہوئی ہو۔ اور اگر محض کاغذات میں تقسیم ہوئی، اور خارج میں جائیداد مشترک ہی رہی ہو تو جائیداد کا ھبہ بھی صحیح نہیں ہوا، واھب کو حق ہے کہ جائیداد بھی واپس لے لے، لأن الشیوع بین الموهوب لهم مانع، وروایة العتابی مخصوص بالشائع بین الواهب والموهوب له، فقط، واللہ اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب،

کتبه الاحقر عبد الکریم عفی عنه
ازخانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
مورخہ ۳۰/ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ

بیٹوں کو ھبہ بالعوض اور ورثہ کے لئے وصیت کا حکم

سوال:۔ نحمدہ ونصلی۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین صورت ذیل میں کہ زید نے اپنے مرنے سے پندرہ سال پیشتر اپنے کل مکانات مسکونہ وجملہ اثاث البیت اور متعدد اراضیات

مشخصہ اپنے چار بیٹوں کے نام ھبہ بالعوض کر دیئے، اور ھبہ نامہ بصورت رجسٹری مکمل اور دفتر سرکاری میں نام داخل و خارج ہوگیا، اور موھوب لھم کو قبضہ کروادیا، چونکہ موھوب لھم اس پندرہ سال کی مدت میں بصیغۂ ملازمت اپنی اپنی جگہ متعین رہے اس لئے بظاہر قبض و دخل جملہ جائیداد منقولہ وغیر منقولہ اور جملہ انتظامات بابت حفاظت آمدنی اراضی مذکورہ زید کے ہاتھ رہا کئے۔ اس ہی سال زید اپنی بقیہ اراضی بذریعۂ ایک وصیت نامہ کے کہ وہ بھی رجسٹری شدہ ہے، اپنی دو بیٹوں اور زوجۂ ثانی اور تین محروم الارث ناتیوں کے نام بشرائط ذیل تقسیم کردی۔

(۱) شرط اول: میں جائیداد مذکورہ وصیت نامہ پر تاحین حیات قابض اور متصرف رہوں گا۔

(۲) شرط دوم: میرے مرنے کے بعد میری تجہیز و تکفین اور خیر و خیرات میرے بیٹے کریں گے، اور اس جائیداد کی ایک سال کی آمدنی میرے مرنے پر میرے بیٹے لینے کے بعد دوسرے سال موافق تقسیم وصیت نامہ ہر شخص اپنے اپنے حصہ پر قابض و دخیل ہوجائے گا۔

اب موصی الھم کو دو باتوں میں نزاع ہے۔

۱ امر اول یہ کہ وصیت نامہ کی شرط ثانی کی صحت سے انکار کرتے ہیں کہ اول تو "لا وصیۃ للوارث" حدیث ہے۔ اور اگر وصیت صحیح بھی ہو تو اس میں اس قسم کی شرائط کا لگا دینا تو ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا لہٰذا ہم ایک سال کا انتظار نہیں کرسکتے، بلکہ مرنے کے بعد ہی سے فوراً وارث ہیں۔ (موصی لھم)

۲ امر ثانی اراضی موجودہ ھبہ نامہ کی آمدنی کے بقدر حصۂ وراثت ہم لوگ بھی مستحق ہیں۔ (حالانکہ زید نے وصیت اور ھبہ کی آمدنی کہیں الگ الگ نہیں رکھی بلکہ یکجائی رکھ کر اپنے اور اپنی اھلیہ اور بالائی شخص کی پرورش، اور دین لین اسی شخص سے کرتا رہا، اور موصی لھم میں سے کسی کسی کو بھی سالانہ کچھ کچھ دیتا رہتا تھا، اور ادھر ھبہ نامہ میں منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کو اپنے لڑکوں کے نام دے دیا تھا۔)

اب دو سوال ہیں (۱) اولاً یہ کہ۔ صورت مسئولہ میں زید کو بعض وارثوں کے لئے اس شرط سے وصیت کر دینا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر بمطابق "لا وصیۃ للوارث"

یہ وصیت نامہ ہی باطل ہے تو پھر زید کے یہ چار بیٹے اس جائیداد مندرجہ وصیت نامہ میں وارث ہوں گے یا نہیں۔

ثانیاً:۔ آمدنی جائیداد ھبہ نامہ جو زید نے بحیثیت منتظمانہ اپنے چار بیٹے (موہوب لہم) کے لئے بطور سرمایہ جمع کی ہے، اس میں موصی لہم کو حق وراثت پہنچتا ہے یا نہیں؟ واضح ہو کہ موہوب لہم اپنی مالیت کے جو آج پندرہ سال سے جمع ہوتی رہی ہے، گاہ بگاہ کچھ کچھ لے کر اپنی اپنی جگہ جہاں وہ ملازم ہیں خرچ میں لاتے رہے۔ فقط بینوا توجروا۔

احقر العباد محمد ساجد

مقام: درگاہ بازار

شہر کٹک (اڑیسہ)

الجواب

زید نے جو زمین چار بیٹوں کے نام ھبہ بالعوض کی ہے، وہ تو اس کے بیٹوں کی ملک ہوگی، اور جو زمین بذریعۂ وصیت نامہ کے بیٹوں اور زوجہ اور محروم الارث ناتیوں کے نام کی ہے، اس میں چونکہ بیٹیاں اور بیوی وارث ہیں، ان کے لئے وصیت باطل ہے، ہاں اس بقیہ جائیداد کے تہائی میں محروم الارث ناتیوں کے لئے وصیت صحیح ہے، اگر ان کے لئے تہائی کی یا اس سے کم وصیت کی ہو، فبہا، اور تہائی سے زیادہ کی ہو تو باطل ہے، جو بدون وارثوں کی اجازت کے صحیح نہیں ہو سکتی، اور اس بقیہ جائیداد کی دو تہائی میں چاروں بیٹے بھی وارث ہیں، اور بیٹیاں بھی، اور زوجہ بھی، اور جائیداد ھبہ نامہ میں اور اس کی آمدنی میں چاروں بیٹوں کے سوا کوئی حقدار نہیں، کیونکہ وہ تو ترکہ سے خارج ہے، جبکہ زید نے اپنی حیات میں اس کا مالک بیٹوں کو بنا دیا۔

(نوٹ) یہ جواب اس صورت میں ہے جبکہ وصیت نامہ میں بیع یا ھبہ کے الفاظ نہ ہوں، صرف وصیت ہی کا ذکر ہو، ورنہ وصیت نامہ کی نقل بھیج کر سوال دوبارہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون ۲۹، شوال ۱۳۴۸ھ

گورنمنٹ کی طرف سے معافی اور سکہ نمبری اراضی میں بڑے بیٹے کے نام ہونے کی شرط، اور اس میں سب ورثاء کا حقدار ہونا۔

سوال:- نہایت ادب سے گذارش ہے کہ فدویان ایک ایسی جگہ آباد ہیں جہاں جناب مولوی صاحبان کا کم گذر ہوتا ہے اس لئے ہم شرعی قواعد وقانون سے بے بہرہ ہیں، اس لئے حضور والا کو تکلیف دی جاتی ہے، امید کہ حضور غور فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

ایک باپ یا دادا کو خدمت کے صلے میں معافی یا سکہ نمبری اراضی عطا ہوئی، گورنمنٹ موبرد کے قانون میں یہ مقرر ہے کہ تین پشت تک بڑے بیٹے کے نام ہوتی چلی آتی ہے اس لئے حضور ایما فرمائیں کہ ان تین پشتوں میں جو چھوٹے بھائی ہوئے ہیں، شرع کی رو سے ان کا حق اس اراضی میں تھا کہ نہیں؟

الجواب

جب معافی یا سکہ نمبری اراضی گورنمنٹ کی طرف سے باپ یا دادا کو ھبہ کردی گئی اور اس نے اس پر قبضہ مالکانہ کرلیا، تو وہ اس کی ملک ہوگئی، اور اس کی وفات کے بعد تمام وارثوں کا حق اس میں جاری ہوگا، گورنمنٹ کی اس ھبہ میں شرط فاسد لگانے سے دوسرے وارثوں کا حق باطل نہ ہوگا، پس تین پشتوں میں جو چھوٹے بھائی ہوئے ہیں، وہ بھی شرعاً ان معافی وآراضی میں بڑے بھائی کے برابر حقدار ہیں۔

کسی ایک بیٹے کو جائیداد سے محروم کرنا یا حصہ کم دینا

سوال:- ایک باپ کے تین لڑکے ہیں، بڑا لڑکا اپنے باپ کو ناراض رکھتا ہے، باپ تاہنوز بوڑھا نہیں ہوا ہے، گھر در باہر روز روز جھگڑے ہوتے ہیں آخر کار یہی فیصلہ ہوا کہ بڑا لڑکا الگ ہوگیا، یعنی گھر میں جو چیزیں موجود ہیں ان کے چار حصے کئے گئے، یعنی تین لڑکوں کے، اور ایک خود باپ نے اپنا حصہ لیا، بڑا لڑکا شادی شدہ ہے، مگر دو چھوٹے لڑکے بغیر شادی شدہ ہیں، اس لئے باپ نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں لڑکوں کی شادی کے نام سے آٹھ سو روپیہ ٹھہرا کر بڑے لڑکے سے چوتھا حصہ یعنی دو سو روپیہ لے لئے، اور زمین میں سے بڑے لڑکے کو حصہ نہیں دیا، باپ نے یہ فیصلہ درست کیا یا غلط؟

ازسائلان ۔ رفیع محمد خان، وقلندر خان بیلنشنر

الجواب

باپ کو اپنی زندگی میں اختیار ہے کہ اپنی جائیداد جس بیٹے کو چاہے دے، جس کو چاہے نہ دے، البتہ بلاوجہ کسی کو محروم کرنا یا کم دینا برا ہے۔ اور اگر وجہ معقول سے ایسا کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

خانقاہ امدادیہ، از تھانہ بھون

۱۹ر ذیقعدہ ۴۸ھ

مسئلہ متعلق کتاب الھبۃ

سوال :- حضرت اقدس مولائی ومقتدائی مدظلہم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج اقدس ! بالسلاک عریضہ سابقہ مورخہ ۲ر ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ باادب عرض ہے کہ زید نے از قسم زیور توڑے اور لچا اپنی زوجہ ھندہ کو دیا تھا، پھر اس سے معافی مہر پر خلع کیا، ھندہ نے مہر معاف کر دیا، مگر جاتے ہوئے زید نے اس سے زیور اور لچے بھی لے لئے، اس کی نسبت یہ تنقیح صادر فرمائی گئی ہے" کہ یہ زیور ھندہ کی ملک کر دیا گیا تھا، یا اس کو عاریۃً پہننے کو دیا تھا، جواباً عرض ہے کہ ان دو اشیاء میں سے لچا زید کی والدہ نے دیا تھا، اب نہیں معلوم ھندہ کی ملک کر دیا تھا یا عاریۃً پہننے کو دیا تھا، اس لئے اب والدۂ زید کا انتقال ہو گیا ہے۔

اب رہے توڑے۔ اس میں تھوڑی چاندی ھندہ کی ہے، زید کی والدہ نے مزید چاندی ھندہ کی چاندی میں شریک کر کے توڑے بنوائے، اس کی نسبت بھی معلوم نہیں ہو سکتا، کہ مزید چاندی ھبہ کی تھی یا عاریۃً دی تھی۔

برائے کرم ایما فرمایا جائے کہ ذیل کی صورتوں میں کیا حکم ہے؟

۱۔ اگر ثابت ہو جائے کہ زید کی والدہ نے اپنی بہو ھندہ کو ہر دو زیور ھندہ کی ملک کر دیا تھا ؟

الجواب

اس صورت میں ان زیوروں کا ھندہ سے لینا جائز نہیں کیونکہ خلع مہر پر ہوا ہے،

پس مہر سے زیادہ لینے کا شوہر کو کوئی حق نہیں، اور مہر دہ لے چکا ہے، کیونکہ ھندہ نے مہر اُسے معاف کر دیا۔ پس زیوروں کا واپس کرنا لازم ہے۔

۲ یا ثابت ہو جائے کہ عاریۃً پہننے کو دیا تھا؟

الجواب

اس صورت میں اس زیور کا لے لینا جائز ہے، کیونکہ وہ ہندہ کی ملک نہیں۔

۳. یا معلوم نہ ہو سکے کہ ملک کر دیا تھا یا عاریۃً پہننے کو دیا تھا؟

الجواب

اس صورت میں زوجہ اور زوج دونوں میں سے اگر کوئی بیّنہ قائم کر دیں تو اس کی ملک ثابت ہوگی۔ اگر دونوں بیّنہ قائم کریں، تو جس کا بیّنہ عرف کے خلاف ہو وہ قابل [illegible] اگر بیّنہ کسی کے پاس نہ ہو تو عورت کا قول مع قسم کے قابل قبول ہوگا۔

۴ یا اس بارے میں ہندہ کا قول معتبر سمجھا جائے گا۔ اگر وہ دریافت کرنے پر کہے کہ زیور میری ملک کر دیا گیا تھا؟

خادم فقیر محمد

ناظم تعلیمات، نلگندہ۔ دکن

الجواب

۳ میں تفصیل گذر چکی، اگر زوجین کے پاس بیّنہ نہ ہو تو عورت کا قول مع قسم کے معتبر ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۹ رمحرم ۱۳۴۹ھ

ہبہ میں عوض لینے کے بعد اس کی بیع کرنا صحیح نہیں اور رجوع عن الھبہ کیلئے قضاء قاضی شرط ہے

السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ مندرجہ ذیل میں :

زید شش قطعہ مکانات بلا شرکت غیرے مالک ہے بوجہ ملکیت خود زید نے اپنے رشتہ داروں کو شش قطعہ مکانات زبانی ہبہ کر دیے اور اسی وقت مبلغ پانچ سو روپے بعوض ہبہ زید کے رشتہ داروں نے زید کو دیا اور زید نے اس کو قبول ومنظور کر لیا اور تقسیم کر کے مکانات قبضہ مالکانہ میں دیدیے۔ بعد وفات یکے از موہوب لھما جائداد موہوبہ اس کے ورثہ کے قبضہ میں آگئی ورثاء نے اپنے اپنے حصص ایک دوسرے سے تبدیل کر دیئے اور یہ انتقال جائداد واہب کی حیات میں ہوا شہادت کافی مشمولہ مثل موجود۔ بعد چند روز زید نے تائیدات دستاویز ہبہ نامہ مرتب کروائے اور دستاویز کے مضمون اول میں یہ عبارت ہے (بصحتِ ہوش وحواس وثباتِ عقل بلا اکراہ واجبار غیرے مع اس کے تمامی حقوق داخلی وخارجی شرعیہ کے ہبہ کر دیے یعنی بخشدیے) مضمون دوم یہ عبارت ہے : (تاحیات خود منمقر قابض ودخیل ہونے اور بعد فوتی میرے مسماتان کے قبضہ مالکانہ میں رہیں گے) آخری دستاویز کی عبارت یہ ہے: (یہ ہبہ صحیح وشرعی جائز ونافذ خالی شروطِ مفسدہ سے بتراضی متعاقدین واقع ہوئی اور مکاناتِ موہوبہ کو قبضہ مالکانہ میں دیدیے اب میں یا میرے کوئی بھی وارثان وقائم مقامان وجانشینان نسبت مکاناتِ موہوبہ کچھ کسی قسم کا حق ودعوی کریں تو باطل وناجائز ونامسموع متصور ہو) دستاویز ہبہ نامہ میں معاوضہ پانچصد روپیہ وتقسیم مکانات موہوبہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ اول زبانی ہبہ ہوئی اس پر اعتبار کیا جائے گا یا دستاویز ہبہ نامہ پر جو بعد چند روز بنا بہ تائید معاہدہ زبانی مرتب ہوئی اگر دستاویز ہبہ نامہ تحریر ہو یا نہ ہو تو زبانی ہبہ جو پہلے ہو چکی ہے وہ بااثر ہے تو زید ایسی صورت میں مکاناتِ موہوبہ کو قبل استرداد عمل قانونی وشرعی کے بیع کر سکتا ہے یا بعد استرداد۔ اگر حسب عمل قانونی وشرعی زید نے ہبہ نامہ کو مسترد نہ کرایا تو ایسی صورت میں زید مکاناتِ موہوبہ ومقبوضہ موہوب الیہما کو کسی خریدار کے نام بیع کر سکتا ہے یا نہیں ؟

محمد عبد اللہ خان پنشنر از بھوپال بیرون دروازہ

الجواب

قال فی العالمگیریہ لیس لہ حق الرجوع بعد التسلیم فی ذی الرحم المحرم وفی ماسوی ذلک لہ حق الرجوع الا ان بعد التسلیم لاینفرد الواھب بالرجوع بل یحتاج فیہ الی القضاء اوالرضاء وقبل التسلیم ینفرد الواھب بذلک ھکذا فی الذخیرۃ۔ وفیہ ایضاً اما العوارض المانعۃ من الرجوع فانواع ومنھا خروج الموھوب عن ملک الموھوب لہ بأی سبب کان من البیع والھبۃ ونحوھما۔ وکذا بالموت لأن الثابت للوارث غیر ما کان ثابتاً للمورث الی أن قال : ومنھا العوض اھ - وفیہ ایضاً ولا یرجع فی الھبۃ من المحارم بالقرابۃ کالآباء والامھات وان علوا والاولاد وان سفلوا۔ واولاد البنین والبنات فی ذلک سواء وکذا الاخوۃ والاخوات والاعمام والعمات الخ ص۲۳۵ ج ۵

صورتِ مسئولہ میں زید نے جن رشتہ داروں کو اپنے مکانات ہبہ کیے ہیں اگر وہ ذی رحم محرم ہیں (ذی رحم محرم میں اصول وفروع اور اولاد ذکور واناث کی اولاد اور بھائی بہن اور ان کی اولاد اور پھوپھی داخل ہیں مگر چچا پھوپھی کی اولاد محرم نہیں) تو اس صورت میں خود محرمیت رجوع فی الھبہ سے مانع ہے بعد تسلیم کے۔ اور اگر وہ ذی رحم محرم نہیں ہیں تو جب بھی زید کو اس ھبہ میں رجوع کا حق نہیں کیوں کہ اس نے پانچسو روپے بعوض ہبہ کے موہوب لھم سے قبول کیے ہیں اور عوض لے لینا اجنبی سے بھی مانع رجوع ہے، رشتہ داروں سے بطریقِ اولیٰ۔ باقی اس عوض کا تذکرہ دستاویز میں نہ ہونا کچھ مضر نہیں جبکہ شہادت سے کافی ثبوت ہوا در اگر موہوب لھم محارم بالقرابت بھی نہیں اور پانچصد روپیہ بعوض ہبہ دیے جانے کا بھی ثبوت شرعی نہیں تو اس وقت یہ حکم ہے کہ جو موہوب لہ فوت ہو گیا ہے اور اس کا حصہ اس کے ورثاء کو پہنچ گیا ہے اس میں تو زید کو کسی طرح حقِ رجوع نہیں اور جو موہوب لہ زندہ ہے اس کے حصہ میں بھی زید خود رجوع نہیں کر سکتا بلکہ قضاء قاضی یا موہوب لہ کی تراضی ضروری ہے لیکن اگر در حقیقت اس نے ہبہ کا عوض وصول کیا ہے گو ثبوت بہم نہ پہنچ سکے تو اس صورت میں دیانۃً زید کو رجوع فی الھبہ حرام اور باعثِ گناہ شدید ہے۔ واللہ اعلم۔

کتابُ الاکراہ

اکراہ علی التوکیل بالنکاح باطل ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ:-

برادری نے مسماۃ ھندہ بالغہ کا جبراً نکاح زید کے ساتھ کردیا، جس کو ھندہ نے قطعی اقرار نہیں کیا، اور متنفر رہی اور یہاں تک نفرت رہی کہ نکاح کے شب کو ھندہ مکان کے اندر قفل لگاکر سورہی، اور زید دروازے کے باہر سویا، اور تمام شب مقفل کواڑوں سے باہر خوشامد کواڑ کھولنے کی کرتا رہا، آخرکار صبح ہوگئی، زید اپنے مکان کو رفع ضرورت پیشاب یا پاخانہ کے لئے وہاں سے علیحدہ ہوکر چلا گیا، ھندہ قفل اپنا کھول کر وہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ جاکر امن اس فرضی نکاح سے حاصل کیا۔ اور اس وقت ھندہ کو اس فرضی نکاح کی رضامندی نہیں ہے؟

آیا یہ نکاح قائم رہا یا خارج رہا؟ اور دوسری جگہ اپنی رضامندی اور خواہش سے نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟ جواب سے مطلع فرمائیں۔ والسلام

رقیمہ نیاز محمد روشن روغنگر و شیرانی آہنگر
از قصبہ ناتونہ، محلہ: کوٹ، تحصیل: دیوبند
ضلع سہارنپور۔

تنقیح

۱۔ کیا ان جبر کرنے والوں نے مسماۃ ہندہ کی زبان سے نکاح سے پہلے اجازت نکاح کے الفاظ بھی جبراً کہلوالئے تھے؟ اگر ایسا ہوا تو سوال دوبارہ کیا جائے۔ اور وہ الفاظ بھی لکھے جائیں جو جبراً اس سے کہلوائے گئے تھے۔

۲۔ نکاح کی خبر سن کر ھندہ محض نفرت ہی ہوئی یا اس نے خبر سنتے ہی زبان سے بھی انکار

کیا، یا محض خاموش رہی ؟

بدون ان تنقیحات کے جواب کے جواب نہیں دیا جائے گا۔

فقط والسلام

ظفر احمد عفا عنہ۔ از تھانہ بھون

خانقاہ امدادیہ،

۹ ر شوال ۱۳۴٦ھ

جواب تنقیح

۱ ھندہ نے بوجہ اپنی شرم وآبرو کے جبکہ ھندہ کو برادری کے مجمع نے یہ الفاظ کہی کہ "تجھ کو برھنہ کرکے زنجیروں سے درخت میں لٹکایا جائے گا" (تو اگر ہندہ وہ الفاظ جواب خط سے آگے تحریر ہوں گے نہ کہتی، تو ضرور برادری کے لوگ ایسا کرتے کہ اس کو برھنہ کرکے لٹکایا جاتا، اور مار پڑتی) کہا کہ اچھا آپ لوگوں کو اختیار ہے۔" اس گھر پر آج چراغ جلے گا، کل نہیں جلے گا۔

۲ نکاح کی خبر سے فوراً انکار کیا، اور تمام رات برادری کی وجہ سے مکان میں مقفل رہ کر علی الصباح موقع پاکر پولیس میں رپورٹ درج کرادی کہ مجھے زبردستی نکاح کیا گیا، میں ہرگز ہرگز راضی نہیں ہوں۔

۳ جبکہ برادری نے ھندہ سے دریافت کیا تھا کہ جس شخص سے تو راضی ہو اس سے نکاح کردیں؟ تو ھندہ نے نام (روشن) لے کر مجمع کو خطاب کیا کہ اس سے نکاح کردو، مگر برادری کے مجمع نے ایسا نہیں کیا، بلکہ دوسرے شخص سے نکاح کردیا تھا جبراً۔

الجواب

صورت مسئولہ میں عورت نے اکراہ وجبر کے ساتھ برادری کو وکیل نکاح بنایا ہے اور اکراہ علی التوکیل بالنکاح ہمارے نزدیک باطل ہے۔ اس لئے نکاح صحیح نہیں ہوا، اور ھندہ جس سے چاہے اپنا نکاح رضاء کے ساتھ کرسکتی ہے۔

قال فی الدر فی باب الإکراہ: و(صح) توکیلہ بطلاق وعتاق، وما فی الأشباہ من خلافہ فقیاس، والاستحسان وقوعہ، والأصل عندنا أن کل مایصح مع الھزل یصح مع الاکراہ، لان مایصح مع الھزل لایحتمل الفسخ،

وکل ما لا یحتمل الفسخ لا یوثر فیہ الاکراہ اھ

قلت: والقیاس أن لا تصح الوکالۃ لأنہا تبطل مع الہزل کما صرحوا به، کما ذکرہ الشامی (ج ۵ ص۱۳۲) وہذا ہو الراجح عندنا، لأن صحۃ بعض العقود مع الہزل انما ہی بناءً علی الحدیث "ثلث جدہن جد، وہزلہن جد" ولیست الوکالۃ من ہذہ الثلث لما قالوا: إنہا تبطل بالہزل فالراجح ما فی الأشباہ،

وأیضاً: فصحۃ التوکیل بالنکاح اکراہاً لم یرہ أحد منقولاً، کما ذکرہ الشامی، وإنما الحقوہا بالطلاق والعتاق۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۱۵ر شوال ۱۳۴۶ھ

کتاب الامارۃ والسیاسۃ

حضرت تھانویؒ کی ایک تحریر بابت حمایت خاکساران و مسلم لیگ
(ایک تحریف کا ازالہ بقلم حضرت تھانوی قدس سرہ)

نقل؎ جواب حضرت مولاناؒ بر اشتہار سرخ شائع کردہ جماعت
احرار سہارنپور بعنوان "مسلم لیگ میں شریک ہونا حرام ہے" الخ

جواب

اس اشتہار میں جتنی عبارت میری ہے اس پر میں نے خط بنا دیا ہے، ابتداء اس لفظ سے ہے "اس جماعت کے اقوال.... اور انتہا اس لفظ پر ہے۔" واجب ہے" اور دستخط اسی عبارت پر ہے۔ اور اس کا تعلق صرف جماعت خاکساران سے ہے، نہ کہ مسلم لیگ سے۔"

بس اتنی حقیقت ہے باقی کا میں ذمہ دار نہیں، اس جماعت کے متعلق اور اس سے تعاون کے متعلق یہاں مضمون مرتب ہو رہا ہے، اس کا انتظار کیا جائے۔ بلاوجہ نزاع مناسب نہیں،

اشرف علی
(تاریخ ۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ
بجواب استفتاء آمدہ از کیرانہ بتوسط پیرجی ظفر احمد صاحب)

؎ یہ پوری تحریر مسوّدہ "امداد الاحکام" کے رجسٹر ۹ کے شروع میں درج ہے۔ سوال درج نہیں۔ مگر جواب سے سوال کو سمجھا جا سکتا ہے، اس لئے وہ تحریر بعینہٖ یہاں نقل کر دی گئی حاصل اس تحریر کا یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (بقیہ اگلے صفحے پر)

کتاب الدعوی والشہادات والقضاء

مجلس قضاء کے بغیر شہادت شرعاً معتبر نہیں

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ :- مسماۃ ھندہ کا شوہر اپنی جائیداد مکانات وغیرہ چھوڑ کر فوت ہوگیا، اور دین مہر اس کا اس کے شوہر کے ذمہ باقی ہے، آیا یہ جائیداد مذکورہ ورثہ پر تقسیم ہو جائے گی یا عوض دین مہر کے ھندہ کو ملے گی، اور اقرار شوہر واسطے دین مہر زوجہ اپنی کے عند الشہود درست ہے یا نہیں ؟ اور تعداد شہود عند الشرع کتنی ہے ؟ بینوا توجروا۔

جواب

درصورت مرقومہ باقی رہے دین مہر ذمہ شوہر کے جائیداد مذکورہ بمطالبہ ھندہ ھندہ کو ملے گا، اور اگر جائیداد اس قدر ہے کہ بعد ادار مہر کے باقی رہے تو ورثہ پر تقسیم ہوگی،

کما فی الشامی، قال فی الدر المختار: ثم تقدم دیونہ التی لہا مطالب من جھۃ العباد، ویقدم دین الصحۃ علی دین المرض الخ ثم یقسم بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ــــ) نے ایک مضمون جماعت خاکساران کے متعلق تحریر فرمایا تھا جس میں بعض لوگوں نے تحریف کر کے ایک سرخ رنگ کا اشتہار شائع کیا جس میں ظاہر کیا گیا کہ حضرت تھانویؒ کی وہ تحریر مسلم لیگ کے متعلق ہے، اس پر کیرانہ سے ایک سوال حضرت کے پاس آیا، جس کا جواب حضرت ہی نے تحریر فرمایا اور اس کی نقل امداد الاحکام میں محفوظ کی گئی جو یہاں بعینہ نقل کیا جا رہا ہے۔ فقط

محمد رفیع عثمانی

دار العلوم کراچی

۲۹ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ

ذلك بين ورثته انتهى۔ وايضاً فيه، قال العلامة الشامي على قول الدر المختار، ومثل دينه۔ أى مثله جنساً ومؤجلاً إذا كان من جنسه، والملئ الشافعيؒ، أخذ خلاف الجنس أى من النقود والعروض لأن النقود يجوز أخذها عندنا على ما قررناه آنفاً۔ لكن رأيت فى شرح نظم الكنز للمقدسى من كتاب الحجر، قال ونقل جد والدى لأمه الجمال الأشقر فى شرحه للقدورى، إن عدم جواز الأخذ من خلاف الجنس كان فى زمانهم لمطاوعتهم فى الحقوق، والفتوى اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أى مال كان، لاسيما فى ديارنا لمداومتهم فى العقوق انتهى۔

اور اقل تعداد شہود دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت

كما فى الهداية، أقل الشهادة رجلان اور رجل وامرأتان۔

اور ادائے شہادت میں فقط موافقت دعوی کافی ہے۔

كما فى الهداية، الشهادة إذا وافقت الدعوى قبلت انتهى، وقال فى العناية: قوله إذا وافقت الدعوى بأن تتحد انواعاً وكماً وكيفاً وزماناً وفعلا وانفعالاً ووضعاً وملكاً ونسبةً انتهى۔

اب چونکہ شہادت شاہدین ھندہ یعنی کولیہ میاں اور سفر ملک نوع کم کیف، زمان، فعل، انفعال، وضع، ملک نسبت میں اتفاق ہیں، لہذا دعوی مسماۃ مذکورہ صحیح وثابت واموال مقررہ بسبب اقرار مقر مسماۃ مذکورہ کو ملے گا۔

ہذا حکم الکتاب، واللہ اعلم بالصواب

المجیب محمد خلیل الرحمن عفی عنہ

قلت وشرط لصحة الشهادة مجلس القاضى أيضاً فلا تعتبر بدونها، قال فى الدرهى أخبار صدق لإثبات حق بلفظ الشهادة، فى مجلس القاضى وفى رد المحتار كذا فى البحر، لكنه ذكر أولاً أن شرائط الشهادة نوعان: ما هو شرط تحملها أدائها، فالأول ثلثة، وقد ذكرها الشارح، والثانى أربعة انواع، مايرجع إلى الشاهد، ومايرجع إلى الشهادة، ومايرجع إلى مكانها، ومايرجع إلى المشهود به، وذكر أن مايرجع إلى الشاهد السبعة عشر،

العامة والخاصة، ومایرجع إلی الشهادة ثلثة، لفظ الشهادة والعدد فی الشهادة، بما یطلع علیه الرجال، واتفاق الشاهدین ومایرجع إلی مکانها واحد، وهو مجلس القضاء الخ۔ (ج ۴ ص ۵۷۳)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ شہادت کے معتبر ہونے کے لئے مجلس قضا بھی شرط ہے۔ پس اگر ھندہ میں اور اس کے شوہر کے ورثہ میں مقدار مہر کی بابت اختلاف ہو تو محض دو گواہوں کا ورثہ کے سامنے گواہی دینا شرعی شہادت شمار نہ ہوگا جب تک کہ وہ دونوں کسی قاضی مسلم کے سامنے مجلس قضاء میں گواہی نہ دیں، اور اگر ورثہ نے بدون مجلس قضاء کے اس شہادت پر عمل کیا، تو جو وارث نابالغ ہوں ان کے حق میں یہ شہادت حجت نہ ہوگی، اور نہ محض اس گواہی کی بناء پر ان کے حق میں سے عورت کو کچھ دیا جا سکتا ہے۔ البتہ جو ورثہ بالغ ہوں، وہ اگر رضامندی سے ان گواہوں کے بیان پر عمل کرنا چاہیں تو ان کو اپنے حصہ میں اختیار ہے۔ اگر یہ گواہی مجلس قضاء قاضی مسلم میں پیش نہ ہوتی ہو تو ورثہ کو چاہیئے کہ مہر کی جتنی مقدار بطور تواتر کے یقینی معلوم ہو اس کا اعتبار کریں، ان گواہوں کے قول پر اعتماد نہ کریں۔ اور اگر تواتر سے کوئی مقدار معلوم نہ ہو تو اس عورت کا مہر مثل (یعنی خاندانی مہر) معلوم کر کے وہ ادا کرے بشرطیکہ عورت نے پہلے سے معاف نہ کیا ہو۔ اور شوہر نے بھی ادا نہ کیا ہو۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۳ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ

دو گواہ عورتوں کے درمیان تفریق کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک مقدمہ میں دو عورتیں اور ایک مرد گواہ ہوں اور قاضی عورتوں میں تفریق کر کے ان کے بیانات سنے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

بہتر تو یہ ہے کہ قاضی عورتوں میں تفریق نہ کرے، کیونکہ دو عورتیں مل کر بمنزلہ ایک گواہ کے ہیں، لیکن اگر کسی ضرورت سے تفریق کرے تو جائز ہے بینہ کی حجیت میں اس سے

کچھ نقصان نہ لازم آئے گا۔

قال في البدائع (ج ۷ ص۱) ولهذا اتهم الشهود فلا بأس بأن يفرقهم عند اداء الشهادة، فيسئلهم أين كان؟ ومتى كان؟ فان اختلفوا اختلافاً يوجب رد الشهادة ردّها وإلا فلا اھ

قلت: وهذا بعمومه يجوز التفريق بين المرأتين أيضاً، وقال في الدر: أو رجل وامرأتان ولا يفرّق بينهما، لقوله تعالىٰ: (فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ) الآية۔

وفي رد المحتار، حكى أن أم بشر بن شهدت عند الحاكم، فقال الحاكم فرقوا بينهما، فقالت: ليس لك ذلك، قال الله تعالىٰ (أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ) فسكت الحاكم، كذا في الملتقط، ج ۴ ص۵۷۶،

واللہ اعلم

۴ رجب ۱۴۱ھ

شاہدان طلاق اگر مدت طویل گذر جانے کے بعد گواہی دیں تو ان کی شہادت معتبر نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اہل سنت والجماعت مسئلہ مندرجہ ذیل میں کہ زید نے ھندہ کو عرصہ چودہ سال کا ہوا کہ طلاق رجعی دی تھی، اور ہفتہ عشرہ کے اندر رجعت کرلی تھی، بوقت رجعت برادران کو شبہ ہوا کہ شاید طلاق بائن دی ہو تحقیق کی تو طلاق رجعی ہی ثابت ہوئی، چنانچہ ھندہ زید کے پاس نو دس سال رہی، کسی قسم کا جھگڑا نہیں تھا، بعد دس سال کے زید کے ساتھ بکر نے کاروبار دنیوی میں شرکت کرلی۔ بعد چند روز کے ھندہ سے اور بکر سے آشنائی ہوگئی لہٰذا

عہ قلت: هذا محمول عندنا على أدب القاضي، ومما يتبيّن ينبغي له أن لا يفعل ۱۲ منہ۔

ھندہ کو چھپادیا، جب چند برادریوں کو معلوم ہوا، دس پانچ آدمی جمع ہو کر دریافت کرنے لگے، معلوم ہوا کہ ھندہ کہتی ہے کہ ہم کو دس سال ہوا زید نے تین طلاق دے دی تھی۔ چنانچہ گواہ تلاش کیا تو کوئی نہیں ملا، لہٰذا زید سے دریافت کیا، زید نے کہا کہ ہم نے ایک بار طلاق دی تھی، اور ہفتہ عشرہ کے اندر رجعت کرلی تھی، چنانچہ اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ زید سے قسم لی جائے، لہٰذا مولوی شمس الدین صاحب، اور حافظ رحم اللہ شاہ صاحب بلرام پوری کے سامنے زید نے قسم کھا کر حلفیہ بیان کیا کہ ہم نے صرف ایک طلاق دے کر ہفتہ عشرہ کے اندر رجعت کرلی تھی، جناب مولانا موصوف نے کہا کہ ھندہ زید کے لئے جائز ہے سو ھندہ کو زید کی سپرد کرادی، بعد چند روز کے پھر بکر نے ھندہ کو چھپادیا۔ اور ھندہ سے بکر نے مہر کا دعویٰ کرادیا اور دو گواہ کاذب سے عدالت گورنمنٹ میں شہادت دلوادی عدالت نے ھندہ کو ڈگری دے دی بعدہ بکر نے ھندہ کو اپنے یہاں رکھ لیا جب برادران کو معلوم ہوا، بکر کو جماعت سے علیحدہ کردیا، اور برادران پنچ طلاق کا ثبوت ڈھونڈنے لگے، بہت کوشش کے ساتھ تحقیق کی، مگر طلاق کا ثبوت نہیں ملا۔ ۵ مرتبہ پنچایت ہوئے مگر تحقیق نہیں ہوئی، اور اسی درمیان میں مولوی محمد ادریس صاحب دہلوی کے پاس مسئلہ مقدمہ ھذا پیش کیا گیا، مولانا موصوف نے باقاعدہ گواہ طلب کیا، بکر نے چار گواہ پیش کئے مولانا موصوف نے حلفیہ بیان لیا۔ چاروں گواہوں نے قسم کھا کر حلفیہ بیان کیا کہ صاحب ہم لوگ نہیں جانتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ جو بات سچ معلوم ہو بیان کرو، گواہوں نے کہا کہ صاحب! ہم نے اپنے کانوں سے نہیں سنا ہے کہ زید نے ھندہ کو طلاق دی ہے غرض کہ سب گواہوں نے قطعی انکار کیا، بعد چند روز کے بکر نے ایک تاریخ مقرر کرکے جملہ پنچ چودہ کوس کو مدعو کیا، چنانچہ تاریخ مقررہ پر جملہ پنچ جمع ہوئے، گفتگو ہونے لگی، پنچوں نے کہا کہ اس بات کا کوئی گواہ ہے؟ کہ زید نے عرصہ بارہ برس کا ہوا ھندہ کو طلاق دی تھی بکر نے کہا چار گواہ ہیں۔ پنچوں نے کہا کہ گواہوں کو بلاؤ! قسم کھا کر حلفیہ بیان کریں، اور تم ھندہ کو اس وقت علیحدہ کردو، اور اسی وقت چاروں گواہوں کا بیان اور مفصل حال لکھ کر علماء دین کے پاس استفتاء بھیج دیا جائے، جیسا علماء دین فیصلہ کردیں گے مانا جائے گا، اور ھندہ جس کے لئے جائز ہوگی، اس کے سپرد کی جائے گی۔ بکر نے شہادت دلوانے اور ھندہ کو نکالنے سے انکار کیا، اور کہا کہ ہم ھندہ کو نہیں نکال سکتے ہیں، کیونکہ ہم نے

عدالت سے ڈگری پائی ہے، اس پر پنچوں نے بہت کچھ سمجھایا، غرض آٹھ بجے عشاء کے وقت سے لے کر دس بجے دن تک گفتگو ہوئی، مگر بکر راہ راست پر نہیں آیا، پنچوں نے کہا، ہم سب چودہ کوس بائیکاٹ کر دیں گے، اور کہا کہ تمہارے یہاں ہرگز نہ کھائیں گے، اس پر بکر نے پنچوں کو گستاخانہ کلام بھی کہا، آخر مجبور ہو کر پنچوں نے بکر کو جماعت سے علیحدہ کر دیا، اور دو دو وقت بھوکے رہ کر اپنے مکان و موضع کو واپس گئے، چنانچہ بکر عرصہ سے جماعت سے علیحدہ ہے۔ فی الحال زید و بکر نے ایک مولوی صاحب کے پاس یہ شرط لکھی کہ جو آپ از روئے شرع شریف کے فیصلہ کر دیں ہم دونوں کو منظور ہے، چنانچہ مولانا موصوف نے باقاعدہ گواہ طلب کیا، لہٰذا اس وقت گیارہ گواہ نے قسم کھا کر حلفیہ بیان کیا کہ زید نے ھندہ کو طلاق مغلظہ دیدی تھی، مولانا نے کہا کہ کب دی تھی، گواہان مذکورہ نے کہا کہ چودہ سال ہوئے، چنانچہ جملہ پنچ چودہ کوس کو بہت بڑا شبہ گذرتا ہے کہ کیا وجہ ہے جو ابھی تک ہر پنچایت میں کہتے تھے کہ ہم لوگ نہیں جانتے ہیں، اور مولوی محمد ادریس صاحب نے جب باقاعدہ دریافت کیا تھا جب بھی حلفیہ[۱] چار گواہ نے انکار کیا تھا۔ اور آج وہی قدیم چار گواہ جو پہلے انکار کرتے تھے ساتھ جدید مل کر گیارہ گواہ اظہار کرتے ہیں۔ پہلے جب پنچوں نے دریافت کیا تھا، یا جب مولوی شمس الدین صاحب نے زید سے قسم لی تھی، یا جب مولوی محمد ادریس صاحب نے دریافت کیا تھا جب کیوں نہیں اظہار کیا تھا؟ اگر سچے تھے تو پہلے ہی کہہ دیتے تو کیوں اس میں فتنہ پیدا ہوتا؟ اور بکر کو مع ساتھیوں کے کیوں بائیکاٹ کیا جاتا؟ اور ھندہ کیوں زید کے پاس دس برس رہتی، اور مرتکب زنا کی ہوتی؟ چنانچہ جملہ پنچ چودہ کوس بہت کش مکش میں ہیں کہ پہلے کا قول معتبر ہوگا، یا آج کا قول معتبر مانا جائے گا۔ چنانچہ ایسے گواہان مذکورین کا قول و حلف و قسم از روئے شرع شریف کے معتبر ہوگا یا نہیں؟ اور مسماۃ ھندہ کس کے لئے جائز ہوگی۔

المستفتی: افسر القوم میاں رحم اللہ صاحب
ضلع: گونڈہ، ڈاکخانہ: قصبہ بلرام پور
متصل سنی گھاٹ: موضع: بلھا

---

[۱] یہ چار گواہ جس وقت مولوی شمس الدین صاحب نے پہلے قسم زید سے لیا تھا موجود تھے ۱۲۔

الجواب

صورت مسئولہ میں جن چار گواہوں نے پہلے طلاق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی تھی اور اب وہ طلاق مغلظہ کی گواہی دیتے ہیں ان کی گواہی تو یقیناً جھوٹی اور غلط ہے۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیة، وفی جواھر الفتوی من الشھادات، شھد علی وجهٍ فیه خلل، ثم أعاد الشھادة فی غیر ذلك المجلس بدون الخلل، فأن کان یحتاج إلی زیادة فزاد، لایقبل، وإن لم یکن بین الأول والثانی تناقض فانما کان اھمالاً، لأن الظاھر أن لاشھادة عنده إلا علی ماشھد اولاً، وإنما زاد ثانیًا لتلقین انسان تزویرًا واحتیالاً فلا یقبل استدلالاً بماذکره محمدٌ فی الجامع الصغیر، رجلٌ شھد، ولم یبرح عن مکانه، حتی یقول، أوھمتُ بعض شھادتی، ان کان عدلاً تقبل شھادته وقوله لم یبرح دلیل علی أنه إذا برح ثم عاد لاتقبل أھ (ج ۱ ص ۳۱۷)

اور جو باقی سات گواہ ہیں ان کی شہادت بھی باطل اور جھوٹی ہے، کیونکہ جب چودہ سال کے بعد وہ طلاق مغلظہ کی گواہی دے رہے ہیں تو اتنے عرصہ تک گواہی کو مؤخر کرنے کی وجہ سے وہ فاسق ہوگئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ طلاق مغلظہ کی گواہی کو پانچ دن تک مؤخر کرنے سے بھی گواہ فاسق ہوجاتے ہیں۔ چودہ برس تک مؤخر کرنے سے تو کیوں نہ فاسق ہوں گے، لہٰذا یہ شہادت بالکل باطل ہے۔ اور ھندہ زید کی بیوی ہے، بکر کو اس سے ہرگز ہرگز نکاح جائز نہیں۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیة (سئل) عن شھودٍ شھدوا بإقرار الرجل بالطلقات الثلث بعد شھر، (الجواب) لاتقبل شھادتھم بعد أن أخروا خمسة أیام من غیر عذر، إن عالمین بانھا یعیشان عیش الازدواج، والشھادة بدون الدعوی (من المرأة) یجوز فی ھٰذه المسئلة أھ (ج ۱ ص ۳۲۸)

۲۳/ رمضان۔

حکم کے فیصلہ کردینے کے بعد کسی ایک فریق کو رجوع کرنا جائز نہیں

سوال:۔ اگر دو چار آدمی باہم کسی قسم پر تصفیہ کردیں، اور دونوں فریق منظور کرلیں، اور

بعد گزرنے ایک شب کے اگلے روز کوئی ایک فریق اس تصفیہ منظور شدہ سے انکار کردے تو وہ گنہگار اور وعدہ خلاف ہے یا نہیں؟ اور قرآن پاک اور شریعت کا اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب

جبکہ فریقین رضامندی کے ساتھ کسی کو حکم تجویز کرلیں، اور وہ حکم اپنا فیصلہ سنادے تو پھر کسی فریق کو رجوع کرنا تحکیم سے درست نہیں ہے، اور اس فیصلہ سے رجوع کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ قاضی کے فیصلے سے، اور وہ یقیناً گنہگار رہے۔

فان حکم لزمھما، ولا یبطل حکمه بعزلھما، لصدوره عن ولایة شرعیة۔ درمختار علی الشامی باب التحکیم (ج ۴ ص ۳۴۹)

والله اعلم بالصواب
احقر عبداللطیف عفا الله عنه
مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

الجواب صحیح حق
عنایت الٰہی عفی عنه
مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

الأجوبة کلھا صحیحة
احقر ظفر احمد عفا الله عنه
از تھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ
۸ رشوال ۱۳۴۱ھ

مشرک عورت ایک مرد مسلمان کے پاس رہی دونوں سے بچے بھی پیدا ہوئے، اور عورت نے اسلام بھی بظاہر قبول نہ کیا اب عورت اپنے مسلمان ہونے اور مسلمان کی بیوی ہونے کا دعوی کرتی ہے۔

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس میں کہ:۔

۱ زید ایک مسلمان مرد نے ایک ھندو عورت کو اپنے گھر میں رکھا جس سے اولاد ہوئی، اور اس کا نام وہی ھندوانی رہا، جو مسلمان مرد کے گھر میں آنے کے وقت تھا، اور بعد موت بھی اسی نام سے یاد کی جاتی ہے، اس صورت میں عورت مذکورہ کس مذھب کی سمجھی جائے گی، اور اولاد مذکور مرد مسلمان کی جائز اولاد مانی جائے گی یا نہیں؟

۲ زید ایک مشہور شخص تھا، باوجودیکہ اس تعلق کے ناجائز ہونے کی نسبت عام شہرت ہوچکی

تھی، لیکن زید نے اپنی حیات میں کوئی تردید اس مشہور واقعہ ناجائز کی نہیں کی پس اگر اس کی اولاد مسلمان اور منکوحہ ہونے کے ثبوت کے لئے ایک نکاح نامہ پیش کرے، تو کیا یہ نکاح نامہ اس کے اسلام اور نکاح کے ثبوت کے لئے کافی ہے یا نہیں ؟

۳ بر تقدیر ثبوت اسلام کے کیا یہ عورت مذکورہ اور زید کو اس کے بطن سے اولاد ان لوگوں کی (جن کو ماں باپ دونوں کی طرف سے قدامت اسلام کا شرف حاصل ہے) ہم کفو ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ اور نجیب الطرفین اس کی اولاد کو کہا جائے گا یا نہیں ؟ بینوا توجروا

محمد عنایت اللہ عفا اللہ عنہ

افسر مدرس مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ

الجواب وھو المصوب

۱ ہندو عورت کا کسی مسلمان کے گھر میں رہنا، اور اس سے اولاد ہونا، عورت کے مسلمان قرار دیئے جانے کے لئے کافی نہیں، جبتک وہ بیّنۂ عادلہ سے اس کا ثبوت نہ دیں کہ وہ حیات زید میں اسلام لا چکی تھی، اور اسلام کے بعد باقاعدہ نکاح ہوا تھا، یا ورثائ بدون بیّنہ ہی کے اس کے اسلام و نکاح کی تصدیق کر دیں اگر بیّنہ یا تصدیق ورثائ سے اس کا ثبوت ہو گیا تب تو اس عورت کو وقت نکاح زید ہی سے مسلمان سمجھا جائے گا۔ اور اولاد بھی جائز اولاد مانی جائے گی، اور وہ اس کی وارث بھی ہوگی،

اور اگر بیّنہ سے یا تصدیق ورثائ سے اس کا ثبوت نہ ہو سکا تو اس عورت کے اور اس کی اولاد کے اقرار کو صرف ان کی ذات کے حق میں قبول کیا جائے گا، لیکن اس اقرار کو ورثائ پر حجت نہ قرار دیا جائے گا، یعنی جب وہ عورت اپنے اسلام و نکاح کا دعوی کرتی ہے اور اس کی اولاد بھی، تو عورت کو ابتداء سے مسلمان مانا جائے گا۔ اور اس کا ہندوانی نام بدل دیا جائے گا۔ اور اس کی اولاد بھی مسلمان سمجھی جائے گی۔ لیکن ان کو زید کی اولاد، اور اس کا وارث اور اس کے خاندان کا کفو نہ مانا جائے گا۔ لما فیه من تحمیل النسب علی الغیر بلا حجة،

۲ نکاح نامہ جو پیش کیا جاتا ہے اگر ورثائ زید اس کی تصدیق کرے، یا اس پر کم از کم دو مسلمان گواہوں کی شہادت موجود ہو، اور وہ دونوں مسلمان اس وقت زندہ ہوں اور اس وقت بھی گواہی دیں کہ یہ نکاح بحالت حیات زید ہمارے سامنے ہوا تھا، اور اس وقت یہ ہندو عورت مسلمان ہو گئی تھی تب تو یہ نکاح نامہ اس عورت کے اسلام ماضی و

نکاح کے ثابت ہونے کے لئے حجت ہے، ورنہ نہیں۔ اور دونوں صورتوں کا حکم اوپر گذر چکا۔

۳: اس کا جواب دوسرے سوالات متعلق کفائت کے ضمن میں آجائے گا۔

الدليل على الجوابين الاولين

قال في الهداية: ولومات المسلم، وله امرأة نصرانية فجاءت مسلمة بعد موته، وقالت اسلمت قبل موته، وقالت الورثة: أسلمتِ بعد موته، فالقول قولهم ايضاً۔ (أي وعلى المرأة البينة ١٢) ولايحكمه الحال، لأن الظاهر لا يصلح حجة للاستحقاق، وهي محتاجة إليه (قلت فيه دلالة على قبول اسلامها في الماضي في حق نفسها من غير استحقاق ١٢)۔ أما الورثة فهم الدافعون، ويشهد لهم ظاهر الحدوث أيضاً۔ (فيه أنه لوصدقها الورثة، اوأقامت بينةً، يقبل قولها) اھ ج ۳ ص ۱۳۳۔ وفيها ايضاً، ويقبل إقرار المرأة بالوالدين والزوج والمولى لما بيّنا، ولا يقبل بالولد، لأن فيه تحميل النسب على الغير وهوالزوج إلا أن يصدقها الزوج (أو ورثته، لأن الحق له، أوتشهد بولادته قابلة، لأن قول القابلة في هذا مقبول قال في الحاشية إذا الفرض أن الفراش قائم، فيحتاج إلى تعيين الولد، وشهادتها في ذلك مقبولة

وقد مر في الطلاق، وقد ذكرنا في إقرار المرأة تفصيلاً في كتاب الدعوى، (قال المحشي: وهوأنها إذا كانت ذات زوج (معروف بنكاح معروف ١٢) لم يجز دعوها حتى تشهد امرأة على الولادة، ولوكانت معتدة، فلا بد من حجة تامة عند أبي حنيفة رحمه الله، وإن لم تكن منكوحة ولامعتدة، قالوايثبت النسب منها بقولها ١٢) ولا بد من تصديق هؤلاء، (ج ۳ ص ۲۲۸)

زوجہ کی وفات کے بعد اس کے ورثاء اور زوج میں ایک قطعہ زمین پر اختلاف ہونے کا حکم، جبکہ وہ قطعہ زوجہ کے نام پر ہو

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس بارے میں کہ۔ زید نے ایک زمین خرید کی، اور اس کی قیمت ڈھائی ہزار روپیہ بھی بائع کو دیدی، اور بائع نے اس زمین پر مشتری زمین زید کو قبضہ بھی کرادیا، ایک سال تک دستاویز نہیں لکھا گیا تھا، کیونکہ حساب کے دفتر میں یہ بیع تاریخ بیع میں درج کردی گئی تھی۔ زید کی بیوی جو ان دنوں موجود تھی، لاولد ہونے کی وجہ سے زید نے دوسرا نکاح کرنا چاہا، تب بائع اور اس کے چند رفقاء جو زید کی بیوی کے رشتہ دار واقارب تھے انہوں نے زید سے کہا کہ آپ دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہیں تو اپنی موجودہ بیوی کے نام مذکورہ زمین کی دستاویز بائع سے لکھوادیں۔ کچھ زمین مہر کے لئے، اور کچھ زمین ھبہ کے طور پر، اور یہ نہیں معین کیا کہ کتنی زمین مہر کے لئے اور کتنی ھبہ میں؟ اور کس جانب کی مہر کے لئے، اور کس جانب کی ھبہ میں؟ اس موجودہ بیوی کے خاندان میں سے سب سے بڑے رکن نے کہا کہ صرف دستاویز موجودہ بیوی کے نام کردو، ہم نے اس بیوی کے بعد اس زمین سے حصہ لینا نہیں ہے (انہوں نے صرف تسلی کے لئے زمین اس بیوی کے نام دستاویز لکھوادیا، تاکہ دوسری بیوی کی طرف رجحان زید کا زیادہ ہونے کی وجہ سے زوجہ اولیٰ غمگین نہ ہوجائے) زمین کی دستاویز لکھانے کے بعد ھبہ کی شروط کے مطابق زید نے موہوبہ قطعہ کو معین بھی نہیں کیا، اور موہوبہ قطعہ پر زوجہ اولیٰ کا قبضہ بھی نہیں کرایا، اور بالمشافہہ یا بالواسطہ واھب و موہوب لہا کا ایجاب وقبول بھی نہیں ثابت، اور قریبی کوئی زمین وقت اشتراء سے زوجہ اولیٰ کی حیات تک، اور بعد وفات زوجہ اولیٰ زید ہی کے قبضہ میں ہے۔ اور اس کا آمد وخرچ اب تک زید اپنے ہی اختیار واقتدار سے کرتا چلا آرہا ہے، زید نے بائع سے دستاویز لکھواتے وقت بائع سے ہی دستاویز میں ھبہ لکھوادیا کہ کچھ مہر کے لئے اور کچھ حصہ ھبہ میں خاوند سے فلاں تاریخ سے بیع کی ہوئی زمین کو میں نے آج دستاویز لکھی ہے، اس لکھنے کے بعد دوسرا نکاح زید نے کرلیا ہے سال دو سال کے بعد زوجہ اولیٰ بلا قبض وتصرف واختیار انتقال کرگئیں، زوجہ اولیٰ انتقال اور بیع کے وقت تخمیناً چالیس سال کی عمر کی تھی بالغہ راشدہ تھی پس وہ خرید کردہ زمین زوجہ اولیٰ کے ترکہ میں شمار کی جائے گی یا خاوند کی ہی رہے گی؟ (مذکور اظہار کو جانبین مانتے ہیں) ؟ بینوا توجروا

الجواب

صورت مسئولہ میں وہ خرید کردہ زمین خاوند ہی کی ملک ہے، زوجۂ اولیٰ کے ترکہ میں شمار نہ ہوگی، کیونکہ جب نہ بیع کی تعیین ہے، نہ موہوب کی، تو بیع اور ھبہ دونوں فاسد ہیں نیز جب زوجۂ اولیٰ سے ایجاب وقبول کچھ نہیں ہوا، نہ بیع کا نہ ھبہ کا، تو یہ معاملہ محض لغو ہوا نیز ھبہ کے لئے بعد صحت کے قبضہ بھی شرط ہے، وہ بھی مفقود ہے لہٰذا زمین مذکور میں ورثہ زوجہ کا کوئی حق نہیں۔ البتہ شوہر سے مہر وصول کرنے کا ان کو حق حاصل ہے۔ جس میں بصورت زوجہ کے لاولد ہونے کے شرعاً نصف مہر تو خاوند کا ہی حق ہے، اور نصف باقی زوجہ کے ورثاء کا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲/ رجب ۱۳۴۲ھ

زوجہ کی وفات کے بعد اس کے ورثا اور زوج میں ان زیورات پر اختلاف کا حکم جو شوہر نے نکاح کے وقت بیوی کو دیئے تھے۔

سوال :- زید کی جانب سے نکاح کے وقت زوجۂ اولیٰ کو پچاس روپے کے قریب گلے میں ایک سونے کا منکا (بمنولی کا منکا جس کو کہتے ہیں) اتنا ہی ڈالے، اور زوجۂ مذکورہ کی ماں کے گھر کی جانب سے تقریباً چار سو کا زیور ڈالے تھے، نکاح کے بعد زینت دیکھنے کی خاطر زید امانۃً ڈیڑھ ہزار کے قریب زیور بنا بنا کر ڈالے تھے، خاوند زید کہتا ہے کہ نکاح کے بعد کا بنایا ہوا زیور سب امانت ہے اور وہ میرا ہے زوجہ اولیٰ کا ہرگز نہیں، مگر زوجہ اولیٰ کا وارث بھائی کہتے ہیں کہ وہ زیور زوجۂ اولیٰ کو پہنچنا چاہیئے، اور زوجۂ اولیٰ نے وہ سارا زیور بھائی کی اولاد کے لئے وصیت کردی ہے، پس آیا یہ زیور امانت میں شمار ہوگا خاوند کا ہوگا یا عورت کے ترکہ میں جائے گا، یا کل زیور کے حق میں وصیت قبول کی جائے گی، اور خصوصاً خاوند جبکہ وصیت سے انکاری ہے۔ بینوا توجروا

الجواب

قال فی الدر: ولو ادعت انہ ای المبعوث من المھر، وقال ھو ودیعۃ، فان کان من جنس المھر، فالقول لھا، وإن کان من خلافہ فالقول لہ بشھادۃ الظاھر اھ وفیہ ایضاً جھز ابنتہ، ثم ادعی أن ما دفعہ لھا عاریۃ وقالت

هو تمليك، او قال: الزوج ذالك بعد موتها ليرث منه، قال الأب لورثته بعد موته عارية، والمعتمد ان القول للزوج، ولها ان كان العرف مستمراً أن الأب يدفع مثله جهازاً لا عارية، اما ان مشتركاً كمصر والشام فالقول للأب أى مع اليمين، اھ مع الشامی (ج ا ص ۶۰۱)

صورت مسئولہ میں عرف کو دیکھا جائے، کہ زید کے خاندان میں نکاح کے بعد جو زیور عورت کو بنا کر دیتے ہیں، وہ اس کی ملک کر دیتے ہیں یا بطور امانت کے دیتے ہیں، اگر عرف یہ ہے، کہ ملک کر دیتے ہیں، تو اس صورت میں اقارب زوجہ کا قول معتبر ہوگا مع قسم کے، اور شوہر کو شہادت سے ثبوت دینا ہوگا، کہ میں نے بطور امانت یہ زیور دیا تھا۔

اور اگر عرف امانۃً دینے کا ہے، تو زید کا قول معتبر ہے مع قسم کے، اور ورثۂ زوجہ کے ذمہ ثبوت دینا ہوگا شہادت سے، کہ یہ تملیکاً دیا گیا تھا،

اور اگر اس کے خاندان میں دونوں طرح دستور ہے (جیسا کہ ہندوستان میں عموماً ایسا ہی ہے) کہ بعضے مالک کر دیتے ہیں اور بعضے مالک نہیں کرتے، بلکہ امانۃً دیتے ہیں، تو اس صورت میں بھی معتبر قول زید کا ہے مع قسم کے اور ورثۂ زوجہ پر بار ثبوت ہے، واللہ اعلم (اور یہ قسم یا ثبوت کسی ثالث کے جو برضائے فریقین تجویز ہوا ہو یا حاکم کے سامنے ہونا چاہئے) اور ترتیب یہ ہوگی، اول اس شخص سے جس پر بار ثبوت ہے شہادت طلب کی جائے گی، اگر وہ شہادت پیش نہ کر سکے تو دوسرے سے جس پر قسم ہے قسم لی جائے گی، اور قسم کے بعد اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲/ رجب ۱۳۴۲ھ

زوجین کے منکر طلاق ہونے کی صورت شہادت طلاق معتبر ہے یا نہیں؟ اور شہادت میں گواہوں کی تاخیر کرنے کا حکم

سوال اول:- اقطر الدین نے اپنی زوجہ مسماۃ چندر بانو کو باہم تنازع کر کے غصے میں آکر کہا کہ تیرے ہاتھ کا طعام ہمارے لئے کھانا حرام ہے، اور طلاق دینے سے منکر ہوا پھر اس کی زوجہ بھی بولی کہ میرے زوج نے مجھ کو طلاق نہیں دیا، تو اس بارے میں تین شاہد مل

گئے، اول باپ، دوسرے ماں، تیسرے بھائی، سو تینوں نے گواہی دی۔

تنقیح ۱

کیا ان تینوں نے عورت کے سامنے یہ طلاق دینا بیان کیا؟

جواب تنقیح ۱

طلاق کے پہلے مسئلہ میں تینوں گواہوں نے عورت کے سامنے طلاق دینا بیان کیا ہے
سوال بالا۔ کہ ہم سب نے سنا ہے کہ اقطر الدین نے اپنی بیوی مذکورہ کو کوئی کلام
سوء پر متازعہ کر کے غضبناک ہو کر کہا کہ میں تجھ کو ایک طلاق دو طلاق تین طلاق دیتا ہوں،
اور تیرے ہاتھ کی بھات ہمارے لئے حرام ہے الغرض یہ ہے کہ اس صورت مرقومہ سے
طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟ اور شہادت والدین مقبول ہے یا نہیں؟

تنقیح ۲

یہ گواہی دینے والے دین دار ہیں یا نہیں؟

جواب تنقیح ۲

یہ گواہی دینے والے پورے دیندار نہیں، اس لئے کہ صلوٰۃ وصوم تو کچھ تو ادا کرتے ہیں
لیکن پردہ وستر عورت وغیرہ کی پابندی نہیں کرتے۔

سوال ثانی۔

اور دوسرے ایک طلاق کے واقعہ میں چار گواہ پائے گئے، ایک مرد تین عورتیں، تو
چاروں نے اس طور پر شہادت دی۔

تنقیح ۱

کس کے سامنے شہادت دی، اور عورت نے بھی سنا یا نہیں۔

جواب تنقیح

طلاق کے دوسرے مسئلہ میں، شاہدوں نے دو مولوی صاحب اور دو منشی صاحب
اور بہت عام لوگوں کے سامنے شہادت دی۔ اور عورت نے بھی سنا۔
سوال بالا ۱۔ کہ شوہر نے اپنی زوجہ کو صریح تین طلاق دی لیکن مرد امّی ہے۔

تنقیح ۲

اس سے پوچھو کہ تو جب دیکھتا نہیں، تو کیسے گواہی دیتا ہے۔

جواب تنقیح

اعمیٰ نے کہا کہ میں اپنے گھر کے سامنے بیٹھا تھا، تو سنتا ہوں کہ میرا چچازاد بھائی میرے ہی مکان میں اپنی باورچی خانہ میں زوجہ پر غصہ ہوکر، اور ان کو مار کر دوسرے گھر کی طرف ہنکایا، اور کہا کہ میں نے تجھ کو طلاق دی ہے، طلاق دی ہے، طلاق دی ہے، تین بار سے بھی زیادہ کہا، اس میں کوئی شک نہیں۔

سوال بالا :۔

اور یوم طلاق سے ایک سال سات ماہ کے بعد شواہد کی شہادت لی گئی۔

تنقیح ۳

شاہد اس تاخیر کا کیا عذر بیان کرتے ہیں؟

جواب تنقیح

شاہد کوئی عذر بیان نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے بالیقین شہادت دی، یہ فقط علماء کا ظن ہے۔ آیا کہ اتنی مدت کے بعد شہادت قبول ہوتی ہے یا نہیں؟ کتابیں زیادہ نہیں جو دیکھ سکنے استخراج کریں، اس لئے جناب کی خدمت میں سپرد کی، مہربانی فرماکر جواب عطا فرمائیں۔

سوال بالا ــــ تو بارگاہ میں مرجو ہے کہ آیا اندھے کی شہادت معتبر ہوگی یا نہیں؟ اور اتنی مدت طویلہ کے بعد طلاق کی گواہی مقبول ہے یا نہیں؟

ازروئے شفقت و مرحمت دونوں مسئلوں کے جواب شافی دے کر خوش و مسرور کریں۔

عبدالحمید عفی عنہ

الجواب

(۱) صورت اولیٰ میں جب زوج و زوجہ دونوں طلاق سے منکر ہیں، اور قاضی شرعی کا وجود ھندوستان و بنگال میں نہیں ہے جس کے سامنے شہادت کا گذرنا شرعاً معتبر ہو، اس لئے وقوع طلاق کا حکم نہیں کیا جا سکتا، البتہ چونکہ قاعدہ فقہیہ ہے "المرأۃ کالقاضی" اس لئے اگر زوجہ کو ان گواہوں کے سچا ہونے کا ظن غالب ہو تو اس پر ان گواہوں کی گواہی

سننے کے بعد یہی واجب ہے کہ وہ اپنے کو مطلقۃ الثلث سمجھ کر زوج سے علیحدگی اختیار کرے، اور اپنی نفس پر اس کو قبضہ نہ دے، اور اگر عورت کو ان گواہوں کے قول کا اعتبار نہ ہو (بوجہ ان کے عادل نہ ہونے، یا باہم دشمن و مخالف ہونے کے) تو پھر یہ گواہی کالعدم ہے، اور نکاح ظاہراً باقی ہے، وعلم الباطن موکول إلی مَن یعلم السرائر۔

(۲) صورت ثانیہ میں بھی اس گواہی سے وقوع طلاق کا حکم نہیں ہوسکتا اور نہ المرأۃ کالقاضی بربنا کرکے عورت پر علیحدگی کو واجب کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ گواہ اس تاخیر شدید کی وجہ سے فاسق ہیں جن کی شہادت شرعاً معتبر نہیں۔

قال فی الدر: ومتی أخر شاهد الحسبة شهادته بلا عذر فسق، فترد کطلاق امرأة أی بائنا وعتق أمة وتدبيرها وکذا عتق عبد وتدبيره اهـ وفی رد المحتار عن الظهيرية إذا شهد اثنان علی إمرأة أن زوجها طلقها ثلثا، او علی عتق أمه، وقالا: کان ذلك فی العام الماضی جازت شهادتهما وتاخيرهما لا یوهن شهادتهما، قيل وينبغی أن يكون ذلك وهنًا فی شهادتهما إذا علما أنه يمسكها امساك الزوجات والإماء فاذا أخروها صاروا فسقة اهـ ج ۳ ص ۵۷۴۔

قلت: وبالنظر إلی العلة ينبغی أن لا تقبل شهادتهما بالتأخير فی زماننا بحال، فإن الزمان زمان الفساد، وربما يطلق الزوج امرأته ويمسكها امساك الزوجات، فعلی الشهود التعجيل فی مثل هذه الشهادات، فاذا أخروا فسقوا، والله اعلم

حرره الاحقر ظفر احمد عفا الله عنه
۵/ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ

باوجود بینہ کے مدعی علیہ کا قسم کھانا

سوال: ہندہ مدخولہ نے دعوی کیا کہ میرے زوج نے مجھ کو تین طلاق دی ہے بلفظ صریح، ہندہ کے گواہوں نے دو طلاق کی شہادت دی ہے، عورت مدعیہ نے ایک گواہ سے کہا کہ تو قسم کرتا ہے؟ کہ مجھ کو اس نے دو طلاق دی ہے تین نہیں) اس نے کہا کہ ہاں کرتا ہوں، پس حلف کرکے دو طلاق کی شہادت دے گیا، اور دوسرے کو مدعیہ نے حلف نہ دی، بعدہ

قاضی نے زوج کو قسم بھی نہ دی، خالد کہتا ہے کہ زوجہ نے جبکہ گواہ کو قسم دی تو گویا اس نے مدعی علیہ کو قسم سے بری کر دیا، اور اپنے حق تحلیف کو ساقط کر دیا، لہٰذا اب زوج پر حلف نہ آئے گی، بکر کہتا ہے کہ جبکہ گواہ مطابق دعوی نہ گزرے کہ دعوی میں تین طلاق کا ذکر ہے، اور وہ دو بیان کرتے ہیں تو وہ گواہ کالعدم ہوئے، اور گواہ پر اس مقام میں قسم بے قاعدہ ہے، بلکہ زوج پر قسم عائد ہوتی ہے، جب تک کہ زوج قسم نہ کرے تب تک عورت کے بقاء نکاح کا حکم دینا غلط ہے، اور بعد قسم کے بھی، اگر عورت جانتی ہے کہ مطلقہ ثلثہ ہوں، مگر اثبات سے عاجز ہوں، تو اس کو عند الدیانۃ خاوند کے پاس رکھنا حرام ہے، کیونکہ مرد نے دروغ قسم کی ہے۔

قال الشامی فی کتاب القضاء فی باب الحبس وکما لو علم القاضی بکذب الشهود حیث لاینفذ أصلاً کالقضاء بالیمین الکاذبة، لوادعت أن زوجها أبانها بثلث، وأنکر الزوج فحلّفه القاضی، فحلف والمرأة تعلم أن الامر کما قالت، لایسعها المقام معه، ولا أن تأخذ شیئاً حتی میراثه وفی الخلاصة لایحل وطئها اجماعاً اه

حضور کتاب کی عبارت سے سنداً تحریر فرماویں کہ کس کا قول درست ہے، اسی کی پشت پر جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

قاعدہ یہ ہے کہ اول مدعی پر بیّنہ قائم کرنا ضروری ہے، اگر وہ بیّنہ قائم نہ کر سکے، تب مدعی علیہ سے قسم لی جاتی ہے، اور اگر مدعی نے بیّنہ قائم کیا، مگر بیّنہ سے اثبات دعوی نہ ہو سکا، یا اس کے خلاف ہوا۔ تو دعوی خارج کر دیا جائے گا، مدعی علیہ سے قسم نہ لی جائے گی، پس صورت مذکورہ میں ھندہ کا دعوی خارج ہے اور زوج پر حلف عائد نہیں۔

قال فی العالمگیریة: فإن صحت الدعوی سئل المدعی علیه عنها، فإن أقر أو أنکر فبرهن المدعی، فقضی علیه وإلا حلف بطلبه، کذا فی کنز الدقائق۔ وفیه ایضاً، ولا یحلف مع وجود البرهان إلا فی مسائل اهـ ج ۵ ص ۱، قلت: وهذه المسئلة لیست منها۔

ہاں صورت مسئولہ میں اگر عورت کو معلوم ہے کہ شوہر نے مجھ کو تین طلاق دی ہیں جیسا کہ اس کے دعوی سے ظاہر ہے تو اس کو شوہر کے پاس رہنا، اور اس کو اپنے اوپر قابو دینا جائز نہیں بلکہ علیحدگی واجب ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۴ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

دعوی کے اندر شاہد اور مدعی میں تاریخ کے اندر اختلاف یا تردد ہو جانے کا حکم

سوال :- زید نے ھندہ پر دعوئ نکاح میں کہا کہ تقریباً دس برس سے ھندہ کے ساتھ میرا نکاح ہوا ہے گواہوں نے بھی لفظ تقریباً یا تخمیناً دس برس کا بیان کیا، قاضی نے جواب دیا کہ دعوی بھی غلط، اور شہادت بھی مردود ہے، کیونکہ نکاح میں تعین وقت ضروری ہے۔

لما فی العمادیۃ من الکافی، إذا اختلف الشاهدان فی الزمان و المکان فی الخیانۃ والغصب والقتل والنکاح لا تقبل الخ

اور لفظ حسبان و تقریباً سے جزم نہیں پیدا ہوتا، ہوسکتا ہے کہ دعوی میں دس روز کم دس برس ہوں، اور شہادت میں پانچ روز یا زیادہ ہوں۔ ان سب صورتوں پر تقریباً دس برس کا اطلاق کئے جاتے ہیں (یہ دعویٰ رجلین علی امرأۃٍ واحدۃٍ نہیں، جو کہ تعین وسبقت وقت ضروری ہو)

کنز الدقائق کی کتاب الشہادات میں ہے :- ھی اخبار عن مشاھدۃ وعیان لا عن تخمین وحسبان۔ اھ

طحطاوی علی الدر میں ہے :-

وبقی من الشروط اشتراط لفظ دلیل علی الجزم اھ

اس قسم کے الفاظ صدہا دعاوی فیصلہ شدہ سابق قضاۃ میں موجود ہیں، کسی اہل علم نے کہا ہے کہ اگر لفظ حسبان و تقریباً صلب دعوی و شہادت میں نہ ہوں بلکہ زوائد اور تفصیل بیان میں ہو تو مضر نہیں، مثلاً دعوی کیا کہ ھندہ میرے منکوحہ ہے مدعی سے سوال ہوا کہ کتنا زمانہ ہوا، جواب دیا کہ تخمیناً دس برس ہوتے گواہوں نے بھی کہا کہ بے شک ھندہ اس کی منکوحہ ہے ان سے سوال ہوا کہ کتنا زمانہ ہوا، جواب دیا تقریباً دس برس ہوتے

ہوں گے۔ تو اس صورت میں اصل دعوی و شہادت میں جزم ہے، حسبان نہیں، بلکہ حسبان جواب سوال میں آیا جو کہ اصل دعوی سے زائد ہے، مگر اس اہل علم نے کتاب نہ بتائی، اب حضور سے سوال ہے کہ اس اہل علم کا قول کہاں لکھا ہے؟ یا کہ مطلقاً دعوی وشہادت ایسا لفظ مفسد دعوی ہے۔ عبارت کتاب سے تشفی فرمائیے۔ زادك الله أجراً وذخراً وعلماً وعملاً۔

الجواب

دعوی اور شہادت دونوں میں تاریخ کا ذکر بلفظ جزم لازم ہے، اگر ذکر کرتے، گو تاریخ کا ذکر فی نفسہ ضروری نہیں پس اگر تاریخ بلفظ محتمل بیان کی گئی، تو دعوی اور شہادت مسموع نہ ہوگا۔

وکذلك إذا ذکر التاریخ فی الدعویٰ علی ھٰذا الوجه، بأن قال: "این عین ملک من ست ازده دوازده سال" فانه لاتسمع دعواه، وکذلك إذا ذکر الشهود التاریخ فی شهادتهم، علی ھٰذا الوجه لاتقبل شهادتهم، کذا فی العالمگیریة ج ۴ ص ۲۴۔

نکاح خواں کی شہادت قبول کرنے میں تفصیل ہے

سوال:۔ نکاح کا وکیل تو جدا ہے، مگر امام مسجد نے ایجاب وقبول کرایا، بعدہٗ شہادت بھی دی، کہ ھندہ منکوحۂ زید ہے، اور میں نے خود نکاح پڑھایا ہے آیا اس عبارت طحطاوی سے "قوله لو بأثبات النکاح أی لاتقبل لأثبات النکاح لانها شهادة علی فعل نفسه، قال الشامی انکر الورثة النکاح فشهد رجل قد تولی العقد، یذکر النکاح ولا یذکر انه تولاه، اھ" ایا نکاح خواں کو متولی عقد نکاح کا کہا جائے گا یا نہ؟ اور اس کی شہادت منظور ہو گی یا کیا؟

الجواب

نکاح خواں متولی عقد نہیں ہے وہ سفیر محض ہے۔ وکیل بالنکاح جس کی شہادت قبول نہیں وہ ہے جو ایجاب وقبول کرتا ہے پس اگر وہ شخص جس نے نکاح خواں کو ایجاب کا وکیل بنایا، اور نکاح پڑھنے کی اجازت دی ہے مجلس عقد میں حاضر ہو، تب تو نکاح خواں کوئی چیز نہیں، محض سفیر ہے۔ اور اگر موکل حاضر عقد نہ ہو تو نکاح خواں بھی وکیل بالنکاح

ہے۔ پس اگر اس صورت میں وہ شاہد نکاح بنایا جائے تو اس کو صرف اتنا کہنا چاہیئے کہ یہ عورت فلاں کی منکوحہ ہے میں اس کی شہادت دیتا ہوں یہ نہ کہے کہ میں نے اس کا نکاح پڑھا تھا، ورنہ اپنے فعل پر شہادت ہوگی جو معتبر نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ متولی عقد ہے اور صورت اولیٰ میں، یعنی جبکہ موکل حاضر عقد ہو معتبر محض ہے متولی عقد نہیں، اس میں اس کی شہادت مطلقا معتبر ہے، گو اپنے نکاح پڑھنے کا ذکر بھی کردے، مگر شرط یہ ہے کہ ذکر نکاح خوانی کے ساتھ موکل کا حاضر مجلس نہ ہونا بھی بیان کردے جبکہ شہادت سے کوئی نفع نکاح خواں کو بھی پہنچتا ہو، اس صورت میں اس کی شہادت مطلقاً معتبر نہ ہوگی، مثلاً مدعی نے دعوی کیا کہ منکوحہ وقت نکاح کے معتدہ یا نابالغہ تھی، اور نکاح خواں اس کے فارغ یا بالغ ہونے کی شہادت دے تو معتبر نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ اپنے فعل کی صحت کو ثابت کر رہا ہے، جس میں یہ متہم ہے۔ ھٰذا ما فہمتہ من القواعد، واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

تاریخ بالا۔

جو احکام تحت القضاء داخل نہیں ان کا حوالہ

سوال: جو احکام تحت القضاء داخل نہیں، آیا وہ حصر کے ساتھ کہیں بیان ہیں یا کہ ان کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ ہے جس سے کل افراد و احکام بالقوۃ معلوم ہو جائیں، جناب حوالہ کتاب و باب تحریر فرماویں تو خوب ہے،

الجواب

عالمگیریہ (ج ۴ صن ۱۹۰ و ۱۹۱ و ۱۹۲) میں باب فیما یجوز فیہ قضاء القاضی وما لا یجوز منعقد کیا ہے، قابل ملاحظہ ہے۔

فقط حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

تاریخ بالا۔

زوجۂ ثانیہ کا اس رقم کا دعوی کرنا جو زوجۂ اول کے گھر کے دور ہونے کی وجہ سے کرایہ میں صرف ہوتی ہے

سوال: ایک شخص کی دو بیوی ہیں، ایک کے مکان دور ہونے کی وجہ سے للعہ یا صہ روپیہ راہ خرچ ہوتا ہے

دوسرے کے مکان نزدیک ہونے کی وجہ سے خرچ نہیں ہے۔ اب دوسری بیوی کیا للعم
یا ام روپیہ شوہر سے دعوی کر سکتی ہے؟

الجواب

القسم عبارة عن التسوية فی البیتوتة والنفقة والسکنیٰ اھ شامی
(ج ۲ ص ۶۵۶)

اور ظاہر ہے کہ جو روپیہ سفر خرچ میں صرف ہوتا ہے وہ زوجہ کے نفقہ کے زیادہ نہیں ہوا لہٰذا دوسری بیوی کو اس میں برابری کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۵ / ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

شہادت علی الطلاق کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ ایک شخص کی دو عورتیں ہیں دوسری عورت کا باپ کہتا ہے کہ شخص مذکور نے جب میری لڑکی کے ساتھ نکاح کیا تھا تو پہلی عورت کو میرے اور ایک دوسرے شاہد کے روبرو طلاق ثلٰثہ سے چھوڑا تھا۔ مگر شخص مذکور منکر ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی، گواہ اس کا دوسرا خسرا اور ایک مرد ہے، کیا شخص مذکور کا خسر ثانی شرعاً شاہد ہو سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ عرفاً وہ متہم ہے کہ اپنی دختر کی خاطر شہادت دے رہا ہے کہ اس پر سوکن نہ ہو۔ در مختار میں "ولا تقبل شهادة عدو بسبب الدنیا" رد المحتار إذا یجلب بها منفعة، أو یدفع بها عن نفسه مضرة لا تقبل اھ بتغیر (ج ۴ ص ۳۸۱)

نام بردہ کے خسر کی لڑکی اپنے باپ کے گھر میں ہے اور پہلی عورت جس کی نسبت طلاق کا الزام ہے، شخص مذکور کے پاس ہے، کیا عبارت بالا کی وجہ سے اس کی خسر کی عداوت بھی دنیوی قرار دے کر اس کے گواہ مردود ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا

بندہ منظور حق۔ از نوشہرہ
ضلع شاہ پور، تحصیل ...
۱۷ / محرم الحرام ۱۳۴۳ھ

الجواب

شہادت علی الطلاق وہ معتبر ہے جو کسی قاضیٔ مسلم کے اجلاس میں ہو، بدون اس کے شہادت کا اعتبار نہیں، لہٰذا یہ شہادت اگر خسر کی یہ شہادت بھی نہ ہوتی جب بھی اس سے ثبوت طلاق نہیں ہو سکتا تھا، لیکن آیا یہ شہادت اگر عورت کے سامنے شاہدین نے دی ہو، تو اس پر عمل کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اس کے لئے یہ حکم ہے کہ خسر کی شہادت تو بہر حال رد ہے۔ لیکن یہ تبلایا جائے کہ دوسرا شاہد نیک آدمی ہے یا فاسق ہے، اور اس نے شہادت بعد نکاح ثانی کے معاً دی، یا دیر میں؟ اور کتنی دیر میں؟۔

قال فی الدر: وجاز علی أصله، إلا اذا شهد علی أبيه لأمه، ولو بطلاق ضرتها، والأم فی نكاحه اھ (ج ۴ ص ۵۸۸)

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون
۲۸ / محرم ۱۳۴۳ھ

مقدمہ میں ایک مرد دو عورتیں گواہ ہوں تو قاضی عورتوں میں تفریق کر سکتا ہے یا نہیں؟

سوال:۔ اگر ایک مقدمہ میں دو عورتیں اور ایک مرد گواہ ہوں، اور قاضی عورتوں میں تفریق کر کے ان کے بیانات سنے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

بہتر تو یہ ہے کہ قاضی عورتوں میں تفریق نہ کرے، کیونکہ دو عورتیں مل کر بمنزلہ ایک گواہ کے ہیں۔ لیکن اگر کسی ضرورت سے تفریق کر دے تو جائز ہے۔ بیّنہ کی حجیت میں اس سے کچھ نقصان نہ لازم آئے گا۔

قال فی البدائع (ج ۷ ص ۱۰) ولو إذا اتهم الشهود فلا بأس بأن يفرقهم عند أداء الشهادة، فيسئلهم أين كان، ومتى كان؟ فان اختلفوا اختلافاً يوجب رد الشهادة ردها، وإلا فلا، اھ

قلت: وهذا لعمومه يجوز التفريق بين المراتين أيضاً،

وقال فی الدر: أو رجل وامرأتان ولا يفرق بينهما، لقوله تعالى (فَتُذَكِّرَ

إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰی) اھ

وفی رد المحتار، حکی أن أمر بشر بن شهدت عند الحاکم فقال الحاکم: فرقوا بینهما، فقالت: لیس لك ذلك، قال تعالیٰ، أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰی) فسکت الحاکم، کذا فی الملتقط، بحر (ج ۴ ص ۵۷۶)

واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنه

۴ رجب سنہ ۱۳۴۱ھ

عدد طلاق میں گواہوں کے اختلاف کی ایک صورت

سوال: ماقولہم رحمہم اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں علیم الدین فقیر کی بیوی نے بیان کیا کہ جس وقت میرا شوہر مجھ پر غصہ ہو کر مجھ کو مارنے آیا تو اس وقت میں گھر میں نہ تھی، بعد اس کے میں گھر میں آکر مادر شوہا کو سنا کہ وہ میرے شوہر کو کہہ رہی ہے کہ تو نے کیا کہا؟ پھر اس عورت نے مجھ کو کہا کہ تو گھر میں نہیں آسکے گی، تجھ کو چھوڑ دیا ہے علیم الدین فقیر کہتا ہے کہ میں نے اپنی عورت کو غصہ میں جو کچھ کہا وہ مجھ کو یاد نہیں، اس وقت میری قوت خیالی نہ تھی، بعد اس کے لوگوں نے سنا کہ میں نے طلاق طلاق کر کے کہا ہے، اس پر تین شخص جو وہاں موجود تھے گواہی دیتے ہیں، ان میں سے دو مرد مسمیان امجد علی وصفدر علی اور ایک عورت مسماۃ مادر شوہا مذکورہ، چنانچہ امجد علی نے بلفظ "اشہد"، بیان کیا کہ علیم الدین فقیر نے طلاق طلاق کر کے کہا، مگر کسی کا نام نہیں لیا، اور صفدر علی نے بلفظ "اشہد" بیان کیا کہ علیم الدین فقیر کو سنا کہ اس نے کہا ایک طلاق، دو طلاق، بائن طلاق میں نے دی ہے مگر کسی کا نام نہیں لیا، مادر شوہا نے بلفظ "اشہد" بیان کیا کہ علیم الدین کو میں نے سنا کہ اس نے کہا کہ ایک طلاق، دو طلاق، میں نے دیا بائن طلاق، مگر کسی کا نام نہیں لیا۔

اب اس صورت میں اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ اور بر تقدیر وقوع

ع قلت: هذا محمول عندنا علی أدب القاضی، ومما ینبغی له، أن لا یفعل ۱۲ منه

طلاق کے کتنے طلاق واقع ہوئیں؟ اور کیا حکم ہے کہ پھر اس عورت کو بلا تحلیل رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب

صورت مسئولہ میں جب علیم الدین مذکور اپنی بیوی پر غصہ ہوا اور اس کو مارنے چلا اور اس کے بعد طلاق طلاق کہا، تو اس میں اضافت معنویہ ہے۔ گو نام نہ لیا ہو، پس مراد اپنی ہی بیوی کو طلاق دینا ہے۔

صرح بمثل ذلك في رد المحتار (ج ۲ ص ۷۰۵) حيث قال: لأن العادة أن من له امرأة، إنما يحلف بطلاقها لا بطلاق غيرها، فقوله، إني حلفت بالطلاق، ينصرف إليها ما لم يرد غيرها، لأنه يحتمله كلامه اھ۔

پس صورت مسئولہ میں زوجۂ علیم الدین پر طلاق واقع ہوگئی، لیکن چونکہ ایک گواہ امجد علی نے لفظ طلاق صرف دو مرتبہ بیان کیا ہے، اور تین دفعہ کے بیان کرنے والے، ایک مرد اور ایک عورت ہیں اس لئے اس صورت میں تین طلاق واقع نہ ہوں گی، بلکہ صرف دو طلاق رجعی واقع ہوں گی، جس سے نکاح باطل نہیں ہوا، بلکہ عدت کے اندر بدون تجدید نکاح کے رجعت ہو سکتی ہے، اور بعد عدت کے تجدید نکاح ہو سکتی ہے، اور یہ اس صورت میں ہے کہ امجد علی کا بیان سوال میں جس طرح لکھا ہے، اسی طرح واقع میں ہو، اور اگر وہ بھی دوسرے گواہوں کی طرح تین بار لفظ طلاق کا سننا بیان کرتا ہو، تو پھر یہ حکم نہ ہوگا۔ بلکہ دوبارہ سوال کیا جائے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۱۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ

شہادت حسبہ میں بلا عذر شرعی تاخیر موجب فسق ہے۔

سوال:- ش و غ آپس میں حقیقی خالہ زاد بھائی ہیں، اور دونوں نے ایک دوسرے کی ماں کا دودھ پیا ہے۔ چنانچہ رضاعی بھائی بھی ہیں۔ اور ھندہ ایک عورت ہے، جس کا حقیقی علاتی بھتیجہ (برادرزادہ) ش ہے، یعنی

ہندہ ش کی حقیقی علاتی پھوپی ہے، اس کا غ سے عقد ہوگیا، جس کو زمانہ اٹھارہ برس کا گذر گیا، اور ہندہ سے پانچ لڑکے بھی پیدا ہوئے تین فوت ہوگئے، اور دو حی القائم ہیں، نکاح دس ہزار روپیوں پر طے ہوا تھا، لیکن اس سے قبل کسی کو ش وغ کی رضاعت کا مطلق علم نہ تھا، اور نہ آج تک دونوں کی ماؤں نے اس کا ذکر کسی سے کیا، اور نہ پہلے، اور نہ اب اس کی اہمیت کو کچھ خیال کیا، اور دونوں کی مائیں ہنوز زندہ تندرست و صحیح الدماغ ہیں، لیکن دونوں کے بیان سے اب رضاعت ش وغ کی معلوم ہوئی، دونوں کی مائیں دیندار اور پابند صوم وصلوٰۃ ہیں، رضاعت کا واقعہ بالکل سچ ہے، پس ایسی صورت میں کیا ہونا چاہیئے، جبکہ دونوں لڑکے چودہ (۱۴) وگیارہ (۱۱) سال کے ہیں، تعلیم ہورہی ہے، وہ اولاد جائز ہیں؟ اور وارث جائداد ہیں؟ ان کی تعلیم وتربیت وکفالت کس پر فرض ہے، باپ پر یا ماں پر، ھندہ ایک پردہ نشین عورت ہے، وجہ معاش کوئی نہیں، پس یہ نان ونفقہ ومہر پانے کی مستحق ہے؟ نکاح اب تک قائم ہے؟ بصورت ترک تعلق عورت کی وجہ معاش کہاں سے ہو؟ اور کیوں کر زندگی بسر ہو؟

دوسرے بلا طلاق نکاح کرسکتی ہے، باوجود اس اعلان کے ایک سال تک شوہر نے کچھ توجہ نہ کی، لیکن اب وہ دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے، اس لئے کسی خانگی معمولی تکرار پر شوہر نے نان ونفقہ بند کردیا اور ترک تعلق کیا، ھندہ سخت تکلیف وپریشانی میں ہے مہر بھی ادا کرنا نہیں چاہتا، اور کل حقوق سے محروم کردیا ہے۔

الجواب

صورت مسئولہ میں ہر دو مدعیٔ رضاعت کا دعویٰ باطل اور رد ہے اور یہ دونوں مائیں جو ش اور غ کی رضاعت کو اب اٹھارہ سال کے بعد بیان کرتی ہیں شرعاً بلاوجہ[۱] تاخیر شہادت کی وجہ سے فاسق ہیں، اس لئے ان کی شہادت رد ہے۔

قال فی الدر: ومتی اخر شاھد الحسبة شھادته بلا عذر فسق فترد

---

[۱] اور اگر وہ اس تاخیر کی کوئی وجہ بیان کریں، تو وجہ لکھ کر دوبارہ سوال کریں۔ ۱۲ ظ۔

کطلاق إمرأة أی بائنًا وعتق امته وتدبیرها وکذا الرضاع کما مرّ فی بابه اھ (ج ۴ ص۵۷۷ مع الشامی)

وفی تنقیح الفتاوی الحامدیه، لاتقبل شهادتهم بعد أن أخروا خمسة أیام من غیر عذر، إن کانوا عالمین بأنهما یعیشان عیش الأزواج والشهادة بدون الدعوی تجوز فی هٰذه المسئلة من معین المفتی شهدوا بالحرمة المغلظة بعدما أخروا شهادتهم خمسة أیام من غیر عذر، لاتقبل إن کانوا عالمین بأنهما یعیشان عیش الأزواج، جامع الفتاوی اھ ج ۱ ص ۳۲۸)

دوسرے اگر یہ عورتیں شہادت میں تاخیر بھی نہ کرتیں تو صرف دو عورتوں کے قول سے ثبوت رضاعت نہیں ہوسکتا جب تک ان کے ساتھ کوئی مرد نہ ہو۔

قال فی الدر، والرضاع حجته حجة المال، وهی شهادة عدلین أوعدل وعدلتین، لکن لاتقع الفرقة الابتفریق القاضی اھ (ج ۲ ص ۶۷۸)

البتہ اگر یہ دو عورتیں عادلہ ہوتیں، اور احسن کے قول سے مرد یا عورت کو دل میں سچائی کا خیال پڑ جاتا، تو ان کو احتیاط کرنا بہتر ہوتا، احتیاط واجب اس وقت بھی نہ ہوتی اور اب تو یہ دونوں شرعًا تاخیر بیان سے فاسق ہوگئیں، اب ان کے قول کا اعتبار نہیں، اور غ اور ش کا نکاح بالکل درست ہے۔ اور ان کی اولاد سب حلالی ہے، اور شوہر پر زوجہ کے سب حقوق کا ادا کرنا واجب ہے، اور ان عورتوں کے قول پر اس کا خیال کرنا لغو ہے،

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۴ھ

القول الماضی فی نصب القاضی

(نصب قاضی کے متعلق چند سوالات)

علماء دین ومفتیان شرع متین سے التماس ہے کہ ذیل کے سوالوں کے جوابات لکھ کر

داخل حسنات ہوں،

(۱) کن کن معاملات میں قاضی کی ضرورت ہے؟

(۲) اور کون شخص قاضی ہوسکتا ہے؟

(۳) اگر اس وقت ہندوستان میں گورنمنٹ اپنی طرف سے کسی مسلمان عالم کو فسخ نکاح وغیرہ امور کے لئے قاضی بنادے تو وہ قاضی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور فسخ نکاح وغیرہ کا اسے اختیار ہوگا یا نہیں ـــ؟

(۴) اگر کسی جگہ کے مسلمان بطور خود مل کر کسی کو ان کاموں کے لئے قاضی بنادیں تو اُسے فسخ نکاح وغیرہ کا اختیار ہوگا یا نہیں؟

(۵) چونکہ فی زماننا نکاح وطلاق ومہر وغیرہ کی بابت زیادہ جھگڑے ہونے لگے ہیں، اور اس کے متعلق بہت سی بے ضابطگیاں اور جعل سازیاں ہونے لگی ہیں۔ اگر گورنمنٹ اس کے انسداد کی غرض سے نکاح ومہر وطلاق وغیرہ کو درج رجسٹر کرنا قرار دے دے یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور مہر کی آیت إِذَا تَدَايَنتُم الآیہ کے تحت میں ہو کر لکھنا نص صریح کے مطابق ہوگا یا نہیں؟ اور شامی ج ۲ ص۲۷۹ میں جو عبارت "وأما الكتابة ففي عتق المحيط يستحب أن يكتب للعتق كتابًا، ويشهد عليه صيانة عن التجاحد، كما في المداينة بخلاف سائر التجارات للحرج لأنها مما يكثر وقوعها، وينبغي أن يكون النكاح كالعتق، لأنه لاحرج فيه"، مرقوم ہے، اس سے اس کا لکھنا داخل استحباب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

محمد بشیر الدین صدیقی

الجواب عن السوال الاول

(۱) فی الدر المختار (وله) أی للولی (إذا كان عصبة) ولو غير محرم كابن عم فی الأصح، خانية۔ (والاعتراض فی غير الكفو) فيفسخه[۱] القاضی وفی الشامی (قوله عصبة) أی بنفسه، إلی كما فی الجرج (قوله فی غير الكفو) أی فی تزويجها نفسها من غير كفو، وكذا له الاعتراض فی تزويجها نفسها أقل من مهر مثلها، حتی يتم مهر المثل او يفرق[ع] القاضی كما سيذكره

ع فی الهندية عن السراج، ولا تكون هذه الفرقة الا عند القاضی۔ شامی ج ۲ ص ۵۳۱ ۱۲ منه

المصنف فی باب الکفاءة۔ (قوله فیفسخه القاضی) فلا یثبت هذه الفرقة إلا بالقضاء، لأنه مجتهد فیه، وکل من الخصمین یتثبت بدلیل، فلا ینقطع النکاح إلا بفعل القاضی (ج ۲ ص۴۸۶) باب الولی۔

وفی الشامی (قوله للفسخ) أی هذا الشرط إنما هو للفسخ، لا لثبوت الاختیار. وحاصله: أنه إذا کان المزوج للصغیر والصغیرة غیر الاب والجد، فلهما الخیار بالبلوغ أو العلم به، فإن اختار الفسخ لا یثبت الفسخ إلا بشرط القضاء (ج ۲ ص۵۰۲) باب الولی۔

وفی الدر، وبحرمة المصاهرة لا یرتفع النکاح، حتی لا یحل لها التزوج بآخر إلا بعد المتارکة وانقضاء العدة، وفی الشامی (قوله بحرمة المصاهرة) قال فی الذخیرة، ذکر محمد فی نکاح الأصل، أن النکاح لا یرتفع بحرمة المصاهرة والرضاع، بل یفسد۔ (قوله إلا بعد المتارکة) وعبارة الحاوی إلا بعد تفریق القاضی او المتارکة ج ۲ ص۲۶۳ باب المحرمات۔

و[۴]إذ جن الزوج جنونا حادثا فهو کالعنین یؤجله القاضی سنة کما فی العالمگیریه ج ۲ ص۱۵۷۔

و[۵]إذا وقع النکاح فاسدا فرق القاضی بین الزوج والمرأة عالمگیریة ج ۲ ص۱۴۰۔

و[۶]المفقود یحکم بموته بمضی تسعین سنة، والمختار أنه یفوض إلی رأی الإمام اھ۔ وینصب القاضی من یحفظ ماله ویقوم علیه ویقبض غلاته اھ عالمگیریة ج ۳ ص۱۲۶۔

و[۷]إذا طلبت المرأة من القاضی أن یفرض لها النفقة من الزوج، فإن کان حاضراً صاحب المائدة، فالقاضی لا یفرض لها النفقة وإن طلبت، إلا إذا ظهر للقاضی أنه یضربها، ولا ینفق علیها فح یفرض لها النفقة، وإن لم یکن

عه فی الهندیة عن السراج، ولا تکون هذه الفرقة إلا عند القاضی۔ شامی ج ۲ ص۵۳۱ ۱۲ منه

صاحب المائدة فالقاضی يفرض لها النفقة فی كل شهر، وأمرة أن يعطيها، اھ ج ۲ ص ۱۶۹ ۔

وقال فی ترتيب الأولياء، ثم السلطان ثم القاضی (إذا كان ذلك فی عهده ومنشوره) ومن نصبه القاضی (بهذا الشرط أيضًا) عالمگيرية ، ج ۲ ص ۱۱ ۔

صرف باب نکاح ہی میں امور ذیل کے لئے قاضی کی سخت ضرورت ہے ۔

(۱) کسی لڑکی کا نکاح بلوغ سے پہلے اس کے ولی (غیر اب وجد) نے کر دیا، اور بلوغ کے وقت لڑکی اس نکاح سے راضی نہیں، تو اس نکاح کو قاضی ہی فسخ کر سکتا ہے دوسرا نہیں ۔

(۲) کسی بالغ عورت نے اپنا نکاح خاندانی مہر سے کم پر، یا غیر کفو سے کر لیا، تو اصل مذہب میں ورثہ قاضی کے یہاں دعوی کر کے اس نکاح کو فسخ کرا سکتے ہیں، یا مہر پورا ہو جائے ،

(۳) کسی شخص نے اپنے بیٹے کی بیوی سے زنا کیا، یا زنا کی نیت سے ہاتھ لگایا، تو یہ عورت اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں رہی، مگر نکاح نہیں ٹوٹا، جب تک قاضی نکاح کو فسخ نہ کرے یا متارکت نہ ہو، اور آج کل بعض لوگ متارکت نہیں کرتے تو بدون قاضی کے ایسی عورتوں کو سخت تکلیفیں ہوتی ہیں ۔

(۴) شوہر نامرد ہو، اور بیوی کو طلاق بھی نہ دیتا ہو تو اس نکاح کو ایک سال مہلت دینے کے بعد قاضی فسخ کر سکتا ہے ۔

(۵) اسی طرح شوہر مجنون ہو جائے تو اس کے نکاح کو بھی قاضی ہی فسخ کر سکتا ہے بدون قاضی کے مسلمانان ہند کو ان مسائل میں سخت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے ۔

(۶) کسی عورت کا خاوند لاپتہ ہو جائے تو اس کا نکاح بھی خاص مدت کے بعد جو قاضی کی رائے پر ہے، قاضی ہی فسخ کر سکتا ہے ۔

(۷) اگر کسی نابالغ لڑکی کا کوئی ولی نہ ہو، اور پرورش کے لئے جلدی نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو اس کا ولی قاضی ہے، بدون قاضی کے ایسے موقع پر بڑی دقت ہوتی ہے ۔

عہ جس کی کچھ شرطیں ہیں ۱۲

(۸) اگر شوہر نان ونفقہ میں تنگ کرتا ہو، تو قاضی اس صورت میں عورت کے لئے نفقہ مقرر کرسکتا ہے۔

(۹) اگر کوئی شخص عورت کو طلاق دے کر دعوی کرے کہ میں نے ہوش وحواس کی حالت میں طلاق نہیں دی، بلکہ میں مدہوش تھا، تو اس صورت میں قاضی کے یہاں اس کو دعوی کرنا لازم ہے اگر قاضی اس طلاق کو طلاق تسلیم نہ کرے تب تو عورت شوہر کے پاس رہ سکتی ہے ورنہ نہیں، (کما صرح به فی الدر والشامیة، باب الطلاق والمدهوش)

(۱۰) کسی نے نکاح فاسد کرلیا تو اس کو بھی قاضی فسخ کرسکتا ہے یا شوہر چھوڑ دے، اگر وہ نہ چھوڑے تو بدون قاضی کے سخت تکلیف ہوتی ہے

یہ چند مسائل صرف باب نکاح کے بطور نمونہ کے عرض کئے گئے ہیں باقی ابواب نسب ووقف، ومیراث وغیرہ میں جو مسائل نصب قاضی پر موقوف ہیں وہ اس سے بھی زیادہ ہیں جن میں بدون قاضی کے مسلمانان ھند کو سخت تکلیف وپریشانی اور دقت شدیدہ کا سامنا ہوتا ہے پھر یا تو ان میں حکم شرعی کے خلاف ہوتا ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو احکام میں سستی کرتے ہیں، یا عمر بھر عورت کو یا مرد کو مصیبت کے ساتھ گذرنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، اور کوئی صورت ایسی پیدا کردیں کہ گورنمنٹ مسلمانوں کی اس تکلیف کا احساس کرکے جلد ہندوستان میں منصب قضاء کو قائم کردے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

جواب سوال دوم

فی العالمگیریة: والقضاء فی الشرع قول ملزم، يصدر عن ولاية عامة كذا فی خزانة المفتين، ولا تصح ولاية القاضی حتى يجتمع فی المولیٰ شرائط الشهادة، كذا فی الهداية، من الاسلام والتكليف والحرية وكونه غير أعمى ولا محدوداً فی القذف، ولا أصم، ولا أخرس۔ وأما الاطرس الذی يسمع القوی من الاصوات، فالأصح جواز توليته، كذا فی النهر اھ ج ۳ ص ۱۶۰۔

وفی الدر المختار، القضاء شرعاً فصل الخصومات وقطع المنازعات واركانه ستة:- حكم، ومحكوم به، وله، ومحكوم عليه، وحاكم، وطريق و اهله اهل الشهادة والفاسق أهلها، فيكون أهله۔ لكنه لا يقلد وجوباً، ويأثم

مقلده، کقابل شهادتہ، بہ یفتی اھ (ج ۴ صـ ۴۶۴)
اس سے معلوم ہوا کہ قاضی کے لئے صاحب حکومت ہونا رکن قضاء ہے، کہ جس مقام پر وہ قضاء کرتا ہے وہاں پر اس کی ولایت وحکومت عام ہو (گو کسی خاص فرقہ ہی پر ہو) اور گو خاص معاملات ہی میں ہو۔

قال فی رد المختار: ثم القاضی تتقید ولایتہ بالزمان والمکان والحوادث اھ، ج ۴ صـ ۴۶۲۔

غیر صاحب حکومت قاضی نہ ہوگا، اور صحت قضاء کے لئے قاضی میں ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے: مسلمان ہو کافر نہ ہو، عاقل بالغ ہو، آزاد ہو غلام نہ ہو، سوانکھا ہو اندھا نہ ہو، محدود فی القذف نہ ہو، اور بہرہ گونگا نہ ہو۔ باقی اونچا سنتا ہو تو اس کا مضائقہ نہیں۔ اور ضروری ہے کہ قاضی عالم بھی ہو، اگر مسلمان جاہل کو قاضی بنا دیا گیا، اور وہ مقدمات میں علماء سے استفتاء کر کے فیصلہ کر دے، یہ بھی ممکن ہے مگر بہتر نہیں، کیونکہ علماء جواب کو بخوبی سمجھتے ہیں، جاہل سے کوتاہی ہوگی، اور غلطی کرے گا، اور عالم کے ہوتے ہوتے جاہل کو قاضی بنانے سے مسلمان گنہگار ہوں گے، جبکہ حکومت کی طرف سے ان کو انتخاب کا حق دیا جائے، اور اگر فاسق کو قاضی بنا دیا جائے تو وہ قاضی ہو جائے گا، مگر فاسق کو قاضی بنانا جائز نہیں، اور فاسق وہ ہے جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اور توبہ کرے، یا صغیرہ پر اصرار کرتا ہو، باقی جن مسائل میں قضاء قاضی شرط ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ایسے مسائل میں حاکم کافر کا فیصلہ ہرگز کافی نہیں، حاکم کافر کے فیصلے سے نہ نکاح فسخ ہو سکتا ہے نہ طلاق واقع ہو سکتی ہے، نہ ثبوت نسب ہو سکتا ہے، نہ مفقود کو میت کہا جا سکتا ہے وغیر ذلك

جواب سوال سوم

قال فی الدر: ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر، ولو کان کافرًا، ذکرہ مسکین وغیرہ۔ إلا إذا کان یمنعه عن القضاء بالحق فیحرم (ج ۴ صـ ۴۶۸)

وفی العالمگیریة، والاسلام لیس بشرط أی فی السلطان الذی یقلد کذا فی التاترخانیة اھ ج ۴ صـ ۱۶۸

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اگر گورنمنٹ اپنی طرف سے کسی مسلمان کو قاضی

بنا دے، اور جن مسائل میں قضا مسلم کی ضرورت ہے، ان میں اس کو فیصلہ کا اختیار دیدے تو وہ شرعی قاضی ہو جائے گا، اور اس کے فیصلے فسخ نکاح وایقاع طلاق وثبوت نسب وحکم موت مفقود وغیرہا میں نافذ ہوں گے، بشرطیکہ اس کو موافق حکم شرع فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، خلاف حکم شرع فیصلہ پر مجبور نہ کیا جائے۔

جواب سوال چہارم

قال فی العالمگیریة: وإذا وقع اهل بلدة علی رجل، وجعلوه قاضیا یقضی فیما بینهم لا یصیر قاضیا، ولو اجتمعوا علی رجل وعقدوا معه عقد السلطنة أو الخلافة یصیر خلیفة وسلطانا اھ (ج ۴ ص ۱۶۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں کسی جگہ کے مسلمان بطور خود بدون گورنمنٹ کی اجازت کے اگر کسی کو قاضی بنالیں تو وہ قاضی نہ ہوگا، کیونکہ اس کی ولایت عامہ نہ ہوگی البتہ حکم ہو جائے گا، جس کا فیصلہ اس وقت معتبر ہوگا جبکہ مدعی اور مدعی علیہ دونوں رضامندی سے اپنے معاملہ کو اس کے سپرد کر دیں، اور اگر ایک نے معاملہ سپرد کیا، اور دوسرے نے سپرد نہ کیا تو اس صورت میں حکم کا فیصلہ کالعدم ہے، اور فریقین باہمی رضامندی سے اگر کسی کو حکم بنالیں، اور وہ موافق حکم شرع فیصلہ کر دے، تو اسے بھی فسخ نکاح وغیرہ کا اختیار ہوگا اور اس کے فسخ سے نکاح فسخ ہو جائے گا، یعنی معاملہ سپرد کر دیا گیا، اور فیصلہ تک

ع۵ قلت: فلا یرد علیه ما فی رد المحتار (ج ۴ ص ۴۷۷) وهذا حیث لا ضرورة، وإلا فلهم أی العامة تولیة القاضی أیضا، کما یأتی بعده، وقال بعد أسطر: وأما بلاد علیها ولاة کفار، فیجوز للمسلمین إقامة الجمعة والأعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین اھ فإن معناه أنه یصیر قاضیا بتراضی المسلمین إذا حصلت له ولایة عامة فی فعل قضائه، لما عرفت أن الولایة احد أرکان القضاء، واهل الهند لو جعلوا قاضیا منهم بتراضیهم لا یکون له ولایة علی أحد أصلا، کما هو مشاهد من حالهم۔

فافهم ۱۲ منه

تحکیم سے کسی فریق نے رجوع نہ کیا تو اب حکم کا فیصلہ بھی مثل فیصلہ قاضی کے لازم ونافذ ہوجائے گا، پھر کوئی فریق اس کو توڑ نہیں سکتا، بشرطیکہ فیصلہ موافق حکم شرع ہو،

قال الشامی: أما المحکم فشرطه اهلیة القضاء، ولیقضی فیما سوی الحدود والقصاص اھ (ج ۴ ص ۴۶۲)

وفیه ایضًا، التحکیم عرفًا تولیة الخصمین حاکمًا یحکم بینهما ببینته أو اقراره، أو نکول، ورضیا بحکمه۔ (إلی أن حکم احترازعما لو رجع عن تحکمه قبل الحکم أو عما لو رضی احدهما فقط ۱۲ شامی) صح لو فی غیر حدٍ وقودٍ ودیة علی عاقلة لأن حکم المحکم بمنزلة الصلح، وهٰذه لا تجوز بالصلح، فلا تجوز بالتحکیم، وینفرد احدهما بنقضه أی التحکیم بعد وقوعه، فان حکم لزمهما، ولا یبطل حکمه بعزلهما، لصدوره عن ولایة شرعیة اھ ج ۴ ص ۵۴۰۔

جواب سوال پنجم

نکاح وطلاق ومہر وغیرہ کو درج رجسٹر کرانا شرعًا واجب نہیں ہاں احتیاطًا مستحب ہے اور اگر مصلحت کی وجہ سے انتظامًا اس کو لازم کر دیا جائے تو اس کا بھی کوئی مضائقہ نہیں مگر چند شرطیں اس کے واسطے ضروری ہیں۔

(۱) گورنمنٹ اس کو لازم نہ کرے، بلکہ گورنمنٹ اپنی طرف سے مسلمانوں کے لئے قاضی شرعی مقرر کر دے، جس کی حقیقت اور تعریف جواب سوال دوم میں گذر چکی ہے، پھر وہ قاضی اگر اس کی ضرورت سمجھیں تو کتابت کو لازمی کر دیں۔

(۲) قاضی اگر لازم کریں تو اس کے لازم کرنے کا یہ مطلب نہ ہو کہ جو نکاح یا طلاق ومہر درج رجسٹر نہ ہو، تو وہ کالعدم اور غیر معتبر ہوگا، کیونکہ یہ شریعت میں دست اندازی اور صریح تحریف وتبدیل ہوگی، کیونکہ جب شرعًا مسلمانوں پر لکھنا ان معاملات کا ضروری نہیں بلکہ محض زبانی ایجاب وقبول نکاح میں، اور زبانی الفاظ طلاق میں کافی ہیں، تو پھر ان کو بغیر کتابت کے معتبر نہ کرنا شریعت کو بدلنا ہے، جس کو مسلمان ہرگز گوارا نہیں کر سکتے، اور اسی طرح رجسٹری یا اندراج کو لازم کرنے کا قاضی شرعی کو بھی کوئی حق نہیں، ہاں قاضی شرعی بایں معنی لازم کر سکتا ہے کہ اگر کوئی نکاح وطلاق ومہر کو درج رجسٹر نہ کرائے گا تو اس کو سزا دی

جائے گی وبس، باقی غیر مکتوب اور غیر مندرج نکاح وطلاق ومہر وغیرہ کو معتبر سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا لازم وضروری ہے کیونکہ وہ نکاح وطلاق بھی شرعًا ثابت وموافق ومتحقق ہو چکے ہیں، گو لکھے نہ گئے ہوں۔ اور اسی طرح کا لزوم بھی جس میں صرف سزا دی جائے اور زبانی معاملۂ نکاح وطلاق کو بھی معتبر رکھا جائے، گورنمنٹ خود نہیں کر سکتی، کیونکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ شرعًا لکھنا اور اندراج رجسٹر کرنا ان معاملات کا مسلمانوں پر ضروری نہیں، بلکہ احتیاط کی صورت میں مستحب ہے، سو گورنمنٹ کسی ایسی دینی بات کو جو ہمارے دین میں مستحب ہے اگر خود لازم کرے بھی تو ہمارے مذہب میں دست اندازی ہوگی اور گورنمنٹ کے لازم کرنے سے وہ امر ہم پر لازم نہ ہوگا البتہ حکم قاضئ شرعی سے بعض مباحات ومستحبات شرعًا مسلمانوں پر لازم ہو سکتے ہیں، اور قاضئ شرعی کی تعریف اور حقیقت اوپر بیان ہو چکی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نکاح ومہر وطلاق کے اندراج رجسٹر کو گورنمنٹ ہم پر خود لازم نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ معاملات خالص دینی معاملات ہیں، دنیوی معاملات نہیں ہیں، ان میں گورنمنٹ کو خود دست اندازی نہ کرنا چاہیئے کہ ایک مستحب کام کو مسلمانوں پر لازم کر دے اور اگر مفاسد کی وجہ سے اس کی ضرورت ہو تو اس کی صورت یہ ہونی چاہیئے کہ اول ہندوستان میں قضاء شرعی کا محکمہ قائم کیا جائے پھر قاضئ شرعی اس کو لازم کر دے تو مضائقہ نہیں، مگر اس لزوم کی وہ صورت نہ ہو جو آج کل عدالت سرکاری میں بیع واجارہ وغیرہ کے ساتھ لزوم رجسٹری کا معاملہ ہے کہ بدون رجسٹری کے بیع نامہ وہبہ نامہ وغیرہ معتبر ہی نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ صورت ہو کہ جو شخص اندراج یا رجسٹری نہ کرائے اس کو تنبیہ کے طور پر سزا کر دی جائے اور غیر مندرج نکاح وطلاق کو بھی جبکہ گواہی وشہادت سے ثبوت ہو جائے معتبر سمجھا جائے، ھٰذا۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ أتم وأحکم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
یکم شعبان ۱۳۴۴ھ

اگر شوہر کہے کہ بیوی مہر معاف کر چکی ہے اور خسر اس کو تسلیم نہ کرے تو مدعی کون ہے اور مدعی علیہ کون ہے؟

سوال: مخدومی ومکرمی جناب مولوی ومولانا حافظ قاری صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گذارش یہ ہے کہ، کیا

حکم ہے اس مسئلہ میں، کہ نذیر احمد کی زوجہ فاطمہ مرگئی، ان کے باپ مجیر الدین نے فاطمہ کے شوہر نذیر احمد سے مہر کا دعویٰ کیا، نذیر احمد نے کہا میری بیوی نے مہر مجھ کو معاف کیا، مجیر الدین اس بات پر ایک عالم شریعت کو ساتھ لے کر معافی کا حال دریافت کرنے کو نذیر احمد کے گھر گیا، مولوی صاحب نے اس کے گھر والوں سے پوچھا، تو ایک عورت نے کہا، کہ جب میں فاطمہ سے کہا کہ اپنے شوہر کو مہر معاف کردو، جواب دیا کہ اگر خدا کا حکم ہے تو معاف کیا، دوسری عورت نے دوسرے وقت کہا کہ اپنے شوہر کو مہر معاف کردو، جواب دیا، دیا ہوں اور کیا دوں، اور دو مرد نے کہا، کہ ہم فاطمہ کی زبانی نہیں سنا ان کے گھر والوں سے سنا ہے کہ مہر معاف کیا ہے اس صورت میں یہاں پر علماء کا اختلاف ہوا ہے، ایک مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں، کہ مجیر الدین مدعی ہے اور نذیر احمد مدعی علیہ پس بمطابق حدیث " البینۃ علی المدعی والیمین علی من أنکر "، جب مجیر الدین بینہ نہ دے سکا، تو نذیر احمد پر حلف عائد ہوگا، اگر نذیر احمد حلف کرے، تو ادائے مہر لازم نہ ہوگا، اور اگر حلف سے انکار کرے تو مہر واجب الاداء ہوگی۔

اور ایک دوسرے مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں، کہ نذیر احمد مہر کی معافی کا مدعی ہے اور مجیر الدین مدعی علیہ، جب نذیر احمد معافی کی شہادت پیش نہ کرسکا، اور جنہوں نے گواہی دی، ان کی گواہی ثبوت دعوی کے واسطے کافی نہیں، پس مجیر الدین چونکہ منکر ہے، اس واسطے بمطابق حدیث مرقومہ اس پر حلف عائد ہوگا، اگر مجیر الدین حلف کرے، تو اپنی بیٹی کا مہر اسے ملے گا، اور اگر حلف سے انکار کرے، تو مہر نہیں ملے گا۔ بشرطیکہ نذیر احمد حلف کرکے کہے کہ مجھ کو میری بیوی زوجہ نے اپنا مہر معاف کیا۔

اور تیسرے ایک مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں نذیر احمد مدعی ہے، اور مجیر الدین مدعی علیہ ہے، جب نذیر احمد کے پاس شاہد ہے، اگرچہ ثبوت مدعا کے واسطے کفایت نہیں ہوتی ہے، مدعی علیہ یعنی مجیر الدین پر حلف نہیں ہوگی، اس واسطے کہ حلف اس وقت ہوتی ہے کہ جس وقت بیّنہ بالکل نہ ہو، اس صورت میں حضرت کی کیا رائے ہے؟ مدعی کون اور مدعی علیہ کون ہوگا؟ اور نذیر احمد کے گھر والے نے جو گواہی دی وہ شہادت شمار کی جائے گی یا نہیں؟ مع دلیل وحوالۂ کتاب جواب تحریر فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

بندہ جمال الدین احمد غفرلہ

الجواب

صورت مسئولہ میں نذیر احمد مدعی ہے۔ اور اس کا خسر مجیر الدین مدعی علیہ ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں صرف مجیر الدین پر حلف عائد ہوتا ہے، اور نذیر احمد کے گھر کی عورتوں کی شہادت جو اوپر لکھی ہے معتبر نہیں۔ اگر وہ اپنے عدم علم پر قسم کھالے تو نذیر احمد کو دین مہر ادا کرنا لازم ہوگا۔

قال في الدر: والمدعي من إذا ترك الدعوى ترك، أي لا يجبر عليه والمدعى عليه بخلافه أي يجبر عليه اهـ (ج ۴ ص ۶۴۶) وفيه أيضاً (ج ۲ ص ۵۹۳) في باب المهر، وإن اختلفا في المهر ففي أصله حلف منكر التسمية، فان نكل ثبتت، وإن حلف يجب مهر المثل إلى أن قال: وإن اقاما البينة فبيّنتها مقدمة: إن شهد مهر المثل له، وبينته مقدمة إن شهد مهر المثل لها، لأن البيّنات لإثبات خلاف الظاهر اهـ

وفي الخلاصة ج ۴ ص ۵۹، والأصل أن البيّنات للإثبات، فمن يقصد بإقامة البيّنة النفي لا تقبل - لأنه اراد أن يضعها في غير ما وضعت في الشرع اهـ

اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں نذیر احمد اور مجیر الدین دونوں اصل مہر کے مقر ہیں کوئی اصل مہر کا منکر نہیں۔ لیکن نذیر احمد بعد تسلیم ثبوت مہر فی الذمہ ایک امر زائد کا دعویٰ کرتا ہے کہ زوجہ نے مہر مجھ کو معاف کر دیا ہے اور مجیر الدین اصل ظاہر کے موافق کہتا ہے، کہ مہر معاف نہیں ہوا، لأن الأصل بقاء الشئ ما لم یثبت ما یسقطه، پس نذیر احمد مدعی ہے، وہ معافی مہر کا ثبوت دے، اگر وہ ثبوت سے عاجز ہو جائے تو پھر مجیر الدین سے حلف لیا جا سکتا ہے، اگر مدعی حلف لینا چاہے۔ اگر مجیر الدین نے نے حلف کر لیا تو پھر نذیر احمد کو مہر زوجہ میں سے حسب قاعدۂ فرائض مجیر الدین کا سہم شرعی دینا لازم ہوگا، جو تخریج فرائض سے معلوم ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

۱۲ / صفر ۱۳۴۶ھ

حکم سماع دعوی بعد پانزده سال

سوال :- ما قولکم رحمکم اللہ اندریں مسئلہ کہ شخصے دعوی ارث بلا عذر شرعی تا مدت پانزده سال ترک کرد، پس تر دعویش بحسب شرع شریف مسموع خواہد شد یانہ؟ بینوا بالدلائل والبراهین توجروا عند أرحم الراحمین۔

الجواب

لا تسمع دعواه بعد هٰذه المدة، إن ترك الدعوة بلا عذر شرعي، وليس فيه اعتراف الخصم بالحق، لما في رد المحتار في كتاب القضاء، قال السيد الحموي في حاشية الأشباه، أخبرني استاذي شيخ الاسلام يحي آفندي الشهير بالمنقاري ان سلاطين الآن يأمرون قضاتهم في جميع ولاياتهم أن لا يسمعوا دعوىٰ بعد مضي خمس عشرة سنة سوى الوقف والإرث، ويخالفه ما في الخيرية حيث ذكر أن المستثنیٰ ثلثة مال اليتيم والوقف والغائب ومقتضاه أن أن الإرث غير مستثنیٰ، فلا تسمع دعواه بعد هٰذه المدة۔ فقد نقل في الحامدية عن المهمنداري ايضاً على سوال آخر في من ترك دعواها الإرث بعد بلوغها خمس عشرة سنة بلا عذر، أن الدعوى لا تسمع إلا بإمر سلطاني، ونقل ايضاً مثله فتوى تركية عن المولیٰ ابی السعود، وتعريبها "اذا تركت دعوى الإرث بلا عذر شرعي خمس عشرة سنة، فهل لا تسمع الجواب لا تسمع، إلا إذا اعترف الخصم بالحق ونقل مثله تيسخ مشايخنا التركماني على آفندي مفتي الروم، وهٰذا الذي رأينا عليه عمل من قبلنا، فالظاهر انه ورد نص جديد لعدم سماع دعوى الارث وفي موضع آخر الثلث عدم سماع القاضي لها انما هو عند انكار الخصم فلو اعترف تسمع، اذ لا تزوير مع الاقرار، وايضاً في التكملة قبيل فصل رفع الدعوى وليس ايضاً مبنيا على المنع السلطاني، حيث منع السلطان عزّة نصرة قضاته من سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة في الاملاك وثلثين سنة في الاوقاف، بل هو حكم اجتهادي نص عليه الفقهاء كما رأيت، فاغتنم تحرير هٰذه المسئلة فانه من مفردات هٰذا الكتاب۔ وايضا فيه وإن القاصر إذا ادعى عقاراً ارثاً عن والده مثلاً، بعد بلوغه واثبته بالبينة الشرعيّة، فلا يسرى سماع الدعوى

لبقية ورثة الباقين البالغين التاركين للدعوى مدة المنع، ومثله من كان مسافراً
وايضاً فيه وانه إذا ترك شخص الدعوى عشر سنين مثلاً، بلا عذر شرعي
ومات وترك دعواها وارثه ايضا البالغ عشر سنين اوخمس سنين فلا تسمع
دعوى الوارث حينئذٍ، لأن مجموع المدتين مدة المنع۔
وايضاً فيه وفي الحامدية، لوكان احد الورثة قاصراً، والباقين بالغين
تسمع الدعوى بالنظر إلى القاصر، وفي قدر ما يخصه دون الباقين انتهى كتبت
ما وجدت في الكتاب، والله اعلم ما به الصواب واليه المرجع والمآب۔
از دلائل مرقومۃ الصدر صاف ظاہر شد کہ، بعد مدت مذکورہ دعوئ ارث مسموع نخواہد
شد، کما لا یخفیٰ،

المستخرج
بندہ محمد یعقوب عفی عنہ

الجواب من جامع امداد الاحکام

۱۵/ سال کے بعد دعوی میراث مسموع نہ ہونا مختلف فیہ ہے، علامہ حموی نے حاشیہ اشباہ میں سماع کو ترجیح دی ہے۔ اور متعدد فقہاء اس میں سماع ہی کو راجح فرماتے ہیں اور یہی اصل مذہب ہے۔ لیکن خشیت تزویر کی وجہ سے متاخرین نے بعد پندرہ سال املاک میں اور بعد ۳۳ سال کے اوقاف میں دعاوی کو غیر مسموع قرار دیا ہے اور یہ بھی چند قیود کے ساتھ مقید ہے۔

(۱) مدعی کا حال، صلاح بخوبی معلوم نہ ہو۔ اگر وہ معروف بالصلاح ہو، اور حیلہ تزویر کا احتمال اس پر نہ ہو تو دعوی بہر حال مسموع ہے۔

(۲) تاخیر کے لئے کوئی عذر قوی نہ ہو۔ اگر عذر قوی موجود ہو، دعوی بہر حال مسموع ہوگا۔

(۳) مدعی علیہ دعوئ مدعی کا منکر ہو۔ اگر وہ مقر ہو کہ بیشک فلاں شخص مرگیا، اور مدعی اس کا وارث ہے تو دعوی میراث مدعی کا مسموع ہے۔ گو کتنی ہی مدت گذر جائے صرح بهذه القيود في الشامية (ج ۳ ص ۶۹۰ و ۶۹۱)

وفي تنقيح الفتاوى الحامدية ج ۲ ص ۶ و ۷

پس مجیب کی یہ کوتاہی ہے کہ اس نے اگر قول عدم سماع کو اختیار کیا تھا تو اس کے شرائط

وقیود کے تحقق کی کیوں تحقیق نہ کی؟ اور جواب کو ان قیود سے کس لئے مقید نہ کیا؟

فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون

۲۲ رصفر ۱۳۴۶ھ

قاضی نکاح خواں دعوی کرے کہ عورت نے بوقت نکاح اپنی رضامندی کا اظہار کیا تھا اور عورت انکار کرتی ہو اور مدعی اذن کے پیش کردہ گواہ مردود الشہادات ہوں تو ——— الخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

۱۔ شیر دین زوج بیان کرتا ہے کہ مسماۃ مجیدہ میرے بھائی اجمیری کی بیوی تھی، اس کے مرنے کے بعد میرا اس سے نکاح ہوا، وہ اس وقت سے بطور میری بیوی کے میرے ساتھ رہتی ہے، میرے عدم موجودگی میں امام الدین وغیرہ اس کو بھگا کر لے گئے، جب میں مکان پر آیا تو اپنی بیوی کو اپنے گھر نہ دیکھا، پھر بیان کیا کہ میں پہلے سے مسماۃ مجیدہ کی شراکت میں رہتا تھا، میں نے دو ڈھائی مہینے ہوئے اس سے نکاح کی درخواست کی۔

مسماۃ مجیدہ نے انکار کیا، مگر پھر اس کے بعد وہ خود ہی رضامند ہوگئی، مگر جب نکاح کے وقت آدمی جمع ہو گئے تو مسماۃ مجیدہ نے پھر نکاح کرنے سے انکار کر دیا۔

(۲) مسماۃ مجیدہ زوجہ کا بیان ہے کہ میرا نکاح اجمیری کے ساتھ ہوا تھا وہ دو سال ہوئے مرگیا، اس وقت سے میں علیحدہ کرایہ کے مکان میں رہتی ہوں، شیر دین اجمیری کا حقیقی بھائی نہیں، وہ کبھی میری شراکت میں نہیں رہا اور نہ اس سے میرا نکاح ہوا، اور نہ میں نے کسی کو اپنے نکاح کے متعلق اجازت اور رضامندی دی شیر دین نے مجھے نکاح کی استدعا کی تھی، مگر میں نے انکار کر دیا، پھر چند آدمیوں نے مجھ پر زور دیا کہ تو شیر دین سے نکاح کرلے میں نے منظور نہیں کیا، اور انکار کیا، اور جبر کے خوف سے اپنا مکان چھوڑ کر امام الدین کے گھر چلی آئی،

(۳) ثبوت شیر دین۔ علاوہ قاضی کے چھ گواہ پیش ہوئے سب نے بالاتفاق بیان کیا کہ شیر دین کا نکاح مسماۃ مجیدہ سے ہوا مگر واقعہ کی تفصیل میں بہت کچھ اہم اختلاف ہیں،

کوئی کہتا ہے کہ مسماۃ نے نکاح کے وقت قطعی انکار نہیں کیا۔ کوئی کہتا ہے کہ مسماۃ نکاح کے وقت انکار کرنے کے بعد پھر رضامند ہوگئی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ سزاول وغیرہ وکیل اور گواہ پوچھنے مسماۃ سے گئی گئے۔ اور پھر قاضی صاحب نے جاکر پوچھا تو اس نے دونوں دفعہ رضامندی ظاہر کی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سزاول وغیرہ سے مسماۃ مجیدہ نے انکار کیا مگر قاضی صاحب کے کہنے سے رضامند ہوگئی، بعض کہتے ہیں کہ نکاح دس بجے رات کو ہوا، بعض کہتے ہیں کہ ایک بجے رات کو ہوا۔

(۴) قاضی صاحب نے بیان کیا کہ میں نے مسماۃ مجیدہ کا نکاح شیر دین کے ساتھ پڑھا قبل نکاح مسماۃ نے میرے سامنے رضامندی کا اظہار کیا تھا، مگر فوراً ہی بعد تکمیل نکاح جب میں نے اپنی رجسٹر میں مسماۃ کا انگوٹھا لگانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا اور مجھ کو دس گیارہ بجے رات کو نکاح کرنے کے واسطے بلایا گیا تھا، میں نے نو ۹ بجے رات کے نکاح پڑھا تھا، رجسٹر نکاح میں نو ۹ بجے کا وقت درج ہے۔

(۵) ثبوت مسماۃ مجیدہ۔ خلاصہ بیان میر خان،

مسماۃ مجیدہ کا نکاح شیر دین سے ہوا، قصبہ کے چند قصاب زبردستی اس کا نکاح کرنا چاہتے تھے، مسماۃ مجیدہ نے نکاح نہیں کیا۔ اور جبر کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ کر ہمارے یہاں چلی آئی، اور تائید میں بھی تین گواہ پیش ہوئے ہیں جو بیان کرتے ہیں کہ مسماۃ نے اپنے نکاح کی رضامندی نہیں دی، کئی دفعہ پوچھا گیا، اس نے ہر دفعہ انکار ہی کیا، اور بعد تکمیل نکاح کے جو بعض آدمی کے اصرار پر پڑھایا گیا، مسماۃ مجیدہ نے انگوٹھا لگانے سے انکار کر دیا اور نکاح کو اپنے تسلیم نہیں کیا، (جملہ بیانات بحلف کئے گئے ہیں) گواہان ہر دو فریق کے حالت ورع کے لحاظ سے مساوی ہیں، عادل کی حد میں کوئی نہیں آتا، اور خود قاضی بھی عادل ہیں یا نہیں ہمیں علم نہیں ہے۔ مگر اس کی ظاہراً صورت مسلمانوں کی سی ہے اور اکثر نماز پڑھتے ہم نے دیکھا ہے۔

ایسی صورت میں عند الشرع تکمیل یا عدم تکمیل نکاح کا کیا حکم ہے؟ اور اگر قاضی کو غیر عادل کہا جائے تو کیا حکم ہے؟

فقط جمشید علی خان

دو روایا شہور ہیں کہ جو ہمارے علم میں ان شہادتوں کے علاوہ آئی ہیں:۔

(۱) مسماۃ مجیدہ نے نکاح کے وقت انکار کیا، اور نو بجے رات سے لے کر ایک بجے رات تک مسماۃ مجیدہ پر اہل قصبہ نے زور دیا کہ تو نکاح کرلے، اور بالآخر تنگ آکر مسماۃ نے اجازت دے دی اور جوں ہی وہ دباؤ کم ہوگیا مسماۃ نے پھر انکار کردیا، اور بعد نکاح رجسٹر پر انگوٹھا نہیں لگایا کہ جبراً نکاح مجھے تسلیم نہیں ہے اور جب شیر دین نے مسماۃ مجیدہ سے اس نکاح کے بعد ہمبستری کی خواہش کی تو مسماۃ نے اس کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔

(۲) مسماۃ مجیدہ نے نکاح کی کوئی رضامندی نہیں دی، اور بلا اس کی رضامندی کے اہل قصبہ نے یہ سمجھ کر کہ یہ عورت ہے، کیا کرسکتی ہے؟ جبراً بلا مسماۃ کی رضامندی کے نکاح کردیا (بلا کسی بیان حلفی کے ہمارے علم میں لائی گئی ہے۔

الجواب

مفصل بیانات فریقین کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مسمی شیر دین زوج مسماۃ مجیدہ بیوہ بالغہ کے ساتھ نکاح شرعی کا مدعی نہیں، صرف ظاہری نکاح کا مدعی ہے، اور اس کے بیان سے شرعی نکاح کی صاف تردید ہورہی ہے، کیونکہ وہ اقرار کرتا ہے کہ جب نکاح کے وقت آدمی جمع ہوگئے، تو مسماۃ مجیدہ نے پھر نکاح کرنے سے انکار کردیا، اور شرعاً عورت کا انکار یا اذن وقت نکاح ہی کا معتبر ہے۔ اس سے پہلے کا اقرار یا انکار محض لغو ہے، اگر وقت نکاح کے خلاف سابق ہو۔ پس شیر دین کا بیان مسماۃ مجیدہ کی تائید کرتا ہے کہ اس نے کسی کو اپنے نکاح کے متعلق اجازت اور رضامندی (نکاح کے وقت) نہیں دی۔ اس صورت میں مسمی شیر دین کو نکاح شرعی کا مدعی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ صرف قاضی عورت کے مقابلہ میں مدعی ہے، قاضی کہتا ہے کہ قبل نکاح مسماۃ نے میرے سامنے رضامندی کا اظہار کیا تھا، مگر فوراً ہی بعد تکمیل نکاح، رجسٹر پر انگوٹھا لگوانے کے وقت انکار کردیا۔ مسماۃ مجیدہ قبل نکاح کسی کو اجازت یا رضامندی دینے سے قطعاً منکر ہے اور قاضی نے اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ عادل پیش نہیں کئے، اور جو لوگ اس کی تائید میں گواہی دے رہے ہیں وہ عادل نہیں، اس لئے شرعاً قاضی کا قول معتبر نہیں اور گو مسماۃ مجیدہ کے گواہ بھی عادل نہیں مگر شرعاً منکر کے ذمہ گواہ پیش کرنا لازم نہیں اس کے ذمہ صرف[^1] قسم ہے۔

[^1]: یہ اولاً لکھا تھا، اسی تحریر کے آخر میں اس سے رجوع کرلیا گیا ہے ۱۲

اس لئے شرعی فیصلہ یہ ہے کہ اگر مسماۃ مجیدہ اس بات کی قسم کھالے کہ اس نے کسی کو قبل نکاح اجازت یا رضامندی نہیں دی، تو مسمی شیر دین کا نکاح مسماۃ مجیدہ بیوہ بالغہ سے ثابت نہیں ہوا، اور شرعاً نہ وہ مسماۃ مذکور کا زوج ہے، نہ وہ زوجہ ہے، مسماۃ اپنی رضامندی سے جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اگر مسماۃ قسم سے انکار کرے تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

قال فی الدر: قال الزوج للبالغة البکر بلغكِ النکاح فسکتت، وقالت رددتُ النکاح، ولا بینة لهما علی ذلك ولم یکن دخل بها طوعًا، فالقول قولها بیمینها علی المفتی به۔

قال الشامی: وهو قولهما، وعنده لا یمین علیها، کما سیأتی فی الدعوی فی الأشباه الستة الخ) قال الشامی: ولا یقبل قول ولیها علیها بالرضاء، لانه یقر علیها بثبوت الملك، واقرار علیها بالنکاح بعد بلوغها غیر صحیح۔ کذا فی الفتح۔

قلت: وینبغی أن لا تقبل شهادته لو شهد مع آخر بالرضا لکونه ساعیًا فی اتمام ما صدر منه فهو متهم، ولم اراه منقولاً بحر۔ قلت وفی الکافی للحاکم الشهید واذا زوج الرجل ابنته فانکرت الرضاء فشهد علیها أبوها وأخوها لم یجز اھ فتامل اھ (ج ۲ ص ۲۹۶)

اس عبارت فتویٰ سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں قاضی کا دعویٰ رضا یا شہادت رضاء لغو ہے، کیونکہ وہ خود کردہ کام کی تکمیل میں ساعی ہونے کی وجہ سے متہم ہے، لہٰذا اب عورت کے ذمہ قسم بھی لازم نہیں۔ بلکہ بدون اس سے قسم لئے ہی یہ دعوی خارج کردیا جائے اور دعویٰ نکاح کو باطل قرار دیا جاتے۔ پس اوپر جو عورت کے ذمہ قسم کو لازم کیا گیا ہے۔ اب میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون
۴ / ربیع الاوّل ۱۳۴۶ھ

حکم سکوت مدعی بر تصرفات مدعی علیہ وتاخیر در دعوی بعذر افلاس خود۔

سوال ۱۔ اگر کسے بحضور قریب یا بحضور اجنبی زمینے می فروشد وآں قریب یا وآں اجنبی می بیند، وہیچ نمی گوید، ومشتری در بیع سالہا از کشت وغیرہ تصوف می نماید، آنرا ہم می دید، وہیچ نمی گفت، مگر اکنوں آن قریب یا آن اجنبی برآن زمین دعوی مدعیت می نماید، ومی گوید کہ چنداں مدت مرا خرچ فیس سرکاری دستیاب نہ بود، لہٰذا پیش ازیں دعوی نہ کردم، اکنوں فیس سرکاری دستیاب شدہ است، ودعوی مدعیت خود کردم، بناءً علیہ از جناب فیض مآب مسئول است کہ فیس سرکاری در عرصۂ دعوی، وتصرف از اعذار مصحح دعوی ہست یا نہ؟

سائل: محمد شفیع، مسجد سوڈاری تعلقہ میٹھر،

ضلع ۱ لاڑکانہ، سندھ

الجواب

اس امر کو قاضی شرعی یا وہ حاکم مسلم جو حکومت وقت کی طرف سے انفصال مقدمات کے لئے مقرر ہو اس کے یہاں مقدمہ کا مرافعہ کیا جائے وہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ عذر میں داخل ہے یا نہیں، باقی افتاء کی حیثیت سے جو ہماری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ عذر مذکور کی وجہ سے دعوی میں تاخیر کرنا عذر قابل سماعت ہے کیونکہ آج کل عدالتوں میں دعوی دائر کرنا خصوصاً جائیداد کے متعلق آسان نہیں، بلکہ اس کے لئے بڑی مقدار مال کی ضرورت ہے، پس مفلس شخص کا قاضی کو یا حاکم کو پانا بدون قدرت مال کے معتبر نہیں، پس یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ عدم وجدان قاضی کی وجہ سے تاخیر ہو۔

ثم رأیت فی رد المحتار تحت قول الدر فلا تسمع الآن بعدها إلا بأمر الا فی الوقف والإرث ووجود عذر شرعی اھ ما نصه العذر یشمل ما لو کان المدعی علیه حاکماً ظالماً کما یأتی، وما لو کان ثابت الإعسار فی هذه المدة ثم أیسر بعدها، کما ذکرہ فی الحامدیة اھ (ج ۴ ص۵۳۳)

فجعل اعسار المدعی علیه عذراً، وینبغی أن یکون اعسار المدعی کذلك عذراً العدم القدرة علی الدعوی بدون المال فی بلادنا هذه۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۲۰ جمادی الاولی ۱۳۴۶ھ

ایک شخص یہ دعوی کرے کہ اس لڑکی کا نکاح اس کے باپ نے بحالت نابالغی مجھ سے کیا تھا اور اولیاء معروضہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ لڑکی نہیں بلکہ یہ اس کی بہن ہے اور وہ مر چکی ہے۔ الخ ـــــــــــ

سوال: عرض ہے کہ مسمّی زید شخصے را دو دختر مسماۃ زینب و فاطمہ بودند صغیرہ نکاح یکے را از اینہا بشخصے مسمی عمر بالغ کردہ داد، و یکے ازاں دو دختر متوفی ہستند، و دیگر زندہ است، و بالغہ شدہ اعمام ایں دختر کہ برادران مسمی زید متوفی اند نکاح دختر و زفاف بشخصے مسمّٰی خالد کردہ اند، عمر می گوید کہ ایں معروسہ ہماں ست کہ در صغرسنی نکاحش پدرش بمن کردہ بود۔ اعمام معروصہ می گویند کہ ایں معروسہ آن نیست آں سماں بود کہ فوت شدہ۔ از برائے ایں فیصلہ سہ حکم مقرر کردہ اند۔ یکے حکم ازایں پرسید جواب مسئلہ گفتش کہ مدعی علیہ عمر اعمام معروسہ شرعًا نمی شوند، مدعی علیہ عمر خود ہماں معروسہ است کہ در مجلس حکم حاضر شود، پس اگر اقرار دعوی عمر کند، دعوی عمر ثابت خواہد شد، و نکاح خالد باطل، و اگر انکار کند، و یا لاعلمی ظاہر کند، و گوید کہ از معاملہ صغر خبر ندارم، از عمر دو گواہ نکاح، و دو گواہ شناخت کہ ہماں نکاح والہ باشند، و یا دیگر قائم کند، اگر ہر دو شہادت برپانے شدند تاہم دعوئ عمر ثابت، و نکاح خالد باطل، چوں ایں قدر جواب دادم، در دل آمد کہ در شق لاعلمی و عدم قیام شہادت حلف بر کسے آید، چراکہ "الیمین علی من انکر" ست و در ایں جا انکار نیست، لہٰذا عرض کہ اگر جواب بندہ صحیح ست تا فقط از صورت حلف تشفی بفرمایند، و اگر ہمہ صورت غلط ست، از تمام جواب صواب بتمامہا ارشاد بفرمایند، فیصلہ ما با آمدن جواب موقوف ست۔؟

الجواب

بظاہر صورت مسئولہ میں مدعی کے دو دعوی ہیں، ایک تعیین ذات تشخص معروسہ کا کہ یہ عورت جس کا عقد اس کے اولیاء نے خالد سے کیا ہے یہ وہ نہیں جو ہنوز غیر منکوحہ ہے بلکہ وہ ہے جس کا نکاح زید بحیات خود کر گیا ہے۔ اس دعوی کا حاصل یہ ہے کہ یہ عورت

چونکہ محل نکاح بننے کی قابلیت نہیں رکھتی بوجہ منکوحۃ الغیر ہونے کے، اس لئے اعمام معروسہ نے اس کا نکاح خالد سے منعقد کرنے میں شرعی جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس دعوی میں اعمام معروسہ مدعی علیہم اور عمر مدعی ہے مگر چونکہ اس دعوی کا حال یہ ہے کہ بعد ثبوت جرم کے اعمام معروسہ کو تعزیر دی جاتی اور یہ حق قاضی و مثلہ کے سوا، دوسرے کو نہیں۔ اور آجکل قاضی شرعی بلاد ھند میں بجز ریاست اسلامیہ کے مفقود ہے، اس لئے اس دعوی کا کچھ حاصل نہیں۔ اب صرف دوسرا دعوی رہ گیا کہ عمر اس عورت سے اپنے نکاح کا مدعی ہے۔ حکم کو ایسے دعوی کو سننا اور اسی کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس دعوی میں عمر مدعی ہے اس کے ذمہ بیّنہ ہے اگر عورت اس دعوی کی منکر ہے تو وہ مدعی علیہا ہے۔ اگر عمر بیّنۂ عادلہ قائم نہ کر سکے تو امام صاحبؒ کے نزدیک تو عورت کے ذمہ یمین نہیں، بلکہ بیّنہ نہ ہونے کی صورت میں دعوی مدعی کا خارج ہو جائے گا۔ لأن النكاح من الامور الستة أو السبعة التي لا يمين فيها على المنكر عند أبي حنيفةؒ، ہاں! قول صاحبینؒ میں عورت سے قسم لی جائے گی، اور مفتی بہ قول یہی ہے۔ اس لئے بصورت انکار حکم کو عورت سے قسم لینا چاہئے، اور عورت اپنے عدم علم کی بناء پر قسم کھا سکتی ہے کہ میں اس کی زوجہ نہیں، مجھے اس سے اپنا نکاح ہونے کا علم نہیں۔ اگر وہ بصورت عدم بیّنہ قسم کھالے جب بھی دعوی مدعی کا باطل ہو جائے گا۔ اور اگر وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۳/ شعبان ۱۳۴۶ھ

نکاح پر شہادت حسبہ مسموع ہے

سوال ۱؎: زید غائب ہے بمدت سفر، اس کی منکوحہ کا نکاح بکر سے کرتے وقت گواہوں نے کہا کہ یہ عورت فلاں شخص کی منکوحہ ہے۔ مولوی نکاح خواں نے کہا کہ نکاح حقوق العباد میں سے ہے۔ مدعی موجود نہیں، لہٰذا سمع شہود بے فائدہ ہے۔ میں تو نکاح باندھتا ہوں، جب زید واپس آئے اور دعوی کرے تو اس وقت شہادت مفید ہوگی، اور حوالہ "جامع الفصولین" کا دیا، کیا نکاح حقوق العباد سے، یا حقوق اللہ سے، یا مشترک ہے؟ اور ایسے موقع پر جبکہ متعدد شہود عدول عقد نکاح کی شہادت دیتے ہیں ان کا کچھ اعتبار نہ

ہوگا، مسئلہ بعبارت کتاب تحریر فرمائیں۔؟

ع۲ سقط یا اطفال خورد سال کے بارہ میں جو حدیث میں وارد ہے بحر ابو یہ بسررہ یہ لفظ بَسَرَرِہ یا کہ بُسُرَرہ ہے؟ اگر اول ہی ہے تو ثانی بھی اوزان جمع میں ہو کر بن سکتا ہے یا نہیں، اور حدیث القبر روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النار کس کتاب کے کون سی فصل میں ہے۔ دوسرا لفظ "حَفَرۃ النیران" ہے یا کہ حُفُرۃ النیران ہے، یعنی بفتح فاء ہے یا بسکون فاء۔؟

امید ہے کہ جناب ذرا تفصیل سے ارشاد فرمائیں گے۔

الجواب

ع۱ اس نکاح خواں نے غلط کیا ہے، فقہاء نے بے شک شہادت علی النکاح کو شہادت حسبہ میں شمار نہیں کیا، جیسا کہ تتبع کتب سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نکاح حقوق العبد سے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہادت حسبہ سے اس عورت کو منکوحہ غائب ثابت نہ کیا جائے۔ اور یہ مطلب نہیں کہ ایسی عورت کا نکاح دوسرے شخص سے منعقد کر دینا جائز ہے، جس کے منکوحہ غائب ہونے پر شہادت حسبہ قائم ہو چکی ہے کیونکہ یہ شہادت اثبات نکاح پر قائم نہیں، بلکہ اثبات حرمت علی الغیر پر قائم ہے کہ اس کا نکاح دوسرے سے حرام ہے، اور عورت کا محللہ ہونا اور اسباب حرمت نکاح سے خالی ہونا حق اللہ ہے۔ لہٰذا اگر غائب کا نکاح اس عورت کے ساتھ شہرت سے ثابت نہ ہو تو بعض شہادت حسبہ سے اثبات نکاح تو نہ ہوگا، مگر شہادت عدول ثقات کے ساتھ اس عورت کا نکاح دوسرے سے منعقد کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ فان الحل والحرمۃ من حقوق اللہ تعالیٰ۔ صرح بہ الأصولیون، کما فی نور الانوار" وغیرہ۔ فکان کالشہادۃ علی الرضاع وحرمۃ المصاھرۃ، وتقبل شہادۃ الحسبۃ فیھما، ثم رأیت الأشباہ، وقد صرح فیہ بأن النکاح یثبت بدون الدعوی لأن حل الفرج والحرمۃ فیہ حق اللہ تعالیٰ اھ

ع۵ بعد کو اشباہ والنظائر سے معلوم ہوا کہ نکاح پر بھی شہادت حسبہ مسموع ہے۔ اور دلیل وہی ہے۔ جو احقر نے بیان کی ہے ۱۲ منہ

قال الحموی بعد تصویرہ ، والذی تحرر لی أن ماتقبل فیه الشهادة بدون الدعوی عند الکل اربع مسائل: عتق الامة، والطلاق، والخلع، والنکاح اھ ص ۲۳۳ ۔

۲: یہ لفظ سَیِّرة بفتح سین ورا یا بکسر سین ہے۔ بضم سین وتشدید را غلط ہے اور حدیث "القبر روضة من ریاض الجنة أو حفرة من حفر النار" ترمذی کے باب عذاب القبر میں ہے۔ اور دوسرا لفظ "حُفَر" بضم الحاء وفتح الفاء جمع حفرة کی ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنه

یکم ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ

ثبوت زنا کے لئے چار گواہ کیوں ضروری ہیں جبکہ قتل مومن کے لئے دو گواہوں پر اکتفا کیا جاتا ہے جو زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے

سوال: جبکہ اور مقدمات بلکہ قتل مومن تک جو سب سے زیادہ سخت گناہ ہے، دو گواہ کافی ہیں، تو زنا کے واسطے چار گواہ کیوں ضروری قرار دیئے گئے؟ اور چار گواہ سے کم اگرچہ بچشم دید سچی گواہی ہو قرآن میں اس کو فضل ربی فرمایا ہے (سورۂ نور)؟

الجواب

اس سوال کا علماء سے کسی کو حق نہیں، کیونکہ وہ واضع قانون نہیں صرف عالم قانون ہیں، ہم سے قانون کے دریافت کرنے کا تو حق ہے قانون کی علتیں دریافت کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ جیسے ڈاکخانہ کے بابو سے کسی کو اس سوال کا حق نہیں کہ اگر لفافہ پر عدالت کا ٹکٹ آٹھ آنے والا لگا دیا جائے تو وہ کیوں بیرنگ ہو جاتا ہے، اور ڈاکخانہ کے ایک آنہ کا ٹکٹ لگا دیا جائے تو کیوں بیرنگ نہیں ہوتا؟ اور کوئی اس سے یہ سوال کرے تو وہ یہ جواب دینے کا حق رکھتا ہے کہ مجھ سے آپ کو اس سوال کا حق نہیں، کیونکہ میں واضع قانون نہیں ہوں صرف عالم قانون ہوں۔ اور اس کا یہ جواب تمام عقلاء کے نزدیک معقول ہوگا، اسی طرح ہم کو بھی یہی جواب دینے کا حق ہے، کہ واضع قانون اللہ تعالیٰ ہے۔ قانون کی علل پوچھنا ہیں تو ان سے پوچھ لیجئے، ہاں حکم معلوم کرنا ہو تو ہم قرآن وحدیث وفقہ سے اس کو معلوم کر کے بیان کر سکتے ہیں۔ رہا یہ کہ یہ سوال کفار کو جواب دینے کے لئے کیا ہے، کیونکہ وہ

ایسے شبہات نکالتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ مخالف اسلام سے اصول میں گفتگو کی جائے گی، فروع میں گفتگو نہیں کی جاسکتی، کیونکہ فروع ہر مذہب میں دو چار نہیں، بلکہ ہزاروں سینکڑوں ہیں۔ فروع میں گفتگو کرنے سے کبھی سلسلہ ختم نہیں ہوسکتا، وہ ہمارے چار فروع پر اعتراض کرے گا ہم اس کے ہزار فروع پر اعتراض کردیں گے، ہاں اصول ہر مذہب کے محدود ہیں اور اصول ہی پر فروع کا مدار ہے، اس لئے سب سے پہلے اصول میں گفتگو ہونی چاہئے، اگر مخالف نے اصول میں گفتگو کرکے توحید و رسالت و قرآن کی حقانیت کو (جو دلائل عقلیہ سے ثابت ہے اور ہم ہر دم اس کے ثابت کرنے کو تیار ہیں) تسلیم کرلیا۔ تو اب اس کو فروع میں کلام کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ اگر اس کو کسی فرعی مسئلہ پر شبہ بھی ہوگا تو ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ جب تم نے قرآن کا کلام الٰہی ہونا تسلیم کرلیا اور مان لیا کہ یہ احکم الحاکمین کا قانون ہے تو اب چاہے کسی حکم کی وجہ تمہاری سمجھ میں آتے یا نہ آئے تم کو ماننا لازم ہے۔ کیونکہ تم دنیا میں ادنیٰ ادنیٰ حاکموں کے بہت سے احکام ایسے مانتے ہو جن کی حکمت تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، بالخصوص حکیم اور ڈاکٹر کے، تو بہت سے احکام ایسے مانتے ہو جن کی وجہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، کسی وقت ڈاکٹر سردی کے موسم میں برف سے دوا کرتا ہے، اور تم چوں وچرا نہیں کرتے، اور بعض دفعہ گرمی میں سخت گرم دوا دیتا ہے، اور تم دم نہیں مارتے، کیوں؟ محض اس لئے کہ اس کی حکمت پر اعتماد ہے پھر غضب ہے کہ خداتعالیٰ احکم الحاکمین کی حکمت پر اعتماد نہ ہو اور اس کا ہر حکم تسلیم کرنے میں اس کا انتظار ہو کہ ہماری سمجھ میں آجائے تو مانیں گے ورنہ نہیں، یہ تو آپ کے سوال کا اصلی جواب تھا اور یہی حقیقی جواب ہے۔ اس سے زیادہ اگر میں کچھ کہوں تو وہ محض تبرع واحسان ہوگا۔

اب سنئے! سائل نے انسان کے جذبات کو سمجھا ہی نہیں، اس لئے اس نے مقدمۂ قبل کو مقدمۂ زنا سے اشد سمجھ لیا، حالانکہ جذبات انسانیہ پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ عزیز تو مذہب ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں وہ نہ عزت و آبرو کی پرواہ کرتا ہے نہ جان و مال کی، اس کے بعد آبرو عزیز ہے۔ انسان آبرو کی حفاظت میں جان جانے کی پرواہ نہیں کرتا، اگر کوئی کسی شریف کو حرامزادہ کہدے یا یوں کہدے کہ تیری ماں کو میں نے جنگلہ میں دیکھا تھا، تو اس وقت وہ دشمن کے ساتھ مقابلہ پر آمادہ ہوجاتا، اور جان جانے کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ پھر آبرو کے بعد جان عزیز ہے۔ اور جان کے بعد مال عزیز ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی، تو اب سمجھو کہ مقدمۂ زنا میں ایک مسلمان عورت و مرد کی آبرو پر حملہ ہے جو عورت کے

لئے تو موت سے بدتر ہے، اس لئے شریعت نے مقدمۂ زنا کے احکام مقدمۂ قتل سے زیادہ سخت کئے، کہ اس کے ثبوت میں صرف دو گواہوں کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ چار گواہ ضروری قرار دیئے جن لوگوں میں حیاء وغیرت اور آبرو ہے، وہ تو قرآن کے اس حکم کی دل سے قدر کریں گے لیکن جن اقوام کی یہ حالت ہے کہ وہ زناء بالتراضی کو جرم ہی نہیں سمجھتے، اور انہوں نے غیرت سے اس درجہ ہاتھ دھولئے ہیں کہ اپنی قوم کے لئے زناء کو گوارا کرتے، اور رنڈیوں سے بھی ٹیکس وصول کرتے ہیں ان سے اس وقت خطاب نہیں۔ اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلّ۔

والله اعلم

حررہ العبد المفتقر الی ربه الصمد عبدہ المذنب
ظفر احمد وفقه الله للتزود لغد
نزیل الخانقاہ الامدادیہ بتھانہ بھون
۱۱ر ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ

بوقت فیصلہ حاکم گواہوں کا حاضر عدالت ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر عورت پردہ نشیں مدعی ہو تو اس کا حاضر عدالت ہونا شرط ہے یا نہیں۔؟

سوال:- کیا قضاء قاضی کے وقت شہود کا حاضر عدالت ہونا شرط ہے؟ کہ ان کی غیبت میں قضاء صحیح نہیں؟ یا شہود کی غیبت میں بھی قضا صحیح ہے۔ جبکہ ان کی شہادت قاضی کے سامنے ہو چکی ہو، اور بیان قلمبند کر لیا گیا ہو نیز اگر عورت پردہ نشین مدعی ہو، تو کیا اس کا بھی حاضر عدالت ہونا شرط ہے؟ بینوا بالدلائل

الجواب

قال فی العالمگیریة: إذا وجد القاضی شهادة شهود فی دیوانه، ای فی خریطة مختومة بختم القاضی والشهادة مکتوبة بخطه أو بخط نائبه، إلا أنه لا یتذکر تلك الشهادة، فعلی قول أبی حنیفة لا یقضی بتلك الشهادة، وعلی قولهما یقضی وکذالك إذا وجد سجلاً فی خریطة، والخریطة مختومة بختمه، والسجل مکتوب بخطه او بخط نائبه فالقاضی لا یمضی ذلك السجل عند أبی حنیفة رح۔ وعندهما یمضی، کذا فی المحیط اھ

قلت: وأما إذا تذکر الشهادة، فلا خلاف فی جواز القضاء به، کما هو مقتضیٰ

التقييد بعدم الذكر۔ وفيه أيضًا، ولو أنه قاضيا عزل عن القضاء، ثم رد بعد ذلك على القضاء، فانه لا يقضى بشيئ مما كان فى ديوانه الاول من القضاء لإنسان على إنسان، إذ لم يذكر بالاجماع، وإن ذكره فكذلك عند أبى حنيفة خلافًا لهما فأما إذا اقامت البينة بحق عنده لإنسان على انسان، فقيل أن يقضى بها عزل ثم اعيد إلى القضاء فرفعت اليه تلك الخصومة، فان المدعى يكلف اعادة البينة تذكر أو لم يتذكر، كذا فى محيط الرخسى اه (ج ۴ ص ۱۷۷) ففرق بين القضاء بالسجل قبل العزل وبعده، فتبصر۔

وفى البدائع فى بيان شرائط القضاء، وأمّا مايرجع إلى المقضى له، فانواع: منها أن يكون حاضرًا وقت القضاء، فان كان غائبًا لم يجز القضاء له، إلا إذا كان عنه خصم حاضرًا۔ لأن القضاء على الغائب كما لا يجوز فالقضاء للغائب ايضًا لا يجوز اھ ج ص ۸۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ جب قاضی کے سامنے شہادت گذر چکی، اور شہود کے بیانات اس کے دفتر میں قلمبند ہو چکے، اور قاضی کو شہادت کا مضمون یاد ہو، تو ایسی صورت میں قضاء کے وقت شہود کا حاضر ہونا شرط نہیں، اور قاضی کو مضمون شہادت یاد نہ ہو تو جب بھی صاحبین کے نزدیک قلمبند شدہ بیانات پر قضاء جائز ہے، جبکہ ان کی خریطہ پر قاضی کی عدالت کا مہر ثبت ہو، اور یہ اس وقت ہے کہ قاضی بعد شہادت سننے اور بیانات قلمبند کرنے کے معزول نہ ہوا ہو۔ ورنہ اس میں تفصیل ہے۔ اور مدعی کا حاضر ہونا وقت فیصلہ کے لازم ہے، خواہ اصالۃً حاضر ہو یا اس کا وکیل حاضر ہو۔ پس پردہ نشین عورت کی طرف سے وکیل کا حاضر عدالت ہونا کافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
۱۹ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

حدیث البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر کی ایک توجیہ کی تغلیط

سوال: قال عليه الصلوة والسلام "البينة على المدعى واليمين على من أنكر"، المراد من هذا الحديث فيما اذا كانت الدعوى بين الصالحين، وأما إذا كانت بين الصالح والطالح، فى اليمين على الصالح وإن كان

المدعی صالحًا ولا بینة له۔ لأن الطالح لا یخاف من الله تعالیٰ، ولا یعرف حرمة الیمین کالذی یشرب الخمر ویأکل الرباء، أو بالسرقة معروف، ویسب فی الخاصمة، لأن الیمین متعلقة للنفس والدین، ولا یجوز للمومن أن یتلقهما، لقوله تعالیٰ، وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ، ولأنه لا یبالی من هلاك دینه با لجهل والکفر، لأنه عدو لنفسه، فکیف یکون صدیقًا لغیره، فلا یجوز للقاضی أن یحلف الفاسق والطالح، فان حلفه القاضی یکفر، لأنه اهان کلام الله تعالیٰ وهو قوله تعالیٰ، وَلَا تَجْعَلُوا اللهَ عُرْضَةً لِاَیْمَانِکُمْ، والعرضة: المنشفة للوجه والیدین والرجلین والمقعد، والمراد بهٰذه الاٰیة أن لا تجعلوا الکاذب والطالح والفاسق لأن اکثر کلامهم الکذب، فلا یعرفون حرمة الیمین۔ شرح کرمانی وجامع الفوائد ص ۲۳۴

یہ عبارت معمول بہا ہے یا نہیں؟ بصورت دیگر اس کے نقصانات سے، اور بصورت اولیٰ حدیث متواتر کی مخصص اور مقید ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب

یہ عبارت ہرگز معمول بہا نہیں ہے۔ اس کے غلط ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس میں قاضی کی تکفیر کی ہے، اگر وہ طالح اور فاسق سے قسم لے، بھلا اس شخص سے کوئی پوچھے کہ اگر مدعی مسلم اور مدعی علیہ کافر ہو، اور مدعی کے پاس بیّنہ نہ ہو، تو کیا کافر سے قسم نہ لی جائے گی اگر کہے نہیں لی جائے گی تو یہ اخبار مشہورہ کے بالکل خلاف ہے، حدیث قسامت میں جو کہ مشہور حدیث ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول موجود ہے "فتحلف لکم یهود، قالوا: لیسوا مسلمین، فوداہ من عندہ، اخرجه الستة (جمع الفوائد ص ۲۷۹)

اور اگر کہے لی جائے گی۔ تو تحلیف فاسق تحلیف کافر سے اہون ہے اس کا انکار غلط ہوا، اور ان تمام شبہات کا جو اس عبارت میں مذکور ہے جواب یہ ہے کہ کسی کے ذمہ کسی کا حق نہ ہو، فإن فراغ الذمه اصلٌ۔ جو شخص دوسرے کے ذمہ حق کا دعویٰ کرتا ہے وہ گواہ لائے، اگر گواہ نہ لا سکا، تو مدعی علیہ کی برأت تو اسی سے ہوگی، آگے اس سے قسم لینا محض مدعی کی تسلّی کے لئے ہے۔ پس مدعی علیہ سے ہر حال میں قسم لی جائے گی، خواہ صالح ہو یا طالح مسلم ہو یا کافر، اب اگر مدعی یہ کہے کہ مدعی علیہ فاسق ہے، اس کی قسم سے میری تسلی نہیں ہوتی،

تواس سے کہا جائے گا کہ پھر تم اپنی دلیل پیش نہ کرنے کی وجہ سے پہلے ہی کمزور ثابت ہو چکے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ مدعی علیہ قسم کھالے۔

وقد کان أنه صلی اللّٰہ علیه وسلم۔ اختصوا إلیه رجلان ولم یقسم المدعی البیّنة: فسئل المدعی علیه الیمین، فقال المدعی، إنه لایبالی بالحلف صادقًا أو کاذبًا، فقال صلی اللّٰہ علیه وسلم: لیس لك منه إلا ذلك، أخرجه مسلم کما فی المشکوٰة ص۲۷۶ نظامی دهلوی۔

عن علقمة ابن وائل عن أبیه قال: جاء رجل من "حضر موت" ورجل من کندة إلی النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم، فقال الحضرمی یا رسول اللّٰہ! إن هٰذا غلبنی علی أرض لی۔ فقال الکندی: هی أرضی وفی یدی، لیس له فیها حق، فقال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم للحضرمی: ألك بینه؟ قال، لا، قال فلك یمینه، قال یا رسول اللّٰہ: ان الرجل فاجر لایبالی علی ما حلف علیه، ولیس یتورع من شئ، قال لیس لك منه إلا ذلك الخ واللّٰہ تعالیٰ اعلم وهٰذا الحدیث صریح ردما فی العبادة المسئول، وتحلیف الکافر ثابت بالنص، وهو قوله تعالیٰ

اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِکُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ أَوْ اٰخَرَانِ مِنْ غَیْرِکُمْ، إلی قوله۔ فَیُقْسِمَانِ بِاللّٰهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا، الاٰیة۔

نزلت فی رجل مسلم مات فی سفر، ولم یکن هناك مسلم یسلّم إلیه متاعه وترکته، فسلم إلی تمیم الداری وصاحبه، کانا کافرین، فخلصهما النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم۔

ع۵ اور اگر مدعی علیہ سے قسم نہ لی جائے، بلکہ مدعی سے لی جائے، تو ہم کو بتلایا جائے کہ اگر مدعی اور مدعی علیہ دونوں فاسق ہوں تو اس صورت میں کس سے قسم لی جائے گی۔ اگر کہو مدعی سے؟ تو وہی محذور لازم آئے گا کہ فاسق سے قسم لی گئی اور اگر کسی سے قسم نہ لی گئی تو فیصلہ کیوں کر ہوگا، کیا بلا دلیل کے فیصلہ کر دیا جائے گا؟ وهٰذا لایجوز ۱۲ منہ

وإذا جاز تحلیف الکافر فتحلیف الفاسق أولی فافہم،
واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۲۶ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ

طلاق کے ایک واقعہ میں گواہوں کا اختلاف

سوال:- ما قولکم رحمکم اللہ تعالیٰ، زید کی ماں اور بھائی اور بہن آپس میں جھگڑ رہے تھے، آکر انہوں نے بہت ڈانٹا، انھوں نے نہ مانا، زید نے دفع نزاع، کے لئے ان کو بولا کہ چوتمرانی جی، حرامزادی، ایک، دو، تین طلاق دیا میں، زید کی بیوی الگ گھر میں کھانا پکا رہی تھی، زید سے پوچھا گیا کہ تم نے کس کو طلاق دی؟ جواب دیا جھگڑا کرنے والوں کو، اور زید کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی بیوی جھگڑے میں شریک نہ تھی اور زید کی بیوی طلاق کی مدعی بھی نہیں، وہ مدعی کیسے ہو سکتی ہے اس نے لفظ طلاق کو بھی نہیں سنا آٹھ گواہ زید کے آمنے سامنے مکان کے اندر چار دیواری گھر میں موجود تھے، گھر کی دیوار بانس کی، اور سطح ٹین کی، گھر میں دو کمرہ ہے، ایک پیچھے کی طرف، ایک آگے کی طرف، حادثہ مذکورہ آگے کے کمرہ میں ہوا، اس گھر کا دروازہ پچھم رخ ہے، زید کے آمنے سامنے جو آٹھ گواہ موجود تھے وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ زید نے باہر سے آکر جھگڑنے والوں کو بہت زجر و توبیخ کی، اس کے بعد بوجہ نہ ماننے کے ان تینوں کو یہ لفظ کہا، "چوتمرانی، حرامزادی، ایک، دو، تین طلاق دیا میں"، گھر مذکور کے پیچھے بمقدار چالیس ہاتھ فاصلہ پر مکان سے باہر ایک چار دیواری کچاری گھر موجود ہے، جس کی رخ پورب طرف ہے، اس کچاری گھر میں اور تین شخص موجود تھے، وہ گواہ گذرتے وقت اس آٹھ گواہ مذکور کے موافق گواہی دیتے تھے، چند روز بعد ان تین گواہ پہلو بدل کے لوگوں کے پاس کہتے ہیں، کہ زید کی ماں نے کہا تھا کہ تو نے اپنی بیوی کی بات سنی ہے وہ کیا کہتی ہے؟ زید نے کہا سنی، سنی! اس بات کے متعلق زید نے کہا:- چوتمرانی جی ایک، دو، تین طلاق دیا میں، لیکن زید کی ماں سراسر انکار کرتی ہے کہ میں نے زید کی بیوی کی بابت کچھ ذکر نہ کیا، اور آمنے سامنے والے آٹھ گواہ بھی کہتے ہیں کہ زید کی ماں نے زید کی بیوی کے متعلق کچھ ذکر نہ کیا۔ قسم دوم کے گواہ

طلاق بصورت متوسط شاہد ہیں۔ اور تینوں چاروں کی شور وغل میں مطلق کی آواز پہچانا، لیکن معائنہ نہیں ہے، اور زید کی ماں یوں مجبور ہے، اس کی بات پر شہادت دینا مقبول ہوگی یا نہیں؟ اب زید کی بیوی شرعاً مطلقہ ہوگی یا نہیں؟ اور قسم اول کے گواہ مقبول ہیں یا قسم دوم کے؟ اور زید مدعی کے غیر حضوری میں اگر گواہ گذارے وہ گواہ مقبول ہیں یا نہیں؟ جواب با ادلہ مع حوالہ کتب تحریر فرمائیں۔ فقط

الجواب

دوسری قسم کے گواہ چونکہ طلاق کے وقت مطلّق کے سامنے نہیں تھے، اس لئے ان کی شہادت ان گواہوں کی شہادت کے معارض نہیں ہوسکتی، جو اس گفتگو کے وقت مطلق کے سامنے موجود تھے۔ خصوصاً جبکہ گواہ قسم دوم کی شہادت میں اختلاف واقع ہو چکا ہے کہ اوّل وہ شاہدان قسم اول کے موافق شہادت دے چکے ہیں، بعد میں شہادت کو بدلا ہے۔ فان الاختلاف یبطل الشہادت، والسامع من وراء الجدار لیس کالمعائن المشاهد، کما هو ظاهر من کلام القضاء فی باب الشهادة۔

قال فی الهندیة: ولو سمع من وراء الحجاب لایسعه أن یشهد لاحتمال أن یکون غیره۔

إذا النغمة تشبه النغمة، إلا إذا کان فی الداخل وحده، ودخل، وعلم الشاهد أنه لیس فیه غیره، ثم جلس علی المسلك، ولیس له مسلك غیره فسمع اقرار الداخل، ولا یراه لأنه یحصل به العلم وینبغی للقاضی إذا فسرله أن یقبله، کذا فی التبیین اھ (ج ۴ ص ۲۳۵)

پس صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق نہیں ہوئی اگر سوال واقع کے بالکل مطابق ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
اشرف علی	از تھانہ بھون
۲۸ رجمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ	۲۸ رجمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ

بے نمازی کی شہادت کا حکم

سوال:- نکاح طلاق وغیرہ معاملات میں جو گواہ ہوتے ہیں اکثر دیہاتی لوگ بے نمازی ہوتے ہیں ایسی

صورت میں مدعی، مدعی علیہ، شاہد سب ایک، جیسے بے نمازی ہوتے ہیں کیا ایسی حالت میں امام صاحبؒ کے قول پر عمل کر کے ظاہری اسلام دیکھ کر جو حکم ہو ایسے شاہدوں کی شہادت قبول کر کے فیصلہ کرے تو حَکَم گنہگار تو نہ ہوگا؟ کیونکہ یہ عذر بھی ضروری ہے کہ جو شرائط عدالت کی ہیں اب وہ بالکل مفقود ہیں۔

اور مدعی مدعی علیہ میں سے شاہدوں پر عدالت کا جرح بھی خود کوئی نہیں کرتا، اگر شہادت سنی جائے تو تضییع حق ضرور ہے۔

سائل: بندہ فخر الدین گھوٹکی ضلع سکھر، سندھ

الجواب

امام صاحبؒ اور صاحبینؒ میں اس بارے میں کچھ اختلاف نہیں، اور ان کے قول کا اختلاف زمانہ کے اختلاف پر مبنی ہے، پس حَکَم پر لازم ہے کہ شاہدین کی عدالت کی تحقیق کرے، اگر عادل شرعی نہ ہو، دعوی رد کرے، اور جس دعوی پر شاہدین عدلین کی شہادت نہیں وہ دعوی ثابت ہی نہیں۔ نہ حق ثابت ہے۔ پھر تضییع حق کہاں ہے۔ والذی قلتہ ذکرہ فی الدر والشامی ج ۴ ص ۵۷۷۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۴ رشعبان ۴۷ھ

حَکَم اپنے علم پر شہادت رد کر سکتا ہے

سوال: چونکہ جہل عام ہے، مدعی مدعی علیہ سے شاہدوں پر عدالت کی جرح کوئی نہیں کرتا، مگر بعض وقت شاہد حَکَم کا شناخت والا ہوتا ہے۔ اور حَکَم جانتا ہے کہ یہ شاہد بے نمازی اور دیگر فسق میں مبتلا ہے۔ تو ایسی حالت میں جب مدعی علیہ کوئی جرح نہ کرے، تو حَکَم اپنے علم پر اس کی شہادت رد کرے یا نہ؟ سائل بالا .....

الجواب

ضرور رد کرے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۴ رشعبان ۱۳۴۷ھ

حقدار کو حق ملنے کے بعد مدعیٰ علیہ کو سزا سے بچانے کے لئے جھوٹی گواہی دینا جائز ہے یا نہیں؟

سوال :۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ، بخدمت جناب حضرت پیر یم مرشد یم صاحب مدّ فیضہ۔ بندہ کی عرض یہ ہے کہ ذیل کا استفتاء پیش خدمت ہے جواب سے سرفراز فرمائیں۔

استفتاء

یہاں تعزیرات ہند کے بعض دفعات ایسے ہیں کہ ان میں اگر فریقین صلح کرنا چاہیں، تو صلح منظور نہیں ہوتی، جیسا سرقہ وغیرہ۔ جب فریقین صلح آپس میں کرتے ہیں تو حقدار کو حق ادا کر کے پھر جو شاہد ہوتے ہیں وہ اپنے بیانات گواہی میں کم و بیش کرتے ہیں، تب وہ مقدمہ کم ثبوت پر خارج ہو جاتا ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے موقع پر جب حقدار کو حق پہنچ جائے، اور وہ بھی راضی ہو، تو اگر شاہد مجرم کو بچانے کے لئے جھوٹ بولے تو گنہگار ہو گا یا نہ؟ اور یہاں عدالتوں میں گواہی لینے کے وقت کلمہ شریف پڑھا کر یا یہ لفظ "خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو کہوں گا سچ کہوں گا" کہلوا کر بیانات لیتے ہیں، تو شاہد مجرم کو جبکہ حق ادا کیا ہو، اور حقدار بھی راضی ہو سزا سے بچانے کے واسطے کلمہ شریف یا "حاضر و ناظر جان کر" کے الفاظ کہہ کر جھوٹ کا اظہار کرے کہ مجرم نے یہ کام نہیں کیا، یا میرے سامنے اقرار نہیں کیا، تو گناہ یا کفارہ قسم کا ہو گا یا نہ؟ زیادہ طالب دعا ہوں، خاتمہ ایمان کی دعا فرمائیں۔

سائل بالا۔۔۔۔

الجواب

صریح جواب نظر سے نہیں گذرا، قواعد کلیہ سے جواب لکھا جاتا ہے، دوسرے علماء سے بھی مراجعت مناسب ہے۔ اوّل، دوّم، مقدمے محفوظ کر لئے جائیں۔

(۱) حدود جب حکّام تک پہنچ جائیں تو اب ان کے اسقاط میں سعی کرنا جائز نہیں۔

(۲) جن ممالک میں اجراء حدود نہ ہو، وہاں جو سزا بھی مقرر ہو، وہ حدود کے قائم مقام ہے۔

ان قواعد کا مقتضا یہ ہے کہ:۔ چوری، زنا، شراب خوری، قذف محض کے مقدمات جب حکام تک پہنچ جائیں، تو اب گواہوں کو جھوٹی گواہی نہ دینی چاہئے، بلکہ سچی گواہی دیں ورنہ گناہ کا خطرہ ہے۔ اور حدود کے سوا دیگر مقامات میں جب فریقین میں مصالحت ہو جائے،

اور حقدار کو حق پہنچ جائے، تو شاہد کو توریہ کے ساتھ اس طرح گواہی دینا کہ مدعی علیہ سزا وغیرہ سے بچ جائے، جائز بلکہ مستحب ہے۔ مگر صریح جھوٹ سے حتی الامکان احتراز کریں، بلکہ توریہ کے ساتھ گول مول اظہار کردیں، جو نہ جھوٹ صریح ہو نہ صدق صریح، فان الکذب لایجوز صریحًا إلا فی مواضع مخصوصة، ولیس ذلك منها،

واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفاعنہ

از تھانہ بھون

۱۳؍ رمضان ۱۳۴۷ھ

بازار میں چلتے پھرتے کھانے سے مطلقًا عدالت ساقط ہوجاتی ہے یا اس میں تفصیل ہے؟

سوال: اور جو مسئلہ مشہور ہے کہ جو شخص بازار میں چلتا پھرتا کھائے اس کی شہادت نامقبول ہے، کیا یہ تمام اشیاء میں کلیةً حکم ہے؟ یا بعض اس سے مستثنیٰ ہیں؟ یعنی پان اور شیرینی وغیرہ جو آجکل بازاروں میں کھائی جاتی ہیں مفصل تحریر فرمائیں کہ کون سی چیز مستثنیٰ ہے؟ اور چونکہ چہ می گوئیاں اور تشکیک بہت ہوچکی ہے۔ اس لئے اگر دونوں مسئلہ مع حدیث شریف اور اقوال مجتہدین ہوں تو بہتر ہے۔

از سائل عبد الرحمٰن

مدرسہ قاسم العلوم، دروازہ شیرانوالہ

مسجد لائن والی، لاہور

الجواب

قال الشامی: إذا شرب الماء، أو أکل الفواکه علی الطریق لایقدح فی عدالته، لأن الناس لاتستقبح ذلك فتح۔ اھ (ج ۴ ص ۵۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ راستہ میں ایسی چیز کے کھانے سے عدالت ساقط ہوجاتی ہے جس کا راستہ میں کھانا عام طور پر عرف میں معیوب شمار ہوتا ہے۔ اور جس چیز کا راستہ میں کھانا عرفًا معیوب نہیں، اس کے کھانے سے عدالت ساقط نہیں ہوتی، ہمارے عرف میں راستہ میں پان کھانا معیوب نہیں، مٹھائی کھانا معیوب ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

۲۰ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ

طلاق کی ایک صورت میں تحمل شہادت کی بحث

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین کہ میرا شوہر مسمّٰی عبدالرشید خان ولد عبدالقادر خان اس وقت کہ میں اپنے والد مسمّٰی حافظ عبداللطیف خان صاحب کے مکان پر تھی آیا، اور کہا کہ تم چلو! میں نے جواب دیا کہ میں ابھی نہیں چلوں گی ماسٹر صاحب منع کر گئے ہیں۔ اس پر میرا شوہر عبدالرشید خان برافروختہ ہوا کہ جب تو میرے کہنے کی نہیں ہے تو میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں، اور میرے والد صاحب سے کہا کہ جاؤ! دو چار آدمیوں کو باہر سے بلا لاؤ، میں ان کے سامنے طلاق دے دوں گا، اس پر میرے والد صاحب باہر گئے، اور چار شخص محمد یعقوب صاحب، محمد یوسف صاحب، محمد اسماعیل صاحب، محمد عبدالحمید خان کو باہر سے بلا لائے، ان چار شخصوں کے اور میرے والد کی موجودگی میں میرے شوہر نے مجھ کو تین طلاقیں دیں۔ ان چار گواہوں میں دو محمد اسماعیل خان و عبدالحمید خان ایسے ہیں جن سے میرا پردہ نہیں ہے، اگرچہ اس وقت میں ان کے سامنے نہیں تھی، بلکہ آڑ میں تھی، اور میرے شوہر کا خطاب میری ہی طرف تھا، اس لئے کہ پہلے سے مجھ ہی سے مخاطب تھا اور نہ سوائے میرے اس کی کوئی منکوحہ ہے۔ اس طلاق کی تصدیق جب محکمہ مجاز میں کرائی گئی اور حاکم نے گواہان کو طلب فرمایا، اور ان کے جو بیانات جن کی نقل مطابق اصل اور بعض سوالات جو ان سے کئے جاتے تھے انہوں نے جواب دیا وہ سب منسلک استفتاء ہٰذا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ۔ صورت مذکورہ میں طلاق ہوئی ہے یا نہیں؟ اور ہوئی تو کون سی ہوئی؟ اور ان بیانات شاہدوں پر ثبوت طلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

فقط

المستفتیہ: عائشہ بی بی بنت عبداللطیف خان

بھوپال

الجواب

صورت مسئولہ میں دیانۃً تو تین طلاق واقع ہو چکی ، اس واسطے عورت کو ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کے پاس جائے۔ البتہ حاکم کے پاس ثابت کرنے کے لئے شہادت کی ضرورت ہے، اس لئے شہادت کے معتبر ہونے یا نہ ہونے پر بحث کی ضرورت ہے اور اس واسطے سوال میں اس امر کا اضافہ ضروری ہے کہ والد لڑکی کا جب شاہدوں کو بلا کر مکان پر لے آیا۔

(۱) تب والد نے لڑکی کو دیکھا تھا، یا وہ بھی دوسرے مردوں کے ہمراہ پردہ سے باہر تھا؟

(۲) ونیز یہ بھی لکھیں کہ والد نے اس وقت یعنی جب مکان میں گواہوں کو بلا کر جا چکا تھا یہ بھی کہا تھا یا نہیں کہ میری لڑکی یہاں موجود ہے، اور اس سے خطاب ہو رہا ہے۔ (بلاتے وقت مکان سے باہر جو کہا تھا اس کے متعلق سوال نہیں ہے)

(۳) اور کیا اس وقت سوا عائشہ اور عبدالرشید کے اور کوئی عورت وغیرہ بھی مکان میں تھی۔

(۴) اور کیا اس مکان کا دروازہ باہر آمد و رفت کے لئے ایک ہی ہے یا متعدد؟

ان چاروں نمبروں کا جواب مفصل آنے پر اس شہادت کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا حکم شرعی لکھا جائے گا۔ علاوہ ازیں ایک یہ بات بھی لکھی جائے کہ وہ حاکم جس کی عدالت میں مقدمہ پیش ہے وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم؟

فقط والسلام

احقر عبدالکریم عفی عنہ۔ از خانقاہ امدادیہ

تھانہ بھون

مورخہ ۵ جمادی الثانیہ ۱۳۵۰ھ

جواب سوال نمبر ۱: گواہوں کو جب بلا کر لایا، تو میں لڑکی کو دیکھتا تھا، وہ میرے نظر کے سامنے تھی، اگرچہ دو گواہوں سے لڑکی کا پردہ پہلے سے نہ تھا، لیکن لڑکی اس وقت پردہ کی آڑ میں تھی۔

جواب سوال نمبر ۲ ــــ میں نے گواہوں کو اندر لا کر یہ الفاظ کہا تھا، کہ میری لڑکی کو اس کا شوہر طلاق دیتا ہے، تم سن لو، لڑکی اس جگہ کواڑ کے آڑ میں موجود تھی، اور ایک کواڑ کھلا ہوا تھا

اور یہ صورت سے بند تھا، اور اسی کواڑ کے آڑ میں لڑکی کھڑی ہوئی تھی، اور بات چیت بھی کر رہی تھی، اور میں لڑکی عائشہ کو دیکھ رہا تھا، اور گواہوں اور شوہر سے لڑکی کی موجودگی دو ڈیڑھ ہاتھ کا فاصلہ تھا، اس لئے کہ مکان مختصر ہے۔

جواب سوال نمبر ۳ — عائشہ کے پاس سوائے اس کی حقیقی ماں کے اور کوئی عورت و مرد نہ تھا۔

جواب سوال نمبر ۴ — دروازہ مکان کا ایک ہی ہے دوسرا دروازہ یا کھڑکی وغیرہ نہیں ہے، مکان کے اندر اس ایک ہی دروازہ سے باہر کا آدمی داخل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی دوسری صورت داخلہ کی نہیں ہے۔

جواب سوال نمبر ۵ — حاکم عدالت مسلمان اور حال ہی میں فرماں روائے بھوپال نے جدید قانون نافذ کیا ہے، کہ شرعی مقدمات کا بلا فتوی مفتی صاحب ریاست و اراکین مجلس علماء کے علاوہ اپنی رائے سے کوئی فیصلہ مسلمانوں کا نہ کرے، مثل کا محکمۂ افتاء میں جانا ضروری ہے مفتی صاحب حال بھوپال قاضی صاحب مرحوم کے حیات میں نائب مفتی تھے وہی مفتی مقرر ہوئے ہیں، ان مفتی صاحب نے دیانۃً فتوی دیا تھا، کہ طلاق مغلظہ واقع ہوگئی ہے، اب بھی عدالت سے مثل انھیں مفتی صاحب کے پاس جائے گی۔ فقط

خاکسار، عبداللطیف پدر
مسماۃ عائشہ۔

الجواب

اختلف المشايخ في تحمل الشهادة على المرأة كانت متنقبة، بعض مشايخنا قالوا: لا يصح التحمل عليها بدون رؤية وجهها، وبعض مشايخنا توسعوا في هذا، وقالوا يصح عند التعريف، وتعريف الواحد يكفي، والمثنّى أحوط، وإلى مال الشيخ الإمام المعروف بخواهر زاده، وإلى القول الاول مال الشيخ الامام الأوزجندي، والشيخ الإمام ظهير الدين وضرب من المعقول يدل على هذا الخ عالمگيرية (ج ۴ ص ۳۵)

وفيه أيضاً في الصفحة الانية، ويصح تعريف من لا يصلح شاهداً لها، سواء كان الإشهاد لها أو عليها، ومن المشايخ من قال: إن كان

الاشهاد لها، لا يصح التعريف ممن لا يصلح شاهداً لها، ولختار نجم الدين النسفي القول الأول، كذا في الفصول العمادية، اھ

اس سے معلوم ہوا کہ پردہ نشین عورت کے متعلق اگر ایک شخص یہ بیان کرے کہ وہ یہاں موجود ہے، اور اس سے یہ خطاب کیا جارہا ہے، یا وہ یہ بات کہہ رہی ہے جو تم سن رہے ہو، تو اس صورت میں سننے والوں کی گواہی معتبر ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے، بعض مشائخ نے اس کو معتبر رکھا ہے۔ اور اس واقعہ میں حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی بھی فرماتے ہیں کہ شہادت قبول کرنا چاہئے، کیونکہ جن مشائخ نے تعریف واحد کو کافی نہیں سمجھا، اس کی بناء یہ ہے کہ شاید یہ شخص غلط کہتا ہو اور اس واقعہ میں سے الفاظ طلاق تو خود شاہدوں نے سنے ہیں، اور زوجہ کے والد نے شاہدوں سے یہ کہا ہے کہ یہ میری لڑکی کو طلاق دے رہا ہے۔ اگر خسر کا یہ قول غلط ہوتا تو داماد رد کر دیتا، اس کے سکوت سے اس کی صاف تائید ہوتی ہے کہ خسر کا قول صحیح ہے۔ اور شہادت اس واقعہ میں معتبر رہنا چاہیئے، پس حاکم کو اس صورت میں ان مشائخ کا قول لینا بہتر ہے جو تعریف واحد کو کافی کہتے ہیں۔ لہٰذا صورت مسئلہ میں حاکم کو شہادت تسلیم کرکے طلاق کا فیصلہ کر دینا چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۵ رجب ۱۳۵۰ھ

طلاق میں گواہوں کا عادل ہونا شرط ہے

سوال: ایک شخص اقرار کرتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو اس طرح طلاق دی کہ ایک طلاق، دو طلاق مگر دو گواہ شہادت دیتے ہیں کہ اس نے یوں کہا تھا "ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق، بائن دی مگر گواہ عادل نہیں، یعنی پابند صوم وصلوٰۃ نہیں۔ اب اگر ہم ان کو غیر معتبر جان کر دو طلاق کا حکم دیتے ہیں، تو اس زمانہ میں کوئی کام شریعت کے موافق ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ دنیا میں ایک طرح سب فاسق ہیں الاماشاء اللہ، پھر مدعی ماشاءاللہ گواہوں سے زیادہ فاسق ہے۔

راقم: فدوی کفیل الدین
مقام اسلام آباد، ضلع تیرہ

الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ گواہ عادل نہیں، اس لئے ان گواہوں کی شہادت سے تین طلاق کا حکم نہیں دیا جا سکتا، بلکہ صرف دو طلاق رجعی واقع ہوئی ہیں اور جب لوگوں نے شریعت کی پابندی چھوڑ دی تو وہ خود چاہتے ہیں کہ شریعت کے موافق ہمارا کوئی معاملہ ثابت نہ ہو، اور جس دن وہ شریعت کے موافق اپنے معاملات کو ثابت کرنا چاہیں گے۔ خود بھی پابندی کریں گے، اور دوسروں سے بھی کرائیں گے۔ اور مدعی کا عادل ہونا شرط نہیں، مدعی تو کافر بھی ہوتا تو کیا؟ عدالت تو شہود میں شرط ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ۔ از تھانہ بھون

۱۳/ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ

كتاب القصاص والديات

مجنون اگر اپنی بیوی کو قتل کر دے؟

سوال:۔ ایک شخص مجنون حالت میں اپنی بیوی کو رات کے وقت نیند میں کڑتالی جس سے لکڑی چیرائی جاتی ہے سر پر مار کر قتل کر ڈالا، گواہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سر پر کڑہالی مار کر پاؤں سے خوب روندا جس کی وجہ سے عورت مر گئی، ابھی اس پر غسل دینا چاہیئے یا نہ؟ اور کیوں؟ خلاصہ تحریر فرمائیں؟

الجواب

قال فی نور الأنوار: والجنون، وتسقط به العبادات المحتملة للسقوط، لاضمان المتلفات ونفقة الاقارب والدية، كما فی الصبی بعینه، لکنه إذا یمتد لحق بالنوم اهـ

وهٰذا فی الجنون العارضی، بأن بلغ عاقلاً ثم جن، وأما فی الجنون الأصلی، بأن بلغ مجنوناً، فعند أبی یوسفؒ هو بمنزلة السباع اھ ص ۲۸۸

وفی الاشباہ فی أحکام الصغار، ولا قصاص علیہ وعمدہ خطاء اھ ص ۳۲۷

وفی عالمگیریة فی تعریف الشھید، اوقتلہ مسلم ظلماً ولم تجب بہ الدیة اھ ج ۱ ص ۱۰۸ ۔

صورت مسئولہ میں اگر زوج قاتل کا جنون ممتد ہے تو وہ نابالغ بچہ کے حکم میں ہے، اور نابالغ کے قتل سے قصاص واجب نہیں ہوتا، صرف دیت واجب ہوتی ہے، لہٰذا عورت شہید کے احکام قرار نہ پائے گی، اور اس کو غسل دیا جائے گا اور زوج اس کے میراث سے بھی محروم نہ ہوگا، جیسا کہ صبی اپنی مورث کو قتل کرکے میراث سے محروم نہیں ہوتا۔

قال فی نور الأنوار: فلا یحرم عن المیراث بالقتل عندنا یعنی لو قتل الصبی مورثہ عمداً أو خطاءً لا یحرم عن میراثہ لأنہ عقوبة وعھدة لا یستحقھا الصبی اھ ص ۲۸۸

اور اگر جنون غیر ممتد ہے تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۲ رشوال ۱۳۴۱ھ

کتاب الحدود و التعزیرات

حاکم کیلئے شخص متہم کو سزا دینا جائز ہے

سوال :- ایک آدمی نے رات کے وقت بذریعہ نقب زنی ایک مکان سے لیمپ، کپڑے اور دیگر اشیاء چرائی علی الصبح مالک کو مکان میں داخل ہونے پر مکان میں سوراخ معلوم ہوا اور مال عدم موجود پایا نقبہ کے پاس دو آدمی کے پاؤں تازہ معلوم ہوئے تھے دو تین آدمیوں نے پاؤں کے نشانات کا پیچھا کیا اور ایک گھر تک نشانات گئے اوس گھر کے ملحق ایک پٹوار خانہ جو کہ اوس گھر والے کے بھائی نے سرکار پر فروخت کیا تھا جسمیں پٹواری بوجہ خطرہ کے نہیں رہتا، اوس گھر والے اپنا بھوسہ وغیرہ اس میں رکھا کرتے ہیں، اس پٹوار خانہ کی تلاش پر بھوسہ میں مال مسروقہ سے گھی کا ایک برتن ملا، گواہان میں سے ایک معتبر گواہ نے ملحقہ گھر والے کو ڈانٹا اور کہا کہ اب تو چوری تم پر ثابت ہو گئی دیگر مال بتاؤ جو دو تین گواہان کے سامنے اسی کوٹھے کے بھوسہ میں سے دیگر مال مشتبہ نکال دیا اور کہا میں نے اور میرے بھائی نے یہ مال چرایا تھا مگر سرکار کو حالت مت کہو۔ اب ایک بھائی تو بھاگ کر سرکاری علاقہ سے باہر چلا گیا دوسرا عدالت میں اس بیان سے منکر ہے جو اس نے گواہان کے سامنے دیا تھا. گواہان اس امر میں متفق البیان ہیں کہ ملزم نے انکے سامنے جرم سے اقبال کیا، بلکہ مال بھی خود نکالا۔ مگر دیگر بیانات میں گواہان کا اکثر اختلاف ہے، ایک گواہ کہتا ہے کہ نقب کی جگہ سے بقدرے فاصلہ تک نشانات قدموں کے اوپر ان کو محفوظ رکھنے کی خاطر ان پر برتن رکھے گئے تھے تاکہ تفتیش میں دقت نہ ہو، دوسرا کہتا ہے کہ ملزم کے گھر تک ان نشانات پر برتن رکھے گئے تھے۔ اس مؤخر الذکر بیان والے دو گواہان ہیں۔ اب بعض گواہان تو کہتے ہیں کہ ملزم کے گھر تک تو وہی نشانات آتے ہیں مگر پٹوار خانہ کے صحن میں بھاری کے ساتھ نشانات مٹائے گئے ہیں مگر پولیس کا سپاہی جو کہ نشانات پاؤں کی شناخت کیلئے سرکار سے مقرر کیا ہے اور اس فن میں ماہر ہے کہتا ہے کہ پٹوار خانہ

کے صحن میں بھی نشانات پاؤں موجود تھے اور ملزم کے پاؤں کے مشابہ پاؤں ہے اور بہاری سے وہ نشانات بالکل نہیں مٹائے گئے سرکار کا قانون تو کہتا ہے کہ اگر ایک گواہ کے بیان پر بھی عدالت کو تسلی آجاوے تو سزا دیجاوے اور اگر بیان متضاد ہوں تو بھی ملزمان کو چھوڑنا نہ چاہیئے۔ اب شرع ایسے ملزم کیلئے کیا حکم دیگی۔

الجواب

صورت مذکورہ میں اگر حاکم کے نزدیک مدعی علیہ متہم معلوم ہو تو اس کو سزائے قید دینا اور زدوکوب کرنا جائز ہے جتنی مدت کی قید بھی اسکے نزدیک مناسب ہو۔ قال فی الدر للقاضی تعزیر المتھم۔ وفی رد المحتار: و فی ھذا التصریح بان ضرب المتھم بسرقة من السیاسة وفی الدر ناقلاً عن العینی عن ابی یوسف ومن یتھم بالقتل والسرقة وضرب الناس احبه واخلده فی السجن الخ صفحہ ۲۹۱ ج ۳۔ اور متہم ہونیکی صورت ایک تو یہ ہے کہ وہ شخص ارتکاب جرائم میں مشہور ہو، دوسری یہ کہ ایک نیک شخص یا دو مجہول الحال آدمی گواہی دیں جنکی گواہی سے حاکم کو مدعی علیہ کا متہم ہونا معلوم ہو جائے لیکن اس صورت میں مدعی علیہ کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ دعوے قتل میں دو عادل مسلمانوں کی شہادت قاتل مسلم میں شرط ہے اور قاتل کافر میں دو کافر گواہ بھی کافی ہیں اور نہ اس پر جرمانہ مالی کیا جاسکتا ہے لیکن اگر قانوناً جرمانہ کرنا ضروری ہو تو جرمانہ بھی کرسکتے ہیں کیونکہ بعض آئمہ نے جرمانہ کو جائز کہا ہے

جرمانۂ مدارس بر طلبۂ غیر حاضر سوال :۔ یہاں کے مدرسہ کا ایک قانون یہ ہے کہ طلبہ کی غیر حاضری پر فی روز دو پیسہ جرمانہ لیا جاتا ہے نیز اُن پر جو فیس مقرر ہے اسکی ادائیگی کی تاریخ معینہ سے دیر ہونے سے فی روز دو جُرمانہ ہے یہ جرمانہ لینا جائز ہے یا نہیں اور اگر انہیں پیسوں کو کسی مدرس کی تنخواہ میں دیا جاوے تو اس مدرس کو لینا جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

حنفیہ کے نزدیک غرامۂ مالیہ جائز نہیں، پس اگر مدرسہ مسلمانوں کا ہے تو ایسے جرمانہ سے مدرس کو تنخواہ لینا درست نہیں اور گورنمنٹ کا ہے تو بوجہ

استیلاء کے درست ہے واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۵ ، محرم ۴۵ھ

اس شخص پر تعزیر کا حکم جس پر عورت نے زنا کی تہمت لگائی ہو اور مرد منکر ہو۔	شخصے بازنے منکوحہ زنا کردہ، بعد ازاں زن میگوید کہ فلان بامن زنا کردہ

است لیکن آں شخص انکار میکند دریں صورت اورا سیاسۃً ہیچ سزا دادن شرعاً چہ حکم دارد۔

الجواب

محض عورت کے کہنے سے مرد پر سیاسۃً تعزیر نہیں ہوسکتی بلکہ اگر قاضی کی رائے میں قرائن اُخر سے وہ متہم کے درجہ میں ہو جاتے تو تعزیراً کچھ سزا دی جاسکتی ہے مگر قاضی آجکل کہاں، البتہ بعض قوموں میں پنچایت کا زور ہوتا ہے تو پنچایت اس بارہ میں بمنزلۂ قاضی کے ہے اگر وہ مسائل شرعیہ سے باخبر ہوں یا کسی عالم سے پوچھکر عمل کرتے ہوں واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

البتہ صورت مسئولہ میں عورت اگر دعوے اکراہ کا نہ کرے تو عورت یقیناً مستحق عقوبت ہے۔ اگر حاکم اسلام کے روبرو ہو تو وہ عقوبت حد زنا ہے بشرائطہا اور اگر غیر حاکم کے روبرو ہو تو حدود شرعیہ کے اندر جس قدر تعزیر اسکے قدرت میں ہو۔

اشرف علی

حکم تعزیر بالمال	چہ میفرمایند علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ

جرمانۂ مال شرعاً جائز است یا نہ مثلاً سرداران بستی اگر کسی را قسمے خطا وقصور می بینند چنانچہ شخصے کسے را سب وشتم یا دیگر ہیچ حرکت ناشائستہ کند پس اورا باتفاق سرداران محلہ سیاسۃً چند روپیہ جرمانہ میکنند یا اگر شخصے مال یا چیز کسے نقصان کند دران نیز بصورت ادائے جرمانہ می سازند آیا این چنین جرمانہ از قرآن

وحدیث و نیز ائمہ اربعہ ثابت است یا نہ. و آن رقم و روپیہ راچہ باید کرد و آن را مستحق کدام کس اند اگر آن رقم ها بنزد یکے از سرداران اوشان جمع داشتہ بامور متفقہ ہمہ مردمان بوقتِ ضرورت صرف نمایند آنرا چہ حکم است آیا جائز است یا نہ بحوالہ کتب تفصل وار ہمہ حکم را جواب تحریر فرمایند۔

الجواب

جرمانۂ مالی مذہب حنفی میں جائز نہیں ہے۔ قال فی الدر فی باب التعزیر لا بأخذ مال فی المذھب اھ و قال الشامی و شرح معانی الآثار (للطحاوی) التعزیر بالمال کان فی ابتداء الإسلام ثم نسخ اھ (ص۲۷۵ ج ۳) باقی دیگر ائمہ کا مذہب بیان کرنا ہمارے ذمہ لازم نہیں۔ نہ دلائل حدیث قرآن بیان کرنا لازم ہے۔ کیونکہ یہ وظیفہ مجتہد ہے اور ہم مقلد ہیں۔ فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

مرتد اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے احکام

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل مفصلہ ذیل میں۔ زید پیدائشی ہندو تھا بالغ ہو کر علی الاعلان مسلمان ہو گیا مگر بی بی بچے اسکے ہندو رہے، اب چار پانچ سال ہوئے کہ زید نے علانیہ بودھ مذہب اختیار کر لیا ہے اور اپنے دروازے پر بودھ کی مورت بھی نصب کر لی ہے اپنے آپ کو بدھ کھتری مشہور بھی کرتا ہے مگر ہر سال مولود شریف اور مسلمانوں کی دعوت بھی کرتا ہے اس طور پر کہ ایک مسلمان مثلاً بکر کو نقد روپیہ دیتا ہے اور بکر محفل میلاد اور دعوت کا انتظام کرتا ہے، بعض مسلمان اسکو مرتد سمجھتے ہیں اور اسکے کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں اور بعض مسلمان کہتے ہیں کہ وہ مصلحتاً اپنے تئیں بودھ کہتا ہے درحقیقت وہ مسلمان ہے۔ نماز پڑھتا ہے روزے رکھتا ہے، مولود شریف کرتا ہے، مسلمانوں کی دعوت علانیہ کرتا ہے، جسکا جی چاہے خلوت میں پوچھ لے زید اپنے مسلمان ہونیکا اقرار کریگا ہاں اپنے برادری کے لوگوں میں اپنے تئیں بودھ بھی کہتا ہے، لہذا علمائے دین و حاملان شریعت غرائے محمدی صلی اللہ علیہ وسلم (۱) زید کے حق میں کیا فرماتے ہیں (۲) بکر کے حق میں کیا فرماتے ہیں

(۳) ان مسلمانوں کے حق میں کیا فرماتے ہیں جو زید کو ایسی صورت میں مسلمان سمجھتے اور کہتے ہیں (۴) ان مسلمانوں کے حق میں جو زید کو مرتد جان کر اسکی دعوت میں شرکت نہیں کرتے (۵) ان مسلمانوں کے حق میں جو کہتے ہیں کہ زید اگر مسلمان نہ ہوتا تو سو روپئے کی رقم مولود شریف اور دعوت کیلئے کیوں دیتا (۶) ان لوگوں کے حق میں جو کہتے ہیں کہ زید ہے تو درحقیقت مسلمان مگر چند مصلحتوں سے اپنے آپکو بودھ کہتا ہے، زید کے ساتھ مسلمانوں کو اخلاق برتنا چاہیئے ممکن ہے کہ وہ اخلاق وارتباط واختلاط باہمی کی وجہ سے پھر مسلمان ہو جائے اگر اخلاق نہ برتا گیا اور نفرت کا اظہار کیا گیا تو اسکا رہا سہا اعتقاد بھی جاتا رہیگا وہ بالکل کافر ہو جائیگا اور جو رقم وہ مولود شریف میں صرف کرتا ہے کفر کے کاموں میں صرف کریگا، جو مسلمانوں کو کھلاتا ہے وہ کفار کو کھلائیگا۔ اسلام کیطرف سے ان سوالات کا کیا جواب دیا جاتا ہے (۷) ان لوگوں کے حق میں جو دعوت میں شرکت کریں (۸) ان لوگوں کے حق میں جو زید کی دعوت کا انتظام زید کی خوشنودی کیلئے بلا اجرت یا اجرت لیکر کریں (۹) ان لوگوں کے حق میں جو بکر کی رعایت اور خوشنودی کیلئے زید کی محفل کا انتظام کریں (۱۰) ان حضرات کے حق میں جو زید کی محفل میں وعظ کہیں یا مولود شریف پڑھیں (۱۱) ان حضرات کے حق میں جو محفل وعظ اور محفل مولود میں زید یا بکر کے ہاں شریک ہوں (۱۲) ان لوگوں کے حق میں جو شرکت نہ کرنیوالوں کو بھلا برا کہیں اور طعن کریں (۱۳) اس شخص کے حق میں جو مسلمانوں کو دھوکہ دیکر زید کا کھانا کھلائے اور دعوت کا اظہار اپنی طرف سے کرے (۱۴) ان لوگوں کے حق میں جنھوں نے زید کی بیوی کی لاش کی مشایعت کی اس کو لاش جلاتے دیکھا (۱۵) اس شخص کے حق میں جو علانیہ اپنے تئیں کافر کہے اور پوشیدہ مسلمان ہو (۱۶) اس شخص کے حق میں جو اسلام کو حق کہے اور دوسرے مذہب مثلاً بودھ مذہب کو بھی حق کہے (۱۷) کافر اور مرتد کے احکام میں کیا فرق ہے۔ بینوا و توجروا من عند اللہ العلی العظیم۔

بصد احترام التجا آنکہ جوابات مسکت و مدلل ہوں تاکہ پھر کسی شبہ وسوال کی گنجائش نہ ہے

الجواب

(۱) زید مرتد ہے اگر اسلامی حکومت ہوتی تو اسکو تبلیغ اسلام کی جاتی اگر علانیہ

اپنے کو مسلمان نہ کہتا تو قتل کر دیا جاتا (۲) اگر بکر کو زید کی خفیہ حالت سے اس کا مسلمان ہونا اور اپنے کو مسلمان کہنا اور نماز پڑھنا وغیرہ معلوم ہے تو اسکو زید کے ساتھ اس نیت سے کہ شاید پھر مسلمان علانیہ ہو جائے اخلاقی برتاؤ جائز ہوگا کما فی التاریخ عن بعض الصحابۃ، أنھم تلاقوا بالحبلۃ بعد ردتہ ونصحوہ ووعظوہ وقبلوا إکرامہ وجوائزہ (۳) جن مسلمانوں کو زید کی خفیہ حالت سے یہ تحقیق ہو گئی ہو کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے ان کو اس کے ساتھ اخلاقی برتاؤ تو جائز ہے مگر مسلمان سمجھنا جائز نہیں جب تک کہ وہ اسلام کا اعلان اس طرح نہ کرے جس طرح اس نے اپنے ردت کا اعلان کیا ہے (۴) زید حقیقت میں بحکم شرع مرتد ہی ہے لہٰذا جن لوگوں کو اس سے اختلاط کرنے میں امید اصلاح نہ ہو ان کو اس سے کنارہ کشی کر لینا اور میل جول ترک کر دینا ضروری ہے (۵) محض مولود شریف کرانا اور دعوت مسلمین کرنا اسلام کی دلیل نہیں بعض ہندو بھی اپنے مسلمان دوستوں کی خاطر مولود کرا لیتے ہیں (۶) جن لوگوں کو زید کی اندرونی حالت معلوم ہو انکو اسکی اصلاح کی غرض سے اس سے اختلاط وغیرہ جائز ہے اور اگر محض طمع دنیا اس کا سبب ہے تو ناجائز ہے (۷) اگر دعوت کا انتظام کوئی مسلمان کرتا ہو اور وہ مسلمان ہی داعی ہو تو قبول دعوت کا مضائقہ نہیں گو اسمیں روپیہ مرتد ہی کا لگتا ہو اور اگر وہ مرتد خود داعی ہو تو عام مسلمانوں کو اسکی دعوت قبول نہ کرنا چاہیئے ہاں جن کو اسکی اندرونی حالت سے اسلام کی طرف میلان ظاہر ہوتا ہو اور ان کے اختلاط سے اسکی اصلاح متوقع ہو ان کو گنجائش ہے (۸) اسکا جواب بھی مثل ۷ ہے (۹) اگر اس محفل کے انتظام سے زید کی اصلاح کی اُمید ہو تو مضائقہ نہیں (۱۰) اسکا جواب بھی مثل ۹ ہے (۱۱) جن کو زید کا میلان الی الاسلام معلوم ہو ان کو شرکت جائز ہے اور جن کو معلوم نہ ہو ان کو مناسب نہیں (۱۲) ان کو بلا وجہ طعن کی وجہ سے گناہ ہو گا کیونکہ جس شخص کو مرتد کا میلان الی الاسلام معلوم نہ ہو اس کے ذمہ اس کے ساتھ مرتدین کا سا برتاؤ لازم ہے (۱۳) اگر یہ شخص محض طمع نفس سے ایسا کرتا ہے گنہگار ہے اور اگر اس سے اس فعل کو مرتد کے اسلام کی طرف آجانیکی امید ہے تو جائز ہے باقی دھوکہ دینا کسی حال میں جائز نہیں حقیقتِ حال سے لوگوں کو مطلع کر کے انتظام کرے جو آئیگا آجائیگا جو

آئیگا نہ آئے گا ⑭ جنازہ کافرہ کی مشایعت ناجائز ہے یہ لوگ گنہگار ہوئے توبہ کریں ⑮ احکام ظاہرہ میں وہ کافر شمار کیا جائیگا اور باطن کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کیا جائیگا ⑯ ایسا شخص جو مذہب اسلام کے سوا کسی اور مذہب کو بھی حق کہتا ہو کافر ہے ⑰ مرد مرتد کو دارالاسلام میں تین دن سے زیادہ تک زندہ نہیں رکھا جاسکتا اگر ارتداد کے بعد وہ اسلام کی طرف نہ آئے تو حکم قتل کا ہے مگر یہ وہاں ہے جہاں اسلامی حکومت ہو۔ ہندوستان میں یہ حکم نہیں یہاں مرتد اور دوسرے کافر ایک حکم میں ہیں۔ البتہ مرتد کے ساتھ دوسرے کافروں سے زیادہ اظہار نفرت وکراہت کرنا چاہیئے مگر یہ کہ اس کے اسلام کی امید ہو تو اس نیت سے مدارات کا مضائقہ نہیں: قال فی العالمگیریۃ مرتد لحق بدار الحرب ثم ظهر على ذلك المال فهو فيئ ولا سبيل لورثته عليه اھ (ص ۱۵۸ ج ۳) دل على ان المرتد بدار الحرب قبل الظهور عليه فى حكم الحربي إلا أنه لا يسترق بعد الظهور عليه قال فى العالمگيرية وان كان لحق بدار الحرب ثم رجع و ذهب بماله وأدخله دار الحرب ثم ظهر على ذلك المال فانه يرد على ورثته الا انه بغير شئ قبل القسمة وبالقيمة بعد القسمة كذا فى الكافى اھ (ص ۱۵۸ ج ۳) قلت ولما جرى القسمة فى ماله الذى تعلق به حق الورثة ففيما لم يتعلق به حقهم وهى الصورة السابقة اولى وفيها ايضاً ذكر الامام ركن الاسلام السندى إذا كان حربيا فى دار الحرب وكان الحال حال صلح ومسالمة فلا بأس بان يصله كذا فى التتارخانية هذا هو الكلام فى صلة المسلم المشرك وجئنا إلى صلة المشرك المسلم فقد روى محمد فى السير الكبير اخباراً متعارضة اھ وفيها ايضاً لا بأس بالذهاب إلى ضيافة اهل الذمة اھ وفيها إذا دخل ذمى على مسلم فقام له ان قام طمعا فى إسلامه فلا بأس به وان قام تعظيما له غير ان ينوى ما ذكرناه او قام طمعا لغناه كره له ذلك اھ (ص ۲۳۲ ج ۲) قلت والمرتد بدار الحرب كالحربي المسالم ظاهرا والله اعلم۔ قال فى البحر: ويزول ملك المرتد عن ماله زوالا موقوفا فان اسلم عاد ملكه، قالوا وهذا عند أبى

حنیفۃ وعندھما لایزول ملکہ لانہ مکلف محتاج فالی ان یقتل یبقی ملکہ
کالمحکوم علیہ بالرجم والقصاص ولہ أنہ حربی مقھور تحت ایدینا حتی
یقتل ولا یقتل الا بالحراب وھذا یوجب زوال ملکہ اھ قلت ومفاد ذلک
امران الاول کون المرتد فی حکم الحربی والثانی زوال ملکہ عن مالہ
للحراب ولا یخفی ان الحراب انما یوجب زوال الملک فی دار الاسلام
واما فی دار الحرب فلا فالمرتد بدار الحرب فی حکم سائر الحربیین :
قال فی البحر: وقید بالمرتد لان المرتدۃ لایزول ملکھا عن مالھا
بلاخلاف فیجوز تصرفاتھا بالاجماع لأنھا لا تقتل فلم تکن ردتھا سببا
لزوال ملکھا کذا فی البدائع ، وینبغی أن یلحق بھا المرتد اذا لم یقتل
وھو من کان فی إسلامہ شبھۃ کما قدمناہ بجامع عدم القتل ولم
ارہ صریحا اھ (ص۱۳۱ ج۵). قلت واللاحق بدار الحرب ومن ارتد فیھا
اولی بھذا الحکم لما فی البحر ایضاً (ص۱۳۲ ج۵) لانہ باللحاق صار من اھل
الحرب اھ قلت فیجوز قبول ضیافتہ اذا کان یرجی إسلامہ کما یجوز
اجابۃ ضیافۃ الذمی والحربی المسالم وکذا یجوز مبایعتہ والمعاملۃ
معہ کما جاز مع اھل الحرب سائرھم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی اللہ عنہ

حکم تعزیر طلبۂ علم وصبیان وزوجہ برکوتاہی در تعلیم۔

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل کے بارے میں ؏ کہ طالب علم چاہے قرآن مجید پڑھتا ہو چاہے دیگر کتب علم دین کی پڑھتا ہو ۔ اگر وہ پڑھنے میں محنت کرکے یاد نہ کرے تو شرعاً کس حد تک مارنے کی اجازت ہے جسمیں عند اللہ مواخذہ نہ ہووے ۔ اور اگر وہ اپنی طرف سے محنت تو خوب کرتا ہے لیکن بوجہ کم ذہن ہونیکے سبق یاد نہیں ہوتا ۔ تو شرعاً کس حد تک مارنے کی اجازت ہے جس میں کہ عند اللہ مواخذہ نہ ہوئے ۔ چاہے طالب علم لڑکا ہو یا لڑکی ہر ایک کا حکم ایک ہی ہے یا جداگانہ بالتفصیل تحریر فرمائیے جس سے استاذ کو پوری نصیحت ہوجائے اور عند اللہ مواخذہ نہ ہووے ۔ آجکل کم علم استاذ بہت ہی مارتے ہیں۔ جواب تسلی بخش تحریر فرمائیں۔

ع۲ ایک شخص کی زوجہ ہے۔ وہ اپنی زوجہ کو خود ہی پڑھاتا ہے۔ اگر اسکی زوجہ پڑھنے میں محنت نہ کرے توکس حد تک اپنی زوجہ کو مارپیٹ کی اجازت ہے اور اگر وہ محنت تو خوب کرتی ہے لیکن بوجہ کم ذہن ہونے کے سبق یاد نہیں رہتا تو اس صورت میں کس حد تک مار سکتا ہے، قرآن مجید پڑھنے میں ایسا کرتی ہے۔ اگر وہ دیگر احکام خداوندی و فرائض (مثل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) میں ایسی کوتاہی کرے توکتنی حد تک مارنے کی اجازت ہے۔ ع۳ کیا حدیث شریف میں اپنی زوجہ کو مسواک سے مارنے کی بھی ممانعت آئی ہے یا کہ نہیں۔ خلاصہ یہ ہے اگر زوجہ قرآن مجید پڑھنے میں ایسا کرے توکس حد تک مارنے کی اجازت ہے (قرآن مجید پورا پڑھانا ضروری ہے یا نہ، یا کہ اتنا جس سے نماز پڑھ سکے اور اگر زوجہ فرائض واحکام خداوندی میں ایسی کوتاہی کرے تو شرعاً کیا حکم ہے، مار پیٹ کے بارے میں، مارپیٹ کرے یا طلاق دیکر چھوڑ دیوے اسکے بارے میں نیز جواب شافی وکافی تحریر فرمائیے کہ جس سے خاوند حقوق العباد کے گناہ میں نہ پکڑا جاوے اور عنداللہ مواخذہ نہ ہووے برصورت زوجہ کے معاف نہ کرنے پر۔ فقط والسلام

الجواب

طالب علم اگر بالغ ہے، لڑکا ہو یا لڑکی تو اس کو تعلیم میں کوتاہی کرنے پر سزا دینا جائز ہے بشرطیکہ والدین کی طرف سے سزا دینے کی اجازت ہو اور اسکی حد یہ ہے کہ کماً وکیفاً ومحلاً ضرب معتاد سے زیادہ نہ ہو مگر آجکل عوام کو علم دین کی طرف زمانہ سابق کی طرح رغبت نہیں رہی اسلئے اکثر والدین کو معلم کی سزا ناگوار ہوتی ہے، نیز معلم بھی آجکل زیادہ تر مسائل سے جاہل اور اخلاق سے کورے ہیں۔ وہ حدود کی رعایت نہیں کرتے اس لئے زمانہ میں ایسے سوالات کا یہی جواب دیا جائیگا کہ معلم خود سزا نہ دے بلکہ جو لڑکا تعلیم میں کوتاہی کرے، اسی دن والدین کو اطلاع کردی جائے کہ یہ لڑکا محنت نہیں کرتا۔ اب والدین خواہ سزا دیں یا نہ دیں اختیار ہے اور جو لڑکا محنت کرتا ہو مگر قدرتی طور پر کند ذھن ہے اس کو سزا نہ دی جائے نہ والدین سے سزا دلوائی جائے بلکہ اس کو بقدر ضرورت قرآن اور کچھ نماز روزے کے مسائل پڑھا کر والدین سے کہدیا جائے کہ اس کو کسی کام میں لگادو یہ پڑھنے کے لائق نہیں۔ اور نابالغ بچہ کو لکڑی یا کوڑے سے مارنا جائز نہیں۔ صرف ہاتھ سے مارنا جائز ہے، بشرطیکہ چہرہ پر اور

نازک موقعہ پر نہ مارا جائے اور تین بار سے زائد نہ مارا جائے۔ اور بیوی کو تعلیمی کوتاہی پر مارنا جائز نہیں یہ حق باپ کا ہے، شوہر کا نہیں۔ اور ترک صلاۃ پر مارنے میں اختلاف ہے والمسئلۃ فی رد المحتار ص۲۹۲ تا ص۲۹۳ ج۳ و ص۳۶۴ ج۱ و ص۵۵۶ و ص۵۵۸ ج۵ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۴ محرم ۴۷ھ

حکم تعزیر نابالغ بوطئی بہیمہ | عرض اینکہ ایک لڑکے صغیر دس گیارہ برس عمر والے نے بچہ مادہ جاموس کے ساتھ بدفعلی کی ہے، اب اسکی نسبت جو شرعی احکام ہو روشن فرمادیں اور بچہ جاموس نسبت نیز۔

الجواب

اس بچہ کے والدین سے یا جو اسکا ولی سرپرست ہو کہا جاوے کہ اس بچہ کو بطور تادیب کے کچھ سزا دیدے۔ مگر لکڑی سے نہ مارے بلکہ ہاتھ یا جوتے سے سزا دے اور نازک موقعہ اور چہرہ پر نہ مارے اور بہت زیادہ نہ مارے کیونکہ بچہ نابالغ ہے۔ اور مادہ جاموس کے متعلق کچھ حکم نہیں وہ جنکی ملک ہے اس کو اس سے انتفاع جائز ہے۔ قلت: وحکم الذبح والتحریق الذی صرح بھما فقھاءنا مختص عندی بوطأ البالغ لان المطلق اذا اطلق یراد بہ الکامل۔ وھو ھذا لا وطأ الصبی۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفی اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲ صفر ۴۷ھ

احکام تعزیر | کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص ایسا ہے جو بے باکانہ دوسرے پر جھوٹی تہمت زنا کی لگاتا ہے نوجوانوں کو بہکا کر مختلف شرارتوں سے گاؤں میں بدامنی پھیلاتا ہے، مثلاً گھروں میں ڈھیلے پھینکواتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے بہکا کر پٹوا دیتا ہے۔ گالی دلواتا ہے نماز جماعت بغرض فساد واشتعال الگ کرتا ہے۔ جماعت میں خلل ڈلواتا ہے، الگ چبوترہ نماز کا قائم کرتا ہے، پھر طرفہ یہ کہ مسجد سے روکنے کا الزام دوسرے پر لگا دیتا ہے، اور اس الزام کے اثبات کیلئے چبوترہ قائم کرتا ہے۔ دوسرے کو مالی نقصان پہونچاتا ہے اور اس فکر میں رہتا ہے

گاؤں میں دو جھگڑنے والے اگر صلح کرنا چاہیں تو اشتعال آمیز باتیں کہکر صلح نہیں کرنے دیتا۔ غرضیکہ ایسے امور میں جس سے دوسروں کو ایذا پہونچے اور گاؤں میں بدامنی پھیلے اس کو خاص دلچسپی رہتی ہے، حرام حلال سے جائز ناجائز سے اسے کوئی بحث نہیں ایسا شخص شرعاً کس تعزیز کا اور کتنی تعزیر کا مستحق ہے۔ کیا حاکم کے علاوہ کوئی رئیس زمیندار ذی اثر گاؤں میں امن پھیلانے کے خیال سے کچھ تعزیز کر سکتا ہے ایسے تعزیر کیلئے ایسے زمیندار کیلئے حد شرعی کیا ہے۔

الجواب

قال فی الشامیة عن بعض المتاخرین إن الحد مختص بالامام و التعزیر یفعله الزوج و المولیٰ وکل من رأی احدا یباشر المعصیة ص۲۷۰ ج۳ ۔ وفیہ ایضاً عن المجتبی: الاصل أن کل شخص رأی مسلماً یزنی ان یحل له قتله و انما یمتنع خوفاً ان لا یصدق انه زنی ص۲۷۸ ج۳ ۔ وعلامہ ابن وهبان بأنه لیس من الحد بل من الامر بالمعروف والنهی عن المنکر وهو حسن۔ وفی الدر وعزر کل مرتکب منکراً و موذی مسلم بغیر حق بقول او بفعل اھ ۔ والتعزیر تادیب دون الحد اکثره تسعة وثلاثون سوطاً و اقله ثلثة لو بالضرب وجعله فی الدر علی اربع مراتب اھ ملخصا۔

صورت مسئولہ میں یہ شخص مستحق تعزیر یقینا ہے پھر جو شخص اس کو خود برا کام کرتے ہوئے دیکھے اس کو اقامت تعزیر کا حق ہے اگر سمجھانے سے باز نہ آوے۔ اور جو خود نہ دیکھے بلکہ غائبانہ اسکی حرکتوں کو سنے اس کو تعزیر کا حق اس وقت ہے جبکہ ولایت تادیب حاصل ہو مثلاً زوج، مولیٰ اور باپ اور معلم کو تعزیر کا حق ہے اسی طرح رئیس دیہہ کو ان لوگوں کی تعزیر کا حق ہے جو اسکی رعیت ہوں۔ اور جو اسکی رعیت نہ ہوں انکی تعزیر کا حق نہیں مگر جبکہ اسکے سامنے معصیت کر رہا ہو تو ہر مسلمان کو حق تعزیر ہے۔ البتہ اگر رئیس کو حکومت کی طرف سے اختیار تعزیر حاصل ہوجاوے تو اس کو تعزیر متہم کا حق ہے اور تعزیر کے درجات ہیں کسی کو محض دھمکانا کافی ہوجاتا کسی کو مارنے کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ضرب سے تعزیر کیجاوے تو انتالیس (۳۹) کوڑوں سے تجاوز نہ کیا جاوے۔ واللہ اعلم بالصواب

ظفر احمد عفی عنہ

الجواب صحیح
اشرف علی

کتاب الاقرار والصّلح

صلح فاسد کی ایک صورت کا حکم

سوال:۔ زید و عمرو و بکر و خالد ایک موضع کے زمیندار تھے جب موضع ان کے قبضہ سے برائے بیع نکل گیا تو مبلغ ایک صد روپیہ سالانہ بحق نانکار پاتے رہے اور زید کے سوا دوسروں کو اس موضع میں کچھ زمین بحق ساقط الملکیت بھی حاصل ہے اب زمیندار نے موضع مذکور کو فروخت کر ڈالا اور مشتری جدید نے مبلغ مذکور دینے سے انکار کیا۔ عمرو و بکر و خالد نے دعویٰ کا ارادہ کیا اور زید نے دعویٰ سے انکار کیا اور کہا تم خرچ کرکے دعویٰ کرو اگر تم جیت گئے تو مجھے اپنے حصّے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ عمرو و بکر و خالد دعویٰ میں کامیاب ہوگئے اب زید ان سے اپنے حصۂ حق کا طالب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حق نانکار و ساقط الملکیت لینا جائز ہے یا نہیں اور زید کو اپنے حصہ کا مطالبہ درست ہے یا نہیں اگر درست ہے تو جو اسکو حق نہ دے کیا وہ گنہگار رہوگا۔ فقط

الجواب

(بصورت تنقیح) بیع کے بعد تو بائع کا مبیع سے کوئی تعلق نہیں رہتا پھر یہ حق مالکانہ کیسا ملتا ہے۔ شرعاً اس حق مالکانہ کا لینا کسی کو بھی جائز نہیں ہے نہ زید کو نہ عمرو و بکر کو اور اگر اس معاملہ کی حقیقت کچھ اور ہے تو اس حق مالکانہ کی پوری حقیقت لکھی جاوے کہ یہ کیا ہوتا ہے اور کس وجہ سے ملتا ہے اور کس صورت میں بائع اسکا مستحق ہوتا ہے ونیز اراضی ساقط الملکیت کی بھی مفصل حقیقت تحریر کیجاوے تب مفصل جواب دیا جاسکتا ہے۔

احقر عبد الکریم عفی عنہ
خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ

تفصیل سوال بالا

قبل اسکے کہ نانکار اور اراضی کو واضح طور پر ظاہر کیا جاوے پہلے اس موضع کا حال جسمیں یہ دونوں حقوق واقع ہیں جو زید و عمرو و بکر و خالد وغیرہ کو ملتے ہیں تحریر

کیا جاوے۔ کیفیت موضع یہ ہے کہ ۱۲۳۵ھ فصل مطابق ۱۲۴۳ھ میں منجانب زید وعمرو وبکر وخالد و مورثان ان کے بیع فرضی بلکہ جبراً وقہراً کیا گیا زرثمن کچھ بھی وصول نہیں۔ ۱۲۳۵ھ فصل سے ۱۲۴۱ھ فصل تک مشتری فرضی کا قبضہ رہا ۱۲۴۱ھ ف میں مشتری کو نکالدیا گیا، زید وعمرو وبکر وخالد اور ان کے مورثان نے موضع پر قبضہ کرلیا ان لوگوں کا قبضہ ۱۲۵۹ھ فصل تک رہا ۱۲۵۹ھ فصل سے ۱۲۶۳ھ ف تک ایک اور تیسرے شخص نے بوجہ چند دستاویزات قدیم کے قبضہ رکھا اس شخص ثالث کے قبضہ اٹھا دینے کی غرض سے زید وعمرو وبکر وخالد وغیرھم اور ان کے مورثان نے پھر مشتری فرضی کو بوجہ اسکے کہ وہ غلبہ رکھتا تھا اور شاہ اودھ کے دربار میں رسوخ حاصل تھا بلا یا گیا۔ اب ان سب لوگوں نے ملکر اس شخص ثالث کو موضع سے نکالدیا اسی اثناء میں عملداری انگریزی شروع ہوگئی، ہاں یہ ایک بات اور خیال میں رکھنے کی ہے کہ بیعامہ مذکور پر سب شرکاء کے دستخط بھی نہیں ہوئے تین اشخاص کے دستخط نہیں اور حسب ضابطہ شاہی قاضی کی عدالت میں بھی نہیں پیش ہوا، قاضی وقت کی دستخدا ومہر بیعانہ پر ثبت نہیں ہے۔ اب وہ تیسرا شخص موضع سے نکالدیا گیا ہے، موضع سردست مالک و زمینداری سے خالی ہے اور عملداری انگریزی شروع ہے، بندوبست ہورہا ہے اس وقت مشتری فرضی اس فکر میں ہے کہ موضع پر میں قابض ہوں اور زید وعمرو وبکر وخالد اپنی فکر میں ہیں کہ ہم قابض ہوں۔ یہ زید وغیرہ مفلس اور کمزور ہیں اور مشتری صاحب زر وزوردار ہیں اس نے مبلغ ایک صدروپیہ زید وغیرہ کو موضع سے دینا منظور کرلیا اور ایک کاغذ بھی لکھدیا اور زید وغیرہ کو اس طریق سے دعویداری موضع سے باز رکھا یہ لوگ دعویدار نہیں ہوئے، مشتری کے نام بندوبست ہوگیا اس روپیہ کا نام (نانکار) ہے۔ یہ حقیقت ہے، نانکار ملنے کی اس کے بعد جب مشتری کا قبضہ وتسلط ہوگیا تب اس نے اس روپیہ کو روک دیا نہیں دیا۔ نالش کرنے پر زید وعمرو وبکر اور ان کے مورثوں کے نام ڈگری ہوگئی، کیفیت اراضی ساقط الملکیت کی یہ ہے کہ جب موضع زید وعمرو وبکر وخالد وغیرھم کے پاس تھا اس وقت وہ لوگ کچھ اراضی بھی کاشت کئے ہوئے تھے وہ انکی کاشت میں اب بھی تھے یعنی جب مشتری کا قبضہ ہوا اسکو بھی مشتری نے ان کو دینا نہیں چاہا اور بے دخلی باضابطہ کردی ان کو عذر دار ہونے پر حسب قانون گورنمنٹی ڈگری ساقط الملکیت کی ملگئی جسکی اصلیت

یہ ہے کہ اسکا لگان بمقابلہ عام کاشتکاران فیصدی پچیس روپیہ کم ہوگا اور ہرسال مثل عام کاشتکار انکے بے دخلی نہ ہوسکیگی اس طرح پر یہ دو حق موضع میں زید عمرو و بکر و خالد وغیرھم کو موضع بلا قیمت کھو کر ملتے ہیں جسکی بابت مسئلہ منسلکہ دریافت طلب ہے کیا یہ دونوں حق شرعاً ایسی صورت میں ناجائز ہیں۔ بیّنوا توجروا۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید و عمرو و بکر وغیرہ نے جو مشتری فرضی کے ساتھ سو روپیہ سالانہ موضع سے لینے پر دعویٰ ملکیت سے دستبرداری کی ہے اس عقد کی حقیقت صلح ہے اور جو صورت صلح کی اختیار کی گئی ہے وہ فاسد ہے۔ لان الصلح کالبیع ان وقع عن مال بمال وکالاجارۃ ان وقع عن مال بمنفعۃ کما فی الدر (ص ۴۲۰ و ۴۲۶ ج ۴) ویفسدہ جہالۃ البدل المصالح علیہ کما فیہ ایضاً (ص مذکور) والبدل مجہول ھناک ففسد الصلح۔ اور جب صلح فاسد ہوگئی تو شرعاً یہ موضع زید و عمرو و بکر وغیرہ اصلی مالکان موضع کی ملک ہے۔ مشتری فرضی یا اسکے وارثان کی ملک نہیں زید و عمرو و بکر وغیرہ اس موضع کی پوری آمدنی کے شرعاً مستحق ہیں اور اگر کوئی شخص ظلماً ان کو پوری آمدنی نہ دے تو جتنی بھی ان کو قانوناً مل سکے وہ ان کے اور ان کے ورثاء کیلئے حلال ہے اور حق ساقط الملکیت بھی جو ان کو اس موضع میں حاصل ہے وہ ان کیلئے حلال ہے اور زید نے جو بندو بست سابق کے وقت دعویٰ سے انکار کیا تھا اور عمرو و بکر و خالد سے کہا کہ جس کا جی چاہے خرچ کرکے دعویٰ کرے اس سے زید کی ملکیت اراضی موضع سے زائل نہیں ہوئی بلکہ اس کا حق بدستور قائم رہا اور اس کے بعد عمرو و بکر و خالد کو اس موضع سے جو کچھ بھی ملا یا آئندہ ملے اس میں زید اور اسکے ورثاء کا بھی حق ہے سب کو سہام شرعیہ کے موافق تقسیم کرنا چاہیئے البتہ عمرو و بکر کا دعویٰ میں جو ضروری صرف ہوا ہو اسمیں سے جس قدر زید کے حصہ پر پڑتا ہو وہ خرچ عمرو و بکر و خالد یا ان کے ورثاء زید سے یا اسکے ورثاء سے لے سکتے ہیں ھذا ما ظھرلی واللہ اعلم بالصواب۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفاعنہ۔ از تھانہ بھون

ایک وارث کا دوسرے ورثاء کو کچھ رقم دیکر انکے حصہ سے صلح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال:۔ ایک شخص کے پاس زمین ہے جسمیں بعض ورثاء کا حق ہے جو اُن کو دیا نہیں گیا۔

اب یہ شخص دوسرے ورثاء کے سامنے مثلاً دوسو روپے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا جو حق اس جائیداد میں ہے اسکے عوض تم مجھ سے اتنے روپے لے لو۔ باقی کو چھوڑ دو۔ یا باقی سے مجھ کو بری کردو یہ صورت جائز ہے یا نہیں۔ فقط

السائل: مولوی عبدالمجید صاحب بچھرایونی

الجواب

قال فی الهداية: واذا كانت التركة بين ورثة فاخرجوا احدهم منها بمال اعطوه اياه والتركة عقار اوعروض جاز قليلاً كان ما أعطوه إياه اوكثيراً لأنه امكن تصحيحه بيعا وان كانت التركة فضة فاعطوه ذهبا او ذهبا فاعطوه فضة فكذالك لانه بيع الجنس بخلاف الجنس ويعتبر التقابض فی المجلس لانه صرف وان كانت التركة ذهبا وفضة فصالحوه على فضة او ذهب فلا بد ان يكون ما اعطوه اكثر من نصيبه من ذلك الجنس ولو كان فی التركة الدراهم والدنانير وبدل الصلح دراهم ودنانير ايضاً جاز الصلح كيف ما كان صرفاً للجنس إلى خلاف الجنس لكن يشترط التقابض للصرف اھ (ص ۲۴۰ ج ۲)۔

صورت مسئولہ میں یہ طریقہ جائز ہے کہ ایک وارث سے دوسرا وارث یوں کہے کہ تمہارا جو حق ترکہ میں ہے اسکے عوض تم مجھ سے اتنی رقم لے لو یا یوں کہے کہ میں تم کو یہ رقم اس شرط پر دیتا ہوں کہ تم اپنے باقی حق ترکہ سے خارج اور لا دعوی ہو جاؤ یا باقی ترکہ سے صلح کے طور پر یہ رقم لے لو یا باقی مجھکو چھوڑ دو کیونکہ ان سب صورتوں میں کلام کو صلح پر محمول کرنا ممکن ہے اور صلح بحکم بیع ہے لیکن جائیداد اور سامان غیر نقد میں تو اس طرح معاملہ کرنا مطلقاً درست ہے خواہ اس وارث کو جسے حق ترکہ سے نکالا جاتا ہے قلیل رقم دی جائے یا زیادہ اور اگر ترکہ میں اس وارث کا حق نقدین میں بھی ہو اور اس سے بھی صلح کرنا مقصود ہو تو اس میں بعض قیود کی رعایت ضروری ہے جو عبارت عربیہ میں مذکور ہیں۔ فقط حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ

تنبیہ ضروری: آجکل ہمشیرگان کو عام طور سے میراث نہیں دیجاتی اور محض رسم کی وجہ سے ہمشیرہ بھی انکار کردیتی ہیں اور ایسے مواقع پر اس قسم حیلے فقط ظاہری طور پر کئے جاتے ہیں۔ دل سے ہمشیرہ رضامند نہیں ہوتی سو ایسے حیلہ سے مال طیب نہ ہوگا۔ بلکہ جہاں دلی رضامندی سے ہمشیرہ صلح کرنا چاہے اس صورت پر وہاں عمل کیا جاوے اس کا لحاظ نہایت ضروری ہے فقط

احقر عبد الکریم عفی عنہ

صلح اور تعزیرات سے متعلق چند سوالوں پر مشتمل ایک استفتار

دریں شہر درمیانِ طلبۂ مدرسہ و ہندوان تنازع شد آخر الامر نوبت بایں رسید کہ بہ تعداد کثیر صدہا ہندو جمع شد بر مدرسہ حملہ آوردند القصہ بعد چندیں زدوکوب کلوخہا و چوبہا چہار دندانہا طالبے شکست بضرب ہندوان۔ مقدمہ بروقت در پولیس بود کہ ۱۹ عدد ہندو بحبس گرفتند اکنوں مقدمہ بعدالت رفتہ است و مجسٹریٹ آنرا بر ضامن رہا کردہ است مگر ہندوان و خود آن مجسٹریٹ کہ ہندو است ملتجی برائے صلح شدہ اند۔ بموجب التجائے اوشان کارکنان مدرسہ این مصلحت دیدہ کہ اگر استغاثہ شود مبادا ہیچ کلام کذب گفتن پیش آید کہ خاصہ از عدالت کفار است رہائی شود۔ دیگر معلوم نیست کہ چہ شود آن ہم بغیر چندیں سزائے حبس مجرمان ہیچ نیست و دریں کار ضرورت خرچ زیادہ است و در صلح اُمید غالب حصول دیت دندانہا ست بر تقدیر در استغاثہ کامیابی نہ شود و بعدہٗ ہیچ حاصل نہ شود۔ و برایں مصلحت کارکنان مدرسہ و ہندوان خود آن مجسٹریٹ را امین قبول کردہ نوشتہ دادہ است کہ آنچہ حکم بر ہندوان دیت و سزائے خواہد کرد منظور طرفین باشد اکنوں ع۱ دریں صلح عزتِ مسلم و تذلیل کفار است یا نہ و صلح باید کرد یا نہ بہترے و عزت برائے مسلمانان در صلح است یا در استغاثہ۔ ع۲ چونکہ تعین اشخاص جانے کہ دندانہائے طالب شکستہ اند بہ سبب کثرت ہندوان متعذر است دریں صورت دیت بر جمیع است یا چہ حکم است۔ و بوجہ تعذر تعین دیت ساقط گردد یا نہ۔ ع۳ و دریں جرمہا کہ یکے ازآن است کہ بہ تعداد کثیر حملہ آوردن دوم دندانہا شکستن۔ سوم ایذا رسانیدن، چہارم در حد غیر بہ نیت ایذاء رسانیدن داخل شدن ع۴ بغیر دیت دندانہا سیاستہً سزائے حبس وغیرہ برائے ہر واحد جدا جدا شرعاً

چہ قدر است۔ ع۵ و دیت وسزائے حبس وغیرہ ہر دو جمع کردن شرعاً جائز است یا نہ

الجواب وھو الموفق للصواب

ع۱ اس صورت میں صلح تو بہر حال جائز ہے کیونکہ اس صورت میں حد واجب نہیں جسمیں صلح وغیرہ کا حق نہو بلکہ حق العبد ہے جسمیں مجروح کو اختیار ہے کما فی الدر المختار ج۳ ص۲۳ (وان جرح فقط) ولم یقتل ولم یاخذ نصابا الی ان قال فلاحد وللولی القود الخ وقال الشامی المراد بالولی من له ولایۃ المطالبۃ فیشتمل صاحب المال والمجروح ایضاً الخ مگر حکم (یعنی امین) کسی مسلمان کو بنایا جاوے یا خود براہ راست مجرموں سے گفتگو کیجاوے لان الشرط من جھۃ المحکم بالفتح صلاحیۃ للقضاء کما لا یخفی۔ ع۲ فی الدر المختار ص۶۲۴ ج ۵ باب القسامۃ (وان التقی قوم بالسیوف فاجلوا) ای تفرقوا (عن قتیل فعلی اھل المحلۃ) لان حفظھا علیھم (الا ان یدعی الولی علی اولٰئک او) یدعی (علی) بعض (معین منھم) الخ اس سے معلوم ہوا کہ بلا تعین بھی کل جماعت پر دعویٰ ہو سکتا ہے جب حملہ آوروں کا گروہ معلوم ہے تو پھر خاص کی تعیین ضروری نہیں اور اس صورت میں ایک دیت سب مجرموں سے لیجاویگی ع۳ اول وچہارم موجب تعزیر است ودوم یعنی دندان شکستن موجب قصاص (بشرطیکہ مجرم واحد متعین بود ورنہ موجب دیت) ودر سوم یعنی زد و کوب تفصیل است در بعضے جروح قصاص واجب شود ودر بعضے ارش تفصیل در کتب فقہ باید دید۔ ع۴ دیت وقصاص وارش حق مظلوم است حاکم را معاف کردن نرسد وتعزیر مقدر نیست بلکہ مفوض برائے حاکم است۔ ع۵ سزائے تعزیری در ہر جرم جائز است کما فی الدر المختار ص۲۲۷ ج ۳ (ولا جمع بین جلد ورجم ولا بین جلد ونفی الا سیاسۃً والتعزیر مفوض للامام وکذا فی کل جنایۃ نھر۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

ترکہ میں رجوع عن الصلح کی ایک صورت | سوال :۔ ایک عورت مردہ کے زوج اور

ام اور اَبْ اور دو ابن وارث ہیں تقسیم ترکہ کے وقت زوج نے کہا کہ میں نے سب مال سے یہ چیزیں معینہ لے لی ہیں اور باقی سب مال تم کو چھوڑ دیا ہے۔ تم یعنی ام اور اب اور دو ابن باہم تقسیم کرلو ام اور اب اس پر راضی ہوگئے اور دونوں ابن اس زوج کے صغیر ہیں اسکے بعد ان کو یہ فکر ہوئی کہ اب زوج تو نکل گیا اور ماں باپ اور دو لڑکوں کے درمیان تقسیم کس طرح ہوگی۔ مسئلہ ان کو معلوم نہ تھا۔ زوج نے کہا کہ میں اس صلح سے رجوع کرتا ہوں اور تقسیم میں پھر شریک ہوتا ہوں اور سہام بناکر پورا پورا حصہ لینے میں زوج نے رجوع کرلیا اور کل مال کا ربع لے لیا اور سدس ماں اور سدس باپ نے لے لیا اور باقی مال دونوں لڑکوں کو دیدیا تو کیا زوج کا یہ رجوع صحیح ہے، اگر زوج رجوع نہ کرتا تو بقایا ورثاء کو مال زیادہ آتا اس لئے کہ زوج نے تھوڑی چیزیں لے کر صلح کی تھی۔

الجواب

قال في الدر الصلح إن كان بمعنى المعاوضة بأن كان ديناً بعين ينتقض بنقضها اى بفسخ المتصالحين وان كان لا بمعناها اى المعاوضة بل بمعنى استيفاء البعض وإسقاط البعض فلا تصح اقالته ولا نقضه لأن الساقط لا يعود اھ ص۷۳۳ ج۵۔

صورت مسئولہ میں نقض صلح جائز نہیں کیونکہ ورثاء میں نابالغ بھی ہیں اور نابالغ کے حق میں صلح مفید تھی۔ اور نقض صلح مضر ہے اور نقض صلح بدون تراضی ورثاء درست نہیں اور نابالغ کی رضا معتبر نہیں۔ دوسری اس صلح میں استیفاء بعض واسقاط بعض ہے۔ معاوضہ کی صورت نہیں، اس لئے بتراضی ورثاء بالغین کے حق میں بھی یہ صلح منتقض نہیں ہوسکتی پس زوج نے جو اشیاء اول لے لی ہیں وہی اسکا حق ہے مابقی کے چھ سہام کرکے ایک سہم ماں کا ایک سہم باپ کا حق ہے اور چار سہام لڑکوں کے ہیں دو ایک کے دو ایک کے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

کتاب الوکالۃ والکفالۃ

وکیل اگر سہواً مبیع کی قیمت زیادہ ادا کردے تو زیادتی کا ضمان کس پر ہے؟

ایک شخص نے جو کہ رانديرمیں ہے اپنے بھائی کو جو کہ رنگون میں ہے اس کو اختیار دیا تھا کہ تو میری جائیداد کو بیع کر سکتا ہے، نیز میرے لئے جو چیز مناسب ہو خرید کر سکتے ہو۔ رنگونی نے ایک مکان شرکت میں دس ہزار کی قیمت کا خرید کیا اور عقد کے وقت ایک ہزار روپیہ پیشگی دیئے۔ اب مدت کے دس ہزار روپے ادا کئے۔ لیکن دس ہزار روپے کی ادائیگی کے وقت وہ پیشگی والے ایک ہزار روپیہ بالکل ہی بھول گیا اب یہ ایک ہزار روپیہ دونوں کے متعلق ہونگے یا صرف رنگونی کے؟

الجواب

ایک ہزار روپیہ جو رنگونی نے بھولکر زیادہ دیدیا ہے، وہ صرف اس رنگونی کے ذمہ ہے رانديری کے ذمہ اس ایک ہزار میں سے کچھ نہیں ہوگا نہ کُل نہ آدھا۔

وکیل کو مؤکل کے مال سے اسکی اجازت کے بغیر نفع اٹھانا جائز نہیں۔

تجارتی کمپنی کا قاعدہ ہے کہ مثلاً فی صد پانچ روپیہ کمیشن دیا جاتا ہے۔ زید کو چار شخصوں نے پچیس پچیس روپیہ کے مال کے خرید کرنیکی اجازت دی اور زید نے سو روپے کا مال کمپنی سے منگوایا۔ زید بائع ومشتری میں محض واسطہ ہے اور قبل از فرمائش ان چار شخصوں کو کمیشن کا علم بھی نہ تھا۔ اب وہ کمیشن کا روپیہ ان چاروں پر تقسیم ہونگے یا تنہا زید لے سکتا ہے؟

الجواب

زید وکیل ہے اور وکیل کو یہ جائز نہیں کہ مؤکل کے روپیہ سے بدون اسکی اجازت کے نفع حاصل کرے لہذا وہ کمیشن کا روپیہ چاروں مؤکلوں میں تقسیم ہوگا۔

مدعی کا خصم کی مرضی کے خلاف کسی کو وکیل بالخصومۃ بنانا

چہ قول است علماء دریں صورت کہ شخصے عالی مرتبہ است و دعوئی او بشخصے است کہ ادنیٰ مرتبہ دارد

میخواہد کہ وکیل نماید وخصم بایں راضی نمیشود وی ترسد کہ وکلاء بحیل ودعاوی حق تلفی خواہند کرد آیا دریں صورت توکیل شرعاً جائز است یانہ بینوا توجروا۔

الجواب

دریں صورت توکیل شرعاً جائز نیست: فی مختار الفتاوٰی وفی الفضلی رجل من الاشراف له خصومة مع من دانه فأراد أن يوكل ولا يحضر بنفسه قال الفقيه ابوالليث يحضر الا ترىٰ ان لا يقبل الوكالة منه عليه إلّا ان يحضر بنفسه والشريف وغيرالشريف فى الدعوىٰ سواء فلا يصح الوكالة انتهى۔ وايضاً قال المخدوم محمد هاشم التتوى ناقلاً عن فصول العمادى رجل من الأشراف له خصومة مع من دانه فأراد ان يوكل ولا يحضر بنفسه قال الفقيه ابوالليث نحن لا نرىٰ أن يقبل الوكالة منه وعليه ان يحضر بنفسه والشريف وغير الشريف فى الدعوىٰ سواء إنتهىٰ و تفويض الخيار بقضاة زمانا نسيت قال فى البحر: ناقلاً عن البزازية ومن المعلوم المقرر ان تفويض الخيار الىٰ قضاة عهد الفساد فساد كما هو المقرر من ان علمهم ليس بحجة قال شمس الائمة الصحيح انه اذا علم عن الابى فى اباء الوكيل يفتى بالقبول وان علم منه بالحيل كما هو صنيع وكلاء المحكمة لا يقبل وغرض عن فوض الخيار الى القاضى عن القدماء كان هذا عملوا عن احوال قضاتهم الدين والصلاح انتهىٰ وفى تكملة ردّ المحتار تحت قوله والمختار للفتوىٰ تفويضه للحاكم اى القاضى بحيث انه إذا علم عن الخصم التعنت فى الاباء عن قبول التوكيل لا يمكنه عن ذلك وان علم عن المؤكل قصد الاضرار لخصمه بالحيل كما هو صنيع وكلاء المحكمة لا يقبل منه التوكيل الا برضاء وهو اختيار شمس الائمة السرخسى كذا فى الكافى ونحوه فى الزيلعى وزاد فى معراج الدراية وبه واخذ الصفار فى الخلاصة قال شمس الائمة

الحلوانى فى آداب القاضى المفتى مخير فى هذه المسئلة إن شاء
افتى بقول أبى حنيفة وان شاء أفتى بقولهما ونحن نفتى بأن
الرأى إلى القاضى اھ ھذا فى قضاتهم لما علموا من أحوالهم
عن الصلاح والدين واما قضاة زماننا فلا يلاحظون ما قالوه
بيقين بل قصدهم حصول المحصول ولو علموا من الوكيل التزوير
والاضرار فى الدعوى انتهى مختصرا وايضاً فيها قال فى البزازية
وأصله أن التوكيل بلا رضاء الخصم اذا لم يكن المؤكل حاضرا
فى مجلس الحكم لا يصح عند الامام ولا يجبر خصمه على قبول
الوكالة ، اقول يقول الحنفية افتى الرملى قائلا وعليه المتون
واختاره غير واحد والمحبوبى والنسفى وصدر الشريعة وابو
الفضل الموصلى ورجح دليله فى كل مصنف فلزم العمل به ولا
سيما فى هذا الزمان الفاسد انتهى ملتقطا وفى الخيرية صرّح
علماءنا قاطبة متونا وشروحا بان الوكالة فى الخصومة لا تكون
الا برضاء الخصم إلا ان يكون المؤكل مريضاً اوغائباً مدة السفر
اومخدرة ووجه ذلك ان الجواب مستحق على الخصم ولهذا
يستحضره والناس متفاوتون فى الخصومة ولو قلنا باللزوم يتضرر
به فيتوقف على رضائه والتهذيب التحفه واختار المحبوبى والنسفى
وصدر الشريعة وابو الفضل الموصلى ورجح دليله فى كل مصنف
وغالب المتون عليه فلزم العمل به لرفع الضرر لاسيما فى هذا
الزمان الفاسد والله أعلم انتهى. قال فى رد المحتار حاشية الدر
المختار تحت قوله وعليه فتوى ابى الليث افتى الرملى بقول الامام
الذى عليه المتون واختاره غير واحد وايضاً قال تحت قوله وتفويضه للحاكم
بحث فيه فى البزازية فانظر ما فى البحر انتهى پس ازیں روایات صحیحہ معلوم شد کہ
درصورت مستفاۃ توکیل بلا رضاء خصم جائز نیست ہذا۔ واللہ أعلم وعلمہ أتم واحکم۔

حرّرہ الفقیر غلام محمد بگھروی

الكلام على الجواب من جامع امداد الأحكام

مفتی مذکور نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے یہ امام صاحب کا مذہب ہے اور صاحبین کے مذہب میں توکیل بالخصومۃ بلا رضاء خصم بھی جائز ہے بلکہ جائز تو امام صاحب کے نزدیک بھی ہے ہاں اور ونکے نزدیک لزوم بدون رضاء خصم کے نہیں ہوتا اور صاحبین کے نزدیک لزوم بھی ہو جاتا ہے۔

التوکیل بالخصومۃ بغیر رضاء الخصم لا یلزم و قالا یلزم ثم اختلف المشائخ علی قولہ بعضھم قالوا رضاء الخصم لیس بشرط لصحۃ التوکیل بل ھو شرط لزومہ وھو الصحیح کذا فی خزانۃ المفتین والفقیہ ابو اللیث اختار قولھما کذا فی خزانۃ المفتین وقال العتابی وھو المختار وبہ اخذ الصفار کذا فی البحر الرائق رجل من الاشراف وقعت خصومتہ مع رجل وضیع فاراد أن یؤکل وکیلا ولا یحضر بنفسہ اختلف فیھا قال الفقیہ ابو اللیث نحن نری أن تقبل الوکالۃ کان المؤکل شریفا او وضیعا کذا فی جواھر الاخلاطی اھ عالمگیریہ ج ۴، ص ۳۱۵

پس صورت مسئولہ میں صاحبین کے قول مفتی بہ پر توکیل درست ہے اور اگر خصم کے اضرار کا قصد نہ ہو صرف حاضریٔ عدالت سے بچنا مقصود ہو تو گناہ بھی نہ ہوگا اور اگر توکیل سے خصم کو ضرر پہنچانے کا قصد ہو تو گناہ ہوگا۔ اور اگر محض اپنے نفع کا قصد ہو اور خصم کو ضرر دینے کا ارادہ نہ ہو گو خصم کا ضرر آجائے تب بھی گناہ نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۷ رمضان ۱۳۴۲ھ

ملازمین مدرسہ جو تحصیل چندہ کی غرض سے باہر بھیجے جاتے ہیں بلا اجازتِ مہتمم چندہ میں تصرف جائز ہے یا نہیں؟

السوال: - کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرسین و ملازمینِ مدرسہ کو مدرسہ کی جانب سے تحصیلِ چندہ کی غرض سے باہر بھیجا جاوے تو ان کو بلا اجازت مہتمم کے از چندہ اپنی تنخواہوں

میں لے لینا درست ہے یا نہیں اور اگر اس چندہ میں زکوٰۃ کی رقم بھی ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں بینوا توجروا۔

السائل: ضیاء النبی محرر مدرسہ عالیہ اسلامیہ محلہ چلہ امروہہ

الجواب

جن لوگوں کو (خواہ مدرس ہوں یا ملازم مدرسہ) مدرسہ کی جانب سے تحصیل چندہ کیلئے بھیجا جاتا ہے وہ مدرسہ کی طرف سے صرف وکیل بالقبض ہیں وکیل بالتصرف نہیں اور وہ چندہ دینے والے بھی ان کو وکیل بالقبض ہی سمجھ کر چندہ دیتے ہیں۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاوے کہ چندہ وصول کرنے والے چندہ میں تصرف بالانفاق بھی کرتے تو وہ ہرگز ایسے لوگوں کو چندہ نہ دیں اس لئے بدون مہتمم کی اجازت کے چندہ کے روپیہ میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے گناہ گار ہوں گے، اور تنخواہ میں زکوٰۃ کی رقم لینے میں معطی کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

فان تملك الفقير بلا عوض شرط فی الزکوٰۃ۔ المسئلة ذکرها العلامة الشامی فی رد المحتار (ج ۲ ص ۱۷)۔

الجواب صحیح	واللہ اعلم
اشرف علی	حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۷ شوال ۱۳۴۷ھ	۲۷ شوال ۴۷ھ

کتاب الشفعة

حق شفعہ ثابت کرنے کیلئے کسی کو وکیل بنانا جائز ہے

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت نے شریک فی المبیع ہونے کی وجہ سے شفعہ کا دعویٰ کیا ہے مگر رسم طلب مواثبت وطلب اشہاد خود نہیں کیا بلکہ بذریعہ اپنے شوہر کے اس رسم کو ادا کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں حق شفعہ کا ثبوت ازروئے شرع

اس عورت کو ہوسکتا ہے یا نہیں۔ یا طلب مواثبت واشہاد ثبوت حق شفعہ کیواسطے خود شفیع کو کرنا ضروری ہے۔ اگر شوہر یا کسی اور کے ذریعہ شفعہ کرائے تو کیا جائز نہ ہوگا جو بھی حکم ہو بہت ہی جلد ارقام فرمایا جاوے کیونکہ مقدمہ کچہری میں در پیش ہے۔ بینوا توجروا۔

المستفتی: فضل الرحمٰن
محلہ پکنا پہاڑی ڈاکخانہ مراد پور
مکان نواب امیر حسن صاحب

الجواب

حق شفعہ ثابت کرنے کیلئے کسی کو وکیل کر دینا جائز ہے۔

قال فی العالمگیریۃ: واذا وکل رجل رجلاً بأخذ دار لہ بالشفعۃ ولم یعلم الثمن صح التوکیل واذا اخذھا الوکیل بما اشتراھا المشتری لزم المؤکل الخ۔ ج ۶، ص ۱۲۹۔

پس صورت مذکورہ میں عورت کا اپنے شوہر کے ذریعہ سے طلب مواثبت و طلب اشہاد کرانا صحیح ہے۔ شوہر اس کا وکیل ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۱۸ رجب المرجب ۱۳۴۰ھ

شفعہ کی ایک خاص صورت کا حکم | السوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک صحرائی زمین مثلاً ایک سو بیگہ عمرو کے ہاتھ فروخت کی پھر اسی جلسہ میں عمرو نے اس جائیداد میں سے مثلاً پانچ بیگہ بکر کے ہاتھ فروخت کی اس پانچ بیگہ زمین میں خالد شفیع تھا جب اس فروخت کی اطلاع خالد کو ہوئی تو فوراً شفعہ کرنے کیلئے گواہان کے سامنے اقرار کیا اور ان گواہوں کو ساتھ لے کر بکر کے پاس گیا اور واپسی کے واسطے کہا۔ اور عدالت میں دعویٰ شفعہ کا بنام زید وبکر دائر کردیا اور عمرو کو درمیان سے نکال دیا اب سوال یہ ہے کہ شفعہ کا دعویٰ عمرو اور بکر پر ہوسکتا ہے یا زید وبکر پر یا تینوں پر۔ بینوا توجروا۔

الجواب:۔ قال فی الھدایۃ: ویشھد علی البائع ان کان المبیع فی

يده معناه لم يسلم الى المشترى او على المبتاع او عند العقار فاذا فعل ذلك استقرت شفعته وهذا لأن كل واحد منهما خصم فيه لان للأول اليد و للثانى الملك وكذا يصح الاشهاد عند المبيع لان الحق متعلق به فان سلم البائع المبيع لم يصح الاشهاد عليه لخروجه من ان يكون خصما اذ لا يد له ولا ملك فصار كالاجنبى اھ

قال المحشى ولم يقيد بكون الدار فى يد المشترى لان هذا لا يتفاوت فان الطلب عند المشترى صحيح سواء كانت الدار فى يده او فى يد البائع هذا كله من الذخيرة اھ ج ۴، ص ۳۷۷

وفى العالمگيرية: ولو كان المشترى الأول اجنبياً اشتراها بالف فباعها من اجنبى بالفين فحضر الشفيع فالشفيع بالخيار إن شاء اخذ بالبيع الأول وإن شاء اخذ بالبيع الثانى لوجود سبب الاستحقاق وشرطه عند كل واحد من البيعين فان اخذ بالبيع الأول سلم الثمن الى المشترى الأول والعهدة عليه وينفسخ البيع الثانى ويسترد المشترى الثانى الثمن من الأول، وإن اخذ بالبيع الثانى تم البيعان جميعا والعهدة على الثانى غير انه إن وجد المشترى الثانى والدار فى يده فله أن يأخذه بالبيع الثانى سواء كان المشترى الأول حاضرا أو غائباً وان اراد أن يأخذ بالبيع الأول فليس له ذلك حتى يحضر المشتري الثانى هكذا ذكره القاضى الإسبيجابى فى شرحه لمختصر الطحاوى ولم يحك خلافا وذكر الكرخى ان هذا قول ابى حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى (ج ۶، ص ۱۲۱)

وقال فيه ايضاً: وفى قول ابى يوسف لا تشترط حضرته اى حضرة المشترى الثانى وان كان الدار فى يده فافهم (ج ۶، ص ۱۲۰)۔

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں شفیع کو اختیار ہے خواہ بیع اول کی وجہ سے شفعہ کا دعویٰ کرے یا بیع ثانی کی وجہ سے اور بہر صورت بائع اول یا بائع ثانی پر جب ہوسکتا ہے جبکہ جائیداد پر ان میں سے کسی کا قبضہ ہو۔ پس اگر

بائع اول نے بائع ثانی کو قبضہ دلا دیا اور بائع ثانی نے مشتری ثانی کو قبضہ دلا دیا تو اب صرف دعویٰ مشتری ثانی پر ہو سکتا ہے۔ خواہ بیع اول کی وجہ سے شفعہ طلب کرے یا بیع ثانی کی وجہ سے۔ اور اگر بائع اول نے بائع ثانی کو قبضہ نہیں دلایا تو آب شفیع کو دو اختیار ہیں اگر بیع اول کی وجہ سے شفعہ لینا چاہے تو بائع اول یا بائع ثانی پر دعویٰ کرے اس صورت میں مشتری ثانی پر دعویٰ نہیں کر سکتا اور اگر بیع ثانی کی وجہ سے دعویٰ کرے تو بائع ثانی اور مشتری ثانی پر دعویٰ کرے اس صورت میں بائع اول پر دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور اگر بائع اول نے بائع ثانی کو قبضہ دلا دیا لیکن بائع ثانی نے مشتری ثانی کو قبضہ نہیں دلایا تو اس صورت میں بائع اول پر دعویٰ نہیں ہو سکتا صرف بائع ثانی یا مشتری ثانی پر ہو سکتا ہے خواہ طلب شفعہ بیع اول کی وجہ سے کرے یا بیع ثانی کی وجہ سے اگر بیع اول کی وجہ سے شفعہ لے تو قیمت مشتری اول کو دے اور وہی تمام حقوق عقد کا ذمہ دار ہوگا اور بیع ثانی باطل ہو جائے گی۔ اور اگر بیع ثانی کی وجہ سے شفعہ لے تو دونوں بیع تام ہو جائیں گی اور اس صورت میں مشتری ثانی کو قیمت دے اور اب مشتری ثانی جملہ حقوق عقد کا ذمہ دار ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۹ ر جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ

حق شفعہ بوقت طلب تاخیر ثمن سے باطل نہیں ہوتا

السوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین معاملہ ھذا میں کہ احمد۔ محمود۔ مسماۃ صفیہ نصفی کے اور زید ایک حصہ ومسماۃ زینب دو حصہ نصفی کے ایک مکان میں مشترکاً قابض ہیں۔

احمد اور مسماۃ صفیہ نے اپنا حصہ فروخت کرنا چاہا، زید کو اطلاع کی اس نے اس کی خریداری پر اپنی آمادگی کا فوراً اظہار کر دیا پھر روپیہ کے انتظام میں کچھ دیر ہوئی تو احمد اور مسماۃ صفیہ نے اپنا حصہ خالد کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ کر لیا زید نے خالد پر ظاہر کیا کہ میں اس کا خریدار ہوں خالد نے کہا کہ مجھے اس کی خریداری کی ضرورت نہیں ہے میں تو بائعان کی ضرورت پورا کرنے کی غرض سے خریدتا ہوں تم لینا چاہو تو میں ہٹ جاتا ہوں اور میرا زر بیعانہ دے دیا جائے۔

زید نے کہا کہ پندرہ روز میں روپیہ کے انتظام ہونے نہ ہونے کا حال معلوم

ہوجائے گا اس قدر مہلت دیدی جاتے اس پر خالد نے کہا کہ جلدی بائعان کو ہے مجھے نہیں وہ مہلت دیں تو مجھے اعتراض نہیں زید نے زبانی اور تحریری احمد سے مہلت طلب کی مگر احمد اور مسماۃ صفیہ نے فوراً حصہ خالد کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بیعنامہ دستخطوں کے لئے زید کے پاس بھیجا تو زید نے اِن لفظوں سے انکار کیا کہ دستخط کر کے میں اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری پھیر لوں۔ یہ میرا حق ہے میں ضرور لوں گا۔ دستخطوں سے یہ انکار دو آدمیوں کے سامنے تھا جن میں سے ایک بائع دوسرا منجانب مشتری تھا زید کو اس بیع کی اطلاع اُسی وقت ہوئی جبکہ بیعنامہ دستخطوں کے واسطے اس کے سامنے آیا۔ اب خالد کو یہ خبر پہنچ گئی مگر اس نے کچھ پرواہ نہ کی اور بیعنامہ رجسٹری کرا لیا زید نے تحریر بیعنامہ سے پہلے باحتمال اس کے شاید روپیہ کا فوراً انتظام نہ ہو سکے خالد کو یہ بھی لکھا کہ اگر مکان بیعنامہ آپ کے نام ہو گیا اور آئندہ ہم میں سے کسی نے کسی وقت لینا چاہا تو آپ موجودہ زرِ ثمن اور خرچ لیکر واپس دیدیں گے مگر اس پر خالد نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اِس کے بعد بیعنامہ لکھا گیا زید نے بالوتوف اپنی آمادگی خریداری کا اعلان کر دیا زینب کو زید اور دیگر ذرائع سے اطلاع ہوئی کیونکہ وہ اس کے باپ کا مکان تھا اس لئے وہ ہر وقت اپنی خرید کا مضطربانہ اعلان کرتی رہی زینب کے پاس آنے جانے والی عورتوں کے ذریعہ جب اُسے خلافِ منشا بیع کا علم ہوا تو وہ گریہ وزاری میں مبتلا ہو گئی اور ظاہر کیا کہ میں اُسے خریدنا چاہتی تھی میرے باپ کی چیز ہے میں اس کی خرید کیلئے حق مقدم رکھتی ہوں میں ضرور لوں گی زینب نے مکان کی خرید کیلئے اتنا بڑا اہتمام کیا کہ اس نے اپنی آمدنی کی صحرائی جائیداد فروخت کر دینے کا پختہ ارادہ ظاہر کیا چنانچہ دوسری جگہ اس کا معاملہ طے کر لیا زید اور زینب ایک ماہ کے اندر روپیہ لیکر خالد کے پاس گئے مگر خالد نے شفعہ کی قانونی میعاد یعنی سال بھر تک اس کے متعلق ہر قسم کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ زید یا زینب دونوں میں سے کسی کا شرعی حق شفعہ باقی ہے یا ساقط ہو گیا۔

۲۔ : زید و زینب شفیع و خلیط ہیں اور خالد کو ان کی خریداری پر آمادگی اچھی طرح معلوم تھی ایسی حالت میں خالد کا یہ فعل خرید اور شفیع کا محروم کرنا جائز ہے یا ناجائز۔

س۳: تکمیل بیعنامہ پر ہو جاتی ہے یا بوقت رجسٹری ہوتی ہے۔ بینوا توجروا۔
المستفتی: عبد اللہ

الجواب

قال فی الدر المختار: ویطلبها الشفیع فی مجلس علمه من مشتر او رسوله او عدل او عدد بالبیع وان امتد المجلس کالمخیرة بلفظ یفهم طلبها کطلبت الشفعة أو اطلبها وهو یسمی طلب المواثبة ای المبادرة والاشهاد فیه لیس بلازم بل لمخافة الجحود ثم یشهد علی البائع لو العقار فی یده أو علی المشتری وان لم یکن ذا ید لانه مالك او عند العقار فیقول اشتری من فلان هذه الدار وانا شفیعها وقد کنت طلبت الشفعة و أطلبها الآن فاشهدوا علیه وهو طلب الاشهاد ویسمی طلب التقریر وهذا الطلب لا بد منه حتی لو تمکن ولو بکتاب أو رسولٍ ولم یشهد بطلت شفعته (قال الشامی لکن رأیت فی الخانیة انما سمی الثانی طلب الاشهاد لا لان الاشهاد شرط فیه بل لیمکنه اثبات الطلب عند جحود الخصم اه تأمل ثم بعد هذین الطلبین یطلب عند قاض ویسمّی طلب تملیك و خصومة وبتاخیره مطلقا بعذر وبغیره شهراً او اکثر لا تبطل الشفعة حتی یسقطها بلسانه وبه یفتی وهو ظاهر المذهب وقیل یفتی بقول محمّد ان اخره شهراً بلا عذر بطلت یعنی دفعا للضرر اه ورجح الشامی قول محمّد وصاحب الدر ظاهر الروایة فلیتأمل اه ج/۵، ص/۲۲۱۔

صورت مسئولہ میں چونکہ شفیع نے خبر بیع سنتے ہی طلب مواثبت کی اور دو آدمیوں کے سامنے جن میں سے ایک بائع تھا ایک مشتری کا رسول تھا طلب کو ظاہر کیا اس لئے قاضی خان کے قولِ صحیح پر شفیع کو طلب شفعہ کا حق ہو گیا۔

(اما علی قول المتون فلا لانه لم یوجد طلب فکان یلزم ان یکون رجلان سوی البائع) ثم رأیت ابن عابدین قد استظهر قول

الخانية فی تنقیح الفتاوی الحامدیة وقواہ (ج ۲، ص۱۶۸) - اور اب تاخیر دعویٰ سے شفعہ باطل نہ ہوگا علی ظاہر الروایۃ واللہ اعلم۔

قال فی الهداية : و تجوز المنازعة فی الشفعة وإن لم یحضر الشفيع الثمن الی مجلس القاضی فاذا قضی القاضی بالشفعة لزمه احضار الثمن وهذا ظاهر الرواية - وعن محمد أنه لا يقضی حتی يحضر الشفيع الثمن وهو رواية الحسن عن ابی حنيفة لان الشفيع عساه ان يكون مفلسا فيتوقف القضاء على احضاره الثمن حتی لا مال المشتری وجه الظاهر انه لا ثمن عليه قبل القضاء ولهذا لا يشترط تسليمه فكذا لا يشترط احضاره واذا قضی له بالدار فللمشتری ان يحبسها حتی يستوفی الثمن وينفذ القضاء عند محمد أيضاً لانه مجتهد فيه و وجب عليه الثمن فيحبس فيه فلو اخر اداء الثمن بعد ما قال له (القاضی) ادفع الثمن اليه لا تبطل شفعته لانها تأكدت بالخصومة عند القاضی اھ ج/۴، ص/۳۷۹ -

قلت وبهذا علم أن الشفعة لا تبطل بتاخير الشفيع الثمن عند طلب المواثبة بالاولیٰ لانه لا ثمن عليه عند الطلب بل عند قبض المشفوع فيه -

ع۲ : چونکہ زید اور زینب نے روپیہ مہیا کرنے میں دیر کی اس لئے خالد کو اس مکان کے خریدنے میں گناہ نہیں ہوا مگر زید اور زینب کی اس تاخیر سے اِن کا حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوا۔

ع۳ : شرعاً تکمیل بیع ایجاب وقبول پر ہوجاتی ہے خواہ زبانی ہو یا تحریری - رجسٹری کو اس میں دخل نہیں وہ تو محض پختگی معاملہ کیلئے ہے فقط واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۸ر جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ

مکرر سوال از جانب مشتری متعلق سوال مذکور از دیوبند و خانقاہ امدادیہ

السوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید وعمر ایک مکان میں شریک ہیں عمر اپنی ضرورت کی وجہ سے اپنا حصہ فروخت کرتا ہے کچھ عرصہ تک اول زید سے جو کہ شفیع ہوتا ہے بیع وفروخت کی گفتگو ہوتی رہی جب حسب منشاء عمر، زید شفیع سے کوئی معاملہ طے نہ ہوا تو چند ذرائع سے غیر شخص کو خریدنے پر متوجہ کیا۔ ۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایجاب وقبول ہو کر زبانی طور پر مبیع غیر شخص کو سپرد کر دی گئی اور کچھ زر ثمن بطور بیعانہ رسید لکھ کر لے لیا گیا اور بقیہ کا وعدہ بوقت تکمیل کاغذ ٹھہرا۔

ع۱ اول رسید بیعانہ ملاحظہ ہو نقل حاضر ہے مشتری نے بعد تکمیل رسید بیعانہ بائع سے کہا کہ تم نے شفیع سے زبانی حجت تو قطع کر لی مگر اس میں ہے کہ بذریعہ نوٹس بھی حجت قطع کر لوں تاکہ قانونی حجت بھی قطع ہو۔ بائع نے ۹ نومبر ۲۷ء کو بذریعہ نوٹس شفیع کو مطلع کیا مگر شفیع کو نوٹس ۱۳ نومبر ۲۷ء کو ملا جس کو شفیع نے نوٹس کے جواب میں نوٹس ہی کے ذریعہ سے بائع کو مطلع کرتا ہے ۱۶ نومبر کو۔

ع۲ : ملاحظہ ہو کہ شفیع اس میں لکھتا ہے کہ اس معاملہ میں صحیح علم مجھے ابھی ہوا ہے قیمت وغیرہ کا۔ پھر شفیع نے ۱۶ نومبر ۲۷ء کو مشتری کے نام ایک تحریر بھیجی جس میں طلب وعدہ واپس مبیع وطلب رہائش بحالت اشتراک دریافت کرتا ہے۔

ع۳ : پھر ۱۶ نومبر ۲۷ء کو شفیع نے ایک نوٹس بنام بائع لکھا جس میں شفیع نے شکایات بیان کر کے طلب حق وطلب وطلب مہلت کی مکرر ع۲ کو ملاحظہ فرماویں ۱۳، ۱۶ تاریخوں کے درمیان شفیع نے کسی قسم کی گفت گو کسی سے نہیں کی نہ بائع سے نہ مشتری سے نہ مبیع سے۔ پھر غالباً ۱۸ نومبر کو وثیقہ لکھا گیا، مشتری نے وثیقہ شفیع کے پاس بھیجا کہ اس پر دستخط کرو مگر شفیع نے دستخطوں سے انکار کر دیا۔ اب سوال یہ ہے شرعاً صورت مسئولہ میں بیع کی تکمیل کب ہوگی آیا بوقت ایجاب وقبول وسپرد مبیع یا بوقت تکمیل کاغذ یا بوقت رجسٹری اور شفیع کو کب تک حق شفعہ صورت مسئولہ میں باقی رہے گا یا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب اللّٰھم انت الموفق للصواب (من مفتی دیوبند)

بیع کا انعقاد صرف ایجاب وقبول سے ہو جاتا ہے دستاویز کی تحریر یا اس کی تکمیل پر موقوف نہیں اور ایجاب وقبول کے بعد ہی بیع کا انتقال من ملک البائع الی ملک المشتری ہو جاتا ہے لیکن اس سے قبل کہ مشتری مبیع پر قابض ہو

بیع میں احتمال انفساخ عقد بہلاک مبیع باقی رہتا ہے اور جب مشتری نے مبیع پر قبضہ کر لیا تو یہ احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح انعقاد بیع یا انتقال مبیع من ملک البائع الی ملک المشتری اداء ثمن الی البائع پر موقوف نہیں ہے، بناء علیہ صورتِ مسئول عنہا میں بیع کا انعقاد ۷ر نومبر ۱۹۲۷ء ہی کو ہو چکا رہی بقا حق شفعہ کی بحث سو موجودہ صورت میں یہ حق باقی نہیں کیونکہ اگرچہ شفیع سے معاملہ طے نہ ہونے کے بعد دوسرے شخص سے معاملہ کیا گیا تاہم قبل وجود بیع بین البائع والمشتری اگر شفیع اپنے حق شفعہ کو ساقط کر دے تو حق شفعہ ساقط نہیں ہوتا جب بائع اور مشتری کے مابین بیع کا انعقاد ہو جائے گا تب اس کے بعد شفیع کو حق شفعہ حاصل ہوگا اور اسی وقت تسلیم شفعہ معتبر ہے۔

فتاوی انقرویہ میں ہے: ولو سلموا الشفعة قبل الشراء کان ذلك باطلاً اھ (ج ۲، ص ۳۶۸)

وفی زیلعی شرح الکنز: وقیل البیع هو السبب بدلیل ان الشفیع لو اسقط الشفعة قبل الشراء لا یصح لکونه اسقاطاً قبل وجود سببه وهو البیع ولو کان السبب هو الاتصال لصح لکونه بعد وجود السبب (وجوابه) انه انما لم یصح الاسقاط قبله لفقد شرطه وهو البیع لان السبب لا یکون سبباً الا عند وجود الشروط کما فی طلاق المعلق۔ (ج ۲ ص ۲۴۲)

لیکن کاغذات منسلکہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد انعقادِ بیع شفیع تسلیم حق شفعہ کر چکا ہے کیونکہ نوٹس بائع بنام شفیع ۱۳ر نومبر ۲۷ء کو شفیع کے پاس پہنچا اور شفیع نے اس کا جواب ۱۶ر نومبر ۲۷ء کو لکھا ہے اس قدر مدت کے بعد جواب دینا مسقط حق شفع ہے مجلہ کی دفعہ (۱۰۳۳) میں ہے۔

لو أخر الشفیع طلب التقریر والاشهاد مدة یمکن اجراءها فیها ولو بارسال مکتوب یسقط حق الشفیع۔

اور شفیع کی تحریر کہ اس معاملہ میں صحیح علم مجھے ابھی ہوا اگر حقیقی معنی کے اعتبار سے لیا جاوے تو چونکہ نوٹس اس کے پاس ۱۳ر نومبر ۱۹۲۷ء کو پہنچ چکا ہے اس لئے

یہ کذب ہے اور اگر مجازاً مراد یہ ہے کہ وصول نوٹس منجانب بائع بنام شفیع کیوقت علم ہو تو طوالت مدت مسقط حق شفعہ ہے علاوہ ازیں نوٹس شفیع بنام مشتری مرسلہ ۱۶ر نومبر ۱۹۲۷ء ہی میں شفیع مشتری سے کیفیت رہائش دریافت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آئندہ ہمارے ہاتھ اس مکان کو فروخت کردو گے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت موجودہ بیع کو فسخ کرنا نہیں چاہتا بلکہ آئندہ کیلئے مشتری سے وعدہ بیع لینا چاہتا ہے تو اس لئے بھی حق شفعہ ساقط ہے مجلہ کی دفعہ (۱۰۲۴) میں ہے۔

بشرط ان لا یکون الشفیع رضی فی عقد البیع الواقع صراحۃ او دلالۃ مثلاً اذا سمع عقد البیع وقال ہو مناسب یسقط حق شفعہ ولیس لہ طلب الشفعۃ بعد ذلك وکذا اذا اراد ان یشتری او یستاجر العقار المشفوع من المشتری بعد سماعہ بعقد البیع یسقط حق شفعتہ الخ

۱ر نقل رسید بیعانہ ٹکٹ مع دستخط

بندہ مقصود الحسن پسر حکیم نور الحسن پیرزادہ
قصبہ گنگوہ محلہ کوٹلہ

جو کہ مبلغ چھ سو روپیہ نصف جس کے تین سو روپیہ ہوتے ہیں پاس سے حکیم مسعود احمد صاحب پیشگی بطور بیعانہ منجملہ بارہ سو روپیہ بابت حصہ خود مکان و بیٹھک و بیلخانہ مولوی محمد شفیع صاحب واقع محلہ الٰہی بخش جس پر بذریعہ بیعنامہ ۱۳ر اگست ۱۹۲۷ء مالک و قابض و متصرف ہوں وصول پاکر رسید لکھ دیں بقیہ روپیہ بوقت رجسٹری لونگا۔ مورخہ ۷ر نومبر ۲۷ء

گواہ گواہ گواہ دستخط
مقصود الحسن

۲ر نقل نوٹس منجانب شفیع بنام بائع۔

عزیزم مقصود الحسن

تمہارا نوٹس ملا تاریخ میعادی ۲۴ر نومبر ۱۹۲۷ء مجھے ۱۳ر نومبر ۲۷ء کو بوقت شام وصول ہوا جس پر میں بغیر افسوس کئے ہوئے نہیں رہ سکتا اس معاملہ

میں صحیح علم مجھے ابھی ہوا نصف حصہ مکان کی قیمت سہ ہزار وہ بھی ابھی تم سے اور دیگر صاحبان کی زبانی معلوم ہوئی۔ مجھے اور والدہ صاحبہ کو مکان کی سخت ضرورت ہے اس لئے مذکورہ قیمت پر نصف حصہ مکان حضرت نانا مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کا خریدار ہوں مگر اس کام کیلئے میعاد کم ہے۔ ایک ماہ ہونی چاہئے تھی ۱۳ر نومبر ۲۷ء کی شام کو مجھے نوٹس ملا میری ضرورت اور حقوق خریداری پر نظر کرتے ہوئے ۱۴ر نومبر ۲۷ء سے ۲۸ر نومبر ۲۷ء تک ۱۵ر یوم کی مہلت تو مجھے ملنی چاہیئے ہارون سلمہ نابالغ ہے اس کا حصہ تاحصول اجازت ضابطہ بیع نہ ہو سکے گا اس تمہارا اور تمہاری بہن کا حصہ اس وقت معرض بیع میں ہوگا اگر میں ۲۹ر نومبر ۲۷ء تک تمہاری اور تمہاری بہن کے حصہ کا بیعنامہ نہ کرا سکا تو پھر جو تم نے چاہا وہ ہی کرو گے میرے لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دستخط

عزیز الحسن غفرلہ

۳۔ نقل مکتوب بنام مشتری منجانب شفیع

حضرت مخدوم حکیم مسعود احمد صاحب بعد سلام مسنون نیازمندانہ عرض آنکہ اگر حصہ مکان حضرت نانا صاحب مرحوم جناب کے نام بیع ہوگیا اور آئندہ کسی وقت ہم میں سے کسی نے کبھی اپنی ضرورت کیوجہ سے لینا چاہا تو از راہ کرم ونوازش موجودہ خرچ وزرِ ثمن لیکر ہم کو عنایت فرمادیا جاوے گا۔

بصورتِ مذکورہ رہائش کی کیا صورت ہوگی۔ حضرت والدہ صاحبہ مکرمہ دیر سے خود اس مکان میں آنے اور رہنے کی متمنی ہیں ان کے پاس رہنے کا کسی عورت کا انتظام نہیں اگر ہوگیا اور وہ آنا اور رہنا چاہیں تو کیا صورت ہوگی وہی جو اب تک رہی یا کچھ اور براہ کرم جواب باصواب سے ممنون فرماویں۔ نیاز مند

عزیز حسن عفی عنہ

۱۲ر نومبر ۱۹۲۷ء

استفتاء از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

السوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید وعمر ایک

مکان میں شریک ہیں عمر اپنا حصہ فروخت کرتا ہے۔ ۷ر نومبر ۱۹۲۷ء کو بائع نے ایک غیر شخص مشتری سے گفتگو بیع و فروخت کی کر کے ایجاب و قبول کیا اور زبانی سپردِ مبیع کر کے تکمیل وثیقہ کو مؤخر قرار پایا۔ جیساکہ مضمون رسید بیعانہ منسلک ھذا ع۱ اول ملاحظہ ہو جوکہ حسب ضابطہ قانون بائع نے تحریر کی مشتری نے بائع سے کہا کہ تم نے جو سب حجتیں شفیع سے قطع کرلیں یہ ٹھیک نہیں بذریعہ نوٹس بھی قانونی حجت قطع کرلو چونکہ بائع اور شفیع میں قرابت قریبہ ہے اس لحاظ سے نوٹس دینا معیوب سمجھا مگر مشتری کی تاکید پر بائع نے بجائے ۷ر نومبر ۲۷ء کے ۹ر نومبر ۲۷ء کو نوٹس دیا جو کہ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۷ء کو شفیع کو ملا جیساکہ شفیع نے اپنے مکتوب نوٹس محررہ ۱۶ر میں ظاہر کیا کہ مجھے صحیح علم ابھی ہوا۔

نقل مضمون نوٹس بنام بائع ع۲ ملاحظہ ہو۔

پھر شفیع نے ۳ر یوم گزار کر اول ایک تحریر مشتری کے پاس بھیجی جس میں مضمون وعدۂ واپسی مبیع و بحالت اشتراک صورت رہائش دریافت کی ع۳ منسلک ھذا ملاحظہ ہو۔ پھر ۱۶ر نومبر کو شفیع نے بذریعہ نوٹس بائع سے طلب حق و مہلت کی درخواست کی وہ بھی مضامین کثیرہ کے بعد ع۲ منسلک ھذا کو مکرر ملاحظہ فرماویں ۱۸ یا ۱۹ کو وثیقہ لکھا گیا ۲۳ر یا ۲۴ کو رجسٹری ہوا ہر سہ کاغذات منسلکہ ھذا کو ملاحظہ فرما کر حکم شرعی سے مطلع فرماویں کہ شفیع کو حق شفعہ باقی ہے یا نہ اور تکمیل ایجاب و قبول کے وقت تمام ہوئی یا سپرد مبیع پر یا تحریر وثیقہ یا رجسٹری پر بلینوا توجروا اس سوال پر حسب ذیل تنقیح کی گئی۔

ع۱ : بائع نے اپنے نوٹس میں کیا لکھا تھا۔ آیا یہ کہ میں نے مکان فلاں مشتری کے ہاتھ بیع کردیا یا کہ بیع کا ارادہ ہے۔

ع۲ : کیا سائل کو اس بات کا علم ہے کہ شفیع نے نوٹس کو پڑھکر یا (پڑھتے ہوئے) زبانی کسی کے سامنے طلب مواثبت ظاہر کی تھی یا نہیں۔

ع۳ : شفیع کا خط بنام مشتری ۱۶ر نومبر ۱۹۲۷ء جس میں مضمون وعدۂ واپسی مبیع و بحالت اشتراک صورت رہائش دریافت کی ہے۔ اس میں یہ لفظ ہے کہ اگر حصہ مکان حضرت نانا صاحب مرحوم جناب کے نام بیع ہوگیا الخ اس سے بظاہر یہ مفہوم

ہوتا ہے کہ اس وقت تک شفیع کے نزدیک بیع نہ ہوئی تھی۔ اس لیئے بائع کے نوٹس کے مضمون کی نقل بھیجنا ضروری ہے۔ جس کا جواب حسب ذیل آیا

جواب تنقیح

ع۱: نقل مضمون نوٹس بائع بنام مشتری اس وجہ سے شامل نہیں کیا تھا کہ شفیع نے بائع کو اغوا کر لیا ہے اس کے حصول میں شک واقع ہو گیا تھا اور اس وقت بائع سے یہی کہا گیا تھا کہ تم اطلاع کر دو کہ فلاں مکان فلاں شخص کے ہاتھ اتنی قیمت میں بیع کر دیا ۷، نومبر ۱۹۲۷ء کو ایجاب وقبول کے بعد شہرت عام ہو گئی تھی کہ فلاں مکان فلاں شخص کے ہاتھ اتنی قیمت میں بیع ہو گیا اسی مضمون کو شفیع اپنے ۱۶ ر نومبر کے نوٹس میں ظاہر کرتا ہے کہ (اس معاملہ میں صحیح علم مجھے ابھی ہوا ہے الخ)

ع۲: اس کا جواب کچھ نہیں دیا گیا، (البتہ جو استفتاء دیوبند بھیجا گیا اس کی نقل جواب تنقیح کے ساتھ بھیجی ہے جسمیں یہ الفاظ ہیں) ۱۳، ۱۶ کے درمیان تواریخ میں شفیع نے کسی قسم کی گفتگو کسی سے نہیں کی نہ بائع سے نہ مشتری سے نہ مبیع سے الخ۔

ع۳: چونکہ بیع وفروخت میں شریعت مقدسہ کا پڑھے لکھے کو بھی پورا خیال نہیں الا ماشاء اللہ ہر شخص اپنی جہالت تکمیل بیع تحریر وثیقہ ورجسٹری کو قطعی سمجھتے ہیں اس لیئے شفیع نے اپنے مکتوب ۱۶ ر نومبر ۱۹۲۷ء میں مشتری سے اگر کہ کے سوال کیا جس کی وجہ سے تنقیح کی نوبت آئی اور قبل از بیع مفہوم ہوا اور زبانی اطلاع ہوئی اور زبانی اطلاع تو خود مشتری نے ۱۳ ر کے بعد اور ۱۶ ر سے قبل صاف لفظوں میں شفیع سے بوقتِ ملاقات کہدیا تھا کہ شرعی بیع قطعی ہو چکی محض تحریر وثیقہ باقی ہے اس پر بھی طلب مواثبت نہیں کی خاموش ہو کر چلے گئے پھر اگلے روز ۱۶ ر نومبر ۱۹۲۷ء کو مکتوب طلب رہائش وغیرہ لکھا۔

عبد المجید تھانوی مقیم حجرہ شریفہ قدوسیہ رشیدیہ
۴ ر شعبان یوم جمعہ

الجواب (من جامع امداد الاحکام بتھانہ بھون)

سائل نے جواب تنقیح کے ساتھ جو استفتاء مع جواب کے بھیجا ہے اس کے

دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ مجیب نے سقوط شفعہ کی بناء امور ذیل پر رکھی ہے۔

ع۱: کاغذاتِ منسلکہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد انعقادِ بیع شفیع تسلیم حق شفعہ کر چکا ہے کیونکہ نوٹس بائع بنام شفیع ۱۳ر نومبر ۱۹۲۷ء کو شفیع کے پاس پہنچا ہے اور شفیع نے اس کا جواب ۱۶ر نومبر کو دیا ہے۔ اس قدر مدت کے بعد جواب دینا مسقطِ حق شفعہ ہے۔

ع۲: اور شفیع کی تحریر کہ اس معاملہ میں صحیح علم مجھ کو ابھی ہوا اگر حقیقی معنی کے اعتبار سے لیا جاوے تو چونکہ نوٹس اس کے پاس ۱۳ر نومبر کو پہنچ چکا ہے۔ اس لئے یہ کذب ہے۔ اور اگر مجازاً مراد یہ ہے کہ وصولِ نوٹس من جانب بائع شفیع کے وقت علم ہوا تو طوالتِ مدت مسقطِ حق شفعہ ہے۔

ع۳: علاوہ ازیں نوٹس شفیع بنام مشتری مرسلہ ۱۶ر نومبر ۱۹۲۷ء ہی میں شفیع مشتری سے کیفیت رہائش دریافت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آئندہ ہمارے ہاتھ اس مکان کو فروخت کردو گے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت موجودہ بیع کو فسخ کرنا نہیں چاہتا ہے آئندہ کیلئے مشتری سے وعدہ بیع لینا چاہتا ہے تو اس لئے بھی حقِ شفعہ ساقط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجیب مذکور نے جواب میں غایت درجہ مسامحت کی ہے اور جتنی بنائیں سقوط شفعہ کی اس نے بیان کی ہیں سب ناکافی ہیں۔ اول تو اس لئے کہ مجیب کو کاغذاتِ منسلکہ سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ بائع نے شفیع کو اپنے نوٹس میں یہ اطلاع دی تھی کہ میں نے مکان کی بیع کردی ہے کیونکہ بائع کے نوٹس کا مضمون کاغذاتِ منسلکہ میں نہیں ہے نہ سوال میں اس کی طرف اشارہ نہ حوالہ۔ بلکہ کاغذات میں جواب شفیع (جس کو نقل نوٹس منجانب شفیع بنام بائع ع۲ ظاہر کیا گیا ہے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بائع نے شفیع کو میعادی نوٹس دیا تھا اور وہ میعادی ۲۴ نومبر تھا اور شفیع اخیر میں لکھتا ہے کہ اگر میں ۲۹ر نومبر ۱۹۲۷ء تک تمہارے اور تمہاری بہن کے حصہ کا بیعانہ نہ کرا سکا تو پھر جو تم نے چاہا وہ کرو گے میرے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۲۷ء۔ اور شروع میں لکھتا ہے کہ نصف حصہ مکان کی قیمت ۳ ہزار وہ بھی ابھی تم سے اور دیگر صاحبان کی زبانی معلوم ہوئی اس عبارت سے متبادر یہ ہے کہ بائع نے شفیع کو بیع کی اطلاع نہیں دی بلکہ ارادۂ بیع کی اطلاع

دی تھی اور نوٹس میں قیمت کا ذکر نہ تھا بلکہ شفیع کو اس کا علم زبانی ہوا۔ پس بدون دریافت مضمون نوٹس بائع کے مفتی کا فتوٰی دینا جائے حیرت ہے۔ اور قبل اس تنقیح کے شفیع کی تاخیر کو مسقط شفعہ کہہ دینا صریح مسامحت ہے کیونکہ تاخیر طلب بعد علم بیع کے مسقط شفعہ ہے نہ قبل از علم بیع کما حررہ مفتی ایضاً۔ اور ثانی اس لئے کہ بلاوجہ شرعی مسلمان کے کلام کو کذب پر محمول کرنے کی کیا وجہ ہے۔ ممکن ہے کہ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۷ء کو شفیع کو صحیح علم ہوا ہو مگر قابل تنقیح تو یہ امر ہے کہ اس کو صحیح علم کس امر کا ہوا بیع کا یا ارادۂ بیع کا۔ شفیع کے نوٹس کی اخیر عبارت مدلول ثانی کو بتلا رہی ہے اس لئے طوالت مدت مسقط شفعہ نہیں ہوسکتی تھی مجیب کو یہ عبارت لکھتے ہوئے شفیع کی پوری عبارت کو پڑھ کر اس کا مدلول متعین کرکے لکھنا چاہیئے تھا اور اس وقت اس کو اس تنقیح کی ضرورت خود محسوس ہوجاتی کہ بائع کے نوٹس کا کیا مضمون تھا۔

اور ثالث اس لئے کہ شفیع نے مشتری کو جو نوٹس دیا ہے اس نوٹس کو شفیع نے اس لفظ سے شروع کیا ہے کہ "اگر حصہ مکان حضرت نانا صاحب مرحوم جناب کے نام بیع ہوگیا الخ"، اس کلام مشروط سے متبادر یہ ہے کہ اس نوٹس کے لکھنے کے وقت تک شفیع کے نزدیک اس مکان کی بیع نہیں ہوئی ورنہ اگر بیع ہوچکی ہوتی تو وہ سوال نہ کرتا۔ اور جب شفیع کی یہ تحریر انیز مدلول کے موافق قبل از بیع ہے تو اس کو مسقط شفعہ کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ مجیب نے اس پر جواب کے شروع میں خود اس کی تصریح کردی ہے کہ قبل از بیع اسقاط شفعہ سے شفعہ ساقط نہیں ہوتا۔

بہر حال جو کاغذات منسلکہ سائل نے مجیب اول کے پاس بھیجے اور جو اولاً ہمارے پاس بھیجے گئے ان کی بنا پر سقوط شفعہ کا حکم اور فتوی دینا ہرگز صحیح نہیں جب تک بائع کے نوٹس کا مضمون معلوم نہ ہوجائے۔ کیونکہ شفیع کا نوٹس بنام بائع اور بنام مشتری اوس امر کو ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو ۱۶ر نومبر تک اس مکان کے بیع ہوجانے کا علم نہیں ہوا۔

اب میں جوابات تنقیح کی طرف توجہ کرتا ہوں اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ بائع کو یہی کہا گیا تھا کہ تم (شفیع کو) اطلاع کردو کہ فلاں مکان فلاں شخص کے ہاتھ اتنی قیمت میں بیع کردیا۔ سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بائع نے اس کی تعمیل بھی کی جب تک اس کی تحریر سامنے نہ ہو کیونکہ شفیع کا نوٹس بنام بائع ۲؎ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو

نوٹس سے نہ بیع کا علم ہوا نہ قیمت کا بلکہ ارادہ بیع کا صحیح علم ہوا اور قیمت کا علم زبانی ہوا کما ذکر ناہ مفصلا ان ذلك مدلول له ظاهراً۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ، ۷، نومبر ۱۹۲۷ء کو ایجاب و قبول کے بعد شہرت عام ہوگئی تھی الخ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شفیع کو بھی مفصل علم بذریعہ عدل کے ہوگیا ہو ممکن ہے اس کو افواہا غیر عدل سے خبر ملی ہو۔ ولا یسقط حقه بالسکوت علی اخبار غیر العدل یا عدل نے خبر دی ہو مگر کل بیع اور کل ثمن کی مفصل اطلاع نہ دی ہو۔ ولا یسقط حق الشفعة بالسکوت علی مثل هذا الخ

اس کے بعد لکھا ہے کہ، ہر شخص بوجہ جہالت تکمیل بیع تحریر وثیقہ و رجسٹری کو سمجھتا ہے اسی لئے شفیع نے اپنے مکتوب ۱۶، نومبر ۱۹۲۷ء میں مشتری سے اگر کر کے سوال کیا الخ مگر اس میں یہ خدشہ ہے کہ اس جہالت کا احتمال جیسا شفیع کی جانب ہے۔ بائع کی جانب بھی ہے۔ ممکن ہے اس نے تحریر وثیقہ اور رجسٹری نہ ہونے کی وجہ سے ۹، نومبر کے نوٹس بنام شفیع میں یہ نہ لکھا ہو کہ مکان کی بیع ہوچکی بلکہ یہ لکھا ہو کہ فلاں تاریخ کے بعد بیع ہو جاوے گی۔

ولا یسقط الشفعة بالسکوت علی علم ارادة البیع او التراخی فی الطلب عنه۔

دوسرے یہ ایک محض احتمال ہے کہ شفیع نے محض جہالت سے ایسا سمجھا اس کی تحقیق درجہ جزم میں بدون مضمون نوٹس بائع کے دیکھے نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ، زبانی اطلاع میں تو صرف مشتری نے ۱۳، نومبر کے بعد اور ۱۹، نومبر سے قبل صاف لفظوں میں شفیع سے کہہ دیا تھا کہ شرئی قطعی ہوچکی ہے محض تحریر وثیقہ باقی ہے اس پر بھی طلب مواثبت نہیں کی الخ یہ سب جزو البتہ قابل توجہ مگر حیرت یہ ہے کہ اس جزو کو نہ یہاں اولاً ظاہر کیا گیا نہ استفتاء دیوبند میں ظاہر کیا گیا بلکہ ہماری تنقیح کے بعد ظاہر کیا گیا۔

دوسرا اس میں بھی پوری بات ظاہر نہیں کی گئی کہ مشتری نے اس مجلس میں شفیع کو کل مبیع اور کل ثمن کی بھی مفصل اطلاع کر دی تھی۔ اور یہ کہ یہ مجلس شفیع کے حق میں اول مجلس علم تھی اور یہ کہ اس نے اس سے پہلے بائع کے یا مبیع کے سامنے طلب مواثبت نہیں

کی تھی۔ اس واسطے اس جزو کی وجہ سے بھی قطعی فتویٰ نہیں دیا جا سکتا صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس مجلس میں مشتری نے شفیع کو قطعی بیع ہو چکنے کی خبر کے ساتھ کل مبیع اور کل ثمن کی بھی اطلاع کردی تھی اور یہ مجلس شفیع کے حق میں پہلی مجلس علم تھی یا اس سے پہلے اس نے بائع یا مشتری کے سامنے طلب مواثبت نہ کی تھی تو اس مجلس میں ترکِ مواثبت سے اس کا حقِ شفعہ ساقط ہوگیا۔ اور اگر ان شرائط میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگئی تو حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۷ر شعبان ۱۳۴۶ھ

دعویٰ شفعہ سے بچنے کی خاطر مبیع کی قیمت زیادہ لکھوانا | السوال:۔ ایک شخص زمین خریدنا چاہتا ہے مگر رقم تو صرف دو سو روپے دیتا ہے اور چار سو لکھواتا ہے۔ اور مالک بھی اس بات پر راضی ہے بلکہ مالک چار سو روپیہ اس لئے لکھواتا ہے تاکہ کوئی حقِ شفعہ نہ کرے۔ اور اگر کوئی حق شفعہ کرے تو پورے چار سو روپیہ ادا کرے تو حضور والا سے اس مسئلہ کے بابت عرض ہے کیا دو سو روپیہ دیکر چار سو روپیہ لکھوانا پھر جو حق شفعہ کرے اس سے بھی چار سو روپیہ وصول کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ امید ہے کہ جواب سے نوازیں گے۔

الجواب

اس طرح کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۸ر رجب المرجب ۴۸ھ

شفعہ کی ایک صورت کا حکم | السوال:۔ ایک عورت نے اپنا مکان بعوض چار سو روپیہ اپنی ساس کے نام بیع قطعی کرا یا جس کو عرصہ نو ۹ ماہ کے قریب ہوا ہے اور بعد انتقال بیع مسماۃ بائعہ کا انتقال ہوگیا مجھے اس ماہ کے اندر اندر پتہ چلا کہ ایسا معاملہ ہوا ہے فوراً اپنے بھائی صاحب کو اطلاع دی کہ آپ شفیع ہیں میرے بھائی نے یہ خط پڑھنے کے بعد ایک گواہ کے سامنے شرائط حق شفعہ ادا کیں اور مجھے لکھا

کہ میں شفیع ہوں اور مطالبہ شفعہ کا کروں گا خریدار مکان یہاں پر موجود نہیں ہے ابھی تک اس کے مقابلہ پر شرائط شفعہ ادا نہیں ہوئیں اور جب مجھے علم ہوا تھا اس وقت بھی خریدار مکان یعنی مسماۃ بائعہ کی ساس یہاں موجود نہ تھی ایسی صورت میں کیا ہونا چاہئیے سنا ہے کہ دھلی میں ہے لیکن مفصل پتہ معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔

دوسرا امر قابل دریافت یہ ہے کہ زرثمن مکان مذکور کا چارسَو روپیہ قرار دیا گیا ہے اور نفس الامر میں قیمت زیادہ ہے اب میرے بھائی کو چار سو روپیہ زرِ ثمن پر مطالبہ شفعہ کرنا چاہئیے یا کمی بیشی پر۔ بینوا توجروا۔

احقر العباد عابد حسین
محلہ امروہہ دربار کلاں

تنقیح

جس خط کے ذریعہ اطلاع بیع مکان مذکور کی دیگئی تھی اس میں اس اطلاع کے ساتھ اور کوئی مضمون بھی تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو بیع کی اطلاع خط کے آخر میں تھی یا شروع میں یا درمیان میں اور طلب شفعہ کا گواہ پورے خط کو پڑھنے کے بعد بنایا یا درمیان میں ہی فقط بیع کی خبر پڑھ کر۔ اس کا جواب مع اس پرچہ کے دیا جاوے۔

احقر عبد الکریم
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

جواب تنقیح

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جس خط میں بیع کی خبر دی گئی تھی وہ خط بعینہ ارسال ہے پورا خط پڑھنے کے بعد طلب شفعہ کا گواہ بنایا تھا۔

احقر زاہد حسین
شفیع مکان مبیعہ

مرسلہ خط

دیگر احوال آنکہ آپکے قریب میں سبط علی والا مکان جو ہے وہ سبط علی

نے اپنی بہو کے نام بیع کر دیا تھا جب اس کی بہو کا انتقال ہونے کے قریب ہوا تو اس نے مکان اپنی بیوی کے نام منتقل کرا دیا یعنی بہو نے اپنی ساس کے نام لکھ دیا اور مبلغ چارسو روپیہ کا بیعانہ بھی لکھ دیا ہے اور سبط علی کی بہو کا تب دق میں انتقال ہوگیا ہے۔ اب وکیلوں نے یہ رائے دی ہے کہ تمھارے بھائی کا شفعہ ہے وہ لینا چاہیں تو شرائطِ شفعہ فوراً ایک ایسے شخص کے سامنے ادا کردیں جو تاریخ پر عدالت میں بیان کردے کہ میرے سامنے انھوں نے شرائط شفعہ ادا کیں تھیں اور آپ کو یہاں آنے کی ضرورت فوراً ہوگی۔ تاکہ یہاں دو شخصوں کے سامنے کہا جاوے کہ میرا حق تھا میں شفیع ہوں اور شفعہ طلب کروں گا ایک شخص کے سامنے بیان کرنا کافی ہے جو آکر یہاں بیان کردے اور قیمت چارسو روپیہ اس نے قرار دی ہے۔ چارسو روپیہ ہی قیمت مانی جائے گی۔

الجواب ۷۸۶

حق شفعہ کے واسطے ابھی یہ امر قابل غور ہے کہ بیع مکان کی بابت جو اطلاعی خط آپکو ملا ہے اس میں اگر ”قرار دی ہے“ تک عبارت پڑھ کر فوراً اپنی زبان سے کہدیا تھا کہ حق شفعہ لوں گا تب تو حق باقی ہے گو اس وقت کوئی گواہ موجود نہ ہو اور اگر ”قرار دی ہے“ تک خط پڑھ کر شفعہ لینے کو زبان سے نہیں کہا بلکہ تمام خط پڑھ کر ہی گواہ کے سامنے ظاہر کیا تو حق شفعہ باطل ہوگیا۔ بلکہ اگر خط کے حاشیہ کی عبارت پہلے پڑھی ہو تو ”بیع کر دیا ہے“ تک پڑھ کر زبان سے کہنا ضروری تھا۔ اگر نہ کہا ہو تو حق باطل ہوگیا۔ اس حق کے باطل ہونے کی صورت میں مطالبۂ شفعہ سے عاصی ہوگا کہ غیر کے حق کو غصب اور اس پر ظلم کرنا ہے۔ اور حق شفعہ باقی ہو تو اس اس صورت اسی قیمت میں مکان لینا جائز ہے۔ جو بیع کے وقت قرار دی گئی ہے خواہ وہ رعایت سے رکھی گئی ہو یا پوری قیمت ہو۔

فی الدر: فی جواهر الفتاوی انه (ای طلب المواثبة) علی الفور وعلیه الفتوی وقال الشامی (فروع) اخبر بکتاب والشفعة فی اوله أو وسطه وقرأه إلی آخره بطلت هداية۔ ج ۵، ص ۲۱۶۔
وفی الدر ایضاً: (ویقضی) القاضی (بالشفعة والعهدة) لضمان

الثمن عند الاستحقاق (علی البائع قبل تسلیم المبیع الی المشتری) والعهدة (علی المشتری لو بعده) لما مر اھ ج ۵، ص ۱۴۳-

وفیه ایضاً: (تملیک البقعة جبراً علی المشتری بما قام علیه). بمثله لو مثلیا والا فبقیمة وفی الشامی تتمه والمراد ما لزم المشتری من المؤن بالشراء اھ ج ۵، ص ۲۱۱-

وفیه ایضاً: قلت ما قام علیه عام فی القلیل والکثیر والثمن ما تراضیا به سواء کان مساویا للقیمة او زائداً علیه او ناقصاً عنه وأیضاً فی الدر (وحط البعض یظهر فی حق الشفیع) فیأخذ بالباقی الخ صـ ۲۲۴-

وعدم الفرق بین الحط بعد البیع ولمحاباة قبل البیع ظاهر- واللہ اعلم

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۲ ربیع الثانی ۴۵ھ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۱ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

متعلق سوال بالا

اور سوال میں اور خط میں ایک شاھد بنانا حق شفعہ طلب کرنے کے واسطے لکھا ہے اس کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص گواہی کے واسطے کافی نہیں۔ دو گواہوں کی ضرورت ہے اور چونکہ اس امر پر گواہ بنانا کہ ھم نے فوراً حق شفعہ کا مطالبہ زبان سے کہدیا تھا شفعہ کی شرط نہیں ہے اس لیئے ایک گواہ کی کمی سے حق شفعہ تو باطل نہیں ہوا لیکن اگر مشتری کہے کہ تم نے فوراً طلب ظاہر نہیں کی تھی تو اس کے مقابلہ میں ایک گواہ ناکافی ہے۔

فی الدر المختار: (و) رضابها (لغیرها من الحقوق سوا کان) الحق (مالا او غیره رجلان اھ ملخصاً وقال الشامی (قوله لغیرها) ای لغیر الحدود والقصاص ومالا یطلع علیها الرجال منح اھ ج ۴، ص ۵۷۶-

وفی العالمگیریة ج ۴ صـ ۲۲۵: ومنها الشهادة بغیر الحدود والقصاص ومالا یطلع علیه الرجال وشرط فیها شهادة رجلین او رجل

اورجل وامرأتين سواء كان الحق مالا او غير مال الخ

وفى الدر : والاشهاد فيه ليس بلازم بل لمخافة الجحود و قال الشامى كذا فى الهداية وغيرها لان طلب المواثبة ليس لاثبات الحق بل ليعلم انه غير معرض عن الشفع معراج ونهاية۔ ج ۵، ص ۲۱۹۔

وفى الهندية : واما طلب الاشهاد فهو ان يشهد على طلب المواثبة حتى يتأكد الوجوب بالطلب على الفور وليس الاشهاد شرطا لصحة الطلب لكن يتوثق حق الشفعة اذا انكر المشترى طلب الشفعة الخ ج ۶، ص ۱۱۶۔

اب رہی یہ بات کہ خریدار موجود نہ ہونے کے باعث اس کے سامنے مطالبہ نہیں کیا گیا سو اس حالت میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب بیع کی شفیع کو اطلاع ہو اس کو خود یا اپنے کسی وکیل کے ذریعہ سے اس مکان کے پاس جاکر دو گواہوں کے سامنے یہ کہے کہ یہ مکان فلاں نے خریدا ہے اور میں نے اطلاع ہوتے ہی شفعہ طلب کیا ہے اور اب بھی طلب کرتا ہوں تم گواہ رہو اگر ایسا نہیں کیا یعنی اس مکان پر جاکر مطالبہ نہیں کیا تو شفعہ باطل ہوگیا اور اس اشہاد میں اطلاع بیع کے بعد اتنی تو تاخیر ہوسکتی تھی کہ جتنی دیر سفر سے مکان پہنچنے میں درکار ہے اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں زیادہ تاخیر سے شفعہ باطل ہوجاتا ہے۔ یہ تو جب ہے کہ مطالبہ کیلئے شفیع خود آوے اور اگر شفیع کسی کو وطن میں وکیل بنادے تو اس وکیل تک خط پہنچنے میں جو وقت صرف ہو اتنی تاخیر معاف ہے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ سو اگر وکیل نے خط ملنے کے بعد طلب میں تاخیر کی تب بھی شفعہ باطل ہوگیا۔

فى الدر المختار : (ثم) يشهد (على البائع لو) العقار (فى يده او على المشترى) وان لم يكن ذا يد لانه مالك او عند العقار فيقول اشترى فلان هذه الدار وانا شفيعها وقد كنت طلبت الشفعة و اطلبها الآن فاشهدوا عليه، (وهذا) الطلب لابد منه حتى لو تمكن ولو بكتاب او رسول ولم يشهد بطلت شفعته وفى الشامى (قوله حتى لو تمكن) لو افتتح التطوع بعد طلب المواثبة قبل طلب

الاشهاد بطلت خانیۃ اھ ج ۵، ص ۲۲۰ -

وفی العالمگیریۃ: واذا کان الشفیع غائباً یؤجل بعد العلم قدر مسیرۃ الطلب للاشهاد فان حضر ھو او وکیله والا بطلت شفعته وبعد سطر - فان ظهر المشتری فی بلد لیس فیه الدار لم یکن علی الشفیع الطلب هناك وانما یطلب حیث الدار کذا فی محیط السرخسی (ص۱۱۷)-

اور اگر اس طلب میں یعنی بائع یا مشتری یا جائداد کے پاس جاکر جو شفعہ کی طلب ظاہر کی جاتی ہے اس میں دو گواہوں کے سامنے مطالبہ نہیں ہوا بلکہ شفیع نے بائع یا مشتری سے تنہا مطالبہ کیا یا مکان کے پاس جاکر الفاظ طلب کہہ دیئے تو دیانۃً تو شفعہ باطل نہیں ہوا لیکن حاکم تسلیم نہ کرے گا جبکہ مشتری شفیع کی تصدیق نہ کرتا ہو کما فی الشامی ج ۵، ص ۲۲۰-

قوله: (وھو طلب الاشهاد) ویسمی طلب التقریر اقول ظاهر عبارا تهم علی لزوم الاشهاد فیه لکن رایت فی الخانیۃ انما سمی الثانی طلب الاشهاد لا لان الاشهاد شرط بل لیمکنه اثبات الطلب عند جحود الخصم اھ تأمل - الشامی (ج۵، ص ۲۲۰) -

نوٹ

اگر بائع کا تپ دق بیع کے وقت ایسا تھا کہ جسکو مرض موت شمار کیا جاوے تو یہ تحقیق کرکے دوبارہ سوال کریں کہ اس نے جو کمی زرِ ثمن میں کی ہے وہ ثلث ترکہ سے تو زائد نہیں، اگر زائد ہے تو ورثہ نے اس کو نافذ رکھا ہے یا نہیں ؟

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون
۱۹ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

الجواب مع التفصیل صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

حکم دعویٰ شفعہ از جانب مسجد و اوقاف دیگر

السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بازار میں ایک مسجد کے متعلق چند دوکانیں ہیں - اور ان دوکانوں کے

متصل ایک دوکان ایک مسلمان شخص کی تھی اس دوکان کو ایک اور مسلمان نے خرید لیا ہے اور مہتمم مسجد نے شفع کر دیا ہے اس مسئلہ میں آپ کیا فرماتے ہیں. شفعہ من جانب مسجد جائز ہے یا نہیں۔ اور تاریخ شفعہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۶ء میں مقرر ہے جواب سے بہت جلدی مطلع فرمائیے گا۔ المستفتی

نیاز محمد خیاط

ضلع میر بازار۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۶ء

الجواب

فی الدر المختار: (ولا شفعۃ فی الوقف) ولا لہ نوازل (ولا بجوارہ) شرح مجمع وخلافاً للخلاصۃ والبزازیۃ ولعل لا ساقطۃ:

قال المصنف: قلت وحمل شیخنا الرملی الأول علی الأخذ بہ والثانی علی اخذہ بنفسہ اذا بیع۔ ففی الفیض حق الشفعۃ یبنی علی صحۃ البیع اھ، فمفادہ ان لا یملک من الوقف بحال لا شفعۃ فیہ وما یملک بحال ففیہ الشفعۃ وأما اذا بیع بجوارہ او کان بعض المبیع ملکا وبعضہ وقفا وبیع الملک فلا شفعۃ للوقف واللہ اعلم۔

وفی الشامیۃ: (قولہ وخانیۃ) عبارتہا کذا فی المنح ولا شفعۃ فی الوقف لا للقیم ولا للموقوف علیہ (قولہ خلافا للخلاصۃ والبزازیۃ) حیث قالا: وکذا تثبت الشفعۃ بجوار دار الوقف اھ

اقول: وفی نسخۃ البزازیۃ لا تثبت، نعم رأیت فی نسخۃ الخلاصۃ کما قال (قولہ ولعل لا ساقطۃ) یؤیدہ انہ ذکر فی کل من الخلاصۃ والبزازیۃ قبلہ باقل من سطر ما لا یجوز بیعہ من العقار لا شفعۃ فیہ الخ فالتشبیہ یقتضیہ فافہم (ج ۶، ص ۲۲۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں حق شفعہ نہیں ہے اور خلاصہ

وبزازیہ سے درالمختار نے جو اختلاف نقل کیا ہے اول تو بوجہ اختلاف نسخ اس کا اعتبار نہ کیا جاوے گا دوسرے خود درمختار نے اس کا محل بیان کر دیا۔ واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
۱۸ر ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۳ر ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

تبادلہ جائیداد میں بھی حق شفعہ ثابت ہو جاتا ہے

السوال:۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کے متعلق شرعی نقطۂ خیال سے روشنی ڈالیئے۔ زید و بکر نے ایک دوسرے سے اپنی جائیداد کا تبادلہ کیا بکر کے رشتہ دار عمرو و خالد نے شفعہ شرعی زید و بکر پر داخل کیا آیا تبادلہ پر بھی حق شفعہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور کن کن حالتوں میں شفعہ ہو سکتا ہے۔

الجواب

تبادلہ میں بھی حق شفعہ ثابت ہوتا ہے۔ لان فیہ تملك بعوض المال۔ وفی الدرالمختار: (لا تثبت قصدا الا فی عقار ملك بعوض) خرج الھبة (ھو مال) خروج المھر (وان لم) یکن (یقسم) اھ

واللہ أعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
۲۹ر جمادی الاولیٰ ۵۱ھ

کتاب المزارعۃ والمساقاۃ

کچھ روپے لیکر کاشتکار کو موروثی کر دینا جائز نہیں

السوال:۔ اگر کچھ روپیہ لیکر زمیندار کاشتکار کو موروثی کر دیا جائے تو کیا یہ جائز ہے اور یہ روپیہ رشوت تو نہیں ہے۔ بینوا توجروا۔

محمد الیاس طالب العلم

الجواب

جائز نہیں کیونکہ یہ حق استخلاص کا معاوضہ ہے اور حقوق متقوم نہیں ہیں۔
قال فی الدر وفی الاشباہ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ۔ اھ (ج ۴، ص ۲۰) واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون
۲ ربیع الثانی ۴۰ھ

زمین کی کاشتکاری میں وراثت جاری نہیں ہوتی

السوال:۔ اگر زمیندار کاشتکار کے نام اپنی کسی کھیت کی بخوشی کاشتکاری لگوادے تو آیا زمیندار اور کاشتکار دونوں کے مرجانے کے بعد یا ایک کے مرجانے کے بعد پھر کاشتکار کے لڑکے کو اس کاشتکاری منتفع بہ ہونا جائز ہوگا یا نہیں۔ ونیز اگر کسی زمیندار نے اپنا کھیت بطور کاشتکاری کے کسی کاشتکار کے نام نسلاً بعد نسل کرکے لکھ دیا تو یہ لکھنا جائز ہوگا یا نہیں بعض زمیندار کچھ روپیہ لیکر لکھ دیتے ہیں۔

الجواب

کاشتکار کے نام اگر زمیندار کھیت کی کاشتکاری لکھ دے تو ایک یا دونوں کے مرنے کے بعد کاشتکار کی اولاد کو حق کاشتکاری نہ پہنچے گا کیونکہ وراثت مملوک میں ہوتی ہے اور حقوق مجردہ مملوک نہیں ہوتے اور اگر زمیندار کچھ روپیہ لیکر زمین کو موروثی کردے تو جب بھی زمین شرعاً موروثی نہ ہوگی اور زمیندار نے جو رقم لی ہے وہ رشوت ہے اس کا تصرف میں لانا حرام ہے کاشتکار اپنی وہ رقم واپس لے سکتا ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۰ھ

زمین موروثی کا حکم اور زمین کو موروثی کرنے کے عوض مال لینے کا حکم۔

السوال:۔ جو کھیت کاشتکار بلا رضامندی زمیندار کے بارہ سال قبضہ ہوجانے کے بعد اپنی کاشتکاری لگوا لیتا ہے یا زمیندار اپنی رضامندی سے اس کے نام اپنے کسی کھیت

کی کاشتکاری لگوادے تو فریقین کے مرنے کے بعد یہ کاشتکاری بالتراضی کاشتکار کے لڑکے کو جائز ہو گی یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو غاصبانہ قبضہ یا اس طرح سے کہ زمیندار نے خود لگوایا اور اس کے بعد مر گیا پھر تجدید معاملہ نہ ہوا تو آیا کاشتکار کو حرام خور یا فاسق و فاجر کہا جا سکتا ہے اور سلام وغیرہ اس سے ترک کرنا واجب ہے یا نہیں۔ زید کہتا ہے کہ جب کاشتکاری ناجائز ہے اور کاشتکار حرام خور، بدکار ٹھہرا تو سلام و کلام ایسوں سے ترک کرنا واجب و لازم ہے۔ مولانا صاحب ذرا اس مسئلہ کو صراحۃً بحوالہ کتب فقہ و حدیث سے فرمائیے اور کاشتکاری کے بارے میں جو اصل صورت جواز کی ہو اور وہ متفق بہ ہو اس سے مطلع فرمائیے۔

السائل:

محمد شمس الدین عفی عنہ

الجواب

بارہ سال کے بعد کاشتکار کا موروثی بن جانا حرام ہے اور جو زمیندار اپنی مرضی سے کاشتکار کو موروثی کرتے ہیں وہ اس کے معاوضہ میں کچھ رقم لیتے ہیں اور حق کاشتکاری شیٔ متقوم نہیں اس لئے وہ معاوضہ لینا اور دینا بھی حرام ہے پس بعد موت زمیندار یا کاشتکار کے کاشتکار کی اولاد کو اس زمین میں کچھ حق نہیں وہ قبضۂ حرام کا مرتکب ہے۔ جس شخص کے پاس موروثی زمین ہو اول اس کو مسئلہ شرعی سے خبردار کر دینا چاہیئے اگر پھر بھی باز نہ آئے تو اس سے سلام و کلام قطع کر دینا چاہیئے بشرطیکہ اس سے نفع کی اُمید ہو اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ وہ اس برتاؤ سے اور زیادہ حرام کا ارتکاب کریگا تو ایسا نہ کیا جاوے۔ البتہ اس کے یہاں کا کھانا کسی حال میں نہ کھایا جائے، کاشتکاری کی بہت سی صورتیں جائز بھی ہیں اور بعض ناجائز ہیں آپ کو جس صورت کا حکم دریافت کرنا ہو صاف لکھ کر سوال کریں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۷؍ شوال ۱۳۴۰ھ

اضافہ، لگان کر کے زمین کو موروثی پر لینا

السوال: دو صورتیں مندرجہ ذیل بہت ضروری ہیں بایں وجہ جناب کو تکلیف دیتا ہوں۔

صورت اول :۔ زید عمر شریک کاشت موروثی ہیں زید نے چھوڑ دیا بوجہ شریک کاشت ہونے کے عمر سب حصہ پر قابض ہو گیا ہے زید نے مالگذاری میں کچھ اضافہ کر دیا زمیندار نے اس کے حوالہ کر دیا یہ بایں وجہ کہ عمر سے سوائے مقررہ لگان کے کچھ اور نہیں مل سکتا اور اگر دونوں استعفیٰ دیدیں تو زمیندار کو سہ چند یا اس سے بھی زیادہ لگان مل سکتی ہے لیکن عمر استعفیٰ نہیں دیتا تو ایسی حالت میں اگر زید زیادہ کر دے اور زمیندار بوجہ مجبوری مذکورہ بالا قناعت کر جائے اور زید کے حوالہ کر دے میعاد مقررہ دو یا چار برس تک یا اپنی زندگی تک تو زید کیلئے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

از جانب حاجی منیر

الجواب

صورتِ مسئولہ میں اگر زید اضافہ لگان کر کے بطور موروثی ہی اس زمین کو لیتا ہے تو اضافۂ لگان کے بعد بھی زید کو اس زمین کی کاشت کرنا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی زمیندار مجبور ہے البتہ اگر زید موروثیت سے باقاعدہ استعفیٰ دیدے گو عمر استعفیٰ نہ دے تو پھر زید کو اس کی کاشت جائز ہے مگر اس صورت میں عمر کیساتھ شرکت نہ کرنا چاہیئے بلکہ علیحدہ ہو کر کاشت کرے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۸ رجمادی الثانی ۱۳۴۵ھ

حکم خرص در مزارعت | السوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ میرے یہاں کنکوت صرف شامارخ کی ہوتی ہے، طبیعت میں نہایت خلجان ہے اور ضیق ہے کہ کوئی صورت جواز کی نہیں نکلتی مصالحت میں بھی صورت جواز نہیں، اسامیوں کے حلف پر اگر چھوڑا جاوے تو ان کے حلف کا کچھ اعتبار نہیں۔ ایک وقت میں کل کھیت کی کٹائی نہیں جو بٹائی کر لی جاوے تھوڑا تھوڑا موافق ضرورت مولیشی کاٹ لیتے ہیں۔ اگر تھوڑا تھوڑا ہی روزانہ آتا جاوے اور تقسیم ہو جاوے تو ایک ماہ، سوا ماہ تک اس کام کی خاطر میرا قیام ناممکن ہے اور نوکروں کا اعتبار نہیں۔ کیا کیا جاوے؟

الجواب

کنکوت یعنی خرص مزارعت بین ائمہ اربعہ میں سے ہے کسی کے نزدیک

بھی جائز نہیں ہے۔ شرح بہ العینی فی شرح البخاری ج ۴، ص ۴۱۸ اور علت عدم جواز خرص کی لزوم ربوا ہے اس لیئے حنفیہ نے احادیث خرص ثمار کو قبل تحریم ربوا پر محمول کیا ہے عینی ج ۴، ص ۴۱۹۔ اور جب یہ علت ہے تو اس کا مقتضاء یہ ہے کہ خرص مسلمانوں کے ساتھ جائز نہ ہو لیکن کفار، اھل حرب کے ساتھ برضاء طرفین جائز ہو۔ لجواز الربوا بین المسلم والحربی بدار الحرب عندھم و قال ابن العربی لم یثبت عنہ صلی اللہ علیہ وسلم خرص النخل الا علی الیھود لأنھم کانوا شرکاء وکانوا غیر امناء واما المسلمون فلم یخرص علیھم۔ اھ، (ج ۴، ص ۴۲۰)۔

پس مزارعین کفار کیساتھ خرص جائز ہے جبکہ وہ اس پر راضی ہوں کہ خرص سے معاملہ کر لیا جاوے۔

لم أرہ صریحاً لکنہ مقتضی القواعد۔ واللہ اعلم۔

کتبہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ

۱۰ / صفر ۱۳۴۴ھ

دخیلکار اور موروثی زمین کی پیداوار کا حکم

السوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو تمام ہندوستان میں سرکار نے قانون قبضہ اراضی نافذ کر کے کاشتکاروں کو قبضہ دلایا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص دخیل کار اور موروثی کاشتکار ہو گیا ہے بیشتر دخیلکاروں کی تعداد کم تھی مگر اب ہر کاشتکار دخیلکار ہو گیا ہے زمیندار جس طریقہ سے بیشتر کے دخیلکاروں سے ناخوش اور ناراض تھے اسی طریقہ سے ان کاشتکاروں سے بھی ناخوش اور ناراض ہیں چونکہ زمینداروں کا منشاء تو یہ ہے کہ ہر سال نئے نئے کاشتکاروں کو زمین دیدیا کرے اور اس لگان سے کچھ زر لگان خفیہ کر لیا جایا کرے۔ بغیر پٹواری کے کاغذات میں بجائے للعہ فی بیگہ کے درج کرا کر مالگذاری میں کمی رکھی جائے سرکار نے اس وجہ سے کل کو دخیلکار بنایا تاکہ زمیندار یہ غبن نہ کریں اور مالگذاری بمقدار وصولیت زر لگان از کاشتکار لے جایا کرے

اس کے بعد سرکار نے یہ حق زمیندار کو دیا ہے کہ جو روپیہ تم اپنی جائیداد سے وصول کرو اس میں سے ۵۰ للعہ فی صدر کھکر باقی تحصیل میں داخل کردو۔ اور احناف کا مذہب ہے کہ استیلاء کافر علی مال مسلم سبب ملک کا ہے سرکار کا جس وقت آنا ہندوستان میں معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے ہی پتہ چلتا ہے کہ ملک پر قبضہ پورے طریقہ سے ان کو حاصل ہوا۔ لہذا یہ استیلاء کل ملک پر ظاہر ہے اس کے بعد قدرے قدرے قطعہ اراضی لوگوں کو دے گئے جن کو زمینداروں کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے مشہور تو ہے کہ زمیندار مالک اراضی نہیں لیکن بعض قانون دانوں نے نیز بعض زمینداروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زمیندار مالک اراضی نہیں بلکہ ایک مقدار معینہ کے معاہدہ سے ٹھیکہ دار ہیں۔ معاہدہ یہ ہے کہ فیصد آمدنی اراضی سے مثلاً مبلغ ۵۰ روپیہ ادا کریگا۔ چنانچہ اگر ایک سال میں اس معاہدہ کے خلاف کرلے تو اس کو اراضی سے سرکار علیحدہ کردے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ ٹھیکہ دار ہے اور اگر اس کو مالک ہی کہا وے تو اس قانون کے نفاذ کی وجہ سے کیا سرکار کا استیلاء اراضی پر نہیں ہے جو موجب ملک ہے اور خود سرکار یہ مقولہ ہے کہ زمیندار کوئی چیز نہیں کاشتکار یا ہم ثالث کون ہیں۔ تو ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشاد عالیہ سے سرفراز فرمایا جاوے کہ ان کاشتکاروں کا قبضہ اراضی پر جو باجازت سرکار ہے جائز ہے یا ناجائز اور ان کاشتکاروں کی آمدنی حلال ہے یا حرام۔ درصورتِ حرمت ان لوگوں کا مساجد و مدارس وغیرہ میں چندہ دینا واعانت کرنا درست ہے یا نہیں۔ و نیز جو لوگ محتاط ہیں ان کو ان کاشتکاروں سے غلہ خریدنا جو ان اراضی میں پیدا ہوتا ہے درست ہے یا نہیں۔ حلت و حرمت دخیلکار امسال اور گذشتہ زمانہ کے جو دخیلکار ہیں مساوی ہیں یا کچھ فرق ہے۔ ہر دو غاصب ہیں یا نہیں اگر احدھما غاصب ہے تو مابہ الامتیاز کیا ہے جبکہ رضامندی زمیندار ہر دو کاشتکار کے متعلق نہیں ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

حکومت کے قبضۂ سلطنت کو استیلاء علی الاراض سمجھنا ہمارے فہم میں نہیں آیا کیونکہ استیلاء قبضۂ مالکانہ کا نام ہے اور گورنمنٹ نے جو ہندوستان

پر تسلط کیا ہے وہ مالکانہ ہے اور قبضہ مالکانہ سے زمین مُلک کے بادشاہ کی مِلک نہیں ہوتی۔ وہ صرف منتظم و مدبر ہے گذشتہ حالات کی ہم کو خبر نہیں اور نہ صحیح طور پر خبر ہوسکتی ہے لیکن حالاتِ موجودہ اس پر شاھد ہیں کہ گورنمنٹ نے اراضی ہند پر قبضہ مالکانہ نہیں کیا۔ مثلاً۔ گورنمنٹ اپنی ضرورت کیلئے بعض دفعہ اگر کسی کی زمین لیتی ہے تو اس کا معاوضہ دیتی ہے۔

عدالتوں میں شب و روز جائیداد کے بیعنامے اور ھبہ نامے اور وقفنامے اور وراثت کے دعوے دائر ہوتے ہیں اور گورنمنٹ اِن سب کو معتبر سمجھتی اور اس کے موافق عمل کرتی ہے۔ اگر زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ محض ٹھیکہ دار ہے تو اس کی بیع و ھبہ و وراثت و وقف سب باطل ہونے چاہئیں اور اس پر جس فسادِ عظیم کا مرتکب ہوگا وہ مخفی نہیں ہے۔ اس لئے اِن حالات کے ہوتے ہوئے یہ ہرگز تسلیم نہیں ہوسکتا کہ اراضیٔ ہند گورنمنٹ کی مِلک ہیں۔ اور زمیندار محض ٹھیکہ دار ہے اور اگر ایسا ہوتا تو گورنمنٹ کو زمینداروں کا یک قلم الگ کر دینا کیا مشکل تھا وہ اپنے استیلاء کو دلیل بنا کر یہ سہولت کہہ سکتی تھی کہ زمیندار صرف ٹھیکدار ہے اب ہم اس کو ٹھیکہ دینا نہیں چاہتے۔ پھر ٹھیکہ اجارہ کی قبیل سے ہے جس کیلئے شرائط اجارہ کا تحقق ضروری ہے۔ اور یہاں ان کا بالکل وجود نہیں۔ نہ اس ٹھیکہ کی مدت مقرر ہے نہ زمیندار کی موت سے وہ اجارہ باطل ہوتا ہے بلکہ اس میں میراث جاری ہوتی ہے پھر کیونکر اس کو اجارہ مان لیا جاوے بلکہ یقیناً زمیندار اپنی زمین کا مالک ہے جو کاشتکار کو اجارہ پر زمین دیتا ہے۔ اور کاشتکار مُستاجر ہے لیکن اس قانونِ جدید کی وجہ سے اب جو کاشتکار کسی زمیندار کی زمین اجارہ پر لیتا ہے تو وہ گویا اجارہ میں یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ زندگی بھر میں اس کی زراعت کرونگا جو ایک شرطِ فاسد ہے۔ نیز اس میں مدتِ اجارہ ہی مجہول ہے پس اس کا حکم اجارۂ فاسد کا حکم ہوگا جس کا حاصل یہ ہے کہ موجر کیلئے اُجر حلال ہے اور مستاجر جو کچھ زراعت کرتا ہے پیداوار سب اس کی مِلک ہے لیکن مستاجر بوجہ اس شرطِ فاسد کے گنہگار رہے اور زمیندار تو قانون کی وجہ سے اس شرط کے ماننے پر مجبور ہے لیکن مستاجر مجبور نہیں ہے اِس لئے اِس شرط کی وجہ سے وہی گناہ گار ہوگا رہا یہ کہ اس گناہ کا اثر صرف کاشتکار کے

ذمہ تک ہے یا زراعت و پیداوار میں بھی اس کا خبث سرایت کرے گا۔ تو اس میں تفصیل ہے، جو روایاتِ ذیل سے واضح ہوگی۔

قال فی الھندیۃ: ولو کان المشتری استاجر الارض الی ان یدرک ولم یذکر مدۃ معلومۃ فالاجارۃ فاسدۃ لجھالۃ المدۃ فان ترکہ فی الارض حتی أدرک لزمہ أجر المثل بخلاف ا حتی لا یجب ھناک الأجر اصلاً۔ قال ویطیب لہ من الذرع بقدر الثمن وما عزم من الأجر ویتصدق بالفضل ھذا الذی ذکرنا قیاس قول ابی حنیفۃ ومحمد وا ما علی قول ابی یوسف یطیب لہ الزیادۃ فی الوجوہ کلھا کذا فی الذخیرۃ اھ ج ۵، ص ۲۷۲۔

قلت ووجہ قول ابی یوسف کونہا من الاجارۃ الناس کما یظھر من کلامہ حق واللہ أعلم،

قال فی الدر: فی الاجارۃ الفاسدۃ وحکم الاول وھو الفاسد وجوب اجر المثل بالاستعمال لو المسمی معلوما ان کمال اھ

وفیہ ایضاً: الفاسد من العقود ما کان مشروعاً باصلہ دون وصفہ والباطل ما لیس مشروعاً اصلاً لا باصلہ ولا بوصفہ۔

وقال الشامی تحت قولہ: وجوب أجر المثل والاجر طیب وان کان السبب حراما کما فی المنیۃ، ونقل فی المنح أن شمس الأئمۃ الحلوانی قال تطیب الأجرۃ فی الاجارۃ الفاسدۃ اذا کان اجر المثل اھ ج ۵، ص ۴۲۔

وفی الدر: ولا تملک المنافع بالاجارۃ الفاسدۃ بالقبض بخلاف بیع الفاسد فان المبیع یملک فیہ بالقبض بخلاف فاسد الاجارۃ حتی لو قبضھا المستاجر لیس لہ أن یوجرھا ولو اجرھا وجب المثل ولا یکون غاصباً اھ

وفیہ ایضاً: وفی الاشباہ: المستاجر فاسد لو آجر صحیحا جاز ولو بعد قبضہ فی الأصح منیۃ اھ ج ۵، ص ۴۳

قلت وھذا حکم المنافع واما الاعیان المتولدۃ من المأخوذ

اجارة فاسدة فحكمه ما فى الحامدية : وفى الخلاصة رجل دفع الى خياط ثوبا ليخيطه له قباء أوجبة ولم يشا الأجرة فلما فرغ منه اعطاه صاحب الثوب زيادة على اجر مثله فى قياس قول ابى حنيفة يطيب له وقال فقيه ابو الليث الزيادة جائزة فى قولهم جميعا اھ ج ۳ ، ص ۱۴۹

قلت واذا طاب للخياط الزيادة على اجر مثله فالظاهر جواز لُبس القباء للمالك ايضاً ولعل وجه ذلك عندهما كونهن اجارات الناس والله اعلم۔

ونصها لو زرع ارض الغير بغير اذنه يعتبر العرف فان اقتسموا الغلة انصافاً او ارباعاً اعتبر والا فالخارج للزارع وعليه اجر المثل للارض اھ ثم نقل عن جامع الفصولين ومن زرع ارض غيره بلا امره يجب الثلث او الربع على ما هو عرف القرية ثم رمز الفتاوى القاضى ظهير الدين زرع الاكار سنين بعد مضى مدة الزراعة جواب الكتاب انه لا يكون مزارعة فالزرع كله للاكار وعليه تصدق بما فضل من بذره واجر المثل عمله وهكذا كانوا يفتون ببخارى وقيل تكون مزارعة وقيل لو كانت الارض معدة للزراعة بان كان ربها ممن لا يزرع بنفسه ويدفعه مزارعة فلرب الارض حصة على ما هو عرف تلك القرية لكن انما يحصل على على هذا لو لم يعلم وقت الزراعة انه زرعها على وجه الغصب صريحاً او دلالة او على تاويل فان من آجر أرض غيره بلا اذنه ولم يجز ربها وقد زرعها المستاجر فالزرع كله للمستاجر لا على الزراعة (بل على وجه الاجارة لانه زرعها بتاويل الاجارة) والحاصل ان فى المسئلة قولين او ثلاثة الأول انه اذا زرع ارض غيره بلا امره لا يكون غصبا بل يحمل على الزراعة وحصة رب الارض ما جرى عليه عرف القرية من ثلث او ربع والقول الثانى جواب الكتاب انه يكون غاصبا

والزرع کله له لکن یتصدق بما فضل عن بذره واجر مثل عمله ویمکن حمل هذا علی ما اذا لم یکن عرف فی اخذها علی وجه المزارعة فلا یخالف ما قبله والقول الثالث انه یکون مزارعة اذا کان صاحبها اعدها للاستغلال بان کان یدفعها مزارعة لغیره ولا یزرعها بنفسه لانه یکون قرینة علی ان الزارع انما اخذها علی وجه المزارعة علی عرف تلک القریة اما لو کان صاحبها یزرعها بنفسه یکون الزارع غاصبا فالزرع کله له اھ فتاوی حامدیة۔ ج ۲، ص۱۵۷، ص۱۵۸۔

قلت وظهر من مجموع الکلام ان الزراع انما یجب علیه التصدق بما فضل عن بذره واجر مثل عمله اذا کان غاصبا ولا یکون غاصبا اذا لم تکن الارض معدة للاستغلال او کان صاحبها یزرعها بنفسه و هذا کله فیما اذا زرع ارض الغیر بدون اذنه واما فی صورة المسئولة فلا یمکن القول بکون الزارع غاصبا لانه یزرعها علی تاویل الاجارة ویزرعها بان المالک لا بلا اذنه فیکون مستاجرا لا غاصبا فیکون الزرع کله له ولا یجب علیه التصدق بما فضل عن بذره واجر مثل عمله عند ابی یوسف خلافا لهما وللمالک اجر مثل ارضه بالغا ما بلغ ولا ینقص عن المسمی لا یقال کیف یجب اجر المثل بالغا ما بلغ والاجرة لیست بمجهولة بل مسماة وحینئذ لا یزاد علی المسمی کما فی الدر قلت علل فیه عدم الزیادة علی المسمی برضاهما به ج ۵، ص ۴۶

وفی الصورة المسئولة لا یکون المالک راضیا بالاجر الذی یؤدیه الاکار المدعی لنفسه حق القرار کما هو مشاهد واللہ اعلم

خلاصۂ روایات یہ ہوا کہ جو شخص غاصب ہو کر دوسرے کی زمین میں زراعت کرے اس کی زراعت کی پیداوار میں سے زائد سب خبیث ہے جس کا تصدق واجب ہے اور جو شخص اجارہ فاسد کیساتھ دوسرے کی زمین میں زراعت کرتا ہے اسکی پیداوار بھی طرفین (امام ابو حنیفہ و محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک مطلقاً خبیث ہے۔ اِلا بقدر بذرہ واجر مثل عملہ۔ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک

بعض صورتوں میں جو من جنس اجارات الناس ہو جائز ہے۔
پس صورت مسئولہ میں جبکہ مالک ارض جانتا ہے کہ مستاجر اپنی حیات تک زمین پر قابض رہے گا اور اس بات کو جانتے ہوئے زمین کو اجارہ پر دے رہا ہے تو مستاجر اس صورت میں غاصب نہیں البتہ یہ اجارہ فاسدہ جس میں مستاجر ایک شرط فاسد کر رہا ہے اور مدتِ اجارہ بھی مجہول ہے اس لیئے اس کا حکم یہ ہے کہ خود اس مستاجر کے حق میں تو اس کی پیداوار کا وہ حصہ جو قدر تخم اور اجرت مثل عمل سے زائد ہو حلال نہیں ہے۔ علی قول الطرفین۔ اور دوسروں کے حق میں قول ابو یوسف پر اس کی کل پیداوار کو دفع حرج کیلئے جائز کہا جائے گا۔ کیونکہ اب اس میں ابتلاء عام ہو گیا ہے جس سے دوسروں کو تحرز دشواری ہے ان کیلئے ایسے مستاجر کی دعوت وہدیہ وچندہ کی رقم لینے کو جائز کہا جائے گا۔ اور خود اس مستاجر کے حق میں چونکہ حرج کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ اس اجارہ فاسد کا اپنے فعل سے مرتکب ہو رہا ہے تو اس کے حق میں پیداوار زائد علی القدر المذکور کو حرام کہا جائے گا۔ اور دوسروں کیلئے بھی یہ توسع صرف اس صورت میں ہے جبکہ مالکِ ارض ابتداء ہی سے کسی مستاجر کو حیاتی کاشتکار مان کر زمین اجارہ پر دے اور اگر مالکِ ارض نے ابتداء میں حیاتی کاشتکار مان کر زمین نہ دی تھی بلکہ ایک مدتِ معینہ کیلئے اجارہ پر دی تھی پھر مستاجر اس قانونِ جدید کی وجہ سے حیاتی کاشتکار و دخیلکار بن گیا تو یہ شخص مدتِ معینہ کے تمام ہونے کے بعد غاصب شمار ہو گا۔ اور اس کی پیداوار زاید علی القدر المذکور سب کیلئے حرام ہے اس کے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی۔ مگر یہ کہ وہ مدتِ معینہ اجارہ اولیٰ کے ختم ہونے پر اجارہ فسخ کر دے اور دوبارہ قانونِ جدید پر اجارہ کرے یا مالکِ ارض کو قانوناً اس کاشتکار کو الگ کر دینے کا مدتِ معینہ تک حق حاصل تھا اور مالک ارض نے عمداً اس کو الگ نہیں کیا تو اب یہ کاشتکار بھی صورتِ اولیٰ کے کاشتکاروں جیسا ہو گیا وحکمہ کحکم الاول۔
اس تقریر سے واضح ہو گیا ہو گا کہ امسال کے دخیلکاروں اور گذشتہ زمانہ کے دخیلکاروں میں فرق ہے۔ کیونکہ گذشتہ زمانہ کے دخیلکاروں سے مالکانہ ارض مدت معینہ تک کیلئے اجارہ کرتے تھے پھر وہ بدون رضا مالک کے بارہ سال کے بعد

محض قانون کی وجہ سے قابض و دخیلکار بن جاتے تھے پس وہ بحکم غاصب تھے اور اس وقت جو کاشتکار کسی سے زمین لیتا ہے تو مالکِ ارض اس کو دائمی کاشتکار مان کر زمین دیتا ہے تو وہ اس کے قبضۂ حیاتی میں ابتدا ہی سے ہے۔ رہا یہ کہ وہ دل سے کہاں راضی ہے محض قانون کی وجہ سے مجبور ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قانوناً زمین کاشت کیلئے دینے پر مجبور نہیں اگر وہ خود کاشت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور جب وہ خود کاشت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو زمین دے رہا ہے اور جانتا ہے کہ یہ کاشتکار بنتے ہی دخیلکار ہو جائے گا تو اس کا اس حالت میں زمین دینا کاشتکار کی دخیلکاری پر رضا ہے۔ نیز قانون نے مالکِ ارض کی زبان تو بند نہیں کی وہ اس قانون کے بعد بھی زبان سے اتنا کہہ سکتا ہے کہ میں یہ زمین مدتِ معینہ کیلئے (مثلاً سال دو سال کیلئے) اجارہ پر دیتا ہوں اور اس سے زائد کے لئے میں راضی نہیں ہوں اگر وہ زبان سے ایسا کہہ دے تو اس کاشتکار کا اب بھی مدتِ معینہ کے بعد وہی حکم ہوگا جو گذشتہ دخیلکاروں کا حکم تھا لیکن جب وہ زبان سے کوئی مدت معین نہیں کرتا اور قانون حال سے واقف ہے تو دلالۃ وہ مستاجر کی شرطِ فاسد پر راضی ہے پس اس صورت میں مستاجر کو غاصب مثل گذشتہ دخیلکاروں کے نہ کہا جائے گا ہاں اس قانون سے نفع لینے میں وہ گناہ گار ضرور ہے اور اس کے حق میں اس کی پیداوار حرام ہی ہے باستفتاء ما مرّ لیکن غاصب نہ ہونے کا اثر دوسروں کے حق میں بصورتِ توسع ظاہر ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حرّرہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ امدادیہ

۱۰ رشعبان ۴۴ھ

موروثی کاشتکار کی ایک خاص صورت کا حکم السوال :- زید ایک زمین پر انگریزی قانون کی رُو سے قابض و دخیل ہے (جس کو عرفاً قدیم قانونِ انگریزی کے اعتبار سے موروثی کاشتکار و جدید قانون کے لحاظ سے حین حیاتی دخیلکار کہا جاتا ہے) اس نے ایسی زمین خالد کے یہاں رھن رکھی خالد نے بکر سے جو اس زمین کا زمیندار و مالک ہے زبانی خود جوتنے بونے کا معاملہ کرلیا اب راھن جب مرتھن کو زرِ رھن

ادا کرے گا اس وقت وہ زمین راھن کو ملے گی ورنہ اس مدت تک مرتھن اس زمین سے انتفاع حاصل کرتا رہیگا پس صورتِ مسئولہ میں شرعاً کوئی حرج بھی ہے یا نہیں ہے۔

الجواب

جب مرتھن نے اصل مالک زمین سے اس زمین کی کاشت کی اجازت لے لی ہے اور اس کو اس کی رضا کے موافق لگان ادا کرتا ہے تو مرتھن کو بس زمین کی کاشت جائز ہے اور پیداوار حلال ہے اور اس کو انتفاع بالمرھون میں داخل نہ کہا جاوے گا کیونکہ دخیلکار کا اس کو رھن کرنا صحیح نہ تھا لکونہ قابضاً علی ارض المالك قبضا حراما اھ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۸ محرم الحرام سنہ ۴۶ھ

دلیل حرمت موروثی و دخیلکاری | السوال:۔ ملجائی وماوائی حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے معروض ہے کہ مکمل ومدلل بہشتی گوہر صـ۱۳۹ میں مسئلہ ۱۴ اجارہ یا مزارعت میں بارہ سال یا کم وبیش مدت تک زمین سے منتفع ہوکر موروثیت کا دعویٰ کرنا جیسا اس وقت رواج ہے محض باطل اور حرام اور ظلم وغصب ہے بدون طیب خاطر مالک کے ہرگز اس سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے اگر ایسا کیا تو اس کی پیداوار بھی خبیث ہے اور کھانا اس کا حرام ہے صـ۲۴ ج ۴ شامی اھ۔ ہم لوگ جب سے یہ مسئلہ حضور والا کے تصانیف مثلاً صفائی معاملات وامداد الفتاویٰ وبہشتی گوہر میں پائے ہیں اس وقت سے بحمد اللہ تعالیٰ خود اس میں عمل کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں کیونکہ ہم تو حضور کو اپنا راہنما مانے ہوئے ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ قواعد شرعیہ سے بھی یہ مسئلہ بخوبی سمجھ میں آتا ہے اور اب تو نورٌ علی نور مدلل بہشتی گوہر میں حوالہ بھی مندرج ہوگیا ہے ان وجوہ سے قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مسئلہ پر عمل کرنے میں ہم لوگوں کو ذرا بھی خلجان نہیں لیکن ہمارے ادھر کے لوگ حتی کہ اکثر مدعیان علم بھی اس مسئلہ سے واقف نہیں اور اس مسئلہ کے خلاف پر عامل ہیں اور گناہ تک نہیں جانتے اور فقط بہشتی گوہر کے دیکھنے پر قانع ہوتے نہیں لہذا اس مسئلہ کے بارے میں زمینداروں کو عموماً اور ہم لوگوں

کو خصوصاً یہ خیال ہوا ہے کہ مزید حوالجات کیساتھ بنگلہ زبان میں بطور فتاویٰ یہ مسئلہ چھاپ کر شائع کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم ہوگا۔ اس غرض سے یہ مسئلہ شامی کی عبارت سے خود بھی سمجھنے کی کوشش کی اب حضور کا ھدایت نامہ پاکر شامی کی کتاب الاجارۃ کے جہاں یہ لفظ کدک اور اس کے بعد عسر المسکہ لکھا ہے نکال کر خوب غور سے مطالعہ کیا لیکن کون سی عبارت سے یہ مسئلہ نکلتا ہے ہمارے فہم ناقص میں نہیں آیا ہٰذا مجبوراً نہایت عاجزی کے ساتھ حضور والا کو دوبارہ تکلیف دیتے ہوئے عرض کرتا ہے ازروئے ھدایت پروری بعینہا وہ عبارت مسئلہ تحریر فرماکر ممنون و مشکور فرماویں ان اجرك الا علی اللہ۔

اطلاعاً دوسری گذارش یہ ہے کہ ھماری شامی کتاب کی جلد خامس میں کتاب الاجارہ ہے اور بہشتی گوہر میں مسئلہ مذکور کیلئے جلد رابع سے حوالہ دیا گیا ہے۔ اگر لکھنے میں کوئی خطأ و قصور واقع ہوگئی ہو تو للہ معاف فرمادیں اور ھم لوگوں کیلئے علم نافع اور عمل صالح کی دعا فرماویں۔ والسلام مع الکرام

نیازمند فدوی سید واجد علی عفا اللہ عنہ

ساکن اسلام آباد۔ ڈاکخانہ کھوائی ضلع بنگال

الجواب

جس شامی سے بہشتی گوہر میں حوالجات لکھے گئے ہیں وہ مطبوعہ قدیم ۱۲۷۲ھ ہے اس لیئے جدید مطبوعہ شامی کے صفحات اس سے موافق نہیں ہوتے یہ مسئلہ شامی میں کتاب البیوع جلد ۴ کے شروع میں بایں الفاظ موجود ہے

قال فی البدائع: الحقوق المفردة لا تحتمل التمليك ولا يجوز الصلح عنها اقول وكذا لا تضمن بالاتلاف قال السرخسی واتلاف مجرد الحق لا يوجب الضمان لان الاعتياض عن مجرد الحق باطل اھ ج ۴ ص ۲۰

اس کے بعد شامی نے خلو اور مشد مسکہ اور کردار و کدک وغیرہ سے بحث کی ہے جس میں وجہ تفسیر معلوم نہ ہونے کے دیکھنے والوں کو دھوکہ جواز موروثی کا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ موروثی اور مشد مسکہ و کردار وغیرہ کو متحد سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے ان سب کی تفسیر علامہ شامی نے فتاوی حامدیہ میں تفصیل سے کی ہے۔ جس سے موروثی

کا ناجائز ہونا بخوبی واضح ہے: قال فی تفسیر الفلاح والمسکة لاشک انهما لفظان متغایران معناً وحکماً، اما المسکة فهی عبارة عن استحقاق الحرثة فی ارض الغیر من المسکة وهی لغة ما یتمسک به فکان المتسلم للارض المأذون له من صاحبها فی الحرث صار له مسکة یتمسک بها فی الحرث فیها وحکمها انها لا تقوم فلا تملک ولا تباع ولا تورث، واما الفلاحة فمعناها عمل الحراسة نفسها وحکمها انها تقوم فتملک و تباع وتورث قال ابن عابدین: فی القاموس: الفلاحة الحراثة فان کان المراد بها الکراب کما هو المتبادر فلا یصح قوله انها متقومة لان الکراب کما فی القاموس اثارة الارض لزرعها ای شقها وتهیئتها له فهو وصف غیر متقوم فی نفسه کما مر غیر مرة فلا یباع ولا یورث۔ وان کان المراد بها الکردار یصح ذلک وان کان بعیداً والکردار کما فی المغرب والقاموس بکسر الکاف مثل البناء والاشجار والکبس اذا کبسه من تراب نقله من مکان کان یملکه ومنه قول الفقهاء یجوز بیع الکردار ولا شفعة فیه لانه نقلی اه واما فی القنیة ونقله المؤلف عن الحاوی بقوله یثبت حق قرار فی ثلاثین سنة فی الارض السلطانیة والملک وفی الوقف فی ثلاث سنین ولو باع حق قراره فیها جاز وفی الهبة اختلاف ولو ترکها بالاختیار تسقط قدمیته فالمراد به ایضا ما ذکرنا من الاعیان المتقومة لا بمجرد الامر المعنوی لما علمت من عدم صحة بیعه اه ص ۱۹۹ ج ۲

اس میں صاف تصریح ہے کہ محض زمین کے بونے جوتنے سے کسی مدت کے بعد حق قرار بطور ملک کے حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ امرِ معنوی مجرد قابلِ ملک نہیں اور جو حق قابلِ ملک ہے وہ محض زراعت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ بناء غراس باذنِ مالکِ ارض سے حق قرار حاصل ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۶؍ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

حکم زمین موروثی | السوال :۔ بعض لوگ حرام آمدنیوں میں (مثل موروثی و رہن زمینوں کی آمدنی میں جکڑے ہوئے ہیں اس کے سوا ان کی روزی کی بظاہر کوئی سبیل نہیں زمیندارہ کے سوا اور کوئی صورت نہیں اس صورت میں اگر ان کو چھوڑنے پر مجبور کیا جائے تو سائل کو خود ایسی صورت میں اِن لوگوں کو فتنِ عظیم میں مبتلاء ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں کیا چاہیئے۔

الجواب

اس صورت میں ان لوگوں کو چند امور کی فہمائش کی جاوے۔

الف: اپنے آپ کو گناہ گار سمجھیں اور روزانہ اس گناہ سے استغفار کریں کہ اور اللہ سے توبہ کریں کہ اس بلا سے نجات کی توفیق دے۔

ب: مالکان زمین کو اگر باقاعدہ قبضہ دینے کی ہمت نہیں تو کم از کم ان کو راضی رکھنے کی تو کوشش کرتے رہیں مثلاً لگان مقررہ سے کچھ زاید لگان ان کو دیدیا جائے اور خوشامدیں کر کے ان کو ایسا خوش کریں کہ وہ آپ کی کاشتکاری خوشی سے منظور کر لیں۔

ج: اس تدبیر میں برابر لگے رہیں کہ جب کوئی صورت ہوگی فوراً موروثی کو چھوڑ دیں گے۔

د: اگر اسی حالت میں کسی وقت موت کے اثرات ظاہر ہوں تو مرنے سے پہلے ضرور موروثی سے استعفاء دیدیں۔ اولاد کیلئے موروثی چھوڑ کر نہ جائیں۔ کیونکہ مرنے کے بعد اولاد کام نہ آئے گی واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ر جمادی الثانی ۴۷ھ

مزارعت فاسدہ کی ایک صورت کا حکم | السوال :۔ ذیل کے مسئلہ کی ضرورت درپیش ہے۔ دیگر علماء کرام کے فتوی سے تسکین نہیں ہوئی اس لئے مستدعی ہوئے تاکہ بعد حصول فتویٰ اس پر عمل کیا جائے۔ چند سال سے ہمارے ملک میں خشک سالی کی وجہ سے سیلاب کا پانی کم آتا ہے اس لئے زراعت کے واسطے زمیندار لوگ زمین پر مشین لگواتے ہیں۔ بعض مشینیں نالوں پر اور بعض فقط زمین پر کوہی زمین

سے پانی نکالتی ہیں زمیندار اور مالک مشین آپس میں اسطرح معاملہ کرتے ہیں کہ مشین مالکِ مشین کی خریدی ہوگی اور زمین تک مشین کو پہنچانے اور لگانے کا جو خرچ ہوگا وہ مالک مشین کا ہوگا۔ جب مشین چالو ہوگی تو ڈرائیور اور مزدوروں کی مزدوری اور تیل لکڑی وغیرہ کا خرچ زمیندار اور مالکِ مشین پر مشترکہ ہوگا۔ اور محصولِ سرکاری بھی دونوں پر مشترک ہوگا۔ جب پیداوار ہوگی تو اول جو حصہ مزارعت سے مقرر شدہ ہوگا وہ مزارع حضرات کو دیا جاوے گا اور خرچ مذکور جو مشترکہ طے شدہ ہے وہ بھی نکالا جاوے گا اس کے بعد مابقی پیداوار مثلاً نصفاً نصف حصہ ہر ایک یعنی زمیندار اور مالکِ مشین لے لے گا اس معاملہ کی مدت بھی مقرر کرتے ہیں مثلاً دس سال وغیرہ۔ اگر معاملہ کو وہ لوگ شراکت کہتے ہیں اور قانوناً بھی ایسی دستاویز شراکت نامہ کا رجسٹری کراتے ہیں۔

چند سال سے ہماری زمین بھی خشک پڑی ہے میرا ارادہ بھی مشین لگوانے کا ہوا ہے میرے ناقص فہم میں تو یہ صورت فاسد معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ معاملہ شرکت ہے یا مزارعت اگر مزارعت کہا جائے اور مشین کو آلات شمار کیا جاوے چونکہ آلات کا خرچ مزارعت میں مشترک یا خاص کرنا بھی حسب تحریر رسالہ مولوی فتح محمد صاحب لکھنوی کے جائز معلوم ہوتا ہے۔ مگر چونکہ مزارع تو اور ہیں اور مالکِ مشین تو فقط مشین کھلوا کر فقط پانی دینے کے عوض حصہ لیتا ہے اس لیئے مزارعت فاسد معلوم ہوتی ہے۔ اور شرکت تو کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوتی۔

حضور اس کو کیا فرماتے ہیں اور مزارعت میں آلات کا خرچ مزارع اور زمیندار پر برضاء مشترک کریں تو جائز ہے یا نہ۔ اور مالکِ مشین کو بھی اگر مزارعوں کے ساتھ مزارع کہا جائے کہ مشین سے پانی دینا اس کے ذمہ ہے۔ دیگر کام ہل جوتنا وغیرہ دیگر مزارعوں کے سپرد ہو گو یا زمیندار سے ان سب مزارعوں نے مزارعت پر زمین لی ہے یہ کام آپس میں تقسیم کر رکھا ہو۔ اس کے جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں۔

دوسری یہ صورت بھی ذہن میں آئی ہے کہ اگر مالکِ مشین سے مشین مقررہ تعداد ــــــ اور مقررہ مدت تک کرایہ پر لی جاوے جس کے چلانے لگانے وغیرہ

کا خرچ مالک مشین پر ہو اس بات کی مالکِ مشین سے دستاویز لکھا لی جاوے اور عقد کر لیا جاوے اس کے بعد اس کرایہ والے روپوں میں جو کہ زمیندار کو واجب الاداء ہوں گے اس کے عوض زمین کا حصہ مقرر کر کے مقررہ مدت تک مالک مشین کو زمیندار ٹھیکہ پر دے دے اور ایسا عقدِ ٹھیکہ اور دستاویز جدا کر کے زمیندار اس کو کہہ دے تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں یہ حضور کی خدمت میں عرض ہے کہ جو صورت جواز کی ہو اور سہل ہو یا اور کوئی تاویل یا حیلہ شرعی ہو تو تحریر فرماویں کہ اس کے موافق سرکاری قانون پر ہی دستاویز لکھ دیا جاوے کہ فریقین کو حجت ہو کہ یہ بڑا کام ہے۔

الجواب

یہ معاملہ شرکت ہے نہ مزارعت ہے بلکہ مزارعتِ فاسدہ ہے۔

قال فی الدر: ومتی دخل ثالث فاکثر بحصته فسدت، قال الشامی عن الخانیة لو اشترك ثلاثة او اربعة ومن البعض البقر وحده او الارض وحده فسدت وکذا لو من احدهما البذر فقط او البقر فقط وعد فی الجامع الفصولین من الفاسدة مالو کان البذر لواحد والارض ثمان والبقر لثالث والعمل لرابع لان الاستیجار لبقر ببعض الخارج یرد به اثر فاذا فسدت فی حصة البقر فسدت فی الباقی وعندهما فساد البعض لا یشیع فی الکل اھ ج ۵، ص ۱۷۔

قلت فشرکة غیر صاحب البقر مما لا شئ له سوی آلة الماء فسادة بالاولیٰ۔

پس صورت جواز یہ ہے کہ مشین والے سے مشین کو کرایہ پر لیا جاوے اور کرایہ شرائط اجارہ کے ساتھ منعقد کیا جاوے۔ اجرت روپوں سے منعقد کی جاوے یا غلہ کی مقدار معین یعنی مقرر کی جاوے اور تصریح کر دی جاوے کہ اسی زمین کی پیداوار سے دینا لازم نہیں۔ لئلا یکون شبهة قفیز الطحان۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۵ ذی الحجہ ۴۶ھ

زمیندار پر سرکاری پابندی ہے کہ کاشتکار کو اتنی معافی ضرور دیں اور اس کی ایک خاص صورت کا بیان۔

السوال:- کیا فرماتے ہیں علماء اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک قطعہ اراضی سو بیگھہ مبلغ آٹھ ہزار روپے میں خرید کیا جس کی مالگذاری سرکاری پچاس روپے و ابواب پانچ روپے جملہ مبلغ ۵۵ داخل خزانہ کرتے ہوئے اور اس کا لگان جو کاشتکار سے وصول کیا جاتا ہے مبلغ ساڑھے تین سو پچاس روپے ہے سرکار نے بقدر ۱/۴ مالگذاری میں سے یعنی مبلغ ۱۲ زمیندار کو معاف کیئے اور ابواب بدستور بذمہ زمیندار مبلغ پانچ روپے قائم رکھا اور حکم دیا کہ زمیندار ہی کاشتکار پر مع ابواب بقدر ۱/۴ معاف کرے جسکی تعداد مبلغ ۹۰ کم کرنا چاہیے یا ۱۲ بارہ روپیہ جس قدر کہ زمیندار پر معاف ہوا یا کل لگان پر ۲۵ فیصدی ابواب یعنی ۸ کم کرکے سالم ۱۲ پر معافی دینی چاہیئے۔

الجواب

شرعاً زمیندار کے ذمہ کسی مقدار کا معاف کرنا بھی کاشتکار سے واجب نہیں بلکہ اس کو اختیار ہے کہ کچھ معاف کرے یا نہ کرے البتہ اگر حکومت کی معافی مشروط ہو تو اس کے عفو کے ساتھ یا تو گورنمنٹ کی معافی کو واپس کردے یا جتنی معافی بدرجہ اقل تعمیل حکم کیلئے ضروری ہو اس قدر معاف کردے۔ واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۲۷ رمضان ۱۳۴۸ھ

کتاب الصید والذبائح والاضحیة والعقیقة والختان

خصی دنبے کی قربانی کا حکم

السؤال : اگرکسی دنبہ کا ایک خصیہ نکلا ہوا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

خصی دنبہ کی قربانی جائز ہے اور بظاہر ایک خصیہ نکل جانے کے بعد بھی وہ مثل خصی کے ہو جاوے گا کہ شہوت باقی نہ رہے گی، لہذا یہ بھی حکماً خصی کے مثل ہے، قربانی میں کچھ حرج نہیں ہے ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

قربانی کے جانور کو پہلے سے خرید کر موٹا تازہ کرنا مستحب ہے ۔

السؤال : قربانی کا جانور اگر قربانی کی نیت سے ایک ماہ پہلے خرید لیا ہو تو کیا دسویں ذی الحجہ کو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

قربانی کا جانور پہلے سے خریدنا اور اس کو موٹا تازہ کرنا مستحب ہے ۔ چاہے ایک ماہ پہلے یا زیادہ بہر حال قربانی جائز ہے ۔ واللہ اعلم ۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

عقیقہ ساتویں دن کرنا مستحب ہے

السؤال : عقیقہ میں رعایت سات[٧] دن یا چودہ[١٤] یا اکیس[٢١] دن وغیرہ نہ کرکے جب جی چاہے تو عقیقہ کروں تو عقیقہ ہو گا یا نہ ۔ حدیث دفقہ میں جو سات دن وغیرہ کی تصریح ہے یہ اس وقت کے واسطے ہے یا نفسِ جواز کے واسطے بیان کی گئی ہے بادلیل معہ حوالہ کتاب معتبرہ تحریر فرماویں ۔

الجواب

سات کے عدد کی رعایت محض افضل ہے ورنہ عقیقہ بہر صورت ادا ہو جائے گا ۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ فی احکام العقیقۃ ج ۲ ص۲۱۲، ص۲۱۳
ولو قدم یوم الذبح قبل یوم السابع أو أخّرہ جاز إلا أن یوم السابع افضل (إلی أن قال) ووقتها بعد تمام الولادۃ إلی البلوغ فلا یجزی قبلها و ذبحها فی الیوم السابع یسن والاولی فعلها صدر النھار عند طلوع الشمس بعد وقت الکراھۃ للتبرّک بالبکور ولیس من السبعۃ یوم الولادۃ خلافاً للشیخین ولو ولد لیلاً حسبت الذبیحۃ من الصبیحۃ ویسن أن یعق نفسہ من بلغ ولم یعق عنہ اھ
اس سے معلوم ہوا کہ سات کے عدد کی رعایت کرنا صرف مسنون ہے ورنہ ادائے عقیقہ میں بغیر اس کے بھی خلل نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہٗ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲/ صفر ۱۳۴۰ھ

گائے کا ذبیحہ ہندوستان میں اسلامی شعار ہے۔

السؤال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ذبیحہ گائے ہندوستان میں اسلامی شعار ہے یا نہیں جیساکہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوب ہشتاد و یکم جلد اول ص۸۶ میں تحریر فرمایا ہے: "ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعار اسلام است"۔
۲ اور اگر کسی جگہ ہندو مسلمانوں کو اس سے روکنے لگیں مگر مسلمان اس کے ذبح پر قادر بھی ہوں تو مسلمانوں کے لئے اس وقت کیا حکم ہے؟
۳ اور ایسے وقت میں جو مسلمان بکری وغیرہ کی قربانی چھوڑ کر اکثر صرف گائے ہی کی ذبح کو اختیار کریں یا روزمرہ بجائے بکری کے گائے کا گوشت کھایا کریں تو وہ مسلمان ثواب کے مستحق ہوں گے یا نہیں؟

الجواب

۱ ذبیحۂ گائے ہندوستان میں یقیناً اسلامی شعار ہے، چند وجوہ سے:
۱ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے گائے کی ہندو بہت عظمت کرتے اور اس کو اپنا دیوتا سمجھتے تھے، جیساکہ اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے۔ اس مشرکانہ اعتقاد کے ساتھ جب تک ہندوؤں کی سلطنت ہندوستان میں رہی کسی کی یہ طاقت نہ تھی کہ یہاں کوئی شخص گائے کو ذبح کو سکے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی سلطنت جب اپنے

میں لی تو جیسا کہ انہوں نے دیگر عقائد شرک کو پامال کیا اسی طرح گائے کی اس عظمت کو بھی پامال کیا اور اس کو ذبح کر کے اس کا دیوتا نہ ہونا اور محض عاجز ولاچار ہونا ظاہر کر دیا۔ پس ذبیحۂ گائے چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے شروع ہوا اور اس کا ذبح ہونا اسلامی اثر کا نتیجہ تھا اس لئے یہ ذبیحہ اسلامی شعار ہے۔

ع۲ کلمۂ توحید لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بالاتفاق شعارِ اسلام ہے لیکن ہندو کسی خوف یا تقیہ کی وجہ سے اس کلمہ کو زبان سے کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس وقت ہندو و مسلم کی اتحاد کی گرماگرمی میں سُنا گیا ہے کہ بعض ہندوؤں نے اللہ اکبر اور لآ الٰہ الا اللہ کے نعرے لگائے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ہندو ہی سمجھتے ہیں مسلمان نہیں سمجھتے لیکن گائے کا ذبح کرنا یا اس کا گوشت اعلانیہ طور پر کھانا یہ کوئی ہندو اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے کو مسلمان ظاہر نہ کر دے۔ یہ صاف اس بات کی علامت ہے کہ ذبیحۂ گائے اور اس کا گوشت کھانا ہندوستان میں اسلام کا بڑا شعار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ہندو مسلمان ہوتا ہے تو اہلِ اسلام اس کو پہلے گائے کا گوشت کھلاتے ہیں۔ اگر اس نے اس سے نفرت نہ کی تو اس وقت اس کے سچے مسلمان ہونے کا یقین ہو جاتا۔

ع۳ کفار سے جزیہ یقیناً اسلام کی بڑی علامت ہے لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنت کے زمانہ میں ہندو جزیہ دینے کی ذلت کو گوارہ کرتے تھے مگر گائے کے ذبح ہونے کو گوارہ نہ کرتے تھے بلکہ اس پر ہمیشہ کشت وخون کی نوبت آتی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی بہت سی قیمتی جانوں کا خون کر کے ذبیحہ گائے کو بھی ہندوستان میں جاری کیا۔ پس ذبیحۂ گائے ہندوستان میں غلبۂ اسلام کی اتنی بڑی علامت ہے کہ جزیہ لینا بھی علامت میں اس سے کم تر ہے۔ اس لئے اس میں کچھ شک نہیں کہ ذبیحہ وقربانی گائے ہندوستان میں اسلام کا بہت بڑا شعار ہے۔

ع۴ قرآن شریف میں حق تعالےٰ شانہ کا ارشاد ہے:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰھَا لَکُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ۔ اور بدنہ کو ہم نے تمہارے لئے خداوندی شعار بنایا ہے۔

بُدن جمع ہے بُدنۃ کی، جس کا اطلاق لغۃً اونٹ اور گائے پر ہوتا ہے قال فی القاموس

والبدنة محركة من الابل والبقر كالاضحية من الغنم تهدى الى مكة للذكر والانثىٰ اھ ج ۲-ص ۸۶۳

پس جس طرح اونٹ کی قربانی شعارِ اسلام ہے، اسی طرح گائے کی قربانی بھی شعارِ اسلام ہےؑ

۵۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن انس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من صلی صلوٰتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی له ذمة اللہ ورسوله فلا تخفروه فی ذمته۔ رواه البخاری (مشکوٰۃ)

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہماری نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرنے لگے اور ہمارا ذبیحہ کھائے پس یہی وہ مسلمان ہے جس کے لئے خدا اور مسلمانوں کی پناہ ہے، پس خدا تعالیٰ کی پناہ کو مت توڑو۔

اس حدیث میں جس طرح نماز اور استقبالِ قبلہ کو آپ نے شعارِ اسلام فرمایا ہے، اسی طرح اسلامی ذبیحہ کھانے کو بھی شعارِ اسلام میں داخل فرمایا ہے۔ اور اسلامی ذبیحہ وہی ہوگا جو ذبیحۂ کفار سے پوری طرح ممتاز ہو اور ایسا ذبیحہ گائے کے سوا ہندوستان میں کوئی نہیں۔ کیونکہ اس کے ذبح اور تناول پر کوئی ہندو کبھی پیش قدمی نہیں کرتا۔ پس ہندوستان میں گائے کا ذبیحہ اور اس کا گوشت کھانا بہت بڑا اسلامی شعار ہے۔

جواب سوال دوم

جب یہ ثابت ہوگیا کہ گائے کا ذبیحہ اسلامی شعار ہے تو اگر ہندو اس سے روکنے لگیں خواہ جبراً یا کسی تدبیر کے ساتھ مثلاً خوشامد اور چاپلوسی کر کے، اس وقت مسلمانوں پر بقدرِ استطاعت اس شعارِ اسلامی کے بقاء میں کوشش کرنا واجب ہے اور ایسی حالت میں جو کوئی ہندوستان کا ساتھ دے گا اس کے ایمان کا اندیشہ ہے جس طرح ہندوؤں کے جبر یا خوشامد سے اذان کا چھوڑنا یا کم کرنا جائز نہیں اسی طرح ان کی خوشامد یا جبر سے

ؑ اور گو اس آیت کا حج کے متعلق ہونا محتمل ہے لیکن اول تو الفاظ عام پھر دوسرے جو لوگ اس کے شعار ہونے کے نافی ہیں بعض احوال میں شعائر ہونا بھی ان کے قول کی نفی کے لئے کافی ہے اور وجوہ بالا میں جو ہر حال میں شعار ہونے کا دعوی کیا گیا ہے وہ باعتبار حالت خاصۂ ہند کو ہے، فلا تعارض۔

ذبیحۂ گائے بند کرنا یا کم کرنا جائز نہیں بقدر استطاعت اس کا جاری رکھنا لازم ہے۔

جواب سوال سوئم

قربانی میں سب سے افضل اونٹ پھر بکری ہے۔

الهدی ادناه شاة لما روی انه صلی الله علیه وسلم سئل عن الهدی فقال ادناه شاة وهو من ثلاثة انواع الابل والبقر والغنم لانه صلی الله علیه وسلم لما جعل الشاة ادنی فلا بد أن یکون له أعلی وهو البقر والجزور اھ

اس میں صاف تصریح ہے کہ گائے کی قربانی بکری کی قربانی سے اعلیٰ ہے اور بکری کی قربانی ادنیٰ ہے۔ فتح القدیر میں بھی اس کی تصریح ہے۔ امام نووی رحؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

فمذهب الشافعی وابی حنیفة والجمهور ان الابل افضل ثم البقر ثم الغنم اھ

یعنی امام شافعی اور امام ابو حنیفہ اور جمہور علماء امت کا مذہب یہ ہے کہ اونٹ (کی قربانی) افضل ہے، اس کے بعد گائے (کی) اس کے بعد بکری (کی) اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ لغتِ عربی میں غنم بکری اور بھیڑ اور دُنبہ سب کو عام ہے۔

فی القاموس: الغنم محرکة الشاء لا واحد لها من لفظها والواحدة شاة اھ

وفیه ایضًا الشاة الواحدة من الغنم للذکر والانثیٰ وتکون من الضأن والمعز۔ اھ

پس حدیث وفقہ کی تصریح کے موافق گائے کی قربانی بکری اور دنبہ اور بھیڑ سب سے افضل ہے۔ بعض لوگوں نے ترمذی کی حدیث خیر الاضحیة الکبش سے یہ استدلال کیا ہے کہ دنبہ کی قربانی گائے کی قربانی سے بہتر ہے، مگر وہ حدیث کا مطلب صحیح نہیں سمجھے۔

حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ بہتر اضحیہ دنبہ ہے اور اضحیہ کے معنی ان لوگوں نے مطلق قربانی کے سمجھے ہیں جس سے حاصل یہ ہے کہ بہترین قربانی دنبہ کی قربانی ہے۔ حالانکہ لفظ اضحیہ لغت میں جنسِ شاۃ کے لئے مخصوص ہے چنانچہ قاموس کی ایک عبارت تو اوپر گذر چکی ہے۔

والبدنة محرکة من الابل والبقر کالاضحیة من الغنم اھ

اور دوسری جگہ قاموس میں ہے:

والاضحیۃ شاۃ یضحی بھا ج اضاحیٌ کالضحیۃ جمع ضحایا ۱ھ

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اضحیہ خاص قربانی شاۃ کو کہتے ہیں۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ بکری، بھیڑ اور دُنبہ کی قربانی اوروں سے بہتر ہے سو اس کا کسی کو بھی انکار نہیں۔ مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ وہ گائے سے بھی افضل ہے۔ چنانچہ فقہاء کے کلام سے بھی حدیث کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے۔

شامی میں ہے: قال فی البدائع: افضل الشاۃ ان یکون کبشًا املح اقرن موجوًا والاقرن العظیم القرن والاملح الابیض۔ اھ

یعنی بکریوں میں افضل قربانی یہ ہے کہ دنبہ سفید بڑی سینگوں والا خصی ہو۔

اور جب فقہاء اور اہل لغت کے کلام سے اس حدیث کا مطلب متعیّن ہوگیا کہ بکریوں کی قسم میں افضل دُنبہ ہے تو پھر اس سے یہ استدلال کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ دنبہ کی قربانی گائے سے بھی افضل ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ یہ حدیث ضعیف بھی ہے، ترمذی نے اس حدیث کو روایت کر کے کہا ہے ھٰذا حدیث غریب وعفیر بن معدان یضعف فی الحدیث۔ یہ حدیث غریب ہے اور عفیر بن معدان حدیث میں ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔

وفی میزان الاعتدال: وقال ابوحاتم یکثر عن سلیم عن ابی امامۃ بما لا اصل لہ اھ ج ۲ - ص ۲۰۳

وہ یعنی عفیر بن معدان ابوامامہ سے بواسطہ سلیم کے بے اصل روایتیں نقل کرتے ہیں۔ (اور یہ حدیث خیر الاضحیۃ الکبش ابوامامہ سے بواسطہ سلیم ہی کے روایت کی گئی ہے) لہٰذا بقاعدۂ اصول یہ حدیث احتجاج کے قابل نہیں ہے تا آنکہ اس سے جمہور امت کے خلاف یہ مسئلہ مستنبط کیا جائے کہ دنبہ کی قربانی گائے سے افضل ہے۔ بعض لوگوں کو درّ مختار کی عبارت الشاۃ افضل من سبع البقرۃ (بکری گائے کے ساتویں حصہ سے افضل ہے) غلط اندازے کا موقع مل گیا ہے کہ گائے کی قربانی سے بکری کی قربانی افضل ہے حالانکہ اس کے بعد اس میں یہ قید بھی مذکور ہے اذا استویا فی القیمۃ واللحم اھ یعنی جب گائے کا ساتواں حصہ اور بکری قیمت اور گوشت میں برابر ہوں اس وقت بکری کی قربانی گائے کے ساتویں حصہ سے افضل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ گائے ہی دبلی ہوگی جس کا ساتواں حصہ گوشت میں بکری کے برابر ہو۔ اور قربانی میں افضل یہ ہے کہ

جانور عمدہ ہو -

فی الدر : فان کان سبع البقرۃ اکثر لحماً فھو افضل اھ ج ۵ - ص ۳۱۵

پس اگر گائے کا ساتواں حصہ گوشت میں زیادہ ہو تو وہی افضل ہے اھ

اور ظاہر ہے کہ جیسی گائے قربانی میں عموماً ذبح کی جاتی ہے اس کا ساتواں حصہ بکری سے گوشت میں زیادہ ہوتا ہے پس گائے کا ساتواں حصہ بھی بکری سے عموماً افضل ہے - ہاں جس دبلی گائے کا ساتواں حصہ بکری کے گوشت کے برابر ہو اس سے بکری اس لحاظ سے افضل ہے کہ اس کا گوشت عمدہ ہوگا - پھر یہ ساری گفتگو تو گوشت اور قیمت کے اعتبار سے افضل ہونے میں ہے لیکن جب اس لحاظ سے نظر کی جائے کہ گائے کے ذبح کرنے میں ہندوؤں کے عقیدۂ شرک کا ابطال اور غلبۂ اسلام کا اظہار ہے اس لحاظ سے ہر حال میں گائے کی قربانی بکری کی قربانی سے افضل ہوگی بشرطیکہ وہ گائے بقاعدۂ شریعت قربانی کے قابل ہو اور اسی لحاظ سے روزمرہ بھی گائے کا کھانا بکری کے گوشت کے کھانے سے بہتر ہے - خصوصاً جس جگہ ہندو مزاحمت کرتے ہوں - مگر مسلمان گائے ذبح کرنے پر قادر ہوں وہاں تو ضرور گائے کے گوشت کو بکری کے گوشت سے ترجیح دینی چاہیئے - بعض لوگ کہتے ہیں کہ آجکل ہندوؤں سے ہمارا اتحاد ہے اور اس اتحاد کی ہم کو ضرورت بھی ہے اس لئے گائے کی قربانی بند کر دینی چاہیئے - اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوؤں سے ایسا اتحاد کرنا خود ہی ناجائز ہے، جس میں ہم کو ان کی عقیدۂ شرک کی کچھ بھی رعایت کرنی پڑے - گئورکشا ہندوؤں کا مذہبی اہم عقیدہ ہے، اس میں مسلمانوں کو کچھ بھی حصہ لینا ہرگز ہرگز جائز نہیں - اور جس مقصد میں مسلمان ہندوؤں سے ایسا اتحاد کئے بغیر کامیاب نہ ہوسکیں وہ کام ہر مسلمان کے ذمہ لازم نہ ہوگا اگر ہندو بدون مذہبی امور میں مداخلت کئے مسلمانوں سے اتحاد نہیں کرسکتے تو ایسے اتحاد کا اختیار کرنا ہی جائز نہیں ہے - اور بعض لوگوں نے جو ایسی مراعات کی نظیر ہمیں شریعت میں ثابت کی ہیں انہوں نے مخلوقِ خدا کو سراسر دھوکہ دیا ہے جس کی حقیقت رسالہ " الخیر النامی " میں ظاہر کردی گئی ہے مسلمانوں کو ایسی باتوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے - شریعتِ اسلامیہ میں ایسی کوئی نظیر نہیں ہے جس میں کفار کے مشرکانہ عقیدہ کی کچھ بھی رعایت کی گئی ہو یا کفار کی خاطر کسی اسلامی شعار کو مٹایا گیا ہو نعوذ

باللہ منہ ۔ واللہ المسئول لان یثبتنا علی الصراط المستقیم والحمد للہ وعلی خیر البریۃ افضل الصلوٰۃ والتسلیم ۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۹ ؍ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۰ھ

تأیید الجواب وھو الھادی الی الصواب

فی بیان القرآن تفسیر قولہ تعالیٰ : یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً الاٰیۃ

ما نصّہ اوپر آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ الخ مخلص کی مدح تھی بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہو جاتا ہے یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا مگر وہ اطاعت بنظرِ غائر حدِ شریعت وسنت سے متجاوز ہوتی ہے اس کو بدعت کہتے ہیں ۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضؓ جو پہلے علماء یہود سے تھے اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا اور اونٹ کا گوشت حرام تھا ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعتِ موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی اور شریعتِ محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں اسی طرح شریعتِ موسوی میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعتِ محمدیہ ؐ میں اس کا کھانا فرض نہیں سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعتِ موسویہ کی بھی رعایت ہو جاوے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہو اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے ۔

فی منھیات عن لباب النقول : اخرج ابن جریر عن عکرمۃ قال قال عبد اللہ بن سلام وثعلبۃ وابن یامین واسد واسید ابنا کعب وسعید بن عمرو وقیس بن زید کلھم من الیھود یا رسول اللہ یوم السبت یومٌ نعظمہ فدعنا فلنسبت فیہ فنزلت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً

وفی روح المعانی : وکرھوا لحمان الابل اھ

وفی التفسیر المظھری : عن البغوی : وکانوا یکرھون لحوم الابل والبانھا

بعد ما اسلموا فنزلت الآیۃ ۔

اس خیال کی اصلاح آیتِ آئندہ میں کسی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابلِ رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جاوے اور ایسے امر کو دین سمجھنا یہ ایک شیطانی لغزش ہے اور بنسبت ظاہری معاصی کے اس کے اشد ہونے کے سبب یہ عذاب کا زیادہ مظنہ ہے

اصلاح مبتدع یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّیْطَانِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۔ ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (یہ نہیں کہ کچھ کچھ یہودیت کی رعایت کیا کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (احکام وشرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں (پھر بھی صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین کر رکھو کہ حق تعالیٰ بڑے زبردست ہیں (سخت سزا دیں گے گو چنداں سزا نہ دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت اور مصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ) یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے) ہیں۔ کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امرِ حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزا و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحبِ اختیار نہ ہوگا۔ سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے ۔

۳؎ (بعد حذفِ فائدتین) آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمانے سے معلوم ہوا ہوگا کہ بدعت پر کس درجہ ملامت و مذمت ورد وانکار فرمایا گیا ہے اور حدیثوں میں اس سے زیادہ صاف الفاظ میں سخت سخت وعیدیں آئی ہیں اور واقع میں اگر غور سے کام لیا جاوے تو بدعت ایسی ہی مذموم چیز ہونی چاہیئے کیونکہ خلاصہ حقیقت بدعت کا غیر شریعت کو شریعت بنانا ہے اور شریعت کا من اللہ ہونا ضرور اور لازم ہے تو یہ شخص ایسے امر کو جو من اللہ نہیں ہے اپنے اعتقاد میں من اللہ بتاتا ہے جس کا حاصل اور مرجع افترا علی اللہ اور ایک گونہ ادعاء نبوت ہے۔ سو اس کے عظیم و ثقیل ہونے میں کیا شبہ ہے۔ یہ تو شناعت ہے اس کی حقیقت کے اعتبار سے اور آثار کے اعتبار سے ایک بڑی شناعت یہ ہے کہ اس سے توبہ کمتر نصیب ہوتی ہے کیونکہ جب وہ اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے تو توبہ کیونکر کرے گا۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس جہل ہی سے نجات بخش دیں کہ اس کی نظر میں وہ استحسان مبدل بہ استہجان ہوجاوے تو یہ اور بات ہے۔ اور پھر توبہ سہل ہے۔ اھ

تفریع علیٰ ما فی التفسیر

مقامِ غور ہے کہ جب ایسے امر کی رعایت کو جو کہ فی نفسہٖ مباح ہو اور ایک وقت میں ایک شریعت کا جزو ہونے سے عبادت بھی رہ چکا ہو اور بعد تنسیخ کے بھی مباح ہی رہا ہو اور نیت بھی کسی دنیوی غرض یا کسی کافر کے خوش کرنے کی نہ ہو صرف عارضِ نسخ کے سبب وہ بدعت ہوگیا ہو جب ایسے امر کی رعایت کو اسلامِ کامل کے خلاف اور یہودیت کا شعبہ اور اتباعِ شیطان اور محلِ وعیدِ شدید قرار دیا گیا ہو تو جو امر کہ شعارِ کفر اور مبنی علی الشرک ہونے کے سبب فی نفسہٖ بھی مباح نہ ہو اور مقصود اس سے رضا مشرکین ہو اور پھر اس کو مقدمۂ تقویتِ دین بتا کر دین بنا دیا جائے اور اس کے سبب نصوصِ شرعیہ میں تحریف و تغیر کی جاوے اس کی رعایت کس درجہ اسلام سے بعید اور محلِ اشد وعید ہوگی وھو ظاھر جدًا ولا یتخلص من الذنب بعذر کون الامتناع عملیًا محضًا لا اعتقادیًا لما فی التفسیر الکبیر لقولہ تعالٰی: لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ۔ المراد من ھٰذا التحریم ھو الامتناع عن الاستمتاع بالازواج لا اعتقاد کونہ حرامًا الخ۔ واللہ اعلم

کتبہ اشرف علی عفی عنہ

۲۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۰ھ

قربانی کی کھال خیرات نہ کر کے مٹی میں دفن کرنے کا حکم

السؤال : قربانی کے چمڑے نہ بیچ کر اور خیرات نہ کر کے اس کو مٹی میں دفن کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب

قربانی میں تو نقص نہ آئے گا مگر اضاعتِ مال کا گناہ ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۹ / صفر ۱۳۴۳ھ

۹۰ ک ۵۵

اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم اور حکمتِ جواز

السؤال : کتابیہ کے ہاتھ کا ذبیحہ یا اُن کے یہاں شادی بیاہ کرنا درست ہے یا نہیں اگر ان کے ہاتھ کا ذبیحہ جائز ہے تو کس طرح سے، کیونکہ جو شخص مسلمان نہیں رسول اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور خدا کی وحدانیت کا قائل نہ ہو اس کے یہاں شادی بیاہ یا اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ ذبیحہ میں مسلمان ہونا ضروری ہے۔ جب یہود و نصاریٰ اسلام کے سراسر خلاف اور منکرِ رسالت یا توحید کے ہیں تو پھر ان کے ہاتھ کی کوئی چیز کیسے درست

ہو سکتی ہے۔ جو چیز کہ ضروریاتِ دین اور شعائرِ اسلام سے عبادات کے اندر پائی جاتی ہو رہا معاملہ اس میں تو ھندو یعنی اہل کتاب و غیر اہل کتاب سب مساوی ہیں۔ کوئی فرق نہیں۔
میں نے مالابدّمنہ، مؤلفہ جناب مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی جب سے یہ عبارت دیکھی ہے کہ کتابیہ کے ہاتھ کا ذبیحہ جائز ہے اور اس کے علاوہ غالباً کوئی آیت قرآن کی بھی اس کے جواز کا فتویٰ دے رہی ہے، سرِ دست مجھے فرصت نہیں ورنہ مدلّل لکھتا بہرکیف تردّد یہ یہ ہے اس کے باوجود کہ اہل کتاب اپنی اصل شریعت پر قائم ہوں پھر بھی یہ دین محمدی بلا اختیار کیے اور آپؐ کی رسالت کے مقر ہوئے بغیر ان کی کوئی چیز کیسے جائز ہوگی۔ اس آیت سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔ ماسوا اسلام کے اور کسی مذہب اور دین کے قبول کرنے کی رد میں یہ آیت کافی معلوم ہوتی ہے کہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ
خلاصہ ان سب مضامین کا مطالع فرمایئے، سمجھ کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور اس کا کہنا اور لکھنا بجا ہے۔ بیّنوا توجروا

السائل:
محمد شمس الدین غفرلہٗ
۳ر رجب ۱۳۴۰ھ

الجواب

کتابی کے ہاتھ کا ذبیحہ اور اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا خود نصِ قرآنی سے جائز کیا گیا ہے اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔
پھر سائل کا اس پر چون وچرا کرنا سخت جائے حیرت ہے، کیا احکامِ شرعیہ کی اگر حکمت سائل کی سمجھ میں اگر نہ آئے گی تو وہ اس حکم کو تسلیم ہی نہ کرے گا۔ سائل نے اس سوال میں بہت سخت اور بیجا طور پر چون وچرا کی ہے۔ گویا وہ حکم خداوندی پر اعتراض کرنا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں جائز کیا گیا، حرام کیوں نہ کیا گیا۔ سائل کو اگر حکمت دریافت کرنا منظور تھی تو ادب کے ساتھ حکمت دریافت کرتا۔ حکم شرعی پر اعتراض اور چون وچرا کرنا اپنی عاقبت

کو برباد کرنا ہے چونکہ ہم مسلمان ہیں اس لیے سائل کے جواب میں قرآن کی آیت کا لکھ دینا کافی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں خود کتابی کے ذبیحہ کو اور کتابی عورتوں کو حلال کیا ہے ہمارے واسطے یہ دلیل سب سے بڑی دلیل ہے۔ رہا احکام کی حکمت کا بیان کرنا یہ ہمارے ذمہ نہیں کیونکہ ہم واضعِ احکام نہیں صرف عالمِ احکام فی الجملہ ہیں۔ احکام کا بتلانا اور حوالہ لکھ دینا ہمارا کام ہے۔ دلائل عقلیہ اور حکمتوں کے بتلانے کے ہم ذمہ دار نہیں۔ ہاں اگر مخاطب میں اہلیت ہو اور وہ زبانی دریافت کرنا چاہے تو اس سے بھی انکار نہیں۔ سائل کے بیہودہ طرزِ سوال کو دیکھ کر حکمت بتلانے کو جی نہ چاہتا تھا مگر پھر طبیعت پہ جبر کر کے تبرّعًا لکھتا ہوں

میری سمجھ میں حکمت جو اس مسئلہ کی آئی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے اور خدا پر بھی مسلمانوں کی طرح صحیح ایمان نہیں رکھتے لیکن وہ دوسرے کافروں سے اس بات میں ممتاز ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے دین کا متبع بتلاتے ہیں جو کسی وقت میں دینِ الٰہی یقینًا تھا جس کا اتباع اس وقت فرض تھا۔ نیز وہ اپنے آپ کو ایسے پیغمبروں کا متبع بتلاتے ہیں جو درحقیقت خدا کے سچے رسول اور محبوب ہیں اور اس وقت ان کی رسالت کا دور ختم ہو گیا ہے پس یہ لوگ دوسرے کافروں کے برابر ہرگز نہیں۔ نیز توراۃ و انجیل پر ادھورا ایمان رکھنے کی وجہ سے یہ لوگ قیامت اور ملائکہ اور دیگر انبیاء پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جنت دوزخ کے بھی قائل ہیں (کیونکہ یہ گفتگو ان عیسائیوں اور یہودیوں کی بابت ہے جو حقیقت میں عیسائی اور یہودی ہیں اور جو برائے نام عیسائی ہوں اور عقائد میں ملحد ہوں جیسے اکثر انگریز ایسے ہیں تو وہ گفتگو سے خارج ہیں، نہ ان کا ذبیحہ جائز ہے نہ ان کی عورتیں حلال ہیں) اس لیے شریعت نے فی الجملہ دوسرے کافروں سے اہلِ کتاب کا یہ امتیاز عطا کر دیا کہ ان کے ہاتھ کے ذبیحہ کو حلال کیا بشرطیکہ وہ خدا کے نام پر ذبح کریں، مسیح وغیرہ کے نام ذبح نہ کریں اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز کر دیا واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

۶ رشوال ۱۳۴۰ھ

سینگ ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی کا حکم اور اس کی تحقیق

السّؤال: معروض آنکہ جناب ملکِ بنگالہ میں مکسور القرن کے مسئلہ میں عالموں میں دو فریق میں تنازع ہو رہا ہے ایک فریق اوپر کے خول اور اندر کے استخوان کو قرن، اور دوسرا

فریق فقط اوپر کے خول کو قرن اور اندر کے استخوان کو مشاش ومخ و دماغ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اور فریق اول قرن کی جڑ یعنی اصل قرن کو مشاش مخ و دماغ کو مغز سر کہتے ہیں اور دلیل ہر دو کی شامی و عالمگیری اور بزازی ہے۔ تینوں کتابوں کی دلیل سمجھنے میں تنازع ہوا ہے۔ اب امید ہر دو فریق کی یہ ہے کہ آپ بطور فیصلہ کے ایک جواب دیجئے گا اور آپ نے جو بہشتی زیور میں قربانی کے جانور مکسور القرن کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ البتہ اگر بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں تو درست نہیں اس کے کیا معنی ہیں کہ اوپر کے غلاف کا جڑ سے ٹوٹنا مطلب ہے یا کہ غلاف (یعنی خول اور اندر کا استخوان معًا) اور مغلوف ہر دو ٹوٹنا مراد ہے۔ فریق اول اپنے مدعا کا استدلال اسی دلیل سے کرتے ہیں۔

السائل :

محمد دلاور حسین عفی عنہ

پوسٹ دولت خان حاجی پور و مدرسہ اسلامیہ بنگال

الجواب

قال الشامی: ویضحی بالجماء وھی التی لاقرن لھا خلقۃ وکذا العظماء التی ذھب بعض قرنھا بالکسر أو غیرہ فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز۔ قہستانی۔

وفی البدائع: ان بلغ الکسر المشاش لایجزئ والمشاش رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین اھ ج ۵۔ ص ۳۱۵

قرن کا اطلاق لغۃً اس ہڈی پر ہوتا ہے جو حیوانات کے سر پر بلند ہوتی ہے صرف اس کے خول کو قرن نہیں کہتے اور شامی تصریح کرتے ہیں کہ مکسور بعض القرن کی قربانی جائز ہے جس سے متبادر یہی ہے کہ اگر قرن مع غلاف و عظم باطن کے نصف سے کم ٹوٹ جائے تو قربانی جائز ہے اور مخ سے مراد دماغ ہے جو سینگ کی جڑ سے متعلق (متصل) ہے اس سے مراد باطن غلافِ قرن نہیں ورنہ عبارت اس طرح ہوتی فان بلغ الکسر مخہ ای مخ القرن۔ لغت میں مخ کے معنی نقی العظم کے بھی ہیں اور دماغ کے بھی ہیں۔ لیکن جب لفظ المخ کا اطلاق بلا اضافت الی العظم کے ہو تو ظاہر یہی ہے کہ دماغ مراد ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ بدائع میں بجائے مخ کے لفظ مشاش اختیار کیا ہے اور مشاش کا اطلاق باطنِ غلافِ قرن پر ہرگز نہیں ہو سکتا پس بہشتی زیور کی عبارت میں جڑ سے مراد صرف غلاف کی جڑ نہیں بلکہ اندر کی ہڈی اور غلاف دونوں کی جڑ مراد ہے غلاف تو اگر سارا بھی اتر جائے مگر اندر کی ہڈی باقی رہے تو اضحیہ درست ہے فافہم۔

ذابح کی مدد کرنے والا اگر کافر ہو تو ذبیحہ حلال ہے

السّوال : بعض عوام سمجھتے ہیں کہ اگر ذابح کی اعانت کرنے والا مثلاً جانور پکڑنے والا اگر کافر ہو تو ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے براہ کرم یہ جزئیہ جہاں ہو مع حوالۂ کتاب وباب وجلد وصفحہ نمبر تحریر فرماویں۔

السائل :
مولوی عبدالحی عفا اللہ عنہ
قرب بازار شفاخانہ رحمانی حیدرآباد

الجواب

قال العلامة عبد الحیّ فی فتاواہ : گیرندۂ مذبوح را ہمچو رسن وغیرہ تصور باید ساخت، معین ذابح آنست کہ دستِ خود بر آلۂ ذبح نہد۔

فی کتاب الاضحیة من العالمگیریة : رجل اراد أن یضحی فوضع صاحب الشاة یده علی السکین مع ید القصاب حتی تعاونا علی الذبح قال الشیخ الامام یجب علی واحد منهما التسمیة الخ

وفی کتاب الصید : منها مسلم عجز عن حد قوسه بنفسه فاعانه علی مده مجوسی لا یحل اکله لاجتماع المحرم والمحلل فیحرم کما لو أخذ مجوسی بید المسلم فذبح والسکین فی ید المسلم لا یحل اکله اھ ج ٦ - ص ۲۸۰

برجندی در شرح نقایہ آوردہ کما یشترط تسمیة الذابح یشترط تسمیة من اعان الذابح بحیث وضع یده علی المذبح کما وضع الذابح۔

وقال قاضی خان فی فتاواہ : رجل أراد أن یضحی ووضع صاحب الشاة یده مع ید القصاب علی المذبح واعانه علی الذبح حتی صار

ذابح جامع القصاب الخ ج ۴ - ص ۳۰۵

فتاوی عبد الحی : قلت والقیود الفقہیۃ احترازیۃ فعلم ان الآخذ برجل الذبیحۃ ویدها لیس بذابح ولا بمعین علی الذبح وقال فی الدر وشرط کون الذابح مسلماً الخ فاسلام غیر الذابح لیس بشرط - واللہ اعلم -

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۴ / ذی الحجۃ سنہ ۱۳۴۰ھ

قربانی کے جانور کی کھال اور اس کے گوشت کا حکم

السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قربانی کی کھال کا ڈول بنوا کر مسجد میں دینا یا کھال ہی کھال کی قیمت کو مسجد میں یا دیگر اوقاف میں لگا دینا، تعمیر میں ان کے ملازموں کو تنخواہ میں دیدینا جائز ہے یا نہیں۔

۲ : غریب سید کو یا کسی غنی کو کھال قربانی یا کھال کی قیمت دینا کیسا ہے اور کھال یا قیمت کے ان ہر دو طرح سے دینے میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

۳ : قربانی کا گوشت پختہ یا کچا غیر مسلم ہندو کو دینا کیسا ہے ؟ بیّنوا توجروا

السائل :
جمعیت علی از کالکا ضلع انبالہ ریلوے مسجد کرنالی

الجواب

قال فی الھدایۃ : واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح (تتمہ جلد ثانی فتاوی امدادیۃ ص ۱۳۷)

وفی الدر : فان بیع اللحم او الجلد بہ او بدراھم تصدق بثمنہ اھ
(تتمہ مذکورہ ص ۱۳۶)

وفی عالمگیریۃ : ویھب منھا (ای من الاضحیۃ) ماشاء للغنی والفقیر والمسلم والذمی اھ ج ۶ - ص ۲۰۱)

وفیھا أیضاً : ولا أن یعطی (أی لایجوز) اجر الجزار والذبح منھا اھ
(ج ۶ - ص ۲۰۲)

قربانی کی کھال کا بعینہ مسجد میں دینا (بشرطیکہ اس کو بعینہ مسجد کے کام میں لایا جاوے یعنی فروخت نہ کیا جاوے) اسی طرح اس کا ڈول بنا کر مسجد میں دینا جائز ہے۔ کیونکہ کھال کا بعینہ تصدّق صدقۂ نافلہ ہے اور صدقۂ نافلہ کا مسجد میں دیدینا جائز ہے۔ باقی کھال کو بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں دینا جائز نہیں ہے کیوں کہ قیمت کا تصدق واجب ہے۔ اور صدقۂ واجبہ کے لئے تملیک شرط ہے اور مسجد محلِّ تملیک نہیں۔ اسی طرح کھال کی قیمت کو ملازمینِ مسجد و دیگر اوقاف کی تنخواہ میں دینا بھی جائز نہیں ہے اسی طرح بعینہ کھال یا اس کی قیمت مسجد کے مؤذن یا امام کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں بھی دینا جائز نہیں ہے البتہ اگر مؤذن و امام کو مقرر کرتے وقت صاف کہہ دیا گیا ہو کہ قربانی کی کھالوں میں تمہارا کچھ حق نہ ہوگا اس کے بعد اس کو بعینہ کھال یا اس کی قیمت دیدی جاوے تو جائز ہے اور صورتِ ثانیہ میں اس کا فقیر ہونا شرط ہے۔ اسی طرح اس کی قیمت کو مسجد کی مرمّت میں بھی صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں بعینہ کھال اگر مسجد یا اوقاف کے کاموں میں لگا دی جائے تو جائز ہے مثلاً مسجد یا مدرسہ کے لئے ڈول بنا دیئے جاویں۔

ع۲ : بنوہاشم کو بعینہ کھال دیدینا درست ہے پھر وہ خواہ اس کو بعینہ کام میں لاوے یا فروخت کر کے قیمت کام میں لاوے کیونکہ کھال کا بعینہ تصدق صدقۂ نافلہ ہے، اور صدقۂ نافلہ بنوہاشم کو دینا جائز ہے۔ مگر کھال بیچکر اس کی قیمت بنوہاشم کو دینا جائز نہیں کیونکہ قیمت کا تصدق واجب ہے اور وہ صدقاتِ واجبہ کے مصرف سے نہیں۔

ع۳ : قربانی کا گوشت کچا یا پختہ ہندو غیر مسلم کو دینا جائز ہے کیونکہ گوشت کا تصدق واجب نہیں پس وہ یا ہدیہ ہے یا صدقۂ نافلہ اور یہ دونوں کافر ذمّی کو دینا درست ہیں۔

قلت والمستامن فی حکم الذمی فی ذلك والحربی المسالم فی حکم الذمی فافهم۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۲ ذی الحجۃ ۳۴ھ

عقیقہ کی نیت سے خریدے ہوئے جانور کا حکم

السّوال : احقر کے یہاں بال بچہ پیدا ہونے والا تھا، اس واسطے ایک بھیڑہ خرید لیا تھا اس نیت سے کہ اگر لڑکا ہوگا تو ایک اور خرید لیا جاویگا، ورنہ یعنی لڑکی کی صورت میں تو یہی عقیقہ میں ذبح کر لیا جاویگا۔ اب

ایک لڑکا ہوا جو ایک ہفتہ زندہ رہنے کے بعد مر گیا مگر اس کی طرف سے عقیقہ نہ کر سکا اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس جانور کا کیا کیا جاوے آیا اور کام میں لایا جا سکتا ہے یا عقیقہ ہی کی نیت سے ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ خریدتے وقت عقیقہ ہی کی نیّت تھی گو کہ عقیقہ فرض نہیں مگر نیت کر لینے سے تو اس کا ذبح کرنا فرض ہو جاتا ہے یا نہیں۔ اور مولوی محمد الیاس صاحب سے اس کی بابت تحقیق کی مگر ان کے پاس نہ وقت تھا اور نہ کتابیں تھیں جو تحقیق فرماتے۔ آپ فرماویں کہ اب کیا کروں آیا اُسے ذبح کروں یا قربانی کی نیت سے پال لوں۔

السّائل :

حافظ محمد عثمان۔ تاجر کتب دریبہ کلاں دہلی

الجواب

عقیقہ کی نیت سے جو جانور خریدا گیا ہے اس کا ذبح کرنا واجب نہیں۔ جس کام میں چاہیں لے آویں۔

لان الشراء بنية العقيقة وان كان بمعنى النذر ولكن يشترط لانعقاد النذر أن يكون المنذور عبادة مقصودة

قال في الدرّ : وكان من جنسه واجب اى فرض كما سيصرّح به تبعًا للبحر والدرر۔ وهو عبادة مقصودة اھ

قال الشامي : الضمير راجع للنذر بمعنى المنذور إلى أن قال فهذا صريح في أن الشرط كون المنذور نفسه عبادة مقصودة لا ما كان من جنسه اھ

(ج ۳۔ ص ۱۰۲)

وفي تنقيح الفتاوى الحامدية : ثم إذا أراد أن يعق عن الولد فانه يذبح عن الغلام شاتين وعن الجارية شاة لانه إنما شرع للسرور بالمولود وهو بالغلام أكثر اھ ج ۲ ص ۲۱۲ وهذا يدل على كونها عبادة غير مقصود فافهم۔ والله سبحانه وتعالىٰ أعلم

حرّره الاحقر ظفر احمد عفا الله عنه

۱۷ر محرم سنہ ۱۳۴۱ھ

سینگ ٹوٹی ہوئی گائے کی قربانی کا حکم

السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے قربانی کی نیت سے ایک گائے خریدی ہے۔ مگر اس کا ایک سینگ ٹوٹا ہوا ہے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ آیا سینگ ٹوٹے ہوئے جانور (گائے) کی قربانی جائز ہو جاتی ہے یا نہیں۔

بیّنوا توجروا۔

الجواب

بطور مقدمہ کے چند باتیں اول معروض ہیں :

۱ : کتبِ حنفیہ میں اکثر فقہاء نے مکسور القرن کو مطلقاً جائز لکھا ہے۔ ھدایہ وغیرہ میں قرن کے لئے نصف یا اقل من النصف کی کوئی قید مذکور نہیں ہے۔

۲ : علامہ شامی نے قہستانی سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں بعض قرن کی قید مذکور ہے۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ جمیع قرن کا انکسار مضر ہے۔

قال : وکذا العظماء التی ذھب بعض قرنھا بالکسر او غیرہ فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز قہستانی

اور ظاہر ہے کہ قہستانی کا قول تنہا حجت نہیں ہو سکتا لکونه من المجاھیل

۳ : بدائع وعالمگیریہ وغیرہ میں بلوغ الکسر الی المخ او الی المشاش کو مطلقاً مانع جوازِ اضحیہ قرار دیا ہے۔ بلوغ الکسر الی المخ او الی المشاش کے بعد کسی نے نصف یا ما دون النصف کی قید نہیں بڑھائی

۴ : فقہاء حنفیہ نے مکسور القرن کو جماء پر قیاس کیا ہے اور علتِ جواز مکسور القرن یہ بتلائی لکونه لا یتعلق به المقصود یہ علت جس طرح غلافِ قرن میں متحقق ہے داخل غلاف قرن میں بھی متحقق ہے بلکہ بدرجۂ اولیٰ۔ کیونکہ غلاف اتر جانے کے بعد داخلِ غلاف قرن جو کہ ایک نازک ہڈی ہے دفع اذیٰ کے لئے کسی درجہ میں مفید نہیں اور غلاف قرن دفع اذیٰ کو مفید ہے پس اگر غلافِ قرن کو لا یتعلق به المقصود کا مصداق مانا جاتا ہے تو داخلِ غلافِ قرن کو بدرجۂ اولیٰ اس کا مصداق ماننا پڑے گا۔

۵ : لفظِ مخ کے معنی لغت میں دماغ کے بھی ہیں اور ہمارے نزدیک یہی معنیٰ فقہاء کے کلام میں مراد ہیں۔ اور مشاش کے معنی متعدد ہیں۔ اور لفظ مشترک کی تفسیر وہی

معتبر ہوگی جو فقہاء نے بیان کی ہے۔ فقہاء نے مشاش کی تفسیر رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین سے کی ہے، اس کا مصداق داخل غلافِ قرن ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کو رأس العظم نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کا مصداق قرن کی جڑ ہے۔ رأس الشئ کا اطلاق اصل الشئ پر بکثرت شائع ہے

۶: داخلِ قرن کو ہمارے نزدیک نقی العظم کہنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ نقی العظم سے وہ گودا مراد ہوتا ہے جو بحالتِ لاغری خشک ہوجاتا ہے۔ حدیث میں ہے ولا العجفاء التی لا تنقی اور داخلِ قرن ایسا گودا نہیں جو بحالتِ لاغری خشک ہوجاتا ہو بلکہ وہ بھی خود عظم ہے مگر بنسبت غلاف قرن کے نازک ہے۔

الدلیل علی المقدمات

أما علی الأول فبالاستقراء التام لکتب القوم۔ قال فی الھدایة: ویجوز ان یضحی بالجماء وھی التی لا قرن لھا لان القرن لا یتعلق به مقصود، وکذا مکسورة القرن لما قلنا (من ان القرن لا یتعلق به المقصود۔ المحشی) وفی العنایة، الا تری ان الاضحیة بالابل جائزة ولا قرن له۔

ج ۸ ص ۴۳۴ ھدایہ مع الفتح

وفی البحر: ویضحی بالجماء التی لا قرن لھا یعنی خلقةً لأن القرن لا یتعلق به المقصود وکذا مکسورة القرن بل اولی انتھی۔ ج ۸ ص ۱۷۶۔

وفی العالمگیریة: ویجوز بالجماء التی لا قرن لھا وکذا مکسورة القرن کذا فی الکافی۔ وان بلغ الکسر المشاش لا یجزیه والمشاش رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین۔ کذا فی البدائع۔ اھ ج ۶ ص ۲۰۰

وفی مجمع الانھر: وتجوز الجماء بتشدید المیم وھی التی لا قرن لھا بالخلقة اذ لا یتعلق به المقصود وکذا مکسور القرن بل اولیٰ۔ ج ۲ ص ۵۰۰

قلت: وفی ھٰذہ العبارات دلیل علی المقدمة الرابعة أیضًا۔ فقیاسھم المکسور القرن علی الجماء یفید أن القرن لا یضر انکسارہ مطلقًا، ولو لم یبق منه شئ فغایته أن یصیر کالجماء والتضحیة بھا جائزة، فکذا بالمکسور القرن الذی لم یبق من قرنه شئ للعلة الجامعة التی ھی

کون القرن لا یتعلق به مقصود والغلاف و داخله فیه سواء

وأما علی الثانی فما فی رد المحتار: انه لا یجوز الافتاء من الکتب المختصرة إلی أن قال، او لعدم الاطلاع علی حال مؤلفیها کشرح الکنز لملا مسکین وشرح النقایة للقهستانی۔ ج ۱- ص ۷۲

وأما علی الثالث: فبالاستقراء التام لکتب القوم الموجودة عندنا فلم نجد أحداً صرح بأنه یجوز الأضحیة اذا بلغ الکسر المشاش أو المخ بما دون النصف ولا یجوز إذا زاد علیه بل کلامهم یفید أن بلوغ الکسر إلی المخ أو المشاش یمنع الجواز مطلقاً هذا یدل علی أن المراد بالمخ او المشاش لیس بشیء من اجزاء القرن، فان کسر بعضه لا یضر اتفاقاً۔ وکله أیضاً علی ما هو مقتضی اطلاق الفقهاء المعول علیهم بل المراد به إنما هو أصل القرن الذی یتصل بالمخ ای الدماغ فان بلوغ الکسر الیه عیب فاحش یضر بصحة الحیوان۔ فقول المجیب أطال الله بقاءه فی آخر جوابه: اور مکسور المشاش اور اعضب القرن وہ جانور ہیں جن کی سینگ کا اندر کا حصہ نصف یا ما فوق النصف شکستہ ہو اور اس کی قربانی جائز نہیں الخ لا دلیل علیه ولا أدری من أین أخذ التقیید بالنصف و بما فوقه بعد بلوغ الکسر إلی المشاش والحال ان الفقهاء یمنعون عن التضحیة اذا بلغ الکسر المشاش من غیر تقیید وأما ما نقل من قول سعید بن المسیب فی جواب قتادة العضب ما بلغ النصف فما فوق ذلك فلا حجة فیه ما لم تکن فی المذهب روایة توافقه

وأما علی الرابع: فقد مر۔

وأما علی الخامس: فما فی القاموس المخ نقی العظم والدماغ وشحمة العین الخ ج ۱- ص ۱۶۷

وفی الحدیث: فجاء یسوق عنزا عجافا مخاخهن قلیل هو جمع مخ۔

(مجمع البحار- ج ۱- ص ۸۵)

وهو یدل علی أن مخ العظم یراد به ما یقل حال العجف ویزید فی السمن ولیس داخل غلاف القرن هکذا۔ وفی القاموس أیضاً المشاشة

لضم رأس العظم الممكن المضغ جمع مشاش ۔ ج ۱ ۔ص ۴۲۵ ۔

وفی المجمع : فی صفتہ صلی اللہ علیہ وسلم جلیل المشاش أی عظیم رؤس العظام کالمرفقین والکتفین والرکبتین وقیل ھو رؤس عظام لینۃ، یمکن مضغھا اھ ج ۲ ۔ص ۳۰۲

قلت : وعلیہ یحمل مافی المغرب من قولہ فان بلغ الکسر الی المشاش لایجزیہ یراد بہ عظم داخل القرن اھ فداخل القرن محمول علی أصلہ فانہ یصح اطلاق إطلاق الداخل علیہ أیضا وھو المراد بالمشاش فافھم علی أن تفسیر الفقہاء أولی من تفسیر المغرب ۔

وأما علی السادس : فظاھر غیر خفی

تائید الکلام السابق

قال العلامۃ النووی فی شرحہ علی صحیح مسلم : مانصہ : واجمع العلماء علی جواز التضحیۃ بالاجم الذی لم یخلق لہ قرنان واختلفوا فی مکسور القرن فجوزہ الشافعی وابوحنیفۃ والجمھور سواء کان یدمی ام لا وکرھہ مالک اذاکان یدمی وجعلہ عیبًا اھ ج ۲ ص ۱۵۵

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ اور جمہور علماء کے نزدیک مکسور القرن کی قربانی مطلقاً جائز ہے خواہ اس کسر کی وجہ سے خون بھی بہتا ہو یا نہ بہتا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوازِ اضحیہ میں غلافِ قرن و داخلِ غلاف کا انکسار برابر ہے۔ داخل غلاف ہی کے ٹوٹنے سے خون بہتا ہے اور امام ابوحنیفہ و جمہورِ علماء اس کو بھی مضر نہیں کہتے صرف امام مالک رحؒ نے اس کو مکروہ کہا ہے جبکہ خون بہتا ہو پس مشاش و مخ کی جو تفسیر مجیب سلمہ نے کی ہے وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر منطبق ہو سکتی ہے نہ کہ حنفیہ کے مذہب پر، لیکن وہ بھی صرف کراہت کے قائل ہیں عدم جواز کے وہ بھی قائل نہیں۔ رہا یہ کہ حدیث میں اعضب القرن سے نہی وارد ہے اور عضباء کے معنی الشاۃ المکسورۃ القرن الداخل ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عضب کے معنی قطع کے ہیں پس اعضب القرن بمعنی مقطوع القرن ہوا جو اس کو بھی شامل ہے جس کا سینگ جڑ سے ٹوٹ گیا ہو گو عضباء کا استعمال بمعنی خاص بھی ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اعضب القرن

بمعنی مقطوع الاصل ہے۔ قاموس میں ہے کبشٌ اعضب بیّن العضب ج ۱۔ص ۶۵
پس ہمارے نزدیک اعضب القرن سے مراد وہی ہے جس کے سینگ کی جڑ ظاہر ہوگئی ہو یا سینگ جڑ سے ٹوٹ کر لٹک گیا ہو، بیّن العضب اسی کو بولیں گے۔ ھذا والله اعلم وعلمہ اتمّ واحکم ولعلّ الحق لا یتجاوز عن ھٰذا بعد الفحص الکثیر من کلام الفقہاء السادات الحنفاء فقط۔

حرّرہ المفتقر الی ربّہ الصمد
عبدہ المذنب ظفر احمد عفا الله عنہ بمنّہ وکرمہ المؤید
۳ر صفر المظفر س۱۳۴۷ھ

تتمّہ قال فی المرقاۃ فی تفسیر اعضب القرن والاذن ای مکسور القرن مقطوع الاذن الی أن قال وقیل مقطوع القرن والاذن والعضب القطع وفی المہذب انہ یجوز الجماء التی لا قرن لہا او کان مکسورًا أو ذھب غلاف قرنہا فیکون النہی تنزیہا اھ
ج ۲۔ ص ۲۶۶

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جواز اضحیہ میں جماء اور مکسور القرن اور ذاھب الغلاف سب برابر ہیں۔ اگر حنفیہ کا مذہب اس میں خلاف قول مہذب ہوتا تو علامہ علی قاری ضرور اس پر تنبیہ فرماتے حالانکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ حدیث کا کراہۃ تنزیہ پر محمول ہونا ظاہر کر دیا جس کی دلیل حضرت علی کی دوسری حدیث ہے جو ترمذی نے اس سے پہلے نقل کی ہے۔

عن حجیۃ بن عدی عن علی قال البقرۃ عن سبعۃ قلت فان ولدت قال: اذبح ولدھا معہا، قلت: فالعوجاء قال: اذا بلغت المنسك قلت: فمکسورۃ القرن فقال: لا بأس أمرنا أو امرنا رسول الله صلی الله علیہ سلم امرنا بذلك ولم یأمرنا بذلك ولم یأمرنا باستشراف القرن فلا بأس بالمکسورۃ القرن ترمذی ج ۱۔ص ۱۸۱

دوسری بات عبارت مرقات سے یہ معلوم ہوئی کہ مکسور القرن اسی کو بولتے ہیں جس کا سینگ مع غلاف و داخل غلاف کے ٹوٹ گیا ہو کیونکہ اس میں مکسور کے بعد او ذھب غلاف قرنہا مقابلہ میں مذکور ہے اور یہی میرا خیال ہے کہ جس کا سینگ

اندر سے نہ ٹوٹا ہو صرف غلاف اتر گیا ہو اس کو مکسور القرن نہیں کہتے بلکہ اس کو ذاهب الغلاف کہنا چاہئے ۔

پس کلامِ فقہاء میں جہاں کہیں مکسور القرن کی اجازت مذکور ہے اس سے وہی مراد ہے جس کا غلاف و داخلِ غلاف دونوں ٹوٹ گئے ہوں بشرطیکہ دماغ ومشاش تک اثر نہ پہنچا ہو اور عبارتِ جوہرہ میں قصماء کی اضحیہ کا جواز مذکور ہے اس سے مکسور القرن ظاہرًا وباطنًا کا عدم جواز ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ عبارت اس سے ساکت ہے ۔ اور علّامہ علی قاری کی عبارت اور فقہاء کا اطلاق اور اشتراکِ علت اور علامہ نووی کا کلام جواز کو مقتضی ہے اور ظاہر ہے کہ تصریحاتِ فقہاء کو سکوت پر ترجیح ہے ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

ذابح کی اعانت کرنے کا معنی السّوال : جو شخص بوقت ذبح بکری کے پیر وغیرہ پکڑے رکھے وہ معینِ ذابح ہے یا نہیں اور اس کا بوقتِ ذبح ، تکبیر یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہنا لازم ہے یا نہیں اور اگر بوقتِ ذبح کچھ بھی نہ پڑھے تو ذبح درست ہو جاوے گا یا نہیں ؟

السائل :
محمد اسماعیل ناظم انجمن اسلامیہ گورکھپور

الجواب

پیر وغیرہ پکڑنے والا معینِ ذابح نہیں بلکہ معینِ ذابح وہ ہے جو ذبح کرنے والے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے ۔

قال فی الخلاصة : وفی الاصل التسمية عند الذبح شرط عند القطع آھ ۔ ج ۴ ص ۳۰۸

قلت : مقتضاه ان يشترط على القاطع لاغير قال فی الاشباه : مجوسی اخذ بید مسلم فذبح والسكين فی يد المسلم لا يحل أكله كما لو عجز مسلم عن مدّ قوسه بنفسه فاعانه على يده مجوسی لا يحل اكله اھ ص ۹۰

قلت : وقيود الفقه احترازية فلو لم يأخذ بيد الذابح لا يعد معينا اھ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۹ رجب ۱۳۴۱ھ

ذابح نے غلط تلفظ کے ساتھ بسم اللہ اللہ اکبو کہا تو ذبیحہ درست ہے یا نہیں

السوال : اگر کوئی جاہل غیر محتاط جو نماز کی بھی پابندی نہیں کرتا، غلط تلفظ کے ساتھ بِسمِ اللہ اَللہُ اَکبَر کہہ کر ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ درست ہوگا یا نہیں؟ بیّنوا توجروا۔

السائل :
محمد اسماعیل گورکھپوری

الجواب

جب بسم اللہ کہدیا تو ذبیحہ حلال ہوگیا۔

قال فی الخلاصۃ : ولو قال مکان التسمیۃ الحمد للہ او سبحان اللہ یرید التسمیۃ اجزاہ اھ ج ۴-ص ۳۰۸

بس بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرنے سے حلّت میں کچھ شبہ نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۹ر رجب سنہ ۱۳۴۱ھ

بعد فوت اضحیہ کے ذبح کافی نہیں بلکہ تصدّق بھی واجب ہے

السّؤال : کسی شخص پر قربانی واجب تھی لیکن قربانی کے تین دن گزر گئے اس نے قربانی نہیں کی تو اس کا حکم یہ ہے کہ ایک بکری یا بھیڑ کی قیمت خیرات کردے اگر اس نے قیمت تو نہیں خیرات کی بلکہ اس نے یہ کیا کہ پچھلے سال کا بھی ایک اور حصہ اب کے سال گائے میں لے لیا تو اس سال گذشتہ کی قضاء قربانی صحیح ہوجاوے گی یا نہیں؟ اس مسئلہ کا جواب مع حوالہ کتب ضرور تحریر فرمائیں نہایت احسان ہوگا۔

السائل :
محمد عمران مدرس مدرسہ ارشاد العلوم
گڑھی پختہ ضلع مظفر نگر

الجواب

بعد فوت ایام اضحیہ کے تصدق قیمت شاۃ ہی واجب ہے۔ سال موجودہ میں حصہ لینے یا بکری ذبح کرنے سے سال گذشتہ کی قضاء نہیں ہوسکتی۔

قال قاضی خان : ولو لم یفعل شیئاً من ذلک حتی جاء ایام النحر من السنۃ القابلۃ وضحی بہا عن العام الاول لا یجوز لأن اراقۃ الدم عرف قربۃ اداءً لا قضاءً اھ ج ۴ ص ۳۳۰ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۴ ذی الحجۃ ۱۳۴۲ھ

مالکِ تالاب کا لوگوں کو مچھلیاں شکار کرنے سے روکنے کا حکم

السوال : جس تالاب کے چاروں طرف مٹی اسقدر بلند ہو کہ کبھی باہر کا پانی اندر اور اندر کا پانی و مچھلی باہر نہیں آجا سکتے اور اس کا مدخل مالک تالاب کے اختیار میں ہے ۔ ایسے تالاب میں دو قسم کی مچھلی ہوتی ہے ۔ ایک وہ کہ جسے مالک خود خرید کر اس تالاب میں چھوڑتا ہے جس کو ہمارے ملک میں "روھی کنال" وغیرہ کہتے ہیں ۔ اور دوسری قسم وہ ہے کہ جو مدخل یا کسی اور طرح سے اس میں آجاتی ہے ۔ اس بارے میں سوال یہ ہے کہ مالکِ تالاب اِن دونوں قسم کی مچھلی کے شکار کرنے سے غیر کو روک سکتا ہے یا نہیں ؟ یا اس میں ایک صورت میں منع کر سکتا ہے اور دوسری صورت میں منع نہیں کر سکتا ۔ فقط والسلام

تنقیح سوال اس عبارت یعنی خط کشیدہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا ۔

جوابِ تنقیح اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ تالاب سے پانی نکالنے یا اندر لانے کیلئے جو راستہ رکھا جاتا ہے اس کو جب کھول دیتے ہیں تو باہر سے قسم بہ قسم کے مچھلی آجاتی ہیں اور کبھی تالاب کے بند رہتے ہوئے بھی بعض مچھلیاں کان سے چل کر اندر چلی جاتی ہیں جس کو کٹے مچھلے کہتے ہیں ۔

الجواب

اگر تالاب مچھلی ہی کے جمع کرنے اور پرورش کرنے کے لئے بنایا گیا ہے تو اس میں جس قدر مچھلیاں ہوں خواہ خرید کر چھوڑی ہوں یا خود آگئی ہوں سب مالکِ تالاب کی مملوک ہیں ۔ دوسروں کو ان کا شکار جائز نہیں ہے ۔ اس لیے دوسروں کے روکنے کا بھی حق ہے اور اگر اس غرض کے لئے نہیں بنایا گیا تو جو مچھلیاں خرید کر یا پکڑ کر اس میں چھوڑی جائیں وہ اور ان کی نسل مملوک ہیں ، خواہ مدخل کو بند کرے یا نہ کرے اور جو از خود داخل ہوں وہ مملوک نہیں ہیں مگر جبکہ داخل ہونے کے بعد مدخل کو بند کر دیا جائے

تو وہ بھی مملوک ہوجائیں گی۔ اور شکار سے روکنے کا حق مملوک میں ہے نہ کہ غیر مملوک میں فافہم ھذا ما فہمتہ من عبارۃ الشامیۃ ج ۴ ص ۱۶۴ و ص ۱۶۵

اور یہ مسئلہ تتمہ جلد ثالث فتاوی امدادیہ میں بھی ہے (ص ۱۵۴) مگر اس میں اعداد للسمک کی صرف ایک ہی صورت مذکور ہے سدّ مدخل ونحوہ۔ اس سے یہ بھی مفہوم نہیں ہوتا کہ پورا تالاب بھی معدّ للسمک ہوسکتا ہے مگر حضرت مولانا نے مشافہۃً مجھ سے فرمایا کہ تالاب پورا بھی معد للسمک ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ سراجیہ امدادیہ
۵ ر ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

گونگے آدمی کے ذبیحہ کا حکم

السؤال: صُمٌّ بُکمٌ آدمی جانور کو ذبح کرے تو وہ حلال ہوگا یا حرام اور اس کو تکبیر پڑھنا کس طرح سکھایا جاوے اور اس کے نکاح خوانی میں قبول کس طرح کردیا جاوے۔

الجواب

قال فی العالمگیریہ: وتؤکل ذبیحۃ الأخرس مسلماً کان او کتابیاً کذافی قاضیخان اھ ج ۶ ص ۱۹۲

اس سے معلوم ہوا کہ گونگے مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے اشارہ سے اس کو تکبیر سکھادی جاوے اور نکاح میں اس کا اشارہ سر وغیرہ سے قبول کرلینا کافی ہے واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۶ ر ذی الحجہ ۴۲ھ

قربانی کے جانور کو تبدیل کرنے کا حکم

السؤال: زید نے قربانی کے لئے ایک گائے ۲۷ روپے میں خریدی اور عمر نے ایک گائے ساڑھے ستائیس ½ ۲۷ روپیہ میں خریدی اور عمر نے کاشتکاری کی غرض سے خریدی۔ مگر عمر کی گائے دیکھنے

میں زید کی گائے سے زیادہ موٹی تازہ نظر آتی ہے اور کچھ بڑی بھی ہے مگر ہل جوتنے میں بالکل ناکارہ ہے اور زید کی گائے ہل جوتنے میں خوب چست وچالاک ہے اس لئے عمر سے کہتا ہے کہ تم اپنی گائے مجھے دیدو اور میری گائے لے لو اور قربانی کرلو۔اس حالت میں اس کو تبدیل کرکے قربانی کرنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں۔ اگر یہ صورت جائز نہ ہو پھر یہ کس طرح جائز ہوگی۔

الجواب جائز ہے۔ اگر زید صاحب نصاب ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
المقیم بالخانقاہ الامدادیہ، تھانہ بھون
۲۲ر ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

جو جانور قربانی کے واسطے متعین کردیا ہو اس کا گوشت کھانے کا حکم اور اس صورت میں نذر ہونے کا اشکال اور اس کا جواب

السؤال: معروض بحضور فیض گنجور این کہ از قدیم الایام رسم این دیار چنیں افتادہ است کہ بیع وشراء جانوران اضحیہ بہ دوچہار روز پیشتر از ایام النحر کردہ می شود و مردمان جانور آن خریدہ برای اضحیہ نام زدکردہ متعین می سازند وہمچنین اگر جانورے بملک کسے باشد آنرا قبل ایام النحر برای قربانی معین کردہ میدارند وبروز نحر آنرا ذبح کردہ غنی وفقیر بری الذمہ می شود، فی الحال ماراہ دران باب شکے افتادہ است برائے ازالہ آن شبہ کتابہا دیدہ ایم، جوابِ شافی میسر نیامد۔ امید است کہ آنجناب جوابِ شافی دادہ ممنون ومشکور فرمایند۔ فتوائے کہ دراں باب نوشتہ شدہ است بعینہ نقل کردہ میشود اگر آنرا صحیح پندارند بہ مہرو دستخط مزین نمایند واگر روایتے قابل تردید باشد آنرا رد کنند۔

نقل مطابقِ اصل

ما قولکم رحمکم اللہ تعالٰے اندرینکہ اضحیہ کدام وقت واجب میگردد واگر کسے حیوانے جہت اضحیہ قبل ایام النحر خریدہ بہ زبان ہم بگوید کہ این برای اضحیہ خریدہ ام یا بدین قربانی خواہم کرد۔ وہمچنین اگر جانورے بملکِ کسے باشد وآن رادران ایام برای قربانی نام زد کردہ متعین سازد آیا درین ہر دو صورت آن حیوان منذور باشد یا نہ وبرتقدیر اول غنی را ذبحِ آن از ادائی واجب کافی باشد یا نہ و

خوردنِ آں نادار وغنی را روا باشد یا نہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب وباللّٰہ التوفیق

وقت وجوبِ اضحیہ فجر یوم النحر است تا آخر آں ایام لما فی الدر المختار۔ فتجب التضحیة علی حرّ مسلم مقیم موسر عن نفسه لا عن طفله، شاة او سبع بدنة فجر یوم النحر الی آخر أیامه اھ

پس اگر کسے جانورے را بجہتِ آں قبل آں خریدہ نام زد کند آں منذور باشد لما فی الدر المختار۔

(قوله لوجوبها علیه بذلك) أی بالشراء وهذا ظاهر الروایة لأن شرائه لها یجری مجری الایجاب وهو النذر بالتضحیة عرفًا کما فی البدائع انتهٰی۔

وفی فتاوٰی قاضی خان: رجل اشترٰی شاة للاضحیة واوجبها بلسانه ثم اشترٰی اخرٰی جاز له بیع الاولٰی فی قول ابی حنیفة ومحمد رحمهما اللّٰه فان کانت الثانیة شرًا من الاولی وذبح الثانیة فانه یتصدق بفضل ما بین القیمتین لانه لما أوجب الاولی بلسانه فقد جعل مقدار مالیته للّٰه تعالٰی فلا یکون له ان یستفضل لنفسه شیئًا فلهٰذا یلزمه التصدق بالفضل انتهٰی

می گویم کہ اگر آں منذور نبودے تصدق لازم نشدے۔

وفی الصورة الثانیة: فالایجاب باللسان وما یوجب باللسان یکون واجبًا کما علم مما سبق ویعلم مما فی الهدایة۔ وشرحها۔ ففی الهدایة: ولو لم یضح حتی مضت ایام النحر ان کان اوجب علی نفسه القول وفی الکفایة قوله: ان کان اوجب علی نفسه ای شاة بقیمتها بان یکون فی ملکه شاة فیقول اضحّی بهذه او

---

[1] الکلام علیه: قلت هٰذا راجع الی الفقیر فقط دون الغنی کما سیأتی فی حاشیة الصفحة الآتیة وهو محمول علی ما اذا نوی به الانشاء اما لو نوی به الاخبار فلا نذرا صلاً ۱۲ ظ

[2] الکلام علیه: اقول جواز البیع یدل علی عدم کون شراءه نذرًا فان المنذور لا یجوز بیعه کما سیأتی ان الفقیر اذا اشتری شاة للاضحیة تعینت لها ویمتنع علیه بیعها واما ←

يقول لله علیّ أن أضحّی بھٰذہ اویقول علی ان أضحّی بھٰذہ۔ انتھی وفی العنایۃ سواء کان الموجب غنیًا او فقیرًا انتھی۔

وفی رد المحتار: (قولہ ناذر لمعینۃ) قال فی البدائع اما الذی یجب علی الغنی والفقیر فالمنذور بہ بان قال: للہ علیّ أن أضحّی شاۃ اوبدنۃ اوھٰذہ الشاۃ اوالبدنۃ اوقال جعلت[سه] ھٰذہ الشاۃ اضحیۃ لأنھا قربۃ من جنسھا ایجاب وھو ھدی المتعۃ والقران والاحصار فتلزم بالقدر کسائر القرب والوجوب بالنذر یستوی فیہ الغنی والفقیر اھ

وجوب التصدق بالفضل فلیس لکونہ نذرًا بل لکونہ شبہ الرجوع عن الصدقۃ ولایجوز الرجوع فیھا ولکونہ اعدّھا للقربۃ فیمنع عن التمول بھا ولوسُلّما کونہ نذرًا فلا نسلم عموم ھٰذا الجواب للغنی والفقیر کلیھما بل لخصہ بالفقیر کما فی العالمگیریۃ بعد ذکر المسئلۃ۔ قال بعض مشائخنا ھذا اذا کان الرجل فقیرًا فان کان غنیاً فلیس علیہ أن یتصدّق بالفضل انتھٰی۔

وسلّمنا عمومہ للغنی والفقیر کما سیأتی عن السرخسی فلزوم التصدق علی الفقیر لکونہ نذرًا۔ ولزومہ للغنی لتعیینہ للقربۃ۔ قال الامام السرخسی: الصحیح ان الجواب فیھما علی السواء یلزمہ التصدق بالفضل غنیًا کان اوفقیرًا لان الاضحیۃ وان کانت واجبۃ علی الغنی فی الذمۃ وانما یتعین المحل بتعیینہ فتعین ھٰذا المحل بقدر المالیۃ لأنّ التعیین یقدر فی ذلک اھ عالمگیریہ ص۲۹۱ ج۶ یعنی فلاینبغی التمول بالفضل بعد ما عیّن الاولیٰ للقربۃ ھٰذا ولوکان التعیین نذرًا فی حق الغنی لوجب علیہ أن یضحی بشاتین کما ادعاہ المجیب فیما بعد وشاۃ للنذر وشاۃ للاضحیۃ ولم یذکر قاضیخان وجوب الاثنین فی ھٰذہ المسئلۃ بل اکتفی بذکر جواز بیع الاولیٰ ولایخفی ان جواز بیع الاولی یتفرع علی عدم وجوبہ نعم یشکل علیہ ان الفقیر اذا اشتری اثنین بنیّۃ الاضحیۃ وجب علیہ کلاھما لایجوز لہ بیع واحد منھا فکیف یکون الجواب فی الفقیر والغنی علی السواء فالظاھر تخصیصہ بالغنی اوھو معین علی الروایۃ الاخریٰ وھی روایۃ النوادر ان الفقیر لاتجب علیہ الاضحیۃ بشراء الشاۃ لھا کما سیأتی فافھم ۱۲ ظ

سه قولہ اوقال جعلت: قلت انما یکون الجعل المذکور نذرًا فی حق الغنی اذا نوی بہ الایجاب ابتداء وأما اذا قال جعلت ھٰذہ الشاۃ اضحیۃ ونوی بھا الأضحیۃ الواجبۃ علیہ فلایکون نذرًا کما صرح بہ الشامی فیما بعد وھٰذا اذا جعلنا قولہ جعلت ھٰذہ الشاۃ ←

وقد استفید منہ ان الجعل المذکور نذر وان النذر بالواجب صحیح انتھی۔ فلو لم یوجب باللسان لم یجب بمجرد النیۃ لما فی رد المحتار نقلاً عن البدائع فلوکانت فی ملکہ فنوی ان یضحی بھا لا یجب۔ انتھی ملخصاً

ہم گاہ این منذور باشد غنی را ذبحش از ادای واجبہ کفایت نکند لما فیہ ایضاً

واعلم لانہ قال فی البدائع ولو نذر أن یضحی شاۃ وذلک فی ایام النحر وھو موسر فعلیہ أن یضحی بشاتین عندنا شاۃ بالنذر وشاۃ بایجاب الشرع ابتداءً إلا اذا عنی بہ الاخبار عن الواجب علیہ فلا یلزمہ إلا واحدۃ ولو قبل ایام النحر لزمہ شاتان بلاخلاف لأن الصیغۃ لا تحتمل الاخبار عن الواجب اذ لا وجوب قبل الوقت وکذا لو کان معسراً ثم ایسر فی أیام النحر لزمہ شاتان۔ انتھی

ومقتضی ھذا ان الموسر إذا نذر فی أیام النحر وقصد الاخبار عن الواجب لم یکن ذلک منہ نذراً حقیقۃ وان لزوم الشاۃ علیہ بایجاب الشرع اما اذا لم یقصد الاخبار اوکان قبل أیام النحر أو کان معسراً فأیسر فیھا فانہ وان لزمہ شاۃ أخری بالنذر لکنھا لم تکن واجبۃ قبل بل واجبۃ غیرھا فھو نذر حقیقۃ۔ انتھی۔

وخوردن منذور نادار وغنی را روانباشد لما فیہ أیضاً قولہ ویأکل من لحم

اضحیۃ راجعاً إلی الغنی والفقیر کلیھما والظاھر انہ راجع إلی الفقیر فقط دون الغنی لان الجعل المذکور لیس أقوی من الشراء بنیۃ الاضحیۃ ولم یکن الشراء کذلک نذراً فی حق الغنی کما صرحوا فلذلک جعلہ نعم! ھو نذر فی حق الفقیر مثل الشراء فی حقہ ح فلاحاجۃ إلی الجواب الذی ذکرناہ۔ واللہ أعلم ۱۲۔ ظ

ولا یذھب علیک ان قولہ جعلت ھذہ الشاۃ اضحیۃ أو قولہ أضحی بھا لیس من صیغ النذر حقیقۃ وانما ھو محتمل للانشاء والاخبار معاً فلو اراد بہ الانشاء ابتداءً صار نذراً والغنی والفقیر فیہ سواء ولو أراد الاخبار عن الحال او المستقبل لم یکن نذراً فی حق الغنی اصلاً سواء کان قبل ایام النحر او فیھا لان الاخبار عن المستقبل متعارف أیضاً کالاخبار عن الحال والماضی وبالجملۃ فالتعیین والجعل المتعارفان فی بلادنا لا یدخلان فی النذر لکونھما صادرین علی طریقۃ الاخبار خبر ما دون الانشاء ولا نذر بنیۃ الاخبار کما صرحوا۔ فافھم حق الفھم کذا قالہ سیدی حکیم الامۃ دامت برکاتھم ۱۲ ظ

الاضحية الخ) هٰذا فى الاضحية الواجبة والسنة سواء اذا لم تكن واجبة بالنذر وإن وجبت به فلا يأكل منها شيئا ولا يطعم غنيًا سواء كان الناذر غنيًا أو فقيرًا لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق ذلك ـ ولو أكل فعليه قيمة ما أكل ـ زيلعى ـ انتهى ـ والله أعلم

كتبه محمد عبد الحميد الفتحى عفى عنه

الكلام على الجواب المذكور

اقول هٰذا الجواب كله بناء الفاسد على الفاسد ومنشأوه اتحاد حكم الفقير والغنى فى وجوب تصدق شاة اشتريا ها للاضحية أو عيّناها لها من دون الشراء وفات وقت الاضحية بمضى ايام النحر وعدم جواز اكلهما منها لو ذبحاها بعد الوقت ففهم المجيب باتحادهما فى هٰذا الحكم كون شراء كل منهما نذرًا وكذا تعيينهما لها والحال ان وجوب تصدق الشاة المشتراة أو المعينة للاضحية على الغنى بعد مضى الوقت انما هو لسبب آخر لا لكون شراء او تعيينه لها فى حكم النذر ـ وما ذكره فى الشامية تحت قول الدر : ويكره الانتفاع بلبنها قبله كما فى الصوف ومنهم من اجازهما للغنى لوجوبها فى الذمة فلا تتعين اھ بمانصه ـ والجواب ان المشتراةع للاضحية متعينه للقربة اى ان يقام غيرها مقامه فلا يحل له الانتفاع بها مادامت متعيّنة ولهٰذا لا يحل

ع قلت ولما كان المشتراة للاضحية متعينة للقربة ثبت ان الشراء بنية الاضحية وقوله جعلت هٰذه اضحية وقوله أضحّى بهٰذه كلها سواء فان الاخيرين ايضًا لا يفيدان الزيادة على معنى التعيين فمن كان الشراء نذرا فى حقه وهو الفقير كان الاخيران ايضًا نذرًا فى حقه ومن لا فلا والايجاب باللسان فى حق الغنى لا يتحقق الا بصيغة تفيد الالزام لا بما يفيد التعيين فقط ۱۲ ظ

واما فى ايام النحر فشراء الغنى شاة للاضحية او تعيينه لها من دون الايجاب ابتداءً ليس بنذر ما لم يأت بصيغة النذر صريحًا كقوله « لله علىّ أن أضحّى بهٰذه الشاة » ونحوها وهٰذا ايضًا اذا لم يقصد الاخبار من الوجوب الشرعى عليه فلو ـــــ

له لحمها اذا ذبحها قبل وقتها۔ بدائع على انه يأتى قريبًا انه يكره ان يبدل بها غيرها فيفيد التعيين ايضًا۔ اھ ج ۵ ص ۳۲۱، ۳۲۲

قلت: فلما مضى ايام النحر ولم يستبدل بها غيرها تعينت للقربة من كل وجه لفوات وقت الاستبدال فيجب عليه التصدق بها ميتة كما فى الشامية نقلاً عن البدائع ان الصحيح ان الشاة المشتراة للاضحية اذا لم يضح بها حتى مضى الوقت يتصدق الموسر بعينها حية كالفقير بلا خلاف بين اصحابنا، فان محمدًا قال وهٰذا قول ابى حنيفة وابى يوسف وقولنا اھ وعلى كل فالظاهر انه لا يحل له الاكل منها (لو ذبحها بعد مضى الوقت) كما لا يجوز له حبس شئ من قيمتها۔ تأمل (ج ۵ ص ۳۱۴)

اتى بصيغة النذر واراد بها الاخبار عن الايجاب الشرعى لم يكن نذرًا اولى لان الاصل فى النذر هو القول بصيغته دون فعل الشراء وشراء الفقير لها بنية الاضحية او تعيينه فى أيام النحر نذر فى ظاهر الرواية واما شراءه لها بنيتها قبل أيام النحر۔ وظاهر عبارة التتارخانية انه ليس بنذر فى حقه أيضًا وظاهر اطلاق المتون انه نذر كشراءه فى ايام النحر۔

قال فى الهداية: ولو اشتراها سليمة ثم تعيبت بعيب مانع ان كان غنيًا عليه غيرها وان كان فقيرًا تجزئه هٰذه لان الوجوب على الغنى بالشرع ابتداءً لا بالشراء فلم تتعين به (اى بالشراء وهٰذا صريح فى عدم كون شراءه بنية الاضحية نذرًا ۱۲) وعلى الفقير بشراءه بنية الاضحية فتعينت ولا يجب عليه ضمان نقصانه وعن هذا الاصل (يعنى كون الوجوب على الغنى بالشرع لا بالشراء وعلى الفقير بالعكس ۱۲ عناية)

قالوا اذا ماتت المشتراة للتضحية على الموسر مكانها اخرى ولاشئ على الفقير ولو ضلت اوسرقت فاشترى اخرى ثم ظهرت الاولى فى ايام النحر على الموسر ذبح احدهما وعلى الفقير ذبحهما الخ۔

قال فى العناية: لان الوجوب عليه بالشراء وقد تعدد وهٰذا الذى ذكره من الاصل يوافق ما ذكره شيخ الاسلامؒ ان المشترى اذا كان موسرًا لا تصير واجبة

حاشیہ :

بالشراء بنیۃ الاضحیۃ باتفاق الروایات۔ وان کان معسرًا ففی ظاهر الروایۃ عن اصحابنا رحمهم الله تجب۔ وروی الزعفرانی عن اصحابنا لا تجب عــه وهو روایۃ النوادر، اه

(هدایہ مع فتح القدیر ج ۸ ص ۴۳۵)

قلت فلو کان شراء الغنی نذرًا کشراء الفقیر لزم اتحادهما فی جواب المسئلۃ ووجوب الاثنین علیهما۔ وقد نص فی الهدایۃ علی خلافه وصرح فی العنایۃ عن شیخ الاسلام بعدم الوجوب علی الغنی بالشراء بنیۃ الاضحیۃ وهذا صریح فی نفی کون شراءه نذرًا وهذا باتفاق الروایات فافهم۔ وفی الدر: وفقیر شراها لها لوجوبها علیه بذلک۔ حتی یمتنع علیه بیعها۔ قال الشامی: وهذا ظاهر الروایۃ لان شراءه لها یجری مجری الایجاب وهو النذر بالتضحیۃ عرفا کما فی البدائع

ووقع فی التتارخانیۃ: التعبیر بقوله شراها لها أیام النحر وظاهره انه لو شراها لها قبلها لا تجب ولم اره صریحًا فلیراجع اه (ج ۵ ص ۳۱۳) قلت: وقد اختلف المشائخ فی جواز اکل الفقیر من شاۃ شراها للاضحیۃ وعدم جوازه۔ قال الشامی: ثم ظاهر کلامه ان الواجبۃ علی الفقیر الشراء له الاکل منها وذکر ابو السعود ان شراءه لها بمنزلۃ النذر فعلیه التصدق بها اه

اقول: التعلیل بانها بمنزلۃ النذر مصرح به فی کلامهم ومفاده ما ذکر۔ وفی التتارخانیۃ: سئل القاضی بدیع الدین عن الفقیر اذا اشتری شاۃ لها هل یحل له الأکل قال نعم وقال القاضی برهان الدین: لا یحل اه

ثم اعلم ان هذا کله فیما اذا ذبحها فی ایام النحر بدلیل ما قدمناه عن الخانیۃ انه اذا اوجب شاۃ بعینها او اشتراها لیضحی بها فمضت أیام النحر تصدق بها حیۃ ولا یاکل منها لانتقال الواجب من الاراقۃ الی التصدق وان لم یوجب ولم یشتر وهو موسر تصدق بالقیمۃ اه وقدمنا ان مفاد کلامهم ان الغنی له الاکل من المنذورۃ ←

عــه قال الشیخ العلامۃ سیدی حکیم الامۃ ان الواجح فی شراء الفقیر بنیۃ الاضحیۃ روایۃ النوادر عندی لأنهم عللوا ظاهر الروایۃ لما سیأتی ان شراءه لها یجری مجری الایجاب وهو النذر بالتضحیۃ عرفًا فظهر أن بناءه علی العرف فیمکن ان یکون الایجاب متعارفا فی عصرهم واما فی زماننا فلیس الایجاب متعارفا فی شراء الفقیر اصلًا بل المتعارف نیۃ التطوع ولا یخطر معنی النذر بشراءه فی بال أحدٍ هذا والله اعلم۔ قلت ومقتضی ذلک جواز اکل الفقیر من اضحیته ۱۲ ظ

حاشیہ :

اذا قصد بنذره الإخبار عن الواجب - والمراد بالنذر فی کلام الزیلعی هنا النذر ابتداء اھ (ج ۵ - ص ۳۲۰)۔

قلت : ولما جاز به ذلك فی المنذورة بقصد الاخبار عن الواجب علیه فلان یجوز به فی ذلك فی المشتراة بنیّة الأضحیة الواجبة علیه اولی فالقول بعدم جواز الاکل للغنی من المشتراة بنیّة الواجب وهل ذلك نذرا و ایجاب الآخر علیه باطل لا اصل له۔

قال الشامی : والحاصل ان التی لا یؤکل منها هی المنذورة ابتداءً والتی وجب التصدق بعینها بعد أیام النحر والتی ضحّی بها عن المیت بأمره علی المختار کما قدمناه عن البزازیة۔ والواجبة علی الفقیر بالشراء علی احد القولین المارین والذی ولدته الاضحیة کما قدمناه عن الخانیة - المشترکة بین سبعة نوی بعضهم بحصة القضاء عن الماضی کما قدمناه آنفا عن الخانیة[عہ] أیضًا۔ فهذه کلها سبیلها التصدق علی الفقیر، فاغتنم هذا التحریر ج ۵ - ص ۳۲۰

قلتُ : فهذه کما تری لم یذکر فیها ما اشتراه الغنی لاضحیة او عیّنه لها بل صرح بقید الفقیر فی الواجبة بالشراء و بقید الابتداء فی المنذوره فاتضح الحق بلا امتراء وانجلی الفرق طلوع ذکاء فی کبد السماء - هذا والله سبحانه وتعالی اعلم۔

حرّره العبد الفقیر الی لطف ربه الصمد عبده

المذنب ظفر احمد المقیم بالخانقاه الامدادیه

بتهانه بهون - ۲۳ ذی الحجة ۱۳۴۲ھ

عہ قلت : ذکره تحت الدر ولو کان شریك الستة نصرانیاً او مرید اللحم لم یجز عن واحد اھ بما نصه وشمل ما لو کان احدهم مرید الاضحیة عن عامه واصحابه عن الماضی تجوز الاضحیة عنه ونیة اصحابه باطلة وصاروا متطوّعین وعلیهم التصدق بلحمها وعلی الواحد أیضا لان نصیبه شائع کما فی الخانیة وظاهره عدم جواز الاکل منها اھ (ج ۵ - ص ۳۱۹)

قلت وظهر منه ان الاضحیة اذا فاتت لا یمکن قضاءها بذبح شاة أو أخذ حصته من البدنة فی العام القابل وهذا وافقته الفتوی۔ قد سئلت منه فاجبت بان قضاء الاضحیة لا یمکن الا بتصدق القیمة دون اراقة الدم۔ ولله الحمد علی ما علم و فهّم ۱۲ ظ

مرغی یا کسی بڑے جانور کا سر بندوق یا ریل وغیرہ سے کٹ جائے اور محلِ ذبح باقی ہو اور جانور میں آثارِ حیات بھی ہوں تو اس کو ذبح کر کے کھانا حلال ہے یا نہیں ؟

السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مرغی کی فقط سری بلی نے کاٹ لی تھی یا کسی تیتر وغیرہ پرندہ کی فقط سری بندوق یا تیر سے جدا ہوگئی یا کسی بڑے جانور مثلاً گائے، بکری وغیرہ کی سری ریل کے نیچے آکر کٹ کر جدا ہوگئی یا فقط ہر چار رگیں جو کہ ذبح میں کاٹنی ضروری ہیں، کٹ گئیں لیکن سری جدا نہیں ہوئی اور ان ہر صورتوں میں گردن بہت سی بچی ہوئی موجود ہے اور جانور تڑپ رہا ہے تو چونکہ ذبح کا محل عقدہ سے نحر تک لکھتے ہیں پس تحریر سے ذبح کر کے کھایا جاوے تو جائز ہے یا نہیں بعض کتب میں یہ منقول ہے کہ چونکہ سری جدا ہوگئی اور رگیں کٹ گئیں تو اب محلِ ذبح نہیں رہا اس لئے ذبح کر کے کھانا جائز نہیں ہے اور یہ بھی محل ذبح کے نہ رہنے کی علت لکھتے ہیں کہ چونکہ اب ان رگوں کے کٹ جانے سے یقین ہے کہ زندہ نہیں رہ سکتا اس لیے جائز نہیں ہے۔ فقط

الجواب

نصف راس یا اکثر رأس کے قطع ہو جانے کے بعد جانور محلِ ذبح نہیں رہا۔ اور کل رأس منقطع ہو جائے تو بدرجۂ اولیٰ محلِ ذبح نہیں رہے گا۔

قال فی الدر المختار فی تفسیر قوله صلی اللہ علیہ وسلم ما ابین من الحی فهو میت وبه یعلم انه لو ابان الرأس کلا لانه لیس منفصلاً من حیٍّ حقیقة وحکماً بل حقیقة فقط لانه عند الانفصال میتٌ حکماً (ج ۵ ص ۳۰۲)

او قطع نصف رأسه أو اکثره أو قدر نصفین اکل کله لأن فی هٰذه الصور لا یمکن حیاته فوق حیاة مذبوح اھ

قال الشامی: وهٰذا حیٌّ صورة لا حکماً إذ لا یتوهم بقاء الحیاة بعد هٰذا الجرح اھ

ان عبارات سے مستفاد ہوتا ہے کہ جس جانور کا سر جدا ہو جائے وہ حکماً میت ہے اسی لئے قابل ذبح نہیں رہا۔

نعم: یشکل علیه قول الدر المختار وسیجئ انه یکفی من الحیاة قدر ما

یبقی فی المذبوح اھ (ج ۵ ص ۲۸۸)

وقولہ: والمعتبر فی المتردّیۃ واخواتہا کالنطیحۃ والموقوذۃ وما اکل السبع والمریضۃ مطلق الحیاۃ کما اشرنا الیہ۔ وعلیہ الفتویٰ اھ (ص ۴۶۶)

مع قولھم ان ذکاۃ الاختیار ذبح بین الحلق واللبۃ وذکاۃ الضرورۃ جرح فی ای موضع وقع کذا فی الدر۔ (ج ۵۔ص ۲۸۶)

ان عباراتِ اخیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ المتردّیہ والنطیحہ وامثالھا میں مطلق حیات صحتِ ذبح کے لئے کافی ہے۔ اور صورتِ مسئولہ میں اضطراب اور تڑپنا مطلق حیات کی علامت ضرور ہے۔ اور محلِ ذبح ما بین الحلق واللبہ ہے تو اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ اگر موضع ما بین اللبہ والحلق میں سے دو تین انگل باقی ہو جو ذبح کے قابل ہو اور جانور تڑپ بھی رہا ہو تو اس کو ذبح کر کے کھا سکتے ہیں، گو سر علیحدہ ہو گیا ہو۔ اور عباراتِ سابقہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انفصالِ سر کے بعد جانور بحکم میت ہے۔ اسی لیے مجھ کو اس مسئلہ میں شرح صدر نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۵ر صفر ۱۳۴۲ھ

التنقید علی الجواب المذکور من علماءِ مدرسۃ سہارنپور

حامدًا ومصلیًا ومسلمًا۔ پہلی روایت جو جوابِ اول میں نقل کی گئی ہے وہ مذبوح کے بارے میں ہے اس لیے کہ حدیث ما ابین من الحیّ فھو میتۃ میں اطلاق حی اس امر کو مقتضی ہے کہ منفصل من الحی الحقیقی والحکمی میت ہوتا ہے۔ پس جو منفصل من الحقیقی ہو اور منفصل من الحی الحکمی نہ ہوگا۔ جیسا کہ ذبح کرتے وقت اگر سر جدا ہو جائے تو جانور اس وقت اگرچہ حقیقۃً زندہ ہوتا ہے مگر ذبح کی وجہ سے حکمًا وہ زندہ شمار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ میت بمعنی مذبوح شمار ہوتا ہے۔ اس لیے اس سر کا کھانا شرعًا جائز ہوتا ہے جیسا کہ روایت وبہ یعلم انہ لو ابان الرأس اکلاً لانہ لیس منفصلاً من حیّ حقیقۃ وحکمًا الخ سے واضح ہوتا ہے۔

تحریر مندرجہ بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عبارتِ مذکورہ خاص مذبوح کے بارہ میں

ہے، عام نہیں۔ یعنی ہر جانور جس کا سر جدا ہو جائے خواہ وہ کسی وجہ سے اور اس جانور کو حکماً میت کہا جاوے کہ جس کی وجہ سے اس کا ذبح کرنا جائز ہو یہ صحیح نہ ہوگا۔ اور دوسری روایت یعنی اذا قطع نصف رأسه أو اكثره اور قدره نصفين اكل كله الخ یہ ذکوٰۃ اضطراری کے بیان میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تیر پھینکنے والے نے تیر کے ذریعہ نصف سر یا اکثر سر کاٹ دیا تو اس کے بعد ان دونوں حصوں کا کھانا جائز ہوگا بغیر ذبح کے، اس لیے کہ تیر سے زخم کر دینا ہی صید کے لیے شرعاً ذکوٰۃ قرار دی گئی ہے۔ پس جیسا کہ ذبح میں سر کے الگ ہو جانے کے بعد وہ جانور حکماً میت ہو جاتا ہے ایسا ہی یہاں پر بھی قطع نصف رأس یا اکثر رأس کے بعد وہ جانور حکماً میت شمار ہوگا۔ تو یہاں پر سر منفصل من الحی الحکمی نہ ہوا۔ اگرچہ منفصل من الحی الحقیقی ہوگا۔ اور جب تک وہ منفصل من الحی الحقیقی والحکمی نہ ہو اس وقت تک بمقتضی حدیث ما ابین من الحی الخ حرام نہ ہوگا۔ بلکہ حلال ہی رہے گا۔ تو ان دونوں عبارتوں میں میت سے مراد مطلقاً حی کا مقابل نہیں بلکہ حی حکمی کا مقابل مراد ہے تو اس وقت صید میں ذبح کی ضرورت نہ رہے گی اور بغیر ذبح کے اس کا کھانا جائز ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ ذبح جائز ہی نہیں، کیونکہ ذبح کی تو ان دونوں صورتوں میں ضرورت ہی نہیں بلکہ ذبح متحقق ہو گئی اور وہ مردار ہو گیا اس کا کھانا اب جائز نہیں ہوگا۔ پس صورتِ مسئولہ میں اگر محل کسی جانور کا باقی ہو خواہ سر اس کا بندوق کے ذریعہ الگ ہو گیا ہو یا ریل کے نیچے آکر یا بلی وغیرہ نے توڑ لیا ہو تو اس کو حلال کرکے کھانا جائز ہے۔ البتہ جو حصہ سر کا الگ ہو گیا ہے وہ حصہ حرام ہوگا کیونکہ منفصل من الحی الحقیقی ہے۔

فی الدر المختار: وان علمت حياتها وان قلت وقت الذبح اكلت مطلقاً لكل حال۔ انتهى.

وفی الشامی: تحت قوله «وان كانت حياتها خفيفة» عن البزازية: شاة قطع الذئب او وهي حيّة لاتزكّى لفوات المحل ولو انتزع رأسها وهي حيّة تحل بالذبح بين اللبب واللحيين انتهى.

راقم ضیاء احمد عفی عنہ
۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ

الجواب صحیح۔ عبد اللطیف عفا اللہ عنہ۔ مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

الجواب صحیح۔ خلیل احمد عفی عنہ مدرس مدرسہ مظاہر العلوم

عقیقہ کے جانور میں چند بچوں کا عقیقہ ایک ساتھ ہوسکتا ہے یا نہیں

السؤال: عقیقہ میں بیل، بکری وغیرہ مایکفی للواحد چند بچوں کے لیے بھی کافی ہوسکتا ہے ؟

الف: خواہ بچے ایک ہی دن میں سب پیدا ہوئے ہوں یا آگے پیچھے۔ مگر سنیچر یا اتوار مثلاً روز کے حساب سے سب برابر ہوں۔

ب: یہ بچے ایک ہی شخص کے ہوں یا دو، تین اشخاص کے

الجواب

بکری میں تو ایک بچہ سے زائد کا عقیقہ نہیں ہوسکتا اور گائے بیل میں سات بچوں تک کا ہوسکتا ہے خواہ سب ایک ہی شخص کے ہوں یا مختلف لوگوں کے اور ساتھ پیدا ہوئے ہوں یا آگے پیچھے۔ کیونکہ تاریخ کا لحاظ مستحب ہے ضروری نہیں۔

والدلیل ما فی الحامدیة: ولایکون فیه دون الجذع من الضأن والثنی من المعز ولایکون فیه الا السلیمة من العیوب لانه اراقة دم شرعًا کالاضحیة الی أن قال واحکامها احکام الاضحیة اھ ج ۲ - ص ۲۱۲ - ۲۱۳

وقال الشامی: فی مسئلة الاشتراك فی الاضحیة عند اختلاف الجهة وشمل مالوکانت القربة واجبة علی الکل اوالبعض اتفقت جهاتها اولا کالاضحیة و احصار وجزاء صید وحلق ومتعة وقران لان المقصود من الکل القربة خلافًا لزفر وکذا لواراد بعضهم العقیقة عن ولده قد ولد له قبل ذلك لأن جهة التقرب بالشکر علی نعمة الولد ذکره محمد۔ ج ۵ - ص ۳۱۹

قلت ولما جاز الاشتراك بالعقیقة فی بقرة الاضحیة فجواز اشتراك السبعة فی بقرة العقیقة أولی لاتحاد الجهة۔ واللّٰہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللّٰہ عنہ

از خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون

۲۷ / صفر ۱۳۴۵ھ

تخفیفِ ایذا کے لئے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بے ہوش کرنا

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ غیر قوموں کو مسلمانوں پر ایک

بڑا اعتراض گاؤکشی، نیز دیگر حلال جانوروں کے متعلق ہے کہ اس کے ذبح میں بلاوجہ ایک جاندار کی ایذاء اور تکلیف ہوتی ہے، جو انسانی اخلاق کے خلاف ہے تو کیا اگر اس کے دفعیہ کے لیے اگر کوئی صورت نکالیں اور جانوروں کو کسی دوا وغیرہ سے بیہوش کر کے ذبح کریں تو آیا جانور کو کسی بے ہوشی لانے والی دوا سے بیہوش کرنا اور بیہوشی کی حالت میں ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے یا نہیں، مدلّل جواب با صواب تحریر کریں فقط والسلام

احقر ابراہیم ابن یوسف سورتھ بکس ۱۲۳
رنگون

الجواب

غیر قوموں کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ تجربہ اور اقوال اطباء اس پر شاہد ہیں کہ ذبح میں جانور کو بنسبت جان کنی بدون ذبح کے بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ غیر قوم ذرا ذراسی بات پر انسان کے قتل سے تو رکتے نہیں اور جانور پر اتنا رحم! یہ کونسا قاعدہ ہے۔ پس مخالفین کے اعتراض سے متاثر ہونا اور اس سے متاثر ہو کر جانور کو ذبح سے پہلے بیہوش کرنا جائز نہیں۔ یہ جواب تو اس صورت میں ہے جبکہ جانور کو دوا سونگھا کر بیہوش کیا جائے اور اگر کھانے پینے کی دوا دے کر بیہوش کیا جاوے تو اس میں دو گناہ ہیں۔ ایک تاثر من اعتراض المخالفین کا گناہ، دوسرے جانور کو مسکر و مضر کے کھلانے پلانے کا گناہ۔

قال فی الدر: وحرم الانتفاع بها ولو سقی بها دواب الی ان قال ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون اھ ای القدر المسکر منها۔

(ج ۵۔ ص ۴۵۳)

اور اگر بیہوش کر کے کسی نے ذبح کر دیا تو ذبیحہ حلال ہوگا جبکہ شرائطِ ذبح بتمامہا موجود ہوں مگر کراہت سے خالی نہیں اور اس کا گوشت کھانا جائز ہوگا۔ لیکن ایسے بیہوش کردہ گائے یا بکری وغیرہ ذبح کرنے سے قربانی کے ادا اور صحیح ہونے میں تامل ہے۔

قال فی الدر: ویضحّی بالجماء والخصی والثولاء ای المجنونة اذا لم یمنعها من السوم والرعی وان منعها لا اھ

قال الشامی: الثول بالتحریك استرخاء فی اعضاء الشاة خاصة أو کالجنون

یصیبہا فلا تتبع الغنم وتستدیر فی مرتعہا اھ (ج ۵ ۔ ص ۳۱۵)

ولاشک ان الحیوان اذا غشی علیہ یمتنع من السوم والرعی وایضًا ینتقص ثمنہ فی ہٰذہ الحالۃ حتمًا لا یقال ان ہٰذا العیب بمقدمات الذبح لانا نقول بل ہو تعییب فکان کما اذا فقأ عینہ اوکسر رجلہ قبل الذبح عمدًا۔

قال فی الدر: ولا یضر تعیبہا من اضطرابہا عند الذبح اھ

قال الشامی: وکذا لو تعیبت فی ہٰذہ الحالۃ وانفلتت ثم اخذت من فورہا وکذا بعد فورہا عند محمد خلافا لابی یوسف لانہ حصل بمقدمات الذبح زیلعی (ج ۵ ۔ ص ۳۱۸)

قلت: واما لو عیبہا احدٌ عمدًا من دون اضطرابہا او انفلاتہا فالظاہر عدم الاجزاء عندہما جمیعًا نعم بقی ان جعلہا مغشیًا علیہا عیب کالثول ام ہو دونہ اولیس بعیب اصلًا۔ فلیتأمل،

قلت: ولعل فی ذلک ایذاء للحیوان بازید مما یحتاج الیہ فی الذبح فکان کجرہ برجلہ الی المذبح ونحوہ فان التغشیۃ تورث انضغاطًا و انقباضًا فی الروح شبیہًا بالنزع کما شاہدہ کثیر من الناس وقد کرہ الشارع ایذاء الحیوان قبل الذبح بازید مما یحتاج الیہ فیہ۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ

۲۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۵ھ

قربانی کی نیت سے بکری چھوڑ رکھی تھی وہ حاملہ ہوگئی تو اس کی قربانی میں کوئی قباحت نہیں

السوال: عرض یہ ہے کہ ایک بکری اپنی خوشی سے اس نیت سے چھوڑ رکھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام قربان کردوں گا وہ گابھن ہوگئی اور غالبًا بقر عید سے ایک دو روز پہلے یا اسی روز بیائیگی اس کی قربانی میں بوجہ بچہ کے قباحت تو نہیں اور بچہ بھی قربانی کردیا جائے یا نہیں۔ جو شرعًا حکم ہو جلد جواب سے مشرف فرماویں چونکہ بقر عید آگئی ہے۔ فقط

الجواب

اگر یہ شخص غنی صاحبِ نصاب ہے تو اس بکری کی جگہ دوسری کر سکتا ہے۔ اگر صاحبِ نصاب نہیں تو اس کی قربانی واجب نہیں اور حاملہ کی قربانی میں کچھ حرج نہیں۔ اگر ساتھ بچہ زندہ نکل آئے تو اس کو بھی ساتھ میں قربانی کر دینا چاہئے غنی اور فقیر میں یہ فرق جب ہے کہ بکری اسی نیت سے خرید کر چھوڑی ہو اور اگر خریدی نہیں بلکہ گھر میں پیدا ہوتی تھی یا کسی اور طرح مل گئی تھی، یا خریدی ہے مگر نیت بعد میں ہوئی ہے تو پھر فقیر کا بھی وہی حکم ہے جو غنی کا مذکور ہوا ہے۔

قال الشامی بتحت قوله (شراها لها) فلو كانت فی ملكه فنوی ان يضحی بها او اشتراها ولم ينو الاضحية وقت الشراء ثم نوی بعد ذلك لا يجب لأن النية لم تقارن الشراء فلا تعتبر (بدائع)

وقال الشامی: تحت قوله (قبل الذبح) فان خرج من بطنها حيًا فالعامة على انه يفعل به ما يفعل بالام الخ (ج ۵ ص ۲۱۳ و ص ۳۱۵) والله اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

دوسرے کی طرف سے بغیر اجازت قربانی کرنے کا حکم

السوال: قربانی میری طرف سے ہمیشہ بھتیجے ہی کر دیتے ہیں اور بعد دریافت کرنے کے معلوم ہوتا ہے کہ میری طرف سے بھی کر دی ہے۔ مگر قربانی کرنے سے پہلے مجھے نہیں کہتے کہ میں تمہاری طرف سے قربانی کروں گا اور مجھ سے عیدگاہ سے واپس آنے میں ذرا دیر ہو جاتی ہے، میں اگر موجود ہوں تو شاید وہ مجھ سے دریافت بھی کر لیں۔ تو آیا یہ قربانی میری طرف سے ان کا کر دینا درست ہو جاتا ہے یا نہیں اور شبہ کی وجہ سے کبھی کبھی میں از خود بھی کر دیتا ہوں۔ اگر ان کا کرنا میری طرف سے کفایت نہ کرے گا تو میں خود ہی اپنی طرف سے قربانی کروں گا۔ اس میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ مگر اب میں اس شبہ کو رفع کرنا چاہتا ہوں کہ صاف طور پر معلوم ہو جاوے تاکہ اس کے موافق عمل کروں اور اگر ادا نہیں ہوا تو پھر کس طرح ادا کیا جائے کیا صورت ادائیگی کی اب ممکن ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ درصورت عدم ادائیگی

کُل سالوں کا حساب لگا کر اکٹھے ادا کردوں تاکہ مؤاخذۂ اخروی سے سبکدوش ہوجاؤں اَللّٰھُمَّ سَہِّلْ عَلَیْنَا۔ میری اہلیہ کیطرف سے بھی کبھی کبھی میرے بھتیجے ہی قربانی کر دیتے ہیں تو ان کی جانب سے میرے بھتیجے کا قربانی کرنا درست ہو جاتا ہے یا نہیں ؟

خادم عبد الرحمٰن

الجواب

فی العالمگیریہ: ج ۶- ص ۲۰۲- اذا ضحّٰی بشاۃ من غیرہ بامر ذٰلک الغیر او بغیر امرہ لا تجوز لانہ لا یمکن تجویز التضحیۃ عن الغیر الا باثبات الملک لذلک الغیر فی الشاۃ ولن یثبت الملک لہ فی الشاۃ الا بالقبض ولم یوجد قبض الامر ھٰہنا الا بنفسہ ولا بنائبہ کذا فی الذخیرۃ وفیہ أیضًا بعد أسطر ولو ضحّٰی بدنۃ عن نفسہ وعرسہ واولادہ لیس ھذا فی ظاھر الروایۃ۔ وقال الحسن بن زیاد فی کتاب الاضحیۃ ان کان اولادہ صغارًا جاز عنہ وعنھم جمیعًا فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمھما اللّٰہ تعالٰی وان کانوا کبارًا ان فعل بامرھم جاز عن الکل فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمھما اللّٰہ تعالٰی۔ وان فعل بغیر امرھم وبغیر امر بعضھم لا تجوز عنہ ولا عنھم فی قولھم جمیعًا لان نصیب من لم یأمر صار لحمًا۔

ان روایات سے معلوم ہوگیا کہ بھتیجوں نے چچا کی طرف سے جو قربانی کی ہے وہ اکثر ائمہ کے نزدیک درست نہیں ہوئی ان کو چچا سے اجازت لینا ضروری تھا۔ پس اگر چچا کی طرف سے بکری وغیرہ کی قربانی کی گئی تھی تو وہ ادا نہیں ہوئی اور چچا کے ذمہ قضاء ہے۔ اور اگر گائے وغیرہ میں چچا کا حصہ شامل کر کے قربانی کی تھی تو اس پوری گائے وغیرہ کی قربانی صحیح نہیں ہوئی۔ چچا کے ذمہ قربانی کی قضاء واجب ہے۔ جو اس گائے وغیرہ میں شریک تھے ان پر بھی قضاء واجب ہے مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے استحساناً مروی ہے کہ اہل قرابت کی طرف سے بدونِ امر کے بھی قربانی درست ہے چونکہ صورتِ مذکورہ میں اکثر ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے میں حرجِ شدید ہے کہ چچا کے ساتھ دوسروں کی قربانی بھی باطل ہو جاتی ہے اس لئے ابو یوسف رحمہ اللہ کی روایت پر فتویٰ دیا جاتا ہے کہ گذشتہ قربانی تو سب کی طرف سے ادا ہو گئی مگر آئندہ ایسا نہ کرنا چاہیئے،

بلکہ چچا کو وقتِ اضحیہ سے پہلے ان کو اجازت دینا یا ان کو اجازت حاصل کرلینا چاہئے۔

اور قضاء کی صورت یہ ہے کہ ایک ایسی بکری کی قیمت خیرات کردی جاوے جس کی قربانی جائز ہو۔

کما فی الدر: (و) تصدق (بقیمتها غنی شراها اولا) لتعلقها بذمته شراها اولا فالمراد بالقیمة قیمة شاة تجزی فیها اھ (ج ۵۔ ص ۳۱۴)

احقر عبد الکریم عفی عنہ

۱۳۔ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ

میت کی طرف سے قربانی کرنے کا طریقہ

السوال: پانچ آدمی بقیدِ حیات ایک گائے کی قربانی میں شریک ہوتے ہیں اور دو شخص اپنے باپ، دادا کی طرف سے شرکت حاصل کرتے ہیں تو کیا یہ طریقہ درست ہے یا نہیں یعنی زندہ مردہ میں شریک ہوکر قربانی کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر قربانی میں کوئی حصہ دار اپنا حصّہ مردہ کی طرف سے کرنا چاہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ نیت تو اپنی طرف سے قربانی کی کرے اور ثواب مردہ کو بخش دے، اس صورت کے سوا دوسری صورتوں کی رعایت عوام سے دشوار ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ

عقیقہ میں بکروں کی بجائے گائے میں حصہ لے لینے سے سنّتِ عقیقہ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

السوال: عقیقہ میں دو بکریوں کے بدلہ میں اگر گائے دیدی جاوے تو عقیقہ سنت طریقہ پر ادا ہوجاویگا یا نہیں؟

الجواب

عقیقہ میں بجائے بکریوں یا بکروں کے گائے کرنے یا گائے میں حصّہ لینے سے بھی

سنتِ عقیقہ ادا ہو جاوے گی۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۸؍ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

عقیقہ سے متعلق چند سوالات

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت کے دو لڑکے، چار لڑکیاں قضا کر گئیں اور وہ عورت عقیقہ کے مسئلہ سے واقف نہ تھی ناواقفیت کی وجہ سے آج تک عقیقہ نہیں کیا اور اب وہ چاہتی ہے کہ ان سب مُردوں کے نام ایک ایک گائے عقیقہ کرے کیا اس طرح عقیقہ ادا ہو جاویگا یا نہیں اگر نہیں تو وہ کس طرح کرے؟

الجواب

مُردوں کی طرف سے عقیقہ کی دلیل نہیں ملی ہاں ہر ایک کی طرف سے بہ نیتِ قربانی اگر ایک بکری یا گائے کا ایک حصہ کر دے تو جائز ہے اور جس کا عقیقہ نہ ہوا ہو اس کی طرف سے اضحیہ قائم مقام عقیقہ کے ہو جاتا ہے

السؤال ۲: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی کے چار پانچ لڑکے لڑکیاں زندہ ہیں اور سب کا عقیقہ باقی ہے وہ بھی ایک ہی گائے کر سکتا ہے یا نہیں یا کس طرح کرے؟

الجواب: ایک گائے میں سات بچوں تک کا عقیقہ ہو سکتا ہے۔

السؤال ۳: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کے چند لڑکے اور لڑکیاں زندہ بھی اور مُردہ بھی ہیں۔ ایک ہی ساتھ سب کا اگر عقیقہ کرنا چاہے۔ یا ایک گائے میں سب کا عقیقہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ فقط

الجواب: زندہ کا ہو سکتا ہے مگر مردہ کی طرف سے اضحیہ کی نیت سے کرے

قال فی رد المحتار فی باب الاضحیۃ قد علم ان الشرط قصد القربۃ من الکل وشمل مالوکان احدھم مریداً للاضحیۃ عن عامہ واصحابہ عن الماضی تجوز الاضحیۃ عنہ ونیۃ اصحابہ باطلۃ وصاروا متطوعین وعلیھم

التصدق بلحمها وعلى الواحد أيضًا لأن نصيبه شائع كما فى الخانية وشمل ما لو كانت القربة واجبة على الكل او البعض اتفقت جهاتها أولاً وكذ الو اراد بعضهم العقيقة عن ولد قد ولد من قبل لان ذلك جهة التقرب بالشكر كان كالاضحية وقد جازت الاضحية عن الميت فكذا العقيقة لان الفقهاء قاسوها عليها فى أكثر الاحكام. قال الحافظ عــه فى الفتح واستدل باطلاق الشاة والشاتين على انه لا يشترط فى العقيقة ما يشترط فى الاضحية وفيه وجهان للشافعية واصحهما يشترط وهو بالقياس لا بالخبر ٢٢ع اهـ

ثم اختلفوا فى أنه هل يجوز فى العقيقة البقر والابل ام لا فذهب ابو الشيخ إلى تعيين الشاة لها وقال البندنيجي من الشافعية لا نص للشافعى فى ذلك و عندى انه لا يجزى غيرها۔

قال الحافظ: والجمهور على اجزاء الابل والبقر أيضًا وفيه حديث عند الطبرانى وابى الشيخ عن انس رفعه، يعق عنه من الابل والبقر والغنم ونص احمد على اشتراط كاملة وذكر الرافعى بحثا انها تتادى بالسبع كما فى الاضحية والله اعلم اهـ من الفتح (ج-۹-ص ۵۱۲)

قلتُ: وبه قال اصحابنا كما ترى فى كلام الشامى من جواز اشتراك ذ العقيقة مع اصحاب الاضحية فى بقرة واحدة فقاسوها على الاضحية و قد صحت الاضحية عن الميت فكذا العقيقة ولكن الاحوط ان ينوى عن الصغير الميت الاضحية فانها تقوم مقام العقيقة ايضًا۔ قال الحافظ فى الفتح وعند عبد الرزاق عن معمر عن قتادة من لم يعق عنه اجزاته اضحيته وعند ابن ابى شيبة عن محمّد بن سيرين والحسن يجزى عن الغلام الاضحية من العقيقة اهـ (ج ۹ - ص ۵۱۴)

وقال فى رد المحتار: تحت قول الدر وان مات احد السبعة وقال الورثة اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل مانصّه لان الموت لا يمنع التقرب

عــه اى الحافظ ابن حجر فى فتح البارى ١٢ منه

عن المیت بدلیل انہ یجوز أن یتصدق عنہ ویحج عنہ وعلی ھذا اذا کان احدھم ام ولد ضحی عنہا مولاھا او صغیرًا ضحی عنہ أبوہ اھ

(ج ۵ - ص ۳۱۸)

قلت: جواز الاضحیة عن الصغیر المیت یستدعی جواز العقیقة عنہ بالاولی لعدم ورود الامر بالاضحیة عنہ وقد ورد بالعقیقة وانہ مرتہن بعقیقتہ واخرج ابن حزم عن بریدة الاسلمی (الصحابی) قال ان الناس یعرضون یوم القیامة علی العقیقة کما یعرضون علی الصلوات الخمس ذکرہ الحافظ فی الفتح اھ (ج ۹ - ص ۵۱۳) واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳۰ / ربیع الاول سنہ ۱۳۴۴ھ

میت کی طرف سے قربانی کرنا | **السوال:** وقت قربانی گائے ایک حصہ رسولِ خدا، ایک حصہ کسی عزیز متوفی، بقیہ حصہ اشخاصِ موجودہ کے ہوں تو یہ سب گوشت ہر حصہ کا مثل قربانی تقسیم ہوگا یا کیا۔

الجواب

اگر متوفی نے وصیت کی تھی تو قربانی میں اس کا حصہ فقراء کو دیا جائے۔ اس میں سے خود کھانا جائز نہیں ہے۔ اور اگر متوفی نے وصیت نہیں کی تھی تو اپنی قربانی کی طرح اختیار ہے

کما فی الشامی (ج ۵ ص ۳۲۸) لو ضحّی عن المیّت وارثہ بامرہ الزمہ بالتصدق بھا وعدم الاکل وان تبرّع بھا عنہ لہ الاکل لانہ یقع علی ملک الذابح والثواب للمیت اھ واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ / ذی قعدہ سنہ ۱۳۴۴ھ

امنیة الھالک فی أضحیة مالک | **السوال:** قربانی گاؤ پر ہندوستان میں جو فسادات ہوتے ہیں ان پر نظر کرکے ایک ندوی مولوی نے اخبارات میں

ایک مضمون شائع کیا ہے جو ارسال خدمت ہے اس کو ملاحظہ فرماکر مطلع فرمایا جائے کہ آیا یہ مضمون صحیح ہے یا غلط اور اس پر مسلمانوں کو عمل جائز ہے یا نہیں۔
وھو ھٰذا:

قربانی کے متعلق ایک ضروری مسئلہ

کس درجہ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ ایک پاکیزہ تر رسم جس کی بنیاد محبت واخلاص پر رکھی گئی ہو (خدا تعالیٰ کی محبت پر یا باہمی کفار کی محبت پرؔ) ہمارے دیس میں اب اس کی آمد کا انتظار جنگ وفساد اور قتل وخونریزی کے تخیل کے ساتھ کیا جاتا ہے جن مبارک دنوں میں ہم سب کو ابراہیم خلیل اللہ کی سنت کے مطابق ہمہ تن اپنے آپ کو عاجزی اور بیچارگی کی تصویر بننا چاہیئے خالق کے سامنے یا مخلوق کے سامنے خود ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باپ کے ساتھ اور قوم کے ساتھ توحید کے باب میں جو مخالفت کی ہے منصوصِ قرآنی ہے کہ نوبت القاء فی النار تک پہنچی۔ جن دنوں ہمارے دلوں میں صرف اس بے نیاز مالک کی بارگاہ پر مٹ جانے کی تڑپ ہونی چاہیئے جن دنوں ہمارے دلوں کی توجہ کو اُن جانے والوں کی سمت مصروف ہونی چاہیئے جو نیکی اور محبت کا احرام باندھ کر خدا کے گھر کا طواف کرنے گئے ہیں افسوس ہے کہ ٹھیک اُن ہی دنوں میں کچھ زمانہ سے ہم سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں، امن مفقود ہو جاتا ہے، محبت کی جگہ دشمنی آجاتی ہے، حکمت و محبت یا سر بکف جذبات مٹ کر عداوت اور انتقام کے ملّت کُش جذبات اُبھرتے ہیں۔ اس کے ذمہ دار مسلمان ہیں یا کفّار؟

اور صحیح ہے کہ اس معاملہ میں تنہا ہماری نادانیاں شامل نہیں ہیں بلکہ ہمارے پڑوسی اور ہمسایہ بھی اپنی غلط اندیشیوں سے کچھ فضا کو خراب کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا

؎ اور اس وصف کا بنسبت قربانی کے خود اسلام زیادہ مستحق ہے۔ پھر اگر کسی کا اسلام لانا کسی کو ناگوار ہو اور وہ محتمل ہو فتنہ وفساد کو چنانچہ اب بھی اس کا وقوع ہوتا ہے۔ اس میں جاری کیا جاوے گا۔ اگر کہا جاوے کہ اسلام کا تو کوئی بدل نہیں تو جواب یہ ہے کہ اسلام کا تو بدل ہے، اخفاءِ اسلام تو کیا اس کا مشورہ دیا جائے گا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایک اسلامی فرقہ مرجیہ بھی ہے جو اعمال کو چنداں ضروری بھی نہیں کہتے اور اظہارِ اسلام صرف ایک عمل ہے ۱۲

فرض دوسروں کی نادانیاں اور غلط راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے یہ نہیں ہو جاتا کہ ہم بھی ان کی طرح نادانیوں کا ایک ڈھیر جمع کر دیں۔ کم سے کم ہمیں اپنی نادانیاں کم ضرور کرنی چاہئیں گو دین بھی کم ہو جائے۔

ہماری ذمہ داری جس قدر کم ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ قربانی کے بارے میں یہ مسئلہ بالکل صاف ہے کہ اسلامی شریعت میں گائے کی قربانی روا رکھی ہے کوئی شخص اس کے خلاف حکم شرعی صادر نہیں کر سکتا اور نہ اس اجازت کو باطل ٹھہرا سکتا ہے لیکن شرعی اختیار کی رُو سے ہم گائے، بکری، اونٹ میں سے کسی ایک کا اپنے مناسب حال انتخاب کر سکتے ہیں فقہ کی تمام کتابوں میں تصریح کے ساتھ بکری کی قربانی کو گائے اور بیل کی قربانی پر افضل بتایا گیا ہے۔ سو اگر ہمیں استطاعت ہے تو پھر ہم افضل کو کیوں چھوڑیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اقتصادی حیثیت سے گائے کی قربانی میں زیادہ آسانیاں ہیں تو اس کے متعلق کم از کم ایک سہولت کو جو حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے بیان میں پائی جاتی ہے اُسے کیوں نہ اختیار کیا جائے کہ عموماً ایک ہی گھر میں کئی زندہ اور مردہ اشخاص کی طرف سے قربانیاں کی جاتی ہیں اور اس کے لئے ایک ہی گائے میں مختلف شرکاء کا حصہ لگاتے ہیں یہ صورت بکری میں بھی ممکن ہے اور اس شرکت کے لئے سات کی کوئی قید نہیں بلکہ ایک گھر کے تمام آدمیوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی ممکن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی پیروی کرنے والے بھی اگر اقتصادی اسباب کی بنیاد پر اس شکل کو اختیار کریں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔ بیسیوں مسائل میں حالات کی نزاکت اور موقع کی ضرورت کے لحاظ سے دوسرے ائمہ کے اقوال پر بھی عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ امام مالکؒ کے قول کے علاوہ متعدد صحابہ کے فعل سے بھی ایسا کرنا ثابت ہے۔

مزید تصریح یہ وہ تحریر تھی جو مولوی عبدالرحمٰن ندوی مرحوم نے پچھلے سال بقرعید کے موقع پر شائع کی تھی۔ آج اس مسئلہ کے سمجھانے اور بتلانے کی ضرورت پچھلے سال سے کچھ زیادہ ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے جو لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ سارے گھر کی طرف سے ایک بکری کی قربانی جائز ہونے کا فتویٰ صرف امام مالک ہی کا نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اور آثار صحیحہ کی بناء پر عہد رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا عام طرز عمل بھی یہی تھا کہ ایک بکری میں پورا گھر شریک ہو جاتا تھا۔ حضرت ابوایوب

انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت خفیف لفظی تغیر کے ساتھ سنن ابن ماجہ، جامع ترمذی، مؤطا وغیرہ متعدد کتبِ احادیث میں آتی ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے:

كان الرجل يضحّى بالشاة عنه وعن اهل بيته فياكلون ويطعمون حتى تباهى الناس فصارت كما ترى۔ الحديث، ترمذى ابواب الاضحية و سنن ابن ماجه ابواب الضحايا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص ایک بکری خود اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ذبح کرتا تھا۔ اس میں سے لوگ کھاتے اور کھلاتے رفتہ رفتہ قربانی بھی فخر اور نمائش کی چیز بن گئی۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے اس کو حسن اور صحیح لکھا ہے۔ عام فقہاء حنفیہ جو بکری کی قربانی میں شرکت کے قائل نہیں ہیں وہ بھی اس حدیث کی صحت کا انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ خود امام محمدؒ اس حدیث کو اپنی کتاب مؤطا میں نقل فرماتے ہیں۔

كنا نضحّى بالشاة الواحدة، يذبحها الرجل عنه وعن اهل بيته ثم تباهى الناس بعد ذلك فصارت مباهات مؤطا امام محمد

قال محمد كان الرجل يكون محتاجًا فيذبح الشاة الواحدة يضحّى بها عن نفسه فياكل ويطعم اهله فاما شاة واحدة يذبح عن اثنين او ثلاثة اضحية فهذه لا يجزى ولا يجوز شاة الا عن الواحد وهو قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ والعامة من فقهائنا۔

البتہ ان کا فرمانا یہ ہے کہ اس وقت لوگ محتاج تھے اس لیے ایک شخص ایک بکری اپنی طرف سے ذبح کرتا تھا اور اس کو خود کھاتا اور گھر والوں کو کھلاتا تھا لیکن کسی شخص کا ایک بکری، دو یا تین شخصوں کی طرف سے ذبح کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ایک بکری صرف ایک ہی شخص کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ اور یہی قول امام ابو حنیفہ اور دوسرے فقہاء حنفیہ کا ہے۔ لیکن جیسا کہ خود مؤطا کے ہی بعض شارحین نے لکھ دیا ہے کہ حدیث میں فقر اور محتاجی کا کہیں ذکر نہیں اور حافظ ابن قیمؒ نے "زاد المعاد" میں حدیث ترمذی کی بناء پر ایک بکری میں گھر بھر کی شرکت کو جائز رکھا ہے

المستفتی: شیخ عبدالعزیز زمیندار
ضلع بارہ بنکی۔

الجواب من جامع امداد الاحکام

اقول وباللہ التوفیق : قال فی رحمۃ الامۃ : والابل افضل فی الاضحیۃ ثم البقر ثم الغنم وقال مالک الافضل الغنم ثم الابل ثم البقر والبدنۃ تجزی عن السبعۃ وکذلک البقرۃ والشاۃ عن واحدۃ بالاتفاق

وقال اسحٰق بن راھویہ : والبقرۃ عن العشرۃ اھ (ص ۵۹)

وقال ابن رشد المالکی فی مقدمات المدوّنۃ : والضحیۃ واجبۃ علی المقیم والمسافر والذکر والانثٰی والصغیر والکبیر۔ وقد قال مالک یضحّی الوصی عن الیتیم من مالہ ویلزم الاب أن یضحی عن بنیہ الذکور والاناث ما کانت نفقتھم لہ لازمۃ ۔ الذکور حتی یحتلموا والاناث حتی یتزوّجن ویدخل بھن ازواجھن والاختیار عند مالک ان یضحی عن کل نفس بشاۃ واحدۃ من جمیع اھل بیتہ اجزاھم اھ (ج ۲ - ص ۸)

ان عبارات سے چند امور معلوم ہوئے (۱) رحمۃ الامۃ کی عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاۃ بالاتفاق ایک ہی شخص کی طرف سے کافی ہے زائد کی طرف سے کافی نہیں ۔ (۲) اور مقدمہ مدوّنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک جمیع اہل بیت کی طرف سے ایک ہی شاۃ کافی ہوسکتی ہے ۔مگر افضل ان کے نزدیک بھی یہی ہے کہ ہر شخص کی طرف سے بکری الگ الگ ذبح کی جاوے ۔ (۳) پس امام مالک کے نزدیک بکری کا جملہ اہل بیت کی طرف سے کافی ہونا صحیح طور پر جزماً ثابت نہ ہوا بلکہ ان سے دو روایتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ ایک روایت میں ائمہ ثلاثہ کے ساتھ متفق ہیں کہ ایک شاۃ ایک ہی شخص کی طرف سے کافی ہوسکتی ہے ۔ اور دوسری روایت میں وہ ان سے الگ ہیں پس ایسی صورت میں امام مالکؒ کے اس قول پر کیونکر عمل ہوسکتا ہے ۔ (۴) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جمہور امت کے نزدیک اضحیہ میں افضل ابل ہے پھر بقر پھر غنم اور اس میں صرف امام مالک اختلاف کرتے ہیں کہ غنم کو افضل کہتے ہیں مگر حدیث صحیح جو صحیحین میں مذکور ہے : من راح الی الجمعۃ فی الساعۃ الاولیٰ فکانما قرّب بدنۃ ومن راح فی الساعۃ الثانیۃ فکانما قرّب بقرۃ و من راح فی الساعۃ الثالثۃ فکانما قرّب شاۃ الخ جمہور کی مؤید ہے ۔ اور امام مالکؒ کے

پاس افضلیتِ غنم کی دلیل صرف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبشِ اقرن کی قربانی کی ہے اور یہ کہ ابراھیم علیہ السلام کے لئے فدیہ میں جنت سے کبش آیا تھا۔ مگر طحاوی نے بطریقِ عبد اللہ بن نافع عن ابیہ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کی ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یضحی بالجزور وبالکبش اذا لم یجد جزورًا اھ

(ج - ۲ ص-۳۰۳)

وھو سند حسن وعبد اللہ بن نافع فیہ مقال وقال ابن عدی ھو ممن یکتب حدیثہ وقال ابن ابی مریم عن ابن معین یکتب حدیثہ وقال ابن المدینی کان عندی أحفظھم یعنی ولد نافع۔ کذا فی التھذیب (ج ۶-ص ۵۳)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبش کو اضحیہ میں اس وقت اختیار فرماتے تھے جب جزور نہ ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جزور افضل ہے اور بقرہ مثل جزور کے ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ بقرہ مثل جزور کے سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہے۔ نیز بُدنہ کا اطلاق مثل ابل کے بقرہ پر بھی ہوتا ہے۔ شاۃ وکبش پر بدنہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

قال الشوکانی فی النیل عن النھایۃ لابن الاثیر: البدنۃ تقع علی الجمل والناقۃ والبقرۃ وھی بالابل أشبہ۔ وفی القاموس: البدنۃ محرکۃ من الابل والبقر وفی الفتح ان اصل البدن من الابل والحقت بھا البقر شرعًا وحکی فی البحر عن ابی حنیفۃ واصحابہ والناصر انھا تطلق علی البقر۔ وعن بعض اصحاب الشافعی انھا تطلق علی الشاۃ (أیضًا) قال ولا وجہ لہ وحکی فیہ ایضًا ان البقرۃ عن سبعۃ والشاۃ عن واحد اجماعا اھ (ج ۴- ص ۳۳۲)

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ بدنہ کا اطلاق ابل و بقر پر ہوتا ہے نہ کہ شاۃ پر تو اس سے بقرہ کی فضیلت شاۃ پر دوسری طرح بھی ثابت ہوگئی وہ یہ کہ نصِ قرآنی میں ارشاد ہے وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ تو اس سے اولاً وبالذات اضحیہ ابل و بقر کا شعائر اللہ سے ہونا مستفاد ہوتا ہے نہ کہ اضحیہ شاۃ کا۔ اضحیہ شاۃ اگر شعائر اللہ میں سے ہوگا تو الحاقًا و تبعًا ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اضحیہ کبش کرنا دلیلِ فضیلت جب ہو سکتا تھا جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اسی پر اکتفا کیا ہو اور جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اضحیہ

ابل اور بقر بھی ثابت ہے تو گلہے اضحیۂ کبش کرنے سے اس کی فضیلت کیونکر ثابت ہوسکتی ہے اور اگر کبش ابل اور بقر سے افضل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضحیہ حجۃ الوداع میں جو کہ آخری اضحیہ تھی ضرور اسی کو اختیار فرماتے حالانکہ اس وقت آپ نے بکری یا دنبہ کی قربانی نہیں کی بلکہ صحیحین سے ثابت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں سَو اونٹ اپنی طرف سے اور ایک گائے یا چند گائیں اپنی ازواج کی طرف سے ذبح فرمایا۔

والشك فی وحدۃ البقرۃ وتعدّدها لاختلاف الروایات ففی روایۃ ضحی عن ازواجہ بقرۃ وفی بعضہا عن ازواجہ بقرۃ بقرۃ ذکرہ الحافظ فی الفتح فی باب الاضاحی)

رہی امام مالک کی دوسری دلیل کہ جنت سے فدیۂ اسماعیل میں کبش آیا تھا معلوم ہوا کہ وہی افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شرائع سابقہ کا کوئی حکم مسلمانوں پر اس وقت حجت ہوسکتا ہے جبکہ شریعتِ اسلامیہ میں اس کے خلاف حکم نہ ہو اور یہاں ہم نے بتلا دیا ہے کہ احادیث سے ابل و بقر کا افضل صراحۃً ثابت ہے پس شریعتِ سابقہ کا حکم ہم پر حجت نہیں ہوگا دوسرے وہاں کبش جنت کا ذکر ہے اور ہم ابل و بقر دنیا کو کبشِ جنت سے افضل نہیں کہتے بلکہ کبش و غنم دنیا سے افضل کہتے ہیں ممکن ہے کہ کبشِ جنت جثہ اور جسامت میں ابل و بقرِ دنیا سے زیادہ ہو اس لئے افضل ہوا اور اس کا جنت سے آنا ہی خود فضیلت کے لئے کافی ہے اور اس میں بحث نہیں۔ گفتگو دنیا کے ابل و بقر و غنم میں ہے جن میں دلائل سے یہی ثابت ہے کہ غنم کا درجہ سب کے بعد ہے۔ بہرحال اس مدعا پر متعدد دلائلِ قویہ قائم ہیں کہ بقرہ کبش و غنم سے افضل ہے۔ پس اگر امام مالک سے یہ روایت ثابت ہے کہ ایک بکری گھر بھر کی طرف سے اضحیہ میں کافی ہے تو ان کے قول پر بقرہ کا سب گھر والوں کی طرف سے کافی نہ ہونا بہت عجیب ہوگا۔ اس کو ہرگز قیاس تسلیم نہیں کرسکتا کہ بکری تو گھر کے سو آدمیوں کی طرف سے کافی ہو اور گائے جو قیمت و جسامت میں اور فضیلت میں اس سے زیادہ ہے، وہ سب گھر والوں کی طرف سے کافی نہ ہو۔ (ھذا ھو الذی الزم بہ الطحاوی القائلین باجزاء الشاۃ عن اھل بیت واحد جمیعًا) بلکہ قیاس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اگر بکری ایک گھر کے سب آدمیوں کی طرف سے کافی ہو تو گائے سات گھروں کے آدمیوں کی طرف سے کافی ہوگی کیونکہ بالاجماع ایک گائے سات بکریوں کے برابر ہے۔

قال الشوکانی فی النیل تحت حدیث ابن مسعود مرفوعاً ان رجلاً اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال إن علی بدنۃ وانا موسر ولا اجدھا فاشتریھا فامرہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبتاع سبع شیاہ فیذبحن رواہ احمد وغیرہ ۔ ما نصہ : قولہ سبع شیاہ استدل بہ من قال عدل البدنۃ سبع شیاہ ، وھو قول الجمھور وادعی الطحاوی وابن رشد انہ اجماع اھ

(ج ۴ ۔ ص ۳۳۱)

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اول تو ایک بکری کا سب گھر والوں کی طرف سے کافی ہونا امام مالکؒ کے مذہب میں متفق علیہ نہیں بلکہ اُن سے دو روایتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ ایک جمہور امت کے موافق ہے جیسا کہ رحمۃ الامۃ اور نیل الاوطار کی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ بقرہ کا سات کی طرف سے کافی ہونا اور بکری کا ایک شخص کی طرف سے کافی ہونا اجماعی قول ہے دوسری روایت میں امام مالکؒ جمہور امت سے الگ ہیں اور اس حالت میں امام مالکؒ کے ایک ایسے قول پر فتویٰ دینا جو دلائل سے ضعیف ہے یقیناً خلافِ احتیاط ہے جو عبادات میں کسی طرح جائز نہیں ۔ دوسرے اگر امام مالکؒ کے اس قول کو مان لیا جاوے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک گائے سات گھر والوں کی طرف سے کافی ہو تو پھر وہ مصلحت فوت ہو جائے گی جو امام مالک رحمہ اللہ کے قول کو اختیار کرنے میں ظاہر کی گئی ہے ، کیونکہ اب بھی اقتصادی مصالح گائے میں زیادہ ہوں گی ۔

تیسری یہ کہ حنفی کو اپنے امام کا قول چھوڑ کر دوسرے امام کے قول کو اختیار کرنا صرف دو حالتوں میں جائز ہو سکتا ہے ایک یہ کہ اپنے امام کا قول دلائل سے ضعیف ہو دوسرے کا قوی ہو اور یہاں یہ صورت نہیں ہے ۔ بلکہ اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ کا قول قوی اور امام مالکؒ کا قول ضعیف ہے اور جن آثار سے امام مالکؒ نے استدلال کیا ہے جمہور امت کے نزدیک اُن کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے ذمہ قربانی واجب نہ ہوتی وہ ایک بکری اپنے گھر بھر کے لئے ذبح کر لیتا تھا کما ذکرہ فی المؤطا (۲۷۸) اور قولِ قوی کو چھوڑ کر قولِ ضعیف کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے مضطر ہو کر دوسرے امام کے قول کو اختیار کیا جاوے اور ضرورتِ شدیدہ وہ ہے جس کو شریعت ضرورت تسلیم کرے

اور صورتِ موجود میں شرعاً کوئی ضرورت نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قربانی کی پاکیزہ رسم کی بنیاد محبت و اخلاص پر رکھی گئی ہے اور ہمارے دیس میں اس کا انتظار جنگ وقتل وخونریزی کے تخیل کے ساتھ کیا جاتا ہے اھ میں پوچھتا ہوں کہ قربانی کی بنیاد خدا تعالیٰ کی محبت کی بنیاد پر ہے یا باہمی کفار کی محبت پر۔ یقیناً کفار کی محبت پر شریعت کی کسی چیز کی بنیاد نہیں۔ بلکہ اگر قرآن کریم اور احادیث کا مطالعہ ایمان واسلام کی آنکھ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت میں اعداء اللہ کی بغض و اغاظت کا جابجا امر ہے۔ بالخصوص قربانی میں تو اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔

چنانچہ ابن القیمؒ زاد المعاد میں واقعہ حدیبیہ سے احکامِ شرعیہ مستنبط کرتے ہوئے لکھتے ہیں: و منها استحباب مغايظة اعداء الله فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اهدی فی جملة هدیه جملاً لابی جهل فی انفه برة من فضة لیغیظ به المشرکین (ای لکونه جمل سیدهم) وقد قال تعالیٰ فی صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابه وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وقال عزوجل: ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (ص ۳۸۵ - ج ۱)

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر قربانی کی بنیاد نعوذ باللہ کفار کی محبت پر ہے تو خود اسلام کی بنیاد بھی اسی پر ہونا چاہئے پھر اگر کسی کا مسلمان ہونا ہندوؤں کو ناگوار ہو چنانچہ واقعہ ہے کہ ان کو یہ امر ناگوار ہے تو بس آج سے کسی کافر کو بھی مسلمان نہ کیا جائے تاکہ برادرانِ وطن ناخوش نہ ہوں۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اسلام کا تو کوئی بدل نہیں اور قربانی کا بدل موجود ہے تو میں کہتا ہوں کہ اعلانِ اسلام کا بدل اخفاء اسلام ہے تو کیا آج سے نومسلموں کو یہ مشورہ دیا جائے گا کہ وہ اپنے اسلام کو ظاہر نہ کریں مخفی رکھیں خصوصاً جبکہ ایک اسلامی فرقہ مرجیہ بھی ہے جو عمل کو چنداں ضروری نہیں کہتا صرف ایمانِ قلبی کو ضروری سمجھتا ہے اور یقیناً اظہارِ اسلام بھی صرف ایک عمل ہی ہے۔ پھر ہم

پوچھتے ہیں کہ اگر آج تم نے ہندوؤں کی ایک جماعت کی خاطر اضحیۂ گاؤ کو ترک کیا تو کیا کل دوسری جماعت کی خاطر سے جو مطلقاً جیو شاہی کو جرم سمجھتے ہیں بکری کی قربانی بھی ترک کردو گے اور اس وقت ان علماء کا قول لے لو گے جو اضحیہ کو واجب نہیں کہتے بلکہ محض سنت کہتے ہیں اور کیا مسجدوں میں آذانیں بھی بند کردو گے جو کفارِ ہند کے دلوں پر تلوار سے زیادہ کاری زخم لگاتی ہے۔ چنانچہ جس جگہ ان کا بس چلتا ہے اذان کو فوراً روک دیتے ہیں تو بس پھر نعوذ باللہ اسلام کو یہ کہکر چھوڑ بیٹھنا کہ ہمارے مسلمان رہنے سے ہندوؤں کو ناگواری ہے۔ کیونکہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں ہی کا رہنا پسند کرتے ہیں کسی دوسری قوم کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے چھپی ہوئی بات نہیں۔ اور اگر معاذ اللہ اسلام اور اضحیہ کی بنیاد کفّار کی محبت پر ہے تو شاید فاضل مضمون نگار کے نزدیک تو وہ خلفاء اسلام تو بہت بڑے مجرم ہوں گے جنہوں نے بلادِ کفر کو فتح کر کے بتخانوں اور بتوں کو توڑ کر مسمار کیا تھا۔ کیونکہ اس فعل سے یقیناً کفّار کی آتشِ غضب تیز ہوئی ہے۔ پس قربانی گاؤ کو ترک کر کے امام مالکؒ کے قول پر گھر بھر کی طرف سے ایک بکری پر اکتفاء کرنا محض ہندوؤں کو راضی کرنے کے لئے ہرگز جائز نہیں۔ کیونکہ یہ شرعی ضرورت نہیں بلکہ مقصودِ شرع کے منافی ہے اور کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ قربانی کی بنیاد کفار کے ساتھ محبّت و اخلاص کرنے اور ان کے ساتھ عاجزی و بیچارگی کی تصویر بننے پر ہے بلکہ اس کی بنیاد محبّتِ الٰہی و فدائے نفس فی سبیل اللہ پر ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کسی عبادت کے وقت امنِ عامہ کو مفقود نہ کرنا چاہیئے مگر دیکھنا یہ چاہیئے کہ قربانی کی وجہ سے جو فسادات ہوتے اور امن عام مختل ہوتا ہے، اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ یقیناً مسلمان شرعًا و قانونًا اضحیۂ گاؤ کے مختار ہیں اور یہ ان کا اسلامی حق ہے جس کو گورنمنٹ نے بھی ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنے اس جائز حق کو استعمال کریں تو بتلائیے اس میں مسلمانوں کا قصور ہے یا ہندوؤں کا؟ جو خواہ مخواہ مسلمانوں سے اس جائز حق میں مزاحمت کرتے ہیں: رہا یہ کہ وہ تو اپنی نادانی کی وجہ سے مزاحمت سے باز نہیں آتے تو آخر اس فساد کا کچھ تو انسداد ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان واقعات کے انسداد کی یہ صورت نہیں جو ندوی فاضل نے اختیار کی ہے کہ ہندوؤں کی مزاحمت کو دیکھ کر اپنے مذہب کو بدلنے لگے اور ضعیف اقوال کا انتخاب کرنے لگے

کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ اول تو شرعاً جائز نہیں دوسرے اقتصادی اور تمدنی مصلحتیں بھی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ اس سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھیں گے۔ اور کل کو وہ کسی اور بات سے تم کو روکنے لگیں گے پھر کہاں تک تم اپنے مذہب کو بدلو گے بلکہ اس کی دو صورتیں ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب ہندو مزاحمت کریں اس وقت مسلمان مقابلہ نہ کریں بلکہ حکام کو اطلاع کر کے ان کی مدد سے قربانی کریں۔ دوسرے یہ کہ حکام کی امداد کے بعد بھی اگر وہ مزاحمت سے باز نہ آئیں تو گورنمنٹ سے اجازت لے کر مزاحمت کا جواب مدافعت سے دیدیں۔ اس صورت میں فساد نہ ہوگا۔ بلکہ یہ مزاحمت اعلاء کلمۃ اللہ میں داخل ہو کر باعثِ اجرِ عظیم ہوگی جس میں شہادتِ عظمٰی کا ثواب ملے گا۔ ہاں بدون گورنمنٹ کی اجازت و اطلاع کے مدافعت و مقابلہ کرنا ہمارے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کو ہرگز مناسب نہیں۔ یہ گفتگو تو اس تقریر پر تھی کہ اضحیۂ گاؤ اور اضحیۂ غنم کو مساوی طور پر شعائرِ اسلام تسلیم کر لیا جائے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اضحیۂ گاؤ اعظم شعائرِ اسلام ہے جس کو ہم نے رسالہ " الخیر النامی لدفع شر النظامی " میں مفصل طور پر ثابت کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جب تک مسلمانوں کو اضحیۂ گاؤ پر قدرت ہو اس وقت تک ہندوؤں کی خاطر اس کو ترک کرنا ہندوستان میں ہرگز جائز نہیں۔

اب میں آخر میں فاضل مضمون نگار کو اس کی چند غلطیوں پر اور بھی متنبہ کرتا ہوں، وہ یہ کہ اس نے امام مالک رح کے اس قول کو ظاہر کر کے بزعم خود قتل و خونریزی کو کم کرنا چاہا ہے حالانکہ اس سے اور زیادہ قتل و خونریزی بڑھے گی کیونکہ حنفی علماء ہرگز اس قول کو نہیں مان سکتے، جو آثار اور قیاس سے ہر طرح ضعیف ہے پھر اب تک تو ہندو یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے اقتصادی طور پر اضحیۂ گاؤ ضروری ہے اور یہ سمجھ کر کسی وقت رو براہ بھی ہو جاتے تھے اور جب یہ سمجھیں گے کہ یہ اقتصادی مصالح امام مالک رح کا قول لیکر بکری میں بھی حاصل ہو سکتی ہیں اور مسلمان پھر بھی امام مالک رح کے قول پر عمل نہیں کرتے تو اس سے ان کی آتشِ غضب اور زیادہ بڑھکے گی۔

دوسری غلطی مضمون نگار نے یہ کی کہ گائے کے ذبح میں جو اقتصادی مصالح ہیں اس نے بکری میں ان کا دعوٰی کر دیا ہے حالانکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول لیکر بھی وہ

اقتصادی مصالح بکری سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ امام مالکؒ کے قولِ مذکور پر ایک بکری صرف ایک گھر کے آدمیوں کے لئے کافی ہوسکتی ہے۔ دو یا دو سے زیادہ گھروں کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بوجہ افلاس کے ایسے گھر بہت کم ہیں کہ جن میں ایک گھر کے سب آدمیوں پر قربانی واجب ہوتی ہو بلکہ عام طور پر ایک گھر میں ایک دو آدمیوں پر قربانی واجب ہوتی ہے اور زیادہ تر یہ ہے کہ گائے کے شرکاء مختلف گھروں کے آدمی ہوتے ہیں۔ ان سب کی طرف سے ایک بکری تو کافی ہوگی نہیں کیونکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ تو ہر شخص جدا جدا بکری ذبح کریگا تو اس صورت میں وہ اقتصادی مصلحت کہاں حاصل ہوئی جو گائے میں سات آدمیوں کے شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ والسلام

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

ذبح کرنے کے بعد جان نکلنے سے پہلے جانور کی چھاتی کھولنا مکروہ ہے

السؤال: قصائی لوگ گائے کو ذبح کرنے کے بعد فوراً، جان نکلنے سے پہلے اس کی گردن کی نرم نرم لٹکتی ہوئی کھال سینہ تک چاک کر دیتے ہیں پھر سینہ میں چھری مار کر اس کا خون نکال دیتے ہیں۔ اور قصائی اپنی اصطلاح میں اس کو چھاتی کھولنا کہتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ گائے اس طرح (حوالی قلب کا) خون نکلنے سے جلد ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔ صورۃً جان نکلنے سے پہلے کھال ادھیڑنا اور اس طرح سینہ میں چھری مارنا تاذی بلا ضرورت معلوم ہوتا ہے۔ آیا ذبح کرنے (یعنی نرخرہ ومری) کاٹنے کے بعد اس طرح کھال سینے تک کاٹنا اور دوبارہ چھری مار کر خون بہانا جانور کو جلدی ٹھنڈا کرنے کے عذر سے شرعاً جائز ہے یا تاذی بلا ضرورت کے تحت میں آتا ہے اور ممنوع ہے۔ رسالہ "ارشاد الہائم فی حقوق البہائم" میں صرف دو جگہ اس کا ذکر ہے جس کا اس سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ صـ۸ حدیث چہارم، تحت فائدہ.... رگوں کے کٹنے کے بعد کھال حلق کی کاٹنے لگے یا اور کسی طرح تکلیف پہنچائے.... صـ۱۰ حدیث دہم کے تحت فائدہ... قصابوں کا وہ فعل کہ محض کھال کی بہت قلیل مقدار بڑھانے کے لئے اوپر سے ذبح کر کے رگوں تک لاتے ہیں تو رگوں کے کٹنے

سے قبل جتنی دور سے کھال قطع کی ہے تاذی بلا ضرورت ہے لیکن ان عبارتوں سے مسئلہ میں تشفی نہیں ہوتی۔

الجواب

قال فی الدر المختار : کرہ کل تعذیب بلا فائدۃ مثل قطع الرأس والسلخ قبل ان تبرد ای تسکن عن اضطراب وھو تفسیر باللازم کما لا یخفی لانہ یلزم من برودتہا سکونہا بلا عکس (ج ۵-ص ۲۸۹)

وفی العالمگیریۃ والحاصل ان مافیہ زیادۃ الم لا یحتاج الیہ فی الزکاۃ مکروہ، کذا فی الکافی اھ (ج ۶-ص ۱۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ قصابوں کا یہ فعل مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس میں زیادہ الم ہے۔ جس کی ذبح میں ضرورت نہیں اور گو اس فعل کے بعد جان جلدی نکل جائے مگر خود اس فعل کی تکلیف اشد ہے لہٰذا اس سے احتراز لازم ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

ایسا شکار ذبح کرنے کا حکم جس کے گلے کا اکثر حصہ باقی نہ رہا ہو

السوال : ایک خرگوش پر بندوق چلائی اور اس کے منہ کا نیچے کا جبڑا جاتا رہا اور اوپر کا جبڑا سالم تھا بلکہ اس کی تمام ناک تک کی نشانیاں باقی رہیں لیکن دانت نہ رہے اور دانت کے بیچ میں سے گولی نکلنے سے گردن میں بھی صرف اگلے حصہ میں شہ رگ وغیرہ نہ رہی بلکہ کھال اور کچھ گوشت رہا اور پیچھے بھی اسی شکل میں گوشت اور کھال رہی۔ خرگوش کی کھال اور گوشت جو سامنے رہ گیا تھا ذبح کر دیا اور اس کا گوشت کھالیا گیا اس کے واسطے شرعاً کیا حکم ہے۔

الجواب

قال فی الدر المختار : و ذکاۃ الاختیار ذبح بین الحلق واللبۃ وعروقہ الحلقوم والمری والودجان وحل المذبوح بقطع ای ثلاث منہا اذ للاکثر حکم الکل وصح البزازی اذ اقطع کل حلقوم المری والاکثر من ودجین

یو کل والا فلا اھ (ج ۵ ۔ص ۲۸۸) اگر خرگوش کا گلا اور نرخرہ اور شہ رگوں کا زیادہ حصہ باقی نہیں رہا تھا تو یہ ذبح درست نہیں ہوا اور اس کا کھانا حرام ہوا۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۷؍ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ یوم الجمعۃ

کسی ایک شریک قربانی کا اپنے حصہ کی زیادہ قیمت دینے کا حکم

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سات آدمی شریک ہو کر سولہ روپے سے ایک گائے خرید کر کے قربانی کرتے ہیں اب عرض یہ ہے کہ ۲؍ ادا کر کے کل پندرہ روپے اور ساڑھے پندرہ آنے ہوتے ہیں اور دو پیسہ کی کمی رہتی ہے۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ وہ دو پیسہ میں اپنی خوشی سے زیادہ دیتا ہوں تم اطمینان رکھو۔ آیا اس صورت میں قربانی میں اس گائے مذکورہ کے کچھ حرج تو نہیں۔ بینوا توجروا

الجواب

اگر اس شخص کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنا حصہ دو پیسہ زائد میں خریدتا ہوں۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں سب شرکاء کا دین بخوشی اپنی طرف سے ادا کرتا ہوں تو جائز ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ اس شخص کا حصہ بقدر دو پیسہ کے قربانی میں دوسروں سے زیادہ ہوگا تو درست نہیں لکون الستۃ لا یملك سبعًا کاملاً احد منھم

مسجد یا رباط میں چرم قربانی کی قیمت صرف کرنے کا حکم

السوال: اگر وقف ہو تو اس میں چرم قربانی کی قیمت صرف کرنا جائز ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

الجواب

مسجد یا رباطِ موقوف میں چرم قربانی کی قیمت لگانے سے اس قیمت میں یا وقف میں

کوئی خبث لازم نہیں آتا بلکہ صرف یہ ہے کہ قربانی کرنے والے کے ذمہ چرم کی قیمت بمالہ واجب التصدق رہتی ہے۔ اس طریق سے واجب ادا نہیں ہوا۔ پس اگر کسی نے مسجد یا مسافر خانہ میں چرم قربانی کی قیمت دی ہو اور وہ ان کی عمارت میں لگ چکی ہو تو جو سامان اس سے خریدا گیا ہو سب مسجد و مسافر خانہ پر وقف ہوگیا اور اس کو مسجدِ منہدمہ اور مسافر خانہ میں لگانا درست نہیں۔ البتہ اگر وہ قیمتِ چرم ہنوز صرف نہ ہوئی ہو تو مسئلہ بتلا کر مالک سے دریافت کرلیا جاوے کہ وہ اب بھی مسجد میں یا مسافر خانہ میں یہ رقم دینا چاہتا ہے اور صدقہ واجبہ کو اس سے الگ ادا کرے گا یا واپس لینا چاہتا ہے اگر واپس لینا چاہے تو واپس کردی جائے

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۵ محرم الحرام ۱۳۴۵ھ

قربانی کے جانور کے کسی عضو میں زخم ہو کر کیڑے پڑجائیں تو اس جانور کو قربانی میں ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ جو گائے یا بچھڑا وغیرہ قربانی کے واسطے خریدا جائے اور اس کے کسی عضو میں زخم ہو کر کیڑے پڑجائیں مگر ویسے تندرست ہو تو وہ قربانی ہوسکتا ہے یا نہیں اور موضع کھاری قصبہ جہالو سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے اور ہم ہمیشہ جہالو جاکر قربانی کرتے ہیں مگر شام ہوجاتی ہے اور کھاری میں ہوتی نہیں، بہت ہندو لوگ رہتے ہیں اگر ہم لوگ صبح کے وقت جہالو جاکر قربانی کرلیا کریں تو درست ہے یا نہیں ؟ جواب عنایت فرماکر جلدی روانہ کریں۔

الجواب

اگر کیڑوں کی وجہ سے اس قدر دُبلی ہوجائے کہ اس کی ہڈی میں مغز نہ رہے جب تو اس کی قربانی جائز نہیں ورنہ جائز ہے قیاساً علی الجرباء وقال فیہ صاحب الدر المختار (والجرباء السمینۃ) فلو مہزولۃ لم یجز لان الجرباء فی اللحم نقص وقال الشامی قال فی الخانیۃ و تجوز بالثولاء والجرباء السمینتین فلو مہزولتین لا تنقی لا یجوز اذا ذہب مخ عظمہا فان کانت مہزولۃ

فيها بعض الشحم جاز يروی ذلك عن محمد اھ وقولہ لا تنقی ماخوذ من النقی بکسر النون واسکان القاف ھو المخ ای لا مخ لها وھذا یکون من شدة الھزال فتنبہ قال القهستانی : واعلم ان الکل لا یخلو عن عیب والمستحب ان یکون سلیمًا عن العیوب الظاھرة فما جوز ھھنا جوز مع الکراھة کما فی المضمرات ۔

البتہ اگر کوئی عیب مانع قربانی پیدا ہو گیا مثلاً پاؤں میں کیڑے ہو گئے اور وہ چل نہیں سکتی تو قربانی جائز نہ ہونا ظاہر ہے ۔

اگر گاؤں کا باشندہ قصبہ میں قربانی کرے تو اس کو بھی نماز کے قبل قربانی جائز نہیں ہے (والمعتبر مکان الاضحیة الخ) فلو کانت فی السواد والمضحی فی المصر جازت قبل الصلوٰة وفی العکس لم تجز ۔ قهستانی (شامی ج ۵ ۔ ص ۳۱۱) واللہ اعلم

عبدالکریم عفی عنہ

قبضہ کے بعد چرم قربانی کی قیمت مدرسہ کی تعمیر میں صرف کرنے کا حکم

السوال : رجال اعطوا قیم جلود اضحیتھم لمھتمم المدرسة لیملکھا بین المستحقین من طلبة العلم والمھتمم ملکھا رجلاً فقیرًا ثم استوھبھا منہ وصرفھا فی تعمیر المدرسة بغیر اذن من المعطین ولا رضائھم فھل یجوز للمھتمم ذلك الم لا و یسقط وجوب تصدق قیم الجلود عن المعطین ام لا ۔

الجواب

فی الشامی ج ۲ ۔ ص ۱۷ تحت قول الدر : وللوکیل ان یدفع لولدہ الفقیر وھذا حیث لم یأمرہ بالدفع الی معین اذ لو خالف ففیہ قولان حکاھما فی القنیة وذکر فی البحران القواعد تشھد للقول بانہ لا یضمن لقولھم لو نذر التصدق علی فلان لہ ان یتصدق علی غیرہ ۔ اھ

اقول وفیہ نظر لان تعیین الزمان والمکان والدرھم والفقیر غیر معتبر فی النذر لان الداخل تحتہ ما ھو قربة وھو اصل التصدق دون

التعيين فيبطل و تلزم القربة كما صرحوا به وهنا الوكيل انما يستفيد التصرف من الموكل وقد امره بالدفع الا فلان فلا يملك الدفع الى غيره كما لو اوصى لزيد بكذا ليس لوصيه الدفع الى غيره فتأمل انتهى عبارة الشامی وقلت هذا فی تعیین الشخص ففی تعیین النوع (ای الطلبة) لا یضمن فی قول البحر بالاولى فلا يضمن المهتمم وان كان ما فعله خلاف الاحتياط لكون قول البحر منظورًا فيه فالواجب ان يستفيد مثل هذه الاختيارات من المعطين ـ والله اعلم بالصواب .

کتبه الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۳ محرم ۱۳۴۴ھ

گابھن اور شیر دار گائے کی قربانی جائز ہے | السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ گابھن اور شیر دار گائے کی قربانی جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جائز ہے ۔ کما یعلم ضمنا معنی قول الدر : ولدت الاضحية ولدًا قبل الذبح يذبح الولد معها ۔ وقال الشامی تحت قوله قبل الذبح فان خرج من بطنها حيًّا فالعامة انه يفعل به ما يفعل بالام (ج ۵ ص ۳۱۵)

و فيه ايضًا ويكره الانتفاع بلبنها قبله ای قبل الذبح (ج ۵ ۔ ص ۳۲۱)

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۴ ر صفر ۱۳۴۴ھ

مذبوح فوق العقدہ حلال ہے یا حرام؟ | السؤال : مذبوح فوق العقدہ حلال ہے یا حرام یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی ۔

الجواب

اگر تین رگیں کٹ جاویں تو جائز ہے ورنہ حرام ہے ۔ کما فی الشامی (ج ۵ ص ۲۸۷)

بعد نقل الاختلاف اقول والتحریر للمقام ان یقال ان کان بالذبح فوق العقدۃ حصل قطع ثلاثۃ من العروق فالحق ما قالہ شراح الھدایۃ تبعًا للرستغفنی والا فالحق خلافہ اذ لم یوجد شرط الحل باتفاق اھل المذھب و یظھر ذلك بالمشاھدۃ اوسوال الخبرۃ فاغتنم ھذا المقال ودع عنك الجدال۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۸ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ

ختنہ کرنے سے اگر حشفہ کی کھال پوری نہ اترے تو دوبارہ ختنہ ضروری ہے یا نہیں

السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک لڑکے کا ختنہ کیا گیا لیکن پوری ساری تک چمڑا نہیں کاٹا گیا، نصف تک تخمیناً حشفہ ظاہر ہوتا ہے تو اس میں دوبارہ ختنہ کرانا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب

قال فی العالمگیریۃ : غلام ختن فلم تقطع الجلدۃ کلھا فان قطع اکثر من النصف یکون ختانا وان کان نصفًا او دونہ فلا۔ کذا فی خزانۃ المفتین اختتن الصبی ثم طال جلدتہ ان صار بحال یستر حشفتہ یقطع والا فلا۔ کذا فی المحیط (ج ۶ - ۲۳۷)

صورت مسئولہ میں یہ دیکھا جاوے کہ جتنی کھال ختنہ میں قطع کی جاتی ہے وہ نصف سے زائد قطع ہو چکی ہے یا نہیں اگر نصف سے زائد قطع ہو چکی ہے تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں لان الحشفۃ غیر مستورۃ بل الظاھرۃ کما فی السؤال۔ اور اگر نصف سے کم یا نصف کھال قطع ہوئی ہے تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت ہے بشرطیکہ بچہ کو زیادہ تکلیف ناقابلِ برداشت نہ ہو۔ اگر اس تھوڑی سی کھال کے کھینچنے اور دراز کرنے میں تکلیف زائد ہو جو ناقابلِ برداشت ہو تو بچہ کو ایسی تکلیف دینے کی ضرورت نہیں بلکہ معتبر دیندار حجاموں کو دکھایا جائے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ اس کی ختنہ دوبارہ دشوار ہے اور تکلیف سخت ہوگی تو اس کی دوبارہ ختنہ نہ کی جاوے۔

قال فی العالمگیریۃ : و فی صلاۃ النوازل الصبی اذا لم یختن ولا یمکن ان

یمد جلدتہ لیقطع الا بشدید وحشفتہ ظاھرۃ اذا راٰہ انسان یراہ کانہ اختتن ینظر الیہ الثقات واھل البصر من الحجامین فان قالوا ھو علی خلاف ما یمکن الاختتان فانہ لا یشدّد علیہ ویترك ۔ کذا فی الذخیرۃ (ج ٦ - ص ٢٣٧)

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۴ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

صبی مجنون کا ختنہ سنت ہے یا نہیں

السوال : ختان صبی مجنون سنت است یا نہ ، این مسئلہ واقع شدہ - اگر بجلدی جواب ارسال شود نہایت عنایت باشد ، باید کہ حوالہ کتاب وعبارت کتاب نوشتہ کنید کہ تسلی خاطر ما خوب تر گردد

رسول شاہ قریہ ڈھودہ ضلع کوہاٹ

الجواب

فی الھندیۃ : وللاب ان یختن ولدہ الصغیر ویحجمہ ویداویہ وکذا وصی الاب ولیس لولی الخال والعم ان یفعل ذلك الا ان یکون فی عیالہ فان مات فلا ضمان علیہ استحسانا وکذلك ان فعلت الام ذلك کذا فی السراج الوھاج (ج ٦ - ص ٣٧)

وذکر الاصولیون ان المجنون کالصبی فی احکامہ

باپ دادا اور ماں کو صغیر کی ختنہ کرنے کا حق ہے اور جنون عذر مسقطِ ختان نہیں ہے ۔ اگر ختنہ کرنا اور مختون کی حفاظت کرنا دشوار نہ ہو ۔ اور اگر جنون کی وجہ سے ختنہ کرنا ہی دشوار ہو یا اس کی حفاظت کرنا دشوار ہو تو اس عذر سے ختان ساقط ہو جائے گا اور جواب قواعد سے لکھا گیا ہے ، جزئیہ نہیں ملا ۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم ۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ ۔

از تھانہ بھون

قربانی میں ایک حصہ تمام امتِ محمدیہ کی طرف سے کرنے کا حکم اور شرکتِ اضحیہ کے چند احکام

السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک گائے خرید کی اور اس میں ایک اپنا حصہ، ایک لڑکے کا اور ایک اپنی زوجہ کا اور ایک حصہ اپنے والد مرحوم کا اور ایک والدہ مرحومہ کی طرف سے متعین کیا باقی ایک حصہ میں تمام امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شریک کیا مگر اس شرکت میں یہ نیت نہ کی کہ یہ حصہ لیکر اس امتِ مرحومہ کو ثواب پہنچانا ہے۔ محض شرکت کی نیت کی تو یہ قربانی درست ہوئی یا نہیں۔

نیز ایک شخص نے ایک گائے میں اپنا اور اپنے لڑکے کا جو کہ بالغ ہے اور علیحدہ ہے آدھا، آدھا حصہ متعین کرکے ذبح کی اور گوشت باپ بیٹے نے ثلث فقراء کو تقسیم کردیا قبل اس کے کہ وہ اپنا اپنا حصہ لیکر بانٹیں اور رشتہ داروں کو بھی تقسیم کردیا اور باقی ایک جگہ کھالیا۔

و نیز ایک گائے میں تین، چار یا پانچ یا چھ آدمی برابر حصہ متعین کریں تو یہ قربانی درست ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا

رحیم بخش، بانڈہ بادلی، ضلع مراد آباد
مدرسہ عربیہ اسلامیہ
۲۷ رذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

الجواب

قال فی البدائع : و اما قدره فلا یجوز الشاة والمعز الا عن واحد وان کانت عظیمة سمینة تساوی شاتین، فان قیل ألیس انه صلی اللہ علیه وسلم ضحی بکبشین املحین احدهما عن نفسه والآخر عمن لا یذبح من امته فکیف ضحی بشاة واحدة عن امته علیه الصلاة والسلام فالجواب انه علیه السلام فعل ذلك لأجل الثواب وهو انه جعل ثواب تضحیته بشاة واحدة لامته لا للاجزاء[سه] وسقوط التعبیر عنهم ولا یجوز بعیر واحد ولا البقرة عن اکثر من السبعة ویجوز ذلك عن السبعة او

سه قلت وسبع البقرة لا الشاة کما لا یخفی ۱۲ منه

ذلک وھذا قول عامۃ العلماء الخ (ج ۵۔ ص ۷۰)

وفی الدر المختار تجب شاۃ او سبع بدنۃ وللواحد ھم اقل من السبع لم یجز عن احد وتجزئ عما دون السبعۃ بالاولی اھ

قال الشامی تحت ھذا: اطلقہ فشمل ما اذا اتفقت الانصباء قدرًا اولا لکن بعد ان لا ینقص عن السبع اھ (ج ۵۔ ص ۳۰۸)

صورتِ مسئولہ میں جس شخص نے ایک حصہ بقرہ میں سب امتِ محمدیہ کو شریک کیا ہے اگر اس کی نیت محض ثواب پہنچانے کی نہ تھی بلکہ سب کو اس حصہ میں شریک کرنا اور سب کی طرف سے قربانی کرنا تبرعًا مقصود تھا تو یہ قربانی صحیح نہیں ہوتی کیونکہ بعض شرکاء کے لئے ساتویں حصہ سے کم ہوا پس قربانی صحیح نہ ہوئی نہ اس حصہ میں اور نہ باقی حصوں میں بلکہ اس کے ذمہ باقی رہا۔

اور دوسری صورت میں باپ، بیٹے دونوں کی طرف سے قربانی صحیح ہوگی۔

اور تیسری صورت میں بھی قربانی درست ہے۔ جبکہ سب کے حصے برابر ہوں۔ یا متفاوت ہوں مگر کسی حصے کا ساتویں حصہ سے حصہ کم نہ ہو۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امداد

۹ محرم ۱۳۴۶ھ

چرم اضحیہ کی قیمت میں تملیکِ فقر ضروری ہے یا نہیں؟

السؤال: ما قولکم ایھا العلماء رحمکم اللہ تعالیٰ اندریں مسئلہ کہ: زید میگوید کہ تصدق چرم جانورانِ قربانی گرچہ واجب نیست اما بعد فروختنش بروپیہ مثل آن بحکم شرع شریف چون تصدق قیمتش برو ے واجب گشت پس بہمہ وجوہ حکم آن حکم صدقۂ واجبہ گردد و ہمچون صدقاتِ واجبۂ دیگر مشروط بشرط تملیک باشد بناءً علیہ در کفن میت وساختن راہ و مساجد و مدارس و مجالسِ وعظ وغیرہ صرفِ آن جائز نباشد۔ اما عمرو می گوید کہ آن چرم قبل فروختنش واجب التصدق نبود اما بعد فروخت حکم وجوب التصدق بآن عارض گشت بناء برآن بہمہ وجوہ حکم آن حکم صدقۂ واجبہ نگردد۔ لہٰذا باعتبار اصل در امور مسطورہ صرف کردنش ہم جائز باشد۔

الجواب

قولِ زید صحیح است لان معنی التملیک ماخوذ فی مفہوم الصدقۃ قال فی الدر: والصدقۃ کالھبۃ بجامع التبرع وحینئذ لاتصح غیر مقبوضۃ ولا فی مشاع یقسم ولا رجوع فیھا اھ (ج-۴ ص-۷۹۶)

فحیث امر الفقھاء بالصدقۃ المطلقۃ یعنون بھا تملیک الفقیر۔

مخفی نیست کہ حکم جلدِ اضحیہ ومنافع اضحیہ در وجوبِ تصدق مساوی است ودر منافع اضحیہ تصریح بتصدق علی الفقیر وارد شدہ است۔

قال الشامی: والحاصل ان التی لایوکل منھا ھی المنذورۃ ابتداءً والتی وجب التصدق بھا بعد ایام النحر والتی ضحی بھا عن المیت بامرہ علی المختار والواجبۃ علی الفقیر بالشراء علی احد القولین والذی ولدتہ الاضحیۃ کما قدمناہ عن الخانیۃ، والمشترکۃ بین سبعۃ نوی بعضھم القضاء عن الماضی کما قدمنا آنفاً۔ فھذہ کلھا سبیلھا التصدق علی الفقیر فاغتنم ھذا التحریر (ج ۴-ص ۳۳)

قلت والذی ولدتہ الاضحیۃ من المنافع الزائدۃ کالجلد، فلما وجب تصدقہ علی الفقیر فکذا ثمن الجلد - واللہ اعلم -

وایضاً قیمۃ الجلد لھا شبھۃ بقیمۃ الاضحیۃ التی لم تذبح فی ایام النحر وسبیل الثانیۃ التصدق علی الفقیر فکذا الاولی - وقال فی البحر فی باب الزکوٰۃ تحت قول الکنز لا الی ذمی وبناء مسجد وتکفین میت وقضاء دینہ واصلہ وان علا وفرعہ وان سفل مانصہ وفیہ اشارۃ الی ھذا الحکم لایخص الزکوٰۃ بل یعم کل صدقۃ واجبۃ فلا یجوز دفعھا لھم کالکفارات وصدقۃ الفطر والنذور الی ان قال: وقید بالصدقۃ الواجبۃ لان صدقۃ التطوع الاولی دفعھا الی الاصول والفروع۔ کذا فی البدائع (ج ۲- ص ۲۴۴)

ملخصاً وازین عبارتِ فقہاء صدقۂ واجبہ عام است ہر صدقۂ واجبہ را کہ واجب

از اصل باشد یا نہ پس تخصیص حکم تملیک با حدھما دون الآخر بلا دلیل است و مخفی نیست کہ صدقۂ دراھم جلد اضحیہ در حکم صدقہ جلد اضحیہ ہرگز نیست زیرا کہ جلد اضحیہ مثل لحم اضحیہ است انتفاع بنفسہ ازان جائز است و دراھم جلد اضحیہ غیر جائز الانتفاع درحق بائع است پس دراھم جلد اضحیہ مثل دراھم لحم اضحیہ است در وجوب تصدق بالتملیک۔

وقال فی غنیۃ الناسک فی باب الھدایا: والھدایا یسقط وجوبھا بالذبح فان کان مما یجوز لہ اکلہ لایجب علیہ التصدق بشئ منہ لو استھلکہ بنفسہ بعد الذبح بان اتلفہ او ضیّعہ او وھبہ لغنی او نحو ذلک لا یضمن شیئا وان کان مما لایجوز لہ اکلہ یجب علیہ التصدق بکلہ بالتملیک او الاباحۃ ولو بالتخلیۃ حتی لو استھلکہ بنفسہ بعد الذبح یضمن قیمتہ للفقراء ولو ھلک او استھلکہ غیرہ لاضمان علیہ فی النوعین لانہ لا صنع لہ فیہ ولو باع اللحم جاز بیعہ فی النوعین (المراد بالجواز الصحۃ لا الحل کما صرح بہ بعد) الا انہ فیما لایجوز لہ اکلہ یتصدق بثمنہ لانہ ثمن مبیع واجب التصدق۔ کذا فی الجزار اجرہ منہ فعلیہ ان یتصدق بقیمتہ ای بقیمتہ ان کان اکثر وبالثمن ان کان اکثر علی ما فی البدائع۔ وھذا یرجح قولھم والھدایا کالضحایا فان الاضحیۃ لایجب التصدق بشئ منھا مع انہ لو استھلکھا بان باع لحمھا او جلدھا بمستھلک او بالدراھم او اعطی الجزار اجرہ منھا او اتلفھا او ضیعھا یجب التصدق بالثمن فی صورۃ البیع وبالقیمۃ فی غیرھا فلذا ھذا۔

(ص ۱۹۲)

قلت وقد صرح بمعنی التصدق فی الاولیٰ فھو المراد بہ فی الثانیۃ۔ لعدم القرینۃ علی الفرق۔

وفیہ ایضًا ولا یبیعہ ای الجلد بالدراھم لینتفع بہ او ینفقھا علی نفسہ او عیالہ فان باعہ لذلک او باعہ بما یستھلک تصدق بثمنہ وصح بیعہ مع الکراھۃ عند ابی حنیفۃ ومحمد وعن ابی یوسف باطل

لانہ کالوقف وکذا لو عمل منہ جرابا وآجرہ لم یجز وعلیہ التصدق بالاجرۃ وله ان یبیعه بالدراهم لیتصدق بها الی ان قال فلو باعه بالدراهم لیتصدق بها جاز لانه قربة (ص۱۹۳)

قلت فیه دلالة علی ان تصدق ثمن الجلد لیس کالصدقة النافلة من غیرهم فثبت ان حکمه حکم الصدقة الواجبة الا ان الزکوٰة والفطرة لا یکفی فیهما الاباحة وتکفی فی غیرهما۔

قال فی غنیة الناسك فی باب الهدایا ولو اطعم لغیر اصوله و فروعه من الاقارب جاز وان کان نفقته واجبة علیه اذا لم یحسبها من النفقة اذ لا فرق بین الزکوٰة وبین بقیة الهدایا بل بین کل صدقة واجبة کالفطر والنذور والکفارات فی المصارف واموال الصرف الا ان الزکوٰة لا یجوز صرفها الی الذمی بالاتفاق بخلاف غیرها فانه یجوز صرفها الی الذمی عند ابی حنیفة ومحمد لکن المفتی به قول الثانی وهو انه لا یصح دفع الواجبات الیه فی المختار والا ان الزکوٰة والفطرة یشترط فی صرفهما التملیك وفی ماسواهما یکفی الاباحة۔ ایضاً ملخصاً (ص۱۹۲)

قلت: وفی تکفین المیت وبناء المسجد لا توجد الاباحة ایضاً فلا یجوز صرف ثمن جلد الاضحیة الیهما کما لا یجوز صرف الکفارات الیهما فافهم۔ والله اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۸؍ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۶ھ

مکہ میں یوم النحر ہندوستان سے ایک دن پہلے ہوا تو ہندوستان میں بارہ تاریخ کی قربانیاں صحیح ہوئیں یا کہ نہیں؟

السؤال: اس سال مکہ میں حج جمعرات کو ہوا ہے جس کے حساب سے یہ جمعہ کو دس ذی الحجہ واقع ہوتی ہے اور ہندوستان میں دس ذی الحجہ شنبہ کو ہوئی ہے اور مکہ کی خبر متواتر ذرائع سے ثابت ہو چکی ہے تو جن لوگوں نے ہندوستان کے حساب سے بارہ تاریخ تک یعنی دوشنبہ تک قربانیاں کی ہیں ان کی قربانیاں درست ہوئیں یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

قال فی الدر : کما لو شهدوا انه یوم العید عند الامام فصلّوا ثم ضحوا ثم بان انه یوم عرفة اجزاهم الصلوٰة والتضحیة لانه لایمکن التحرز عن مثل هٰذا الخطأ فیحکم بالجواز صیانة لجمیع المسلمین زیلعی اھ (ج ۵ ـ ص ۳۱۲)

وفی ردالمختار : (ج ۲ ـ ص ۱۵) تحت قول الدر المختار لا لو شهدوا برؤیة غیرهم (ای غیر الشاهدین عند القاضی) لانه حکایة. نعم لو استفاض الخبر فی البلدة الأخری لزمهم علی الصحیح من المذهب اھ مانصّه قوله لانه حکایة فانهم لم یشهدوا بالرؤیة ولا علی شهادة غیرهم انما حکوا رؤیة غیرهم کذا فی الفتح ـ

قلتُ وقضی لو شهدوا برؤیة غیرهم وان قاضی تلك المصر امر الناس بصوم رمضان لانه حکایة بفعل القاضی أیضًا ولیس بحجة بخلاف قضائه الخ

وفیه قوله نعم الخ قلت : وجه الاستدراك ان هٰذه الاستفاضة لیس فیها شهادة علی قضاء قاض ولا علی شهادة لکن لما کانت بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا یوم کذا لزم العمل بها لان البلدة لاتخلوا عن حاکم شرعی عادة فلا بدّ ان یکون صومهم مبنیًا علی حکم حاکمهم الشرعی فکانت تلك الاستفاضة بمعنی نقل الحکم المذکور وهی اقوی من الشهادة بان اهل تلك البلدة رأوا الهلال وصاموا لانها لاتفید الیقین فلذا لم تقبل الا اذا کانت علی الحکم او علی شهادة غیرهم اھ

وفیه ایضًا : واذا ثبت دخول رمضان ضمنًا وجب صومه کما سنذکره فیما لو تمّ عدد رمضان ولم یر هلال الفطر للعلة یحل الفطر وان ثبت رمضان بشهادة واحد لثبوت الفطر تبعًا وان کان لایثبت

قصدًا الا بالعدد والعدالۃ اھ (ج ۲ - ص ۱۵۰)

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

ع۱ اگر خبر مستفیض سے معلوم ہو جائے کہ مکہ میں حج ہندوستان کی نویں تاریخ سے ایک دن پہلے ہوا ہے اور خبر مستفیض ایام تشریق کے بعد پہنچی تو ہندوستان میں جن لوگوں نے یہاں کے حساب سے بارہ تاریخ تک قربانیاں کی ہیں ان کی قربانیاں درست ہوگئیں بحکم جزئیہ اولیٰ۔

ع۲ جب خبر مستفیض سے حج کا ہندوستان کی نویں ذی الحجہ سے ایک دن پہلے ہونا ثابت ہو جائے تو ہندوستان میں بھی تاریخ کو بدل دیا جاوے گا اور مکہ کے حساب سے تیس دن پورے ہو جانے کے بعد یکم محرم قرار دی جائے گی۔ گو یہاں انتیس تاریخ علت کی وجہ سے چاند نظر نہ آوے ملاحظہ ہو جزئیہ ثانیہ وثالثہ جس میں تصریح ہے کہ خبر مستفیض میں شہادت علی الحکم اور شہادت علی رؤیۃ اور شہادت علی الشہادۃ شرط نہیں

نیز یہ بھی تصریح ہے کہ ثبوتِ رمضان سے تبعًا ثبوتِ فطر بھی ہو جاتا ہے فکذا ھٰذا۔ فان بقی الشهور فی حکم الفطر والاضحی۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ہندوستان میں خبر مستفیض سے یکم رمضان کا مکہ مکرمہ میں ہندوستان سے ایک دن پہلے ہونا ثابت ہو جائے تو اگر وسطِ رمضان میں خبرِ مستفیض موصول ہو جائے تو رمضان کی تاریخ بدل دی جاوے گی۔ اور بعد میں ایک روزہ قضاء کرنا ہوگا۔ اور خبرِ مستفیض کے موافق تیس ۳۰ دن پورے کر کے فطر لازم ہوگا۔ اور بعد رمضان کے خبر موصول ہو تو صرف ایک روزہ کی قضاء لازم ہوگی۔ اور تاریخ شوال بھی بدل دی جاوے گی۔ ولا یأثمون بصومهم یوم الفطر علی ھٰذا الخبر۔ واللہ اعلم۔

لا یقال یلزم منه فی بعض الصور زیادۃ عدد الصوم علی ثلثین لانا نقول انها زیادۃ فی الظاهر وفی الحقیقۃ صومهم الاول لم یکن لرمضان بل کان من شعبان ونظیرہ ما فی رد المختار: لو صام رائی هلال رمضان واکمل العدۃ لم یفطر الا مع الامام لقوله علیه السلام فطرکم یوم تفطرون رواہ الترمذی وغیرہ والناس لم یفطروا فی

مثل هذا اليوم فوجب ان لا يفطر بهذا (ج ٢ - ص ١٤٤)
فقد لزم هذا الرأى زيادة الصوم على ثلثين
قال الشامى : يفهم من كلامهم فى كتاب الحج ان اختلاف المطالع فيه معتبر فلا يلزمهم شئ لو ظهر انه اوى فى بلدة أخرى قبلهم بيوم وهل يقال كذلك فى حق الاضحية لغير الحجاج لم أره والظاهر نعم لان اختلاف المطالع انما لم يعتبر فى الصوم لتعلقه بمطلق الرؤية وهذا بخلاف الأضحية فالظاهر انه كاوقات الصلوٰة يلزم كل قوم العمل بما عندهم فتجزئ الاضحية فى اليوم الثالث وان كان على رؤيا غيرهم وهو الرابع . والله اعلم (ص ١٠٤ ج ٢)
قلت ومقتضاه ان يعتبر اختلاف المطالع فى بقية الشهور غير رمضان كلها فان العلة اى تعلق الصوم والفطر منتفية فى فى بقية الشهور وعلى هذا فلا يثبت هلال المحرّم بالخبر المستفيض من مكة - والله اعلم .
قلت : ولكن ما فهمه العلامة من كتاب الحج غير ظاهر فان الذى ذكره هناك هو عدم قبول الشهادة لو شهدوا بعد الوقوف بوقوفهم بعد وقته للحرج الشديد والوقوف صحيح حتى فى حق الشهود أيضاً ولو شهدوا بان الوقوف كان قبل وقته قبلت ان امكن التدارك والالا اھ وحاصله ما قاله الشيخ انه اذا لزم من الشهادة فساد عبادة وقعت لاتقبل وان لزم منها وجوب تدارك ما امكن تداركه قبلت فليس مبنى ماذكروه فى الحج على اختلاف المطالع بل على الحرج كما صرحوا به -
قال الشيخ : وعلة عدم اعتبار اختلاف المطالع فى الصوم استلزامه الاحتياج الى الحساب وقول الموقتين وهو باطل لقوله عليه الصلاة والسلام نحن امّة امّية فهذه علّة مشتركة

فی رمضان و بقیۃ الشهور . و اما ما ذکروه فی علۃ عدم اعتبارہ فی الصوم من تعلقه بمطلق الرؤیة فلا یصح لکون اطلاقهما ممنوعًا واللّٰه أعلم

حرّرہ الاحقر ظفر احمد عفا اللّٰه عنہ

۱۶ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ

قربانی کی کھال ذبح کی اجرت میں دیدی تو اس کی واپسی ضروری ہے یا شرکار کو اطلاع دینا کافی ہے کہ وہ اس قدر تصدق کریں

السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ ہمارے یہاں بعض گاؤں میں دستور ہے کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے کے واسطے کسی ایک شخص کو مقرر کرتے ہیں اور وہی شخص سب جانوروں کو ذبح کرتا ہے اور جانوروں کی کھال دوسرے کے ہاتھ بیچ کر اس کی قیمت میں سے ہر ایک کے حساب سے ایک ایک روپیہ متعین کرکے ذبح کرنے والے کو دیتے۔ مثلاً پانچ روپیہ کے حساب سے کھال بیچی، چار روپیہ فقیروں کو خیرات کرتے ہیں اور ایک روپیہ ذبح کرنے والے کو دیتے ہیں اور یہ ایک روپیہ خیرات میں شمار جانتے ہیں۔ مگر ذبح کرنے والا خود کسی سے یہ نہیں کہتا ہے کہ ہم کو جب کھال ایک روپیہ دو گے تو ذبح کروں گا ورنہ نہیں یہاں تک کہ کسی نے اتفاق سے کچھ نہ دیا تو اصرار بھی نہیں کرتے تو آیا اس صورت میں وہ روپیہ جو ذبح کرنے والے کو دیتے ہیں وہ خیرات میں شمار ہو جائے گا یا اجرت ہو جائے گی۔ اگر اجرت ہوگی تو آیا واپس لینا پڑے گی یا اجرت دینے والوں کو صرف اطلاع دینا کافی ہے کہ وہ اس اجرت کے بقدر تصدق کریں فقط بیّنوا توجروا۔

عرض گذار :

فدوی عبدالوہاب ڈھاکوی عفی عنہ

الجواب

قال فی الدر المختار : فان بیع اللحم او الجلد به ای بمستهلك او بدراهم تصدق به و مفاده صحة البیع مع الکراهة وهو قول ابی حنیفة ومحمد بدائع لقیام الملك والقدرة علی التسلیم ، هدایه . والکراهة

للحدیث الآتی ١٢ شامی

قلت : وھو ما ذکرہ بعد من قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام من باع جلد اضحیتہ فلا اضحیۃ لہ ۔ ھدایہ ۔ وعن الثانی باطل لانہ کالوقف ۔ مجتبی ۔ (ج ٥ ۔ ص ٣٢١)

قلت و مفاد صحۃ البیع مع علۃ الکراھۃ التی ذکروھا حل المشتری للمشتری وکذا حل الاجر للآجر لوجود ارکان البیع باسرھا مع شرائط الصحۃ ولا یجب علیہ ردہ و انما الکراھۃ فی جانب البائع وھی کراھۃ الفعل تصرفہ بالتمول فیما جعلہ قربۃ ۔ و اما ما ذکرہ فی ردّ المحتار عن القھستانی عن الزاھدی فی باب الزکوٰۃ ولا یسترد منہ لو ظھر انہ عبد او حربی ۔ وفی الھاشمی روایتان : ولا یسترد فی الولد والغنی ۔ و ھل یطیب لہ فیہ خلاف واذا لم یطب لہ قیل یتصدق وقیل یرد علی المعطی اھ (ج ٢ ۔ ص ١٠٩)

فلا یفید وجوب الرد علی المشتری فیما نحن فیہ لقولہ لا یسترد من الولد والغنی والعبد والحربی و انما الخلاف فی الھاشمی فقط ۔ وھذا یفید اختصاص علۃ الاسترداد بہ فقط دون غیرہ نعم ! قولہ فی الولد والغنی ھل یطیب لہ فیہ خلاف الخ یوھم عدم الطیب فیما نحن فیہ ولکن عدم الطیب فی الولد والغنی لیس بمتفق علیہ ولم یذکروا ترجیح احد الطرفین علی الآخر وایضاً فان الولد والغنی فی باب الزکوٰۃ یأخذان مالا یستحقانھا والمشتری فی ھٰذہ الصورۃ التی نحن فیھا یأخذ اللحم والجلد عوضاً عن ثمنہ وکذا الاجیر عوضاً عن عملہ فلا وجہ فی ایجاب الرد او التصدق علیھما وانما یجب التصدق علی صاحب الاضحیۃ فقط علی قدر ما بذل لہ فی الآجر کما صرّحوا بانہ اذا باع اللحم او الجلد بدراھم تصدق بھا ولم یقل احد بوجوب التصدق علی المشتری وکذا الاجیر ۔

واللہ اعلم

صورتِ مسئولہ میں جو روپیہ ہر حصہ والے کی طرف سے ذابح کو دیا جاتا ہے

وہ اجرت ہے خیرات نہیں ہے جو اس ذابح کے لئے تو قول طرفین پر جو مفتی بہ ہے حلال ہے البتہ قربانی کرنے والوں کے لئے یہ فعل مکروہ تھا کہ قربانی کی جلد کی قیمت سے اجرتِ ذابح ادا کی۔ ان کو لازم ہے کہ بقدر اس اجرت کے کسی فقیر پر تصدق کر دیں۔ پس ذابح کو اس رقم کا ادا کرنا واجب نہیں جو اس نے ذبح کی اجرت میں لی ہے۔ البتہ گاؤں والوں کو اس مسئلہ میں مطلع کرنا ضروری ہے کہ ان کا اجرتِ ذابح کو صدقہ سمجھنا غلط ہے۔ اس لیے وہ بقدرِ اس اجرت کے دوبارہ تصدق کریں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۷ر صفر ۱۳۴۶ھ

اماطة الستور عن حكم إطارة الطيور

کیا شکار پر قبضۂ یدی ملک کے لئے کافی ہے یا نیتِ تملک بھی شرط ہے؟

السوال: صید پر قبضۂ یدی ملک کے لئے کافی ہے یا نیتِ تملک بھی شرط ہے؟

جواب

قال السرخسی رحمہ اللہ فی شرح السیر الکبیر: ان فی کل موضع یختص المصیب بالمصاب علی وجه لا یشارکه فیه غیره فتلك الاصابة فی معنی الاصطیاد فکما ان الملك فی الصید یثبت بنفس الاصابة للواحد کان او للجماعة فکذلك الملك یثبت للسریة بمثل هذه الاصابة و فی موضع لا یختص المصیب بالمصاب ولکن یشارکه فیه اصحابه فتلك الاصابة فی معنی اصابة الغنیمة ومجرد الاخذ فی الغنیمة لا یوجب الملك قبل القسمة فکذلك ما یکون معناه اھ (ج ا - ص ٤٦)

اس سے معلوم ہوا کہ صید میں اصابتِ ید تملک کے لئے کافی ہے کما یدل علیه قوله یثبت بنفس الاصابة۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳ر جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ

گائے کا عقیقہ جائز ہے یا نہیں

السوال: گائے کا عقیقہ جائز ہے یا نہیں لڑکے اور لڑکی کا فرق ہوگا یا نہیں؟

جواب

گائے کا عقیقہ جائز ہے۔ گائے کے سات حصوں میں سے ایک حصہ بکری کے برابر ہے پس لڑکی کے واسطے ایک حصہ کافی ہے اور لڑکے کے لئے دو حصے دیئے جائیں فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۷ رشعبان ۱۳۴۶ھ

کیا وقت اضحیہ گزر جانے کے بعد آئندہ سال قربانی کرنے سے سال گزشتہ کی قربانی ادا ہوگی؟

السؤال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کسی شخص کی قربانی میں خرابی آگئی تو اگلے سال میں قربانی میں وہ شخص پچھلے سال کی قربانی کا حصہ لے سکتا ہے۔ تو اس کی قربانی واجب ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب

بعد وقتِ اضحیہ گزر جانے کے تصدّق قیمت واجب ہوتا ہے ہر آئندہ سال قربانی میں حصہ لینے یا مستقل جانور کی قربانی کرنے سے گزشتہ سال کی قربانی ادا نہ ہوگی بلکہ اس کی ادا کی صورت صرف تصدّق قیمتِ شاۃ ہے۔

صرح بہ فی الدر وغیرہ۔ قال فی الدر: وان کان شریک الستۃ نصرانیا او مریدا اللحم لم یجز عن واحد منھم اھ

قال الشامی: قد علم ان الشرط قصد القربۃ من الکل وکل ما لو کان احدھم مریدا للاضحیۃ عن عامہ واصحابہ عن الماضی تجوز الاضحیۃ عنہ ونیۃ اصحابہ باطلۃ وصاروا متطوّعین وعلیھم التصدق بلحمھا وعلی الواحد ایضاً لان نصیبہ شائع کما فی الخانیۃ وظاھرہ

عدم جواز الاکل منہا۔ (ج ۵ - ص ۳۱۹) واللہ تعالےٰ اعلم۔
وفیہ تصریح بان نیۃ الاُضحیۃ عن العام الماضی لیس بقربۃ۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۸ رشوال ۱۳۴۶ھ

کیا حرم میں اضحیہ کا بھی اور عبادتوں کی طرح ثواب مضاعف ہے ؟

السؤال : لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح حرم میں اور عبادات کا ثواب مضاعف ہے اسی طرح اضحیہ کا بھی۔ حالانکہ ان کے اس کلیے سے زکوٰۃ ہی مستثنیٰ ہے جس کا منتقل کرنا مکروہ ہے اور پھر قربانی بھی اراقۂ دم کے بعد انفاق مال ہی ہے اس لئے یہ بھی زکوٰۃ کے مشابہ ہے اور بقاعدہ زکوٰۃ اس کا منتقل کرنا بھی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز منیٰ میں سوائے اراقۂ دم کے انفاقِ مالی کا حصول عادۃً ناممکن ہے اس لئے اس میں بلا ضرورت اضاعتِ مال و اتلاف حق مساکین بھی ہے اور بظاہر غیر محتاج کے لئے قربانی منیٰ یا قربانی حرم کی کوئی فضیلت کی روایت نہیں ہے۔ مگر بعض لوگ خود یہاں موجود ہوتے ہیں اور قربانی نیابۃً یا وکالۃً وہاں کراتے ہیں یا میت کی طرف سے کرتے ہیں۔

الجواب

قال الشامی : فی بحث مضاعفۃ الصلوٰۃ بمکۃ ثم ذکر ان للعلماء خلافاً فی ھٰذا الفضل ھل یعم الفرض والنفل او یختص بالفرض وھو مقتضی مشھور مذھبنا ای المالکیۃ ومذھب الحنفیۃ۔ والتعمیم مذھب الشافعیۃ وجاءت احادیث تدل علی ان تفضیل ثواب الصوم وغیرہ من القربات بمکۃ الا انہا لیست فی الثبوت کاحادیث الصلوٰۃ فیھا اھ

وذکر البیری فی شرح الاشباہ فی احکام المسجد ان المشھور عند اصحابنا ان التضعیف یعم جمیع مکۃ بل جمیع حرم مکۃ الذی یحرم صیدہ کما صححہ النووی اھ (ج ۱- ص ۳۰۵)

قلت ومدار التصحیح فیه علی النقل فالظاهر ان الآثار قد صحت فی کون المراد به حرم مکۃ کله واما کراهۃ النقل فمرتفعۃ بما قاله فقهاءنا کما فی الدر و کره نقلها ای الزکوٰۃ (وفی حکمها القربات المالیۃ کلها) الا الی قرابۃ او احوج او اصلح او اورع او انفع للمسلمین او من دار الحرب الی دار الاسلام او الی طالب علم وفی المعراج التصدق علی العالم الفقیر افضل او الی الزهاد اوکانت معجلۃ قبل تمام الحول فلا یکره خلاصه اھ

قال الشامی: لان الفقراء المسلمین الذین فی دار الاسلام افضل من فقراء دار الحرب - بحر. قلت ینبغی استثناء اساری المسلمین اذا کان فی دفعها اعانۃ علی فک رقابهم من الاسر - تامل اھ (ج ۲- ص ۱۱)

پس قربانی کا منتقل کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ وہ دار الاسلام ہے، دوسرے اس لئے کہ ان صور جزئیہ میں نقل کی اجازت کا مدار زیادتِ ثواب ہی پر ہے اور مکہ میں تضاعفِ ثواب ظاہر ہے اس لئے نقل الی مکہ مکروہ نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون۔ سفر ال ۱۳۴۶ھ

قربانی کی کھال فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں

السوال: معروض جناب مستطاب یہ ہے۔ بہشتی زیور تیسرا حصہ ص۴۵ میں جناب نے تحریر فرمایا:

مسئلہ: قربانی کی کھال یا تو یونہی خیرات کردے اور یا بیچ کر اس کی قیمت خیرات کردے، وہ قیمت ایسے لوگوں کو دے جن کو زکوٰۃ کا پیسہ دینا درست ہے الخ
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی کی کھال بیچنا بلا کراہت جائز ہے مگر اس کی قیمت کا تصرف اپنے لئے جائز نہیں جس نے قربانی کیا۔ خیرات کرنا چاہئے وبس۔

نور الاسلام نامی ایک کتاب ہے اس میں ذیل کی عبارت کو اس کے مصنف نے درج کرکے ایک فتوی شائع کیا ہے جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس نے اپنی قربانی کا چمڑا بیچا تو اس کی قربانی نہ ہوئی۔

قوله ویتصدق بجلدها او یعمل منها نحو غربال وجراب وقربة وسفرة ودلو او یبدله بما ینتفع به باقیاً کما مرّ لا بمستهلك كخل ولحم ونحوه كدراهم فان بيع اللحم او جلده به ای بمستهلك او بدراهم تصدق بثمنه ومفاده صحة البيع مع الكراهة - وعن الثانی باطل لانه کالوقف مجتبیٰ - ولا یعطی اجر الجزار منها لانه كبيع واستفيد من قوله عليه الصلوٰة والسلام من باع جلد اضحيته فلا اضحية له (هدایه) وفی جامع الرموز ایضاً انه قول الطرفين واما على قول ابی یوسف فالبيع باطل لانه كالوقف۔

ملاذ من دی زمن یہ مسئلہ لیکر یہاں جھگڑا ہے حضور سے فیصلہ مطلوب ہے۔ والسلام

خاکسار سمت اللہ

ساکن اتن کیری ڈاکخانہ کاپر پور ضلع سلہٹ

الجواب

قال فی غنیة الناسك فی باب الهدايا وله ان يبيعه بالدراهم ليتصدق بها والصحيح ان اللحم بمنزلة الجلد حتی جاز بيعه بما ينتفع بعينه لا بما يستهلك ولو باعه بالدراهم ليتصدق بها جاز لانه قربة كالتصدق اهـ

وفيه ايضاً قبله باسطر : ولا يشتری به ما لا ينتفع به الا بعد استهلاكه نحو اللحم والطعام ولا يبيعه بالدراهم لينتفع بها او ينفقها على نفسه او عياله فان باعه بالدراهم لذلك او باعه بما يستهلك تصدق بثمنه وصح بيعه مع الكراهة عند ابی حنيفة ومحمد رحمهما الله وعن ابی یوسف باطل اهـ

(ص ۱۹۳)

اس عبارت میں تصریح ہے کہ جلد اضحیہ ولحم اضحیہ کی بیع مکروہ یا باطل ہے جبکہ اس کی قیمت سے خود انتفاع کا قصد ہو اور اگر بیع سے تصدق قیمت کا قصد ہو تو مکروہ نہیں پس جو عبارت مشتہر مذکور نے شائع کی ہے وہ مجمل ہے اس لئے احتجاج درست نہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۹ / ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ

حکم ذبیحۂ اہل کتاب | السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین درین مسئلہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگریز کا ذبیحہ حلال ہے کیونکہ وہ نصاریٰ ہیں اور نصرانی کتابی ہے اور کتابی کا ذبیحہ حلال ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ حرام ہے کیونکہ اگرچہ نصرانی ہیں لیکن از حدِ کفر زیادہ تجاوز کناں ہیں۔ جناب والا کیا فرماتے ہیں

احقر فدوی عبدالقادر، جماعت اول مدرسہ اسلامیہ
نواکھالی ڈاکخانہ سونا پور ۲۰ محرم ۱۳۴۷ھ

الجواب

انگریز آجکل اکثر دہریہ ہیں اس لئے ہر انگریز کا ذبیحہ حلال نہیں ہے بلکہ جس کا معتقدِ انجیل ومعتقد عیسیٰ علیہ السلام ومعتقدِ آخرت ہونا ثابت ہو جائے اور یہ کہ وہ مذہب کو محض سیاسۃً نہیں مانتا بلکہ مذہب کو ذریعۂ نجاتِ آخرت سمجھتا ہے اس کا ذبیحہ حلال ہے اور ایسے انگریز بہت کم ہیں۔ فقط

حررہٗ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۸ محرم ۱۳۴۷ھ

خنثیٰ جانور کی قربانی جائز نہیں ہے | السؤال : خنثیٰ کی قربانی جائز ہے یا نہیں زید کہتا ہے کہ اگر مذکر یا مؤنث کی علامت غالب ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ کیا یہ صحیح ہے ؟

بندہ سید عبدالرحیم غفرلہٗ

الجواب

زید کا قول صحیح ہے کہ خنثیٰ کی قربانی جائز نہیں ہے۔ ولا بالخنثیٰ لان لحمها لاتنضج شرح وھبانیۃ۔

قال الشامی : و بھذا التعلیل اندفع ما اوردہ ابن وھبان من انها لاتخلو إمّا ان تکون ذکرًا او انثیٰ وعلی کل تجوز اھ (ج ۵۔ ص ۳۱۷)

اور اگر علامتِ ذکر یا انثیٰ غالب ہو تو جائز ہے کیونکہ وہ خنثیٰ نہیں

ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۶/ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ

ثمن جلدِ اضحیہ کا بعینہٖ تصدق واجب ہے یا دوسری رقم بھی اس کے بدلہ میں دی جا سکتی ہے

السؤال : اگر کوئی شخص چرم جانور قربانی یا چرم جانور عقیقہ کو بارادۂ تصدق بیع کر دے اور ثمن کو اپنے پاس رکھے کہ کسی موقع پر تصدق کر دوں گا پھر اس کو موقعۂ تصدق دستیاب ہو گیا لیکن اس وقت ثمن بعینہٖ اس کے پاس موجود نہیں بلکہ مکان پر ہے جو بوجہ سفر ہونے کے بعید ہے تو کیا یہ شخص بجائے اس ثمن کے دوسری رقم کو تصدق کر سکتا ہے یا بعینہٖ اسی ثمن کا تصدق واجب ہے کہ بدون اس کے بری عن وجوب التصدق نہ ہوگا۔

السائل :

الحاج نظام الدین کانپوری

الجواب

قال فی غنیۃ الناسك فی بیع لحوم الهدایا وجلودها ما نصّه: ولو باع اللحم جاز بیعه لأن ملكه قائم الا انه فیما لا یجوز اكله یتصدق بثمنه لانه ثمن بیع واجب التصدق كذا فی الفتح عن البدائع وان كان مما یجوز له الاكل منه فان باع شیئا او أعطی الجزار اجره منه فعلیه ان یتصدق بقیمته اھ ای بقیمته ان كان اكثر وبالثمن ان كان اكثر علی ما فی البدائع اھ (ص ۱۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تصدق ثمن اس صورت میں واجب ہے جبکہ بیع جائز الاکل نہ ہو اور جائز الاکل میں تصدقِ قیمت واجب ہے نہ تصدقِ ثمن۔ پس یہ واجب فی الذمہ ہوا واجب فی العین نہ ہوا لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بجائے ثمن کے دوسری رقم کو تصدق کر سکتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ثمن اگر قیمت سے کم ہو تو قیمت کاملہ تصدق کی جائے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

کسرِ عظام در عقیقہ اور دایہ کوران دینے کا حکم

السؤال: بہشتی زیور میں عقیقہ کے باب میں جو نیچے حاشیہ ہے اس میں لکھا ہے کہ ہڈیاں اگر نہ توڑی جائیں تو بہتر ہے اور پھر کچھ تقسیم سری پائے اور ادھڑی کا ذکر ہے۔ یہ حاشیہ اس وقت پہلے بہشتی زیور میں موجود نہیں تھا۔ جبکہ میں نے اس کے مسائل کی تخریج کی تھی، اس لئے اس کا ماٰخذ مجھے نہیں ملتا۔ شامی میں اس کی افضلیت کا کچھ ذکر نہیں بلکہ توڑنے نہ توڑنے کو برابر لکھا ہے۔ اور تقسیمِ اعضاء یا عقیقہ کا بھی وہاں کچھ ذکر نہیں ہے براہ کرم اس کے حوالہ سے مطلع فرماویں۔

الجواب

یہ حاشیہ میرا لکھا ہوا نہیں ہے، غالبًا احمد حسن سنبھلی کا ہے اور اس میں جن امور کا ذکر ہے اُن کو علامہ شامی نے تنقیح فتاوٰی حامدیہ میں ذکر کیا ہے۔ صرف اس جزو کا حوالہ نہیں ملا کہ سری حجّام (بال مونڈنے والے) کو دلوائیں اھ

ونصه وحكمها كاحكام الاضحية الا انه يسن طبخها و بحلو تفاؤلاً بحلاوة اخلاق المولود وحمل لحمها مطبوخًا للفقراء ولا بأس بندبهم اليها وتعطى القابلة رجلها لامره عليه الصلوٰة والسلام فاطمة رضي الله عنها باعطائها اياها واليمنى اولى ولا يكسر عظمها وان كسر لا يكره اھ

وفيه ايضًا قبله والمستحب ان يفصل لحمها ولا يكسر عظمها تفاؤلاً بسلامة اعضاء الولد ويأكل ويطعم ويتصدق ويعطي القابلة فخذها ويطبخ جميعها ثم يتصدق بها اھ ملخصًا ص ۲۱۲ و ص ۲۱۳ ج ۲

واعطاء الرجل القابلة ذكره الحافظ في التلخيص الكبير فقال وروى الحاكم من حديث علي قال امر رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة فقال زني شعر الحسين وتصدقي بوزنه فضة واعطي القابلة رجل العقيقة۔ رواه حفص بن غياث عن جعفر بن محمد عن ابيه مرسلاً اھ (ج ۲ - ص ۳۸۸)

واحاديث الحاكم صحاح الا ما تعقب منها وهٰذا لم يتعقبه الحافظ بشيء فليعلم واما ترك كسر العظام واعطاء الجزار من العقيقة شيئًا فقد ينفيه

كلام ابن رشد وهذا نصّه وحكم العقيقة حكم الضحايا لانه نسك فلا يباع جلدها ولا لحمها (روى ان بيع فيتصدق بثمنه) ولا يعطى الجزار على جزارته بشئ من لحمها ويتقى فيها من العيوب ما يتقى فى الضحايا ويوكل منها ويتصدق وتكسر عظامها ولا يمس الصبى بشئ من دمها لان ترك كسر عظامها و ان يلطخ الصبى بشئ من دمها من افعال الجاهلية اھ من المقدمات المطبوعة مع المدونة لمالك (ج ۲ ص ۱۹) واللہ تعالیٰ اعلم

حرّرہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۴ / جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ

اگر چودہ آدمی دو گایوں میں بلا تعیین کے شریک ہوں تو ان کی قربانی درست ہوگی یا نہیں۔

السؤال: اگر چودہ آدمی دو گایوں میں شریک ہو کر قربانی کریں کہ ہر ایک کا حصہ کسی خاص گائے میں متعین نہ کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ گائے سات شخصوں کی ہے اور دوسری گائے دوسرے سات شخصوں کی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ دونوں گائیں مشترک طور پر چودہ شخصوں کی طرف سے ہیں تو اس طرح قربانی درست ہوگی یا نہیں۔ امر حضرۃ الشیخ دام مجدہ وعلاہ بتحقیقہ۔

الجواب

یہ صورت قیاساً تو جائز نہیں ہے۔ ہاں استحساناً جائز ہے۔ ولو اشترك سبعة فى سبع شياهٍ لا يجزيهم قياساً لان كل شاة بينهم على سبعة اسهم وفى الاستحسان يجزيهم وكذا اثنان فى شاتين اھ (ج ۵ - ص ۳۰۸) واللہ تعالیٰ اعلم

حرّرہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ / ذی الحجۃ سنہ ۱۳۴۷ھ

قربانی ترک ہونے کی صورت میں بکری کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے یا گائے کے ساتویں حصہ کی قیمت دینا؟

السؤال: مندرجہ ذیل مسئلہ میں شریعت مقدسہ کا جو حکم ہو اس کو تحریر فرمایا جاوے۔ کہ ایک شخص صاحب نصاب ہے اور ایک سال میں اس سے کسی وجہ سے قربانی ترک ہوگئی تو اس صورت میں اس کو بکری کی قیمت خیرات کرنی چاہئے یا

گائے کے ساتویں حصہ کی قیمت خیرات کرے۔ السائل :
سید احمد خان

الجواب

متوسط درجہ کی بکری کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے۔ گائے کے ساتویں حصہ کی قیمت صدقہ کرنا کافی نہیں۔

قال فی الدر : و تصدق بقیمتها غنی شراها اولا لتعلقها بذمته شراها اولا فالمراد بالقیمة قیمة شاة تجزی فیها اھ

قال الشامی : فبیّن ان المراد (بقیمتها) اذا لم یشترها قیمة شاة تجزئ فی الاضحیة کما فی الخلاصة وغیرها۔

و قال القهستانی : او قیمة شاة وسط۔ کما فی الزاهدی و النظم وغیرهما اھ
(ج ۵ ۔ ص ۳۱۴)

قلت و قیود الفقه احترازیة فالتقیید بقیمة الشاة یقید بعدم اجزاء قیمة سبع البقرة ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۸ / ذی الحجة سنہ ۱۳۴۷ھ

ذبح فوق العقدہ میں موضع ذبح کے چار چیزوں میں سے تین کٹ جائیں تو ذبیحہ حلال ہے ورنہ حرام

السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں
۱ زید نے چند گائے ذبح کیں جن میں سے بعض گایوں کو حلق کے اوپر جبڑوں کے نیچے سے بسبب نادانستگی ذبح کیا اور ان ذبیحوں کا نرخرہ نہیں کٹا۔ اس موقع پر ایک اہل علم نے آکر معائنہ کیا اور کہا کہ ذبیحہ حرام ہے بلکہ اس کا استعمال مثل خنزیر کے ہے۔ باوجود اس کے بعض لوگوں نے اس کا ذبیحہ کھایا اور بعض نے کفار کے حوالہ کر دیا۔ اب عرض یہ ہے کہ ذبیحہ مذکورہ حلال ہے یا نہیں قربانی ادا ہوگی یا نہیں ؟
۲ کتبِ فقہ کی اکثر عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام اعظم کے نزدیک اکثر رگوں کا کٹ

جانا کفایت کرتا ہے اور مؤطا امام محمد اردو کے مضمون سے بھی یوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں۔

ع۳ اگر مذکورہ بالا ذبیحہ حلال ہے تو اسے حرام قرار دینے والے اہل علم پر کوئی الزام تو نہیں۔

ع۴ اگر مذکورہ بالا ذبیحہ حرام ہے تو ذبح کرنے والے پر کیا الزام عائد ہوگا۔ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔

المستفتی

حاجی احمد داد بھائی۔ سواتی بازار

الجواب

موضع ذبح چار چیزیں ہیں: حلقوم، مرئ، ودجین۔ پس اگر ذبح فوق العقدہ میں سے ان چار میں سے تین کٹ جائیں تو ذبیحہ حلال ہے ورنہ حرام۔ (شامی ج ۵ ص۲۸۶)

ع۲ ہاں صحیح ہے۔ پس چار میں سے تین قطع ہوجائیں تو ذبیحہ حلال ہے

ع۳ ان پر کوئی الزام نہیں کیونکہ مسئلہ مختلف فیہا ہے۔

ع۴ ذبح کرنے والے پر الزام اس وقت ہے جبکہ بلا اذنِ مالک کے ذبح کیا ہو۔ اور اگر اذن سے ذبح کیا ہے تو ذابح پر ضمان نہیں۔ ہاں اس کو اس بات کا گناہ ہے کہ جس کام کو وہ جانتا نہ تھا اس پر پیش قدمی کیوں کی۔ پس صورتِ مسئولہ میں اگر تین رگوں سے کم کٹی ہوں تو یہ لوگ جن کی قربانی تھی ہر ایک شخص ایک متوسط بکری کی قیمت صدقہ کردے اور اگر تین رگیں کٹ گئی تھیں تو ذبیحہ حلال ہے اور قربانی درست ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ

غیر مسلم کی بندوق سے شکار کئے ہوئے جانور کو اگر مسلمان ذبح کردے تو وہ حلال ہے یا نہیں؟

السؤال: ایک غیر مسلم نے ہرن کو بندوق کی گولی سے شکار کیا۔ ہرن گولی کھا کر جاں بلب ہوا یعنی بقدر رمق باقی رہا بعدہ ایک مسلم نے بالتسمیہ ذبح کیا تو

وہ ہرن حلال ہے یا حرام۔

الجواب

بندوق کے شکار میں بندوق چلانے والے کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان یا اہل کتاب کا ذبح شرط ہے۔ پس صورتِ مسئولہ میں جب مسلمان نے اس کو ذبح کیا تو حلال ہے کیونکہ بندوق کا شکار بدون ذبح حلال نہیں ہوتا اور تیر اندازی میں مسلم یا کتابی کی شرط اس بناء پر ہے کہ خود تیر کا لگ جانا ہی قائم مقام ذبح کے ہے۔

قال قاضیخان: لایحل صید البندوقة وما اشبه ذلك وان جرح لانه لایخرق الا أن یکون بشئ من ذلك قد حدده وطوله کاسهم وامکن ان یرمی به الخ شامی ج ۵ - ص ۴۶۷

وفی الشامی بعد بیان شرائط حل الصید من کون الصائد اهلاً للذکاة وغیره ومجموع هذه الشروط لمایحل اکله ولم یدرکه حیاً اه ص ۴۵۷

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا اللہ عنہ — کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

۲۷ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ — از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

بدون اذن واطلاع کے شوہر نے بیوی کی طرف سے قربانی کی تو بیوی اور سب سرکار کی قربانی ہوگی یا نہیں

السؤال: احقر نے امسال عید الضحیٰ میں قربانی میں شرکت کی اور تین حصہ ایک گائے میں لئے اور باقی اور لوگوں نے لیے۔ احقر پر تو قربانی واجب نہ تھی میری شادی حال ہی میں ہوئی اور بیوی اکثر آئی اور اپنے میکہ میں گئی۔ چنانچہ عید الضحیٰ میں وہ اپنے مکان یعنی میکہ ہی میں تھی۔ احقر نے اپنے خسر کو ایک ماہ قبل اطلاع دی تھی کہ میری بیوی کی طرف سے آپ قربانی کر دیں کیونکہ اُسی پر واجب ہے۔ اگر وہاں آئے گی تو آپ ہی کو قربانی کرنی ہوگی مگر کسی وجہ سے انہیں یہ خط ملا نہیں۔ اب جبکہ قربانی کا وقت آیا تو احقر نے بدوں اطلاع بیوی خود اس کی طرف سے بھی ایک حصہ لیکر کر دیا اور ایک اپنے والد مرحوم و مغفور کی طرف سے کر دیا۔ اب حال ہی میں دعواتِ عبدیت حصہ ششم کو پڑھ رہا تھا تو اس کے صـ۱۶ مسئلہ ۲ میں لکھا ہوا تھا دیکھا کہ اکثر لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے

عزیزہ کی طرف سے قربانی کرتے ہیں اور اس کو اطلاع نہیں ہوتی اس صورت میں قربانی ادا نہیں ہوتی اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے گی کہ جس سے ایک قربانی صحیح نہ ہو تو باقی کی قربانی بھی صحیح نہ ہوگی۔

۱: کیا احقر کی قربانی، صورتِ مذکورہ میں ادا ہوتی ہے یا نہ

۲: اگر ادا نہیں ہوئی تو پھر زندوں کی طرف سے اب بھی واجب رہی یا مُردوں کی طرف سے بھی واجب ہے۔ اور اسی طرح میرے اوپر بھی واجب رہی یا نہیں۔ کیونکہ پہلے مجھ پر واجب نہ تھی بلکہ مستحب تھی۔ مگر نفل شروع کرنے کے بعد واجب ہو جاتا ہے۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح بیوی پر بھی واجب تھی۔ کیونکہ وہ میکہ میں تھی اس لئے مجھ پر ان کی طرف سے واجب نہ تھی مگر میں نے اُن کا حصہ بھی لے لیا اور انہیں اطلاع نہیں کی جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔

۳: اگر سب پر واجب ہے تو کُل یعنی چار اور حصہ داروں کو تاوان احقر پر ہی ہے یا ان لوگوں پر واجب رہی کیونکہ قربانی میں جو فساد لازم آیا ہے وہ صرف میری ہی وجہ سے ہے۔

۴: اس کے ادا کی صرف یہی صورت ہے کہ قیمت کل کی کل جتنی کی وہ گائے ہے احقر صدقہ کر دے یا اور کوئی صورت بھی ہے۔

۵: بیوی کی طرف سے میکہ میں جیسا کہ میں نے ھدایت کی تھی بوجہ خط نہ ملنے کے قربانی نہیں کی گئی تو کیا حکم ہے۔ المستفتی

محمد احمد کتب خانہ احیاء الدین

محلہ شاہ گنج الہ آباد

الجواب

قال فی الخانیۃ: ولیس علی الرجل ان یضحی عن اولادہ الکبار وامرأتہ إلا باذنھم وعن ابی یوسف انہ یجوز بغیر امرھم استحسانًا اھ (ج ۴، ص ۳۲۹)

وفی العالمگیریۃ: ولو ضحی بدنۃ عن نفسہ وعرسہ وأولادہ لیس ھذا فی ظاھر الروایۃ۔ وقال الحسن بن زیاد فی قول أبی حنیفۃ وأبی

یوسف وان فعل بغیر امرھم او بغیر امر بعضھم لا تجوز عنه ولا عنھم فی قولھم جمیعا لان نصیب من لم یامر صار لحما فصار الکل لحماً الی ان قال: بعد ذکر صورة مثله قال ابو القاسم تجوز عن نفسه کذا فی قاضیخان (ج ٦، ص ٢٠٢)

صورت مسئولہ میں قیاس کا مقتضاء تو وہی ہے جو دعوات عبدیت میں مذکور ہے کہ سب شرکاء کی قربانی باطل ہو جاوے اور اس صورت میں ہر شخص کے ذمہ بشرطیکہ غنی ہو ایک متوسط بکری کی قیمت خیرات کرنا واجب ہے اور جو غنی نہ ہو اس کے ذمہ تصدق واجب نہیں نہ اپنے حصے کا اور نہ میت کے حصے کا۔ لکون الاضحیة متعینة فی المذبوحة فاذا ضلت او بطلت فلا ضمان علیه لعدم الوجوب فی ذمته۔

اور جس شخص کی غلطی سے یہ فساد لازم آیا ہے اس کے ذمہ دوسرے شرکاء کے حصہ کا ضمان و تاوان بھی واجب نہیں (لعدم ضمانھا علی المتسبب الا فی مسائل ولیس ذلك منھا ۱۲) مگر استحسان یہ ہے کہ اولاد اور بیوی کی طرف سے بدون اجازت و اطلاع کے بھی قربانی درست ہے (ولعل وجه الاستحسان ثبوت الاذن دلالة فی مثل ذلك) اس روایت کے موافق یہ قربانی سب کی طرف سے صحیح ہوگی (وقد ذکروا فی رسم المفتی اذا کان فی المسئلة قیاس واستحسان یرجح الاستحسان ویوخذ به) پس صورت مسئولہ میں سائل کی اور اس کی بیوی کی اور سب شرکاء کی قربانی درست ہوگی۔ کسی کے ذمہ اس کی قضاء واجب نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۹ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ

کیا گابھن گائے وغیرہ کی قربانی جائز ہے

السوال: - ازروئے مہربانی جواب مسائل عنایت فرمائیں۔ یہ کہ ایک گائے مادہ دو روز یا ایک روز کی حمل ہوتی ہے اسے جان بوجھکر قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں بینوا توجروا

الجواب

گابھن گائے وغیرہ کی قربانی درست ہے مگر بہتر یہ ہے کہ جو گابھن نہ ہو اس کی قربانی کی جائے یعنی جبکہ گابھن ہونا ظاہر ہو جائے۔ ایک دو روز کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور اگر ایسی گابھن ہو کہ جس کے بچہ پیدا ہونے کا وقت قریب آگیا ہو تو اس کی قربانی کرنا مکروہ ہے۔

کما فی غنیۃ الناسک: ویجوز فیہا الجماء الیٰ ان قال والحامل مع الکراھۃ اذا کان مشرفۃ علی الولادۃ الخ ص۲۱۲۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۵ر جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ

کیا پورے دنوں کی گابھن گائے وغیرہ کی قربانی جائز ہے

السوال :- ایک گائے چند اشخاص نے قربانی کے واسطے خریدی بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گابھن تقریباً پورے دنوں کی ہے۔ اب اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں اور اگر اس کو بیچ کر دوسری خرید لیں تو کیا حکم ہے۔ نیز اگر اس کا بیچنا جائز ہے تو حصہ داروں میں سے کوئی شخص بقیہ حصہ داروں سے اُسے خرید لے تو کیا حکم ہے۔ فقط۔

الجواب

فی العالمگیریۃ: رجل اشتریٰ شاۃ للاضحیۃ واوجبہا بلسانہ ثم اشتریٰ اخریٰ جاز لہ بیع الاولیٰ فی قول ابی حنیفۃ ومحمد وان کانت الثانیۃ شریٰ من الاولیٰ وذبح الثانیۃ فانہ یتصدق بفضل ما بین القیمتین۔ (ج ۶، ص ۱۹۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اُسی گائے کو بیچ کر دوسری گائے خریدنا جائز ہے لیکن دوسری گائے اس کی قیمت سے کم میں آئے تو باقی دام مساکین کو دینا لازم ہے۔ اور گابھن کی بھی قربانی کر دی جائے تو قربانی درست ہو جاوے گی۔ مگر گابھن کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ قربانی میں بھی اور ویسے بھی۔

کما فی العالمگیریۃ ایضاً: شاۃ او بقرۃ اشرفت علی الولادۃ قالوا یکرہ ذبحہا الخ (ج ۶، ص ۱۹۲)

اور جب فروخت کرنا جائز ہے تو حصہ داروں میں سے کوئی شخص بھی لے سکتا ہے۔

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ۔ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔ مورخہ: ۲ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

چرمِ قربانی اور گوشت اجرت میں دینا | السوال :۔ چہ میفرمایند علمبرداران شریعت بیضائے مصطفوی ونکتہ دانان اندریں مسئلہ کہ خورانیدنِ گوشتِ قربانی ولحوم اضاحی مر مزدوران ونوکران را شرعاً چہ حکم دارد جائز یا ناجائز وبر تقدیر ثانی اگر خورانند چہ کنند دریں دیار خورانیدن گوشت قربانی مر مزدوران را بلا نکیر میان خواص وعوام جاری است با آنکہ طعام وآنقدر نان خورش کہ بداں طعام خوردہ شود در اجرت مزدوران داخل است کہ اگر طعام خورانند اجرت کم دہند واگر نہ خورانند بیشتر دہند بینوا توجروا

الجواب

باید دانست کہ چیزے از جانور قربانی گوشت باشد یا جلد کسے را بطور اجرت ہیچ عمل دادن شرعاً جائز نیست۔

فی الدر المختار: ولا یعطی اجر الجزار لانہ کبیع۔ وفی الھدایۃ: ولا یعطی اجر الجزار من الاضحیۃ لقولہ علیہ السلام لعلی رضی اللہ عنہ تصدق بجلالھا وخطامھا ولا تعط الجزار منھا شیئاً۔ والنھی عنہ نھی عن البیع أیضاً لانہ فی معنی البیع فی الحاشیۃ: قولہ لانہ فی معنی البیع لان کل واحد منھما معاوضۃ لانہ انما یعطی الجزار بمقابلۃ جزارہ والبیع مکروہ فکذا ما ھو بمعناہ۔ اھ

ازیں عبارت بخوبی روشن گردید کہ گوشت اضحیۃ را باجرت ہیچ عمل دادن جائز نیست ہمچون فروختنِ آن۔ وچوں طعام مزدوران وقدر کافی از نان خورش باجرت اوشان محسوب است کما مر فی السوال پس اگر گوشت قربانی مزدوران را بخورانند لامحالہ قدر کافی از نانخورش کہ باجرت داخل ومحسوب بود بگوشت قربانی ادا کردہ شد پس آن قدر گوشت کہ بمقابلہ قدر کافی نانخورش افتاد صریح باجرت مزدور دادن شد کہ منھی عنہ است پس ناجائز باشد ومن ادعی الجواز فعلیہ البیان بالبرھان واگر مزدور را لحم اضحیہ بخوراند قیمتِ آن مقدار گوشت کہ مقابلہ قدر کافی نانخورش افتاد تصدق کند۔

فی الھدایۃ: ولو باع الجلد او اللحم بالدراھم او بما لا ینتفع بہ

الا بعد استهلاکہ تصدق بثمنہ لان القربۃ انتقلت الی بدلہ انتہی۔

یا این چنین کند کہ بقدرِ قیمت آن قدر گوشت فلوس در اجرتِ مزدور زیادہ دھد تا این فلوس با جرت محسوب شود و آن گوشت از اجرت خارج گشتہ در حق او محض ہدیہ ماند فقط۔ واللہ اعلم۔

المجیب

احقر الوریٰ بندہ فیض اللہ عفی عنہ

مدرس مدرسہ معین الاسلام چاٹگام

جواب از خانقاہ

بے شک اگر کھانا اجرت میں مشروط ہے تو گوشت قربانی اُن مزدوروں کو اجرت میں محسوب کرکے دینا جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر کھانے میں اور کوئی سالن بھی دیدیں اور تبرعاً دیگر مسلمانوں کی طرح یہ گوشت بھی ان کو دیدیں تو مضائقہ نہیں۔ وھذا کلہ مقتضی القواعد ولم نرہ صریحًا واللہ اعلم بالصواب۔

احقر عبد الکریم عفی عنہ

از تھانہ بھون۔ مورخہ ۲ محرم ۱۳۵۲ھ

السوال:۔ جس گائے کے دانت بالکل نہ ہوں کہ خلقۃً پیدا ہی نہیں ہوئے اس کی قربانی جائز ہے یا	اس جانور کی قربانی جائز نہیں جس کے دانت پیدا ہی نہ ہوئے ہوں۔

نہیں۔ از سائل

حکیم عبد الرحمٰن کاندھلوی از شامل

الجواب

جائز نہیں۔ قال فی الدر المختار: ولا بالھتماء التی لا أسنان لھا ویکفی بقاء الاکثر وقیل قدر ما یعتلف بہ اھ (ج ۵ عہ) واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۴ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ

عہ ص ۳۲۴ ج ۶ ایچ ایم سعید کمپنی

اختلاف جہات در اضحیہ و عقیقہ | **السوال:۔** کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ مسک الختام شرح بلوغ المرام میں لکھا ہے کہ امام احمدؒ نے بتاکید بیان کیا ہے کہ عقیقہ میں شتر و گائے کامل شرط ہے۔ اور امام رافعی نے ذکر کیا ہے کہ مثل قربانی کے سات شخص کی شرکت عقیقہ میں بھی جائز ہے۔ اور فتح الباری میں ہے:

ونص احمد علی اشتراط کاملة و ذکر الرافعی بحثا انها تتادی بالسبع کما فی الاضحیة اور نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ: ونص احمد علی انها تشترط بدنة أو بقرة کاملة و ذکر الرافعی انه یجوز اشتراك سبعة کما فی الاضحیة اھ۔

ان عبارتوں میں فیصلہ اور محاکمہ فرمائیے اور کتب معتبرہ سے مع ادلہ و براہین۔ نیز حضرت مولانا تھانوی صاحب کے دستخط سے مزین فرماکر مطمئن کیجئے۔ ایک گائے یا اونٹ میں کچھ آدمی بنیت قربانی اور کچھ بنیت عقیقہ شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہوسکتے ہیں تو فقہ میں کون سی صورت ہے کہ جس میں تعدد نیت سے قربانی جائز نہیں۔

المستفتی: معین الدین چاٹگامی

الجواب

امام احمدؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر قربانی میں اونٹ یا گائے ذبح کی جائے تو اس کا حصہ کافی نہیں۔ بلکہ کامل جانور عقیقہ ہی کی طرف سے ہو کیونکہ اختلاف جہات جب مانع اضحیہ ہے اسی طرح مانع عقیقہ ہے اور بکرا بکری کر دیا جائے تو چونکہ وہ ایک حصہ سے زیادہ کا متحمل نہیں اس سے عقیقہ بلاتردد درست ہے اور اس بات میں حنفیہ کی دو روایتیں ہیں۔

ایک یہ کہ صحت اضحیہ کیلئے شرط یہ ہے کہ سب شرکا نے قربت کا قصد کیا ہو۔ کسی نے محض گوشت کھانے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ نیز کوئی شریک ایسا نہ ہو جو نیت قربت کا اہل نہیں ہے مثلاً کافر و مرتد اور اتحادِ جہات شرط نہیں۔ پس اگر ایک شریک نے قربانی کا حصہ لیا دوسرے نے عقیقہ کیلئے تو قربانی صحیح ہے۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ اتحادِ جہت مستحب ہے اور شرکت با ختلافِ جہت

مکروہ ہے۔ اس روایت کی بناء پر بھی اضحیہ اور عقیقہ کی شرکت کے ساتھ گائے اونٹ کی قربانی درست ہے مگر مکروہ ہے۔

قال فی رد المحتار: قد علم ان الشرط قصد القربۃ من الکل وشمل مالو کانت القربۃ واجبۃ علی الکل او البعض اتفقت اجہا تہا اولا کاضحیۃ واحصار وجزاء صید وحلق ومتعۃ وقرآن لان المقصود من الکل القربۃ خلافا للزفر۔ وکذا لو اراد بعضہم العقیقۃ عن ولد ولد لہ من قبل لان ذلک جہۃ التقرب بالشکر علی نعمۃ الولد ذکرہ محمد ولو یذکر الولیمۃ وینبغی ان تجوز لانہا تقام شکراً للہ تعالیٰ علی نعمۃ النکاح ووردت بہا السنۃ فاذا قصدا بہا الشکر او اقامۃ السنۃ فقد اراد القربۃ وروی عن أبی حنیفۃ أنہ کرہ الاشتراک عند اختلاف الجہۃ وانہ قال لو کان من نوع واحد کان أحب إلیّ وھکذا قال ابو یوسف بدائع (ج ۵، ص ۳۱۹)

قلت وظاہر کلام الشامی ترجیح الروایۃ الاولیٰ۔ واللہ اعلم

حررہ الأحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۲۹ ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ

ایضاً اختلاف جہات در اضحیہ وعقیقہ | السوال :- غنیۃ الناسک ص۱۹۹ فی جواز الاشتراک فی الھدی میں ہے وبشرط ارادۃ الکل القربۃ وان اختلفت اجناسہا من دم متعۃ وحصار وجزاء صید وغیر ذلک کتطوع وعقیقۃ لمن ولد ولدلہ من قبل وولیمۃ العرس وغیر ذلک مما یقصد بہ القربۃ إلی اللہ تعالیٰ الخ

یہاں یہ شبہ ہے کہ ولیمہ عرس میں ذبح مقصود نہیں بلکہ طعام مقصود ہے بخلاف اضحیہ تطوع وعقیقہ کے وہاں اراقۃ دم مقصود ہے پس ولیمہ کو ہدی اور اضحیہ میں شامل کرنا درست نہ ہونا چاہیئے۔

الجواب

فی الشامیۃ : عن البدائع وکذا لو اراد بعضھم العقیقۃ عن الولد ولد لہ من قبل لأن ذلک جھۃ التقرب بالشکر علی نعمۃ الولد ذکرہ محمّد ولم یذکر الولیمۃ۔ وینبغی أن تجوز لانہا تقام شکرًا للہ تعالیٰ علی نعمۃ النکاح وقد وردت بہا السنۃ فاذا قصد بہا الشکر او اقامۃ السنۃ فقد اراد القربۃ اھ (ج ۵، ص۳۱۹)

اور گو ولیمہ بدون اراقۃ دم کے ادا ہو جاتا ہے مگر حدیث أولم ولو بشاۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اراقۃ دم ولیمہ میں بھی مسنون ہے پس جو درجہ عقیقہ کا ہے وہی ولیمہ کا ہے۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون، ۹ شعبان ۱۳۵۶ھ

مسئلہ ذبح | السوال: نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم : حکیم الأمّت مجدد ملت جامع شریعت وطریقت حضرت مولانا سلمہ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

یہاں پر ایک قسم کے جانور ذبح ہونے کا مسئلہ درپیش ہے چونکہ وہ صورت صراحتًا بحر الرائق و درمختار وغیرہ فتاویٰ میں نہیں ملی، لہٰذا اہل علم کا اس میں اختلاف ہے بعض حلال کہتے ہیں اور بعض حرام۔ فریق اول کی دلیل یہ عبارت ہے۔

وعند أبی یوسف اذا کان بحال لا یعیش مثلہ لا یحل لانہ لم یکن موتہ بالذبح، وقال محمد ان کان مثلہ یعیش فوق ما یعیش المذبوح یحل الافلا لانہ

معتبر بھذہ الحیاۃ علی ما قررناہ الخ ھدایہ کتاب الصید۔

فریق ثانی کی دلیل یہ ہے کہ حضور نے بیان القرآن پارہ چھ کے تحت آیت وَالموقوذۃ و المتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الا ما ذکیتم الآیۃ۔ میں صورت متنازعہ فیہ کو موقوذہ میں داخل فرما کر بعد از ذبح جانور مندرجہ حلال فرمایا ہے، کیا حضور نے بیان القرآن میں یوں ہی تحریر فرمایا ہے کیونکہ یہ صورت اکثر واقع ہوتی رہتی ہے اس لئے اس مسئلہ کی سخت ضرورت ہے۔ فریقین نے حضور کے فتوی کو بلا چوں وچرا تسلیم کرنے کا حتمی وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا مہربانی فرما کر جواب سے سرفراز فرمایا جاوے۔ فریقین میں سے کسی نے یہ عبارت بھی پیش کی ہے جو بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ والاصل فی جنس ھذہ المسائل ان الموت اذا حصل بالجرح یتعین الحل وان حصل بالثقل اوشک فیہ فلا یحل حتما او احتیاطاً، البحر الرائق ج ۸، ص ۲۲۹

صورت مسئلہ بلا کم وکاست مندرج ہے جواب اگر بمعہ حوالہ عبارت ہو تو سبحان اللہ ورنہ جیسا مناسب ہو۔

میرے گاؤں کے قریب ایک سرکاری جگہ ہے۔ مونا ڈپو نام اس میں گھوڑے بیل خچر ہیں۔ جب کوئی گھوڑا بیل عمر کی خاص میعاد تک پہنچ جاتا ہے یا مرض کا شبہ ہوتا ہے تو انگریز افسر ایک نوکر کو خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو حکم دیتا ہے کہ بیل کو کھڑا کر کے پیشانی پر بندوق چلاو افسر مذکور کی غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور مر جائے۔ چنانچہ نوکر بندوق چلاتا ہے بندوق کی گولی دماغ کو پھاڑ کر بعض دفعہ پار بھی نکل جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ بیل فوراً گر پڑتا ہے اور حالت مذبوحی ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ انگریز گولی لگتے ہی گھوڑا دوڑا کر چلا جاتا ہے۔ بعض مسلمان لوگ فوراً چھری لے کر افسر کی غیبوبیت میں اس بیل کو شرعی طریقہ سے ذبح کر لیتے ہیں۔ اس جانور کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

ازسائل

مولوی حافظ کامل الدین از رنو کالاڈا کخانہ پہلوان
تحصیل بھرہ، ضلع سرگودھا پنجاب

الجواب

ازدارالافتاء مجلس مستشار العلماء پنجاب لاہور، حلت وحرمت کامدار مذبوح کی حیات وموت پر ہے۔ اگر عندالذبح جانور میں آثار تڑپنا وغیرہ موجود ہوں تو ذبح کا کھانا جائز ہے اور گولی لگنے سے جانور میں آثار حیات موجود نہ ہوں تو اس کا کھانا ناجائز ہے[1]

| تائید الجواب از خانقاہ امدادیہ | مستشار علماء کا جواب صحیح ہے اور جو اہل علم قول امام ابو یوسف و محمد کی بناء پر اس جواب سے اختلاف |

کرتے ہیں اور حالتِ مذکورہ میں مطلقاً حرمت کے قائل ہیں ان کا قول مفتی بہ نہیں۔ ہدایہ میں جہاں قول ابی یوسف و محمد نقل کیا ہے اس سے بیشتر امام صاحب کا قول بھی موجود ہے، اور اس کے بعد وعلیہ الفتویٰ بھی موجود ہے۔ پس مفتی بہ قول کو ترک کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ فقط

واللہ اعلم

الجواب صحیح مع الحاشیہ
اشرف علی عفی عنہ
مورخہ ۱۹ ر جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ

احقر عبدالکریم عفی عنہ
از تھانہ بھون
مورخہ ۱۵ ر جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ

---

[1] خادم شرع جلیلہ محمد خلیل عفی عنہ

کتاب الحظر والاباحة

باب الرشوة والهدایا والضیافات

طلباء کے والدین کا استاد کو ہدیہ دینا اور اس کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال: کئی سال سے اس نالائق کا پیشہ معلمی رہا ہے چونکہ سرکاری مدارس میں بوجہ دیگر حقوق کے تنخواہیں قلیل ہیں۔ اس لئے بعض حقوق کی زبانی اور بعض کی تحریری اجازت ہے اور اہل دیہہ دینے کے عادی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات شرعاً بھی جائز ہیں یا نہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

(۱) جس وقت کوئی لڑکا داخل مدرسہ ہوتا ہے اس وقت اس کا وارث علاوہ فیس سرکاری کے کچھ نقد یا جنس کی قسم سے دیتا ہے۔ بعض کچھ نہیں دیتے۔

(۲) اوقات معینہ پر جب عام طلباء ترقی پاتے ہیں تب روپیہ دو روپیہ حسب حیثیت استاد کو دیتے ہیں۔

(۳) بعض مدارس میں ہفتہ وار خشک خوراک یا کھانا کھلانے کا رواج ہے۔

(۴) فصل کی پیداوار سے لڑکا یا سرپرست کچھ گڑ روٹی مکئی وغیرہ لاتا ہے۔

(۵) کچھ لوگ بطور خود ماہانہ مقرر کر کے (جبکہ اس کا لڑکا درج رجسٹر سرکاری ہو چکا ہو) اپنے لڑکے کی زیادہ تربیت چاہتے ہیں اور وہ لڑکا اسی استاد کا شاگرد ہوتا ہے یا دیگر مدرسین کا طالب علم۔ ایسی صورت میں مدرسین کا یہ طرز عمل رہتا ہے کہ سکول کے ٹائم میں اس کے ساتھ زیادہ توجہ سے پیش آتے ہیں یا غیر اوقات میں تعلیم دیتے ہیں۔

(۶) ہندوؤں میں ایک تہوار گنیشن چوتھ بھادو کے مہینے میں ہر سال ہوتا ہے۔ اس موقع پر استادوں کو کچھ دینے کا خیال مدنظر رکھ کر تقریباً کل ہندو / مسلمان تمام لڑکوں اور مدرسین کو اپنے مکان پر بلا کر چوپائی (جس طرح بچے کی پیدائش یا شادی کے وقت لڑکے کو آمین پڑھا کرتے ہیں) پڑھواتے ہیں جن میں کسی بادشاہ کا ذکر یا نصیحت ہوتی ہے کچھ دیر بعد نقد یا کپڑا استادوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ پس اسی طرح تمام لڑکوں

کے مکان پر بچے بعد دیگرے پہنچ کر دو چار یوم میں سو پچاس روپیہ مدرس لوگ وصول کر لیتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے اس کی اجازت تحریری ہے اس لئے کوئی افسر مجاز بھی نکتہ چینی نہیں کر سکتا لیکن جو بھٹ کا زیادہ تر رواج ضلع میرٹھ کی ہر تحصیل و دیہات میں موجود ہے۔ بعض مقامات پر اس کا رواج نہیں۔
(نوٹ) تنخواہ ہر صورت میں ملتی ہے۔

الجواب

(۱) وارث وغیرہ سے صاف کہہ دیا جائے کہ اس ہدیہ کی وجہ سے اس لڑکے کے ساتھ کچھ زیادہ توجہ نہ کی جائے گی جیسے اور سب ہیں ویسے ہی یہ بھی ہوگا پھر بھی دے تو قبول کرنا جائز ہے۔
(۲) ترقی کے وقت جو ہدیہ دیا جاتا ہے اس کا قبول کرنا جائز ہے۔
(۳) اس میں وہی تفصیل ہے جو نمبر اوّل میں لکھی گئی کہ اس سے صاف کہہ دیا جائے کہ اس کی وجہ سے کوئی زیادہ خصوصیت نہ ہوگی۔
(۴) اس کا بھی وہی حکم ہے جو نمبر ۱ اور نمبر ۳ کا ہے۔
(۵) ایسے لڑکے کے ساتھ اسکول کے وقت میں زیادہ توجہ سے پیش آنا تو درست نہیں اگر کچھ وقت خارج میں اس کو زیادہ دیا جائے تو ماہانہ کا لینا جائز ہے ورنہ نہیں۔
(۶) ہندوؤں کے تہوار میں کسی قسم کی شرکت بھی جائز نہیں۔ چوپائی پڑھنا گویا تہوار پر مسرت کا اظہار کرنا ہے اس لئے حرام ہے اور اگر بدون چوپائی پڑھے اور بدون ان کے گھر پہ جانے کے وہ مدرس کے گھر پر ہی کوئی ہدیہ بھیج دیں لیکن اگر قبول نہ کرنے میں یہ اندیشہ ہو کہ یہ لوگ آئندہ بھی خدمت نہ کریں گے تو قبول کر لینے میں مضائقہ نہیں دل میں اس سے کراہت رکھی جائے اور قبول کر لیا جائے۔ فتاویٰ ذخیرہ میں ہے۔

لا ینبغی للمؤمن ان یقبل ھدیۃ الکافر یوم عیدھم ولو قبل لا یرسل الیھم شیئا انتھی۔

اور خزانۃ الروایات میں ہے۔

فی الفصول والتتارخانیۃ فی المحیط ما یأتی المجوس فی یوم

نیروز هم من الاطعمة إلی الا کابر والسادات من کانت بینه وبینهم معرفة وذهاب ومجیٔ فقد قیل من أخذ ذالك علی وجه الموافقه یضره ذالك بدینه انتهی.

باقی تقریبات شادی اور غمی میں اگر ہندو دعوت کرے تو اس کا قبول کرنا بعض فقہا کے نزدیک درست ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک مکروہ ہے۔

کما فی خزانة الروایات فی مفید المستفید من الموافقات لا بأس بالذهاب إلی الضیافة اهل الذمه هکذا ذکر محمد لکن المذکور فی النوازل یخالف هذا فانه کره فیه الاجابة انتهی.

(از فتاویٰ عبدالحیؒ ص ۱۱۹ ج ۲)

پس سائل کو اگر ضرورت مجبور کرے تو قبول کرے کیونکہ اس میں گنجائش ہے۔ واللہ اعلم۔

کتبہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۳ محرم سنہ [illegible]ھ

نکاح سے قبل ولیمہ کا حکم

سوال: دعوتِ ولیمہ شادی کے قبل درست ہے یا نہیں۔ بعض اشخاص کہتے ہیں کہ جب تک لڑکے اور لڑکی میں مقاربت نہ ہو اس وقت تک دعوتِ ولیمہ ہو ہی نہیں سکتی۔

الجواب

قال فی مجمع البحار: الولیمة وهی طعام یصنع عنها العرس من او لمت اه وفیه ایضًا هی طعام العرس وهی مستحبة ووقتها بعد الدخول او وقت العقد او عندهما اقوال لمالك اه ص ۶۳ ج ۲

اس سے معلوم ہوا کہ ولیمہ کا وقت مقاربت کے بعد ہے یا نکاح کے وقت یا دونوں وقت باقی نکاح سے پہلے تو کسی طرح ولیمہ کا وقت نہیں۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۶ جمادی الاولیٰ سنہ [illegible]ھ

جس شخص کی آمدنی حرام ہو اس کی دعوت قبول کرنے کا حکم

سوال: بہت سے لوگ اس شہر میں ایسے ہیں کہ دین کا پاس کچھ نہیں کرتے ہیں اور کھلم کھلا کسب حرام سے مال جمع کرتے ہیں یعنی گانجہ افیون کی بیوپاری کرتے ہیں اور کوئی زن فاحشہ کے ذریعہ کچھ کماتے ہیں اور نماز و روزہ کی بالکل پاسداری نہیں کرتے۔ جب کوئی معاملہ یا مقدمہ میں پڑ جاتے ہیں تو ملّا مولویوں کو جمع کر کے دعوت پڑھاتے ہیں اور ملّا بلکہ مولوی لوگ بھی اکثر ایسی دعوت کے متلاشی رہتے ہیں۔ جب کوئی دعوت مل گئی بطیب خاطر دعا مانگتے ہیں مگر صاحب دعوت کو کچھ بھی لحاظ نہیں رہتا کہ میں بھی اللہ پاک سے دعا مانگوں وہ صرف ملا لوگوں کے دعا مانگنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ آیا ایسے لوگوں کی دعوت پڑھنا اور اس سے اجرت لینا اور اس کا کھانا کھانا درست ہے یا نہیں۔ صاف صاف حکم تحریر فرمائیں۔

الجواب

جن لوگوں کی زیادہ آمدنی ذریعہ حرام سے ہے ان کے یہاں کی دعوت قبول کرنا اور کھانا عموماً حرام ہے اور خصوصاً مولویوں کو تو ایسے لوگوں کی دعوت قبول کرنا سختی کے ساتھ ممنوع ہے کیونکہ اس میں علم کی تذلیل اور احکام شرعیہ کی توہین ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۹ جمادی الاخریٰ سنہ ۴۲ھ

اہل مقدمہ کی امداد کے صلے میں مہتمم مدرسہ کا ان سے مدرسہ کے لئے رقم وصول کرنا

سوال: ایک رئیس شخص مدرسہ اسلامیہ کے مہتمم ہیں اور آدمی کے مقدمہ وغیرہ میں بہت کام کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم لوگ ہم کو ایک پیسہ نہ دینا مگر ہمارے مدرسہ میں دو روپیہ امداد کرنا۔ یہ رشوت ہوگا یا نہیں؟ اور لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

یقیناً رشوت ہے یقیناً درست نہیں۔

(مجیب کا نام درج نہیں)

ولیمہ کی تعریف اور اس کا مستحب وقت

سوال: ولیمہ بغیر وطی کرنے کے جائز ہے یا نہیں؟ اور ولیمہ کا کھانا فقط مکان والے کو کھلانا اور دوسروں نہ کھلانا یہ جائز ہے یا نہیں۔ اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

قال فی الفتح: وقد اختلف السلف فی وقتها ای الولیمة هل هو عند العقد او عقبه او عند الدخول أو عقبه أو موسع من ابتداء العقد إلی انتهاء الدخول اھ من حاشیة البخاری ص ۷۷۶ ج ۲)

وفی الشامیة الولیمة هی طعام العرس وقیل اسم لکل طعام (ص ۲۴۰ ج ۵) وفی العالمگیریة: وولیمة العرس سنة وفیها مثوبة عظیمة وهی اذا بنی الرجل بامرأته ینبغی أن یدعو الجیران والأقرباء والأصدقاء یذبح لهم ویصنع لهم طعامًا الخ من خزانة المفتین ولا بأس بأن یدعو یومئذٍ و من الغد وبعد الغد ثم ینقطع العرس والولیمة کذا فی الظهریة (ص ۲۲۹ ج ۶) وفی حاشیة البخاری عن اللمعات واختلف فی تکرادها اکثر من یومین فکرهه طائفة واستحب مالك کونها اسبوعًا (ص مذکور)

اس سے معلوم ہوا کہ ولیمہ مشہور قول میں تو اسی دعوت کا نام ہے جو شب زفاف و دخول کے بعد ہو اور بعض اقوال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے وقت سے دخول کے بعد تک جو بھی دعوت ہو ولیمہ ہی ہے مگر راجح قول اوّل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ولیمہ بعد الدخول ہی ثابت ہے اور ان عبارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ولیمہ پڑوسیوں اور دوستوں اور قرابت داروں کی دعوت کرنے کو کہتے ہیں تو اگر گھر والے ہی خود کھالیں تو وہ ولیمہ نہ ہوگا۔ لعدم کونہ ضیافۃً، باقی یہ ضروری نہیں کہ پڑوسیوں اور قرابت داروں اور دوستوں سب کو بلایا جائے بلکہ حسب توفیق و ہمت بلایا جائے دو چار کو بلا لینا بھی کافی ہے اور ہر حال میں رسوم سے اور نام ونمود

سے بدعات سے بلا وجہ قرض سے بچنا واجب ہے۔ فقط

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳۰ محرم ۴۵ھ از تھانہ بھون

حُقّہ پینے کا حکم | سوال: حُقّہ پینے کے بارے میں اختلاف مکروہ وحرام کا ہو رہا ہے صحیح تحقیق عنایت فرمائیں۔

الجواب

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیة: (ج ۲/۳۳۱، ۳۳۲) فی مسئلة شرب الدخان بعد تفصیل ربط زائد ما نصّہ وبالجملہ ان ثبت فی ھذا الدخان اضرار صرف خال عن المنافع فیجوز الافتاء بتحریمہ وان لم یثبت فالأصل حلہ مع ان فی الافتاء بحلہ ومع الحرج عن المسلمین فان اکثرھم مبتلون بتناولہ مع ان تحلیلہ ایسر من تحریمہ وما خیر رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بین امرین الا اختار ایسرھما واما کونہ بدعة فلا ضرر فانہ بدعة فی التناول لا فی الدین فاثبات حرمة امر عسیر لا یکاد یوجد لہ نصیر نعم لو اضر ببعض الطبائع فھو علیہ حرام ولو نفع ببعض وقصد بہ التداوی فھو مرغوب ولو لم ینفع ولم یضر ھذا ما سنح فی الخاطر اظھار اللصواب اھ

حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو حُقّہ سے نقصان وضرر ہوتا ہو اس کے لئے حرام ہے اور جس کو نفع ہوتا ہو یا نفع وضرر کچھ نہ ہوتا ہو اس کو جائز ہے لیکن حقہ پی کر مسجد میں آنا جائز نہیں جب تک کہ اچھی طرح بدبو زائل نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد، از تھانہ بھون۔

مغنّی کی آمدنی اور اس کی دعوت قبول کرنے کا حکم | سوال: مغنّی جس کو اس ملک کے لوگ

عرف میں قوال کہتے ہیں جو مزامیر کے ساتھ گانا بجاتا ہے اس کے مکسوبہ مال کی نسبت کیا حکم ہے۔ اس کی دعوت قبول کرنا کوئی شئ اس کے ہاتھ فروخت کرکے اس کی اس کمائی سے زرِ ثمن لینا یا اس سے وہ چیز خریدنی جو اس نے اسی کمائی سے بنوائی یا خریدی ہو کیا ارشاد ہے۔

الجواب

اگر مغنّی کی آمدنی کسی اور طریقہ حلال سے بھی ہو تو غالب کو دیکھا جائے اگر غالب آمدنی حلال ہے تو یہ معاملات اس کے ساتھ جائز ہیں اور اگر غالب حرام ہے تو اس کی دعوت کھانا یا اس آمدنی کی بنائی چیز اس سے خریدنا جائز نہیں اور بیچنے کے وقت اس سے کہا جائے کہ کسی ہندو سے روپیہ قرض لے کر قیمت میں ادا کردے اور ہندو کا قرض اپنے روپیہ سے ادا کردے۔ واللہ اعلم۔

حرّرہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ رجب ۴۳ھ

سود سے توبہ کرنے والے کے گھر دعوت کا حکم

سوال: ایک شخص اپنی عورت کو پردہ نہیں کراتا اور نکاح میں خلافِ شرع کام کرتا ہے اور بے نمازی بھی ہے اور تھوڑی کچھ زمین رہن رکھ کر اس سے نفع بھی حاصل کرکے تصرف کرتا ہے اب وہ شخص توبہ کرکے یوں کہتا ہے کہ میں آئندہ ایسا کام نہیں کروں گا جس مال میں شک ہے وہ نہیں کھاؤں گا۔ اب اس کے گھر میں دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

جب مشکوک مال نہیں کھلاتا تو دعوت میں کیا شک ہے۔

سوال: ایک شخص کا دو قسم کا مال ہے اور اکثر حلال ہے تو اس کے گھر میں دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں۔ وہ شخص یوں کہتا ہے کہ میں نے حلال مال الگ رکھا ہے اور اسی حلال سے کھلانا چاہتا ہوں۔ اب یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر حلال علیحدہ ہے تو اس کا کھانا ہر حال میں جائز ہے لیکن اگر مقتدا کی

دعوت قبول کرنے سے عوام کو ایسی آمدنی کمانے پر جرأت بڑھتی ہو تو مقتدا کو احتیاط چاہئے
فقط: احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفی عنہ ۲۱ شوال ۴۳ھ

کسی شبہ سے ترک دعوت مشروع ہے یا مطلقاً قبولِ دعوت مسنون ہے۔

سوال: کسی شبہ کی وجہ سے ترکِ دعوت بھی مشروع ہے یا قبول الدعوۃ ہی مسنون ہے۔

الجواب

اگر موضع دعوت میں کوئی امر خلافِ شرع ہو تو دعوت میں نہ جانا چاہئے البتہ اگر یہ گمان ہو کہ میرے جانے سے وہ خلافِ شرع امر موقوف ہو جائے گا تو جانا چاہیئے۔ فی الدر: (وان علم اولا) باللعب (لا یحضر اصلاً) سواء ممن کان یقتدی بہ اولا الخ۔ وقال الشامی تحت (قولہ اصلاً) الا اذا علم انھم یترکون ذالک احتراماً لہٗ فعلیہ أن یذھب اتقانی (ص ۳۴۱ ج ۵)

واللہ سبحانہ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۱ ذی الحجہ ۴۴ھ۔

فاسق اور بدعتی کے ساتھ معاملہ اور اس کی ضیافت کا حکم

سوال: ایک شخص کے ساتھ ہمارا دنیوی معاملات لین دین رہتا ہے اور یہ شخص شریعت کا پابند نہیں ہے اور بدعت کے کام بھی کرتا ہے۔ اب ہم اس کی دعوت کرنا چاہیں تو جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب

اگر یہ شخص کبھی از خود آجائے تو وہ مہمان ہوگا اور اکرام ضیف مطلقاً مباح و مستحسن ہے۔ گو وہ کافر ہی ہو۔
اور اس کو خود بلانا اور دعوت دینا بطور دوستی کے تو جائز نہیں مگر یہ کہ اس

کے ساتھ قرابت نسبت بھی ہو تو جائز ہے۔

لکون صلة الرحم عامة لکل بر و فاجر لحدیث اسماء حین جاءتها امها راغبة و فی روایة راغمة فسألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم هل تصلها فقال صلی امك رواه ابوداؤد وارسل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ الی اخیه وهو مشرك بمکه حلّة سیراء ذکره الحافظ فی الفتح۔

ہاں فاسق مبتدع اجنبی کو اس صورت میں دعوت دینا جائز ہے جبکہ اس سے اس کی تالیف قلب کر کے اصلاح کا قصد ہو۔ اس صورت میں جب تک امید اصلاح ہو یہ برتاؤ جائز ہے یا معاملات دنیوی کی وجہ سے کبھی خود اس کے گھر مجبوری کی وجہ سے کھانا پڑ جاتا ہو اور دعوت کر کے اس کے احسان کی مکافات مقصود ہو مگر مکافات کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ جب اول اس کی طرف سے ضیافت ہو اور مجبوری کی وجہ سے قبول کرنا پڑے تو اس کے بعد خود ضیافت کر دی جائے، ابتداءً نہ کی جائے اور مکافات سے دفعات میں زائد نہ کی جائے۔

والوجه ما ذکره العلماء فی عموم حرمة الموالاة لکل فاسق او مبتدع، کما بینته فی رسالة تحذیر المسلمین واستثنوا منها. ما کان لتالیف القلب بقصد الاصلاح کما فیها ایضًا ولا بد من استثناء مکافاة الهدیة ایضًا۔ والاحسان فانه صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل الهدیة ویثبت علیها وقد قبل هدیة المشرکین والکفار ایضًا۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۰ رمضان المبارک ۴۵ھ

قاضی کے لئے ماتحت ملازمین کی دعوت قبول کرنے کا حکم

سوال: معروض آنکہ عہدہ قضاء آنکہ از گورنمنٹ عالیہ بذریعہ محکمہ ڈسٹرکٹ بورڈ فدوی عطا شدہ است صرف برائے پڑتال انکہ مندرجہ رجسٹرات نکاح خوانان

علاقہ فدوی دورہ علاقہ میکند از سرکار عالی اجرت مقرر است نکاح خوان ایک روپیہ میگیرد برائے قاضی روبروے بورڈ این تمام رقومات از ناکح وصول میشوند۔

بوقت دورہ ہر جا کہ شب می آید نکاح خوانان بلا گفتہ فدوی ضیافت و مہمان نان و آب دانہ گیاہ اسب می کنند چنانچہ رسم مہمان نوازی است مگر حالِ طیب خاطر معلوم نمی گردد کہ امر مخفی است و افسر بودن فدوی برار شان ظاہر است این نان خوردن و دانہ اسب گرفتن بلا طلب جائز است یا نہ۔ بینوا توجروا۔

الجواب

درصورت مسؤلہ کہ سائل بر عہدہ قضار برائے تفتیش انکحہ مامور است او را ضیافت بحالت دورہ از نکاح خوانان گرفتن کہ افسر بودن سائل برادر شان ظاہر است، بظاہر در رشوت داخل می شود پس احتیاط از آں لازم است۔

واللہ اعلم

ہدیہ دینے والے کا تسلیم وغیرہ الفاظ سے شکریہ ادا کرنا کیسا ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمار کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے سامنے کوئی چیز پیش کی اس نے اس کو لے کر کہا کہ تسلیم، اور تسلیم کے معنی سلامتی کے ہیں اس لحاظ سے کہا نہ کہ اس رواج کے موافق جو آج کل مروج ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے معنی سلامتی کے ہیں۔ یہ دعائیہ فقرہ سمجھ کر کہا تو کیا جائز ہے یا ناجائز۔ ایک شخص کہتا ہے کہ یہ کہنا ناجائز ہے۔ جو حکم ہو تحریر فرمائیں۔

الجواب

اودھ اور لکھنو میں ایسے موقعہ پر جو تسلیم کہا جاتا ہے تو اس کے معنی شکر کے ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں پس اس رواج کے موافق تسلیم کرنا اور دعائیہ فقرہ سمجھ کر تسلیم کرنا دونوں جائز ہے البتہ یہ فعل سنّت کے خلاف ہے۔ سنّت یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر جزاک اللہ وغیرہ کہا جائے۔ واللہ اعلم۔

حرّرہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ شعبان ۱۳۴۷ھ

بعض ورثاء اگر مورث کا مال اپنا مملوک کہہ کر بنیت ایصال ثواب دیں تو اس کے قبول کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء اسلام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ورثاء میں اس کی اولاد ذکور و اناث یتامیٰ اور زوجہ اور والدہ موجود ہیں۔ والدہ اور زوجہ نے متوفی کے مال میں سے کچھ سامان اثاث البیت بستر لحاف وغیرہ کسی کو ایصال ثواب کی غرض سے دیا معطی لہٗ نے ان سے کہا کہ چونکہ اس مال میں یتامیٰ کا بھی حصّہ ہے اس لئے یہ مال نہ کسی کو دینا جائز ہے نہ کسی کو لینا جائز اس لئے میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس پر والدہ اور زوجہ نے کہا کہ یہ مال فی الحقیقہ متوفیٰ کا ہے ہی نہیں اور نہ یہاں کا تیار شدہ ہے بلکہ ہمارا اپنا مملوک ہے اس لئے دیتے ہیں کہ متوفی کی روح خوش ہو اس صورت میں معطی لہٗ کو اس مال کا لینا والدہ اور زوجہ کے قول پر اعتماد کر کے جائز ہے یا ناجائز بحوالہ کتب تحریر فرمائیں۔ اور وہ سامان متوفی کی حیات میں اس کے استعمال میں تھا۔

الجواب

من مفتی مظاہر علوم سہارنپور

حامداً ومصلیاً ومسلماً شرعاً درصورت مسئولہ چونکہ والدہ اور زوجہ متوفی کی یہ کہتی ہیں کہ یہ مال ہمارا مملوک ہے اور ہم اپنی طرف سے دیتے ہیں تو اس صورت میں ان کا قول قبول کر لیا جائے گا اور اس کا لینا شرعاً جائز ہو گا۔ درمختار میں ہے:

کل من حکی امرا لا یملک استنافہ ان فیہ ایجاب الضمان علی الغیر لا یصدق وان فیہ نفی الضمان عن نفسہ صدق انتہی باب الشرکۃ۔ واللہ اعلم۔ رقیمہٗ ضیاء احمد عفی عنہ

۴ شعبان المعظم ۱۳۴۲ھ

الجواب صحیح۔ وقال سیدی حکیم الامّۃ لیس ھٰذا من باب القضاء بل ھو من باب الدیانات فان شھد قلبہ بصدق النساء لم یکذبھن الظاھر یجوز لہٗ اخذہٗ وانما لم یکن من

باب القضاء لکون احد لا ینازعھن فی ماقلن واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ شعبان ۱۳۴۸ھ از تھانہ بھون

جس شخص نے وارث کا حق روکے رکھا ہو اس کے گھر دعوت کھانا اور اس کی آمدنی سے اجرت لینے کا حکم

سوال (۱) یہاں پر عام طور پر ورثاء کا حق نہیں دیتے اور اسی سے جس میں ورثار کا حق ہے کھاتے ہیں اور دعوت کھلاتے ہیں ایسی دھان کو بیچ کر ہدیہ صدقہ وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سوائے اس کے اور کوئی طریقہ معاشں کا نہیں۔ میں ان کے بچوں کو تعلیم دیتا ہوں تنخواہ میں وہ مجھے دھان دیتے ہیں۔ بعض دھان بیچ کر روپیہ دیتے ہیں اور کبھی دعوت کرکے کھلاتے ہیں اور للہ ہدیہ بھی دیتے ہیں اور وہ سب اسی زمین کے دھان یا پیسہ سے کرتے ہیں جس میں ورثار کا حق ہے۔ میرے پاس طلبہ بہت دور ڈھاکہ کمیلاکے وغیرہ رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کھانا انہی میراث نادہندگان کے گھر سے مقرر ہے اور میرے معاشں کا انتظام اس طرح ہے کہ وہ طلبہ فیس دیتے ہیں آٹھ دس روپیہ فیس سے ہوتا ہے۔ باقی دھان وغیرہ دیتے ہیں جیسے اوپر ذکر کیا۔

(۲) میں نے تھوڑی سی زمین میراث نہ دینے والوں سے خریدی تھی اس سے تھوڑا دھان ملتا ہے۔ غرض یہ کہ طلبہ کی فیس ہمسایوں کا دھان اور اپنی زمین کا کچھ دھان اسی سے خوراک، پوشاک چلتا ہے۔ کوئی زیادتی کے ساتھ نہیں بلکہ ضرورت کے لحاظ سے کفایت ہوتا ہے اب طلبہ سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں بھی ورثار کا حق نہیں دیتے، اب میں کیا کروں مدرسہ چھوڑنے میں معاشں کی تکلیف ہے اور علم کی عدم حفاظت بھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضور والا از روئے مہربانی دستگیری فرمائیں۔

الجواب

(۱) جن لوگوں نے زمین میں سے اپنی ہمشیراؤں یا کسی شرعی وارث کا حق نہیں

دیا ہے اس زمین کی پیداوار میں یہ تفصیل ہے کہ جتنا تخم ریزی میں صرف ہوا ہے اتنی پیداوار حلال ہے جس نے خرچ کیا ہے وہ اس کو کھا سکتا ہے اور پیداوار میں سے اس قدر حلال ہے کہ جس قدر اس قابض کے حصہ میں از روئے شرع آیا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے ایک بیٹا بیٹی چھوڑے اس بیٹے نے بہن کو حصہ نہ دیا اور زمین کاشت کی اور عہ کاشت پر اور تخم ریزی پر اور آبپاشی پر خرچ ہوئے اور پیداوار للعہ کی ہوئی تو اب اس کے واسطے عہ خرچ شدہ اور بقیہ میں عہ حصہ میراث سے کل سہ کا غلہ حلال ہے۔ باقی عہ کا غلہ حرام ہے کہ وہ ہمشیرہ کا حق ہے سو اگر ہدیہ وغیرہ کے وقت اس کا لحاظ کر لیا جائے کہ یہ اپنے حصہ سے زائد میں تصرف نہ کرے تو جائز ہے۔ مثلاً مثال مذکورہ میں جب تک سہ کے غلہ میں تصرف کرے اس وقت تک ہدیہ وغیرہ لینا جائز ہے اور جب غلہ فقط عہ کا رہ جائے تو اس میں تصرف حرام ہے اس لئے ہدیہ ہرگز قبول نہ کیا جائے۔

والجزء الآخر من الجواب یستنبط من قاضیخان ونصہٗ ھذا رجل لہ ثلثۃ اقفزۃ حنطۃ باع منھا قفیزاً من رجل آخر ثم باع منھا قفیزاً من آخر ثم باع منھا قفیزاً من ثالث ثم کال لھم الا قفزۃ الثلثۃ ثم جاء رجلٌ وستحق من الکل قفیزاً فان المستحق یأخذ القفیر الثالث لأن صاحب الید حین باع القفیر الاول (والثانی) باع ما یملکہ و باقی الجواب ظاھرٌ۔

اور یہ غلہ اور اس کی قیمت کا حکم ہے اگر کپڑے وغیرہ ترکہ مشترکہ میں سے جو کوئی دے اس کا حکم اور ہے ضرورت ہو تو دریافت کر لیا جائے۔

(۲) اور جو زمین خریدی ہے اس کے متعلق یہ بات قابل تحقیق ہے کہ جو قطعہ آپ نے خریدا ہے اس جگہ فقط اتنا ہی قطعہ مشتری کے وارث نے ترکہ میں چھوڑا تھا یا اس قطعہ مبیعہ کے متصل اور زمین بھی اس کی متروکہ ہے۔ اس کا جواب لکھنے پر ہر بیع کی صحت و بطلان کا حکم معلوم ہو سکتا۔ کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

۲۸ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

باب الأکل والشرب

حلال ذبح شدہ جانور میں کون کون سی اشیاء حرام ہیں

سوال: نر بکرا ایک شخص مسلمان نے مطابق شرع شریف ذبح کیا۔ یہ امر دریافت طلب ہے کہ اس کے کون کون سے اجزاء ایسے ہیں جن کا کھانا حرام ہے۔ بالتفصیل جواب ملنا چاہیئے۔

الجواب

حلال ذبح شدہ جانور میں سے سات چیزیں کھانا حرام ہیں (۱) خون بہنے والا۔ (۲، ۳) پیشاب گاہ نر و مادہ دونوں کی (۴) خصیتین (۵) غدود (۶) مثانہ (۷) پتا۔

کما فی العالمگیریۃ: ج ۶/۱۹۵، واما بیان ما یحرم اکلہ من اجزاء الحیوان سبعۃ الدم المسفوح والذکر والانثتان والقبل والغدۃ والمثانۃ والمرارۃ کذا فی البدائع اھ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ صفر ۱۳۴۵ھ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔

جو جانور کثرت سے نجاست کھائے ان کا دودھ اور گوشت کھانے کا حکم

سوال: جو گائے یا بھینس یا بکری کثرت سے نجاست کھائے اس کا دودھ پینا شرعاً درست ہے یا نہیں اور اس کے گوشت کھانے کے متعلق ارشاد فرمائیں۔

الجواب

اگر گائے یا بکری اس قدر نجاست کھاتی ہے کہ اس سے بدبو آنے لگے تو اس کا کھانا جائز نہیں، جب تک کہ اس کو اتنے روز بند نہ کیا جائے کہ بدبو زائل ہو جائے اور اگر اس بکری میں بدبو پیدا نہیں ہوئی تو اس کا کھانا جائز ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے اس لئے چند روز بند رکھنا چاہیئے اور یہی حکم دودھ کا ہے۔

کما فی الدر: ولو اکلت النجاسۃ وغیرھا بحیث لم ینتن لحمہا حلت وقال الشامی وعن ھذا لاباس باکل الدجاجۃ لانہ یختلط ولا یتغیر لحمہ وروی انہ علیہ السلام کان یاکل الدجاجۃ

تجس ثلاثۃ ایام ثم تذبح فذلك على سبيل التنزہ ۔ زیلعی
(شامی ج ۵ ۳۳۳ ج ۵) وفیہ ایضًا (ولبنها) لتولدہ من اللحم ۔

فقط کتبہ الاحقر
عبدالکریم عفی عنہ ۲۸ ربیع الاول ۵۴ھ

آلائش نکالنے سے قبل مرغی کو گرم پانی میں ڈالنے کا حکم

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مرغی وغیرہ کی آلائش نکالنے سے پہلے پر اتارنے کے لئے گرم پانی میں ڈال رکھے اور پھر پانی سے نکال کر علیحدہ کر کے پکائے تو اس کا کھانا درست ہوگا یا نہ اور وہ پاک رہے گی یا ناپاک ہو جائے گی ۔ اگر ناپاک ہو جائے تو اس کو پاک کرنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں ۔

الجواب

آلائش نکالنے سے قبل گرم پانی میں ڈالنے سے اگر نجاست گوشت کے اندر سرایت کر جائے تب تو گوشت کسی طرح پاک ہی نہیں ہو سکتا ۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ڈالا گیا ہے کہ گوشت میں نجاست نے سرایت نہ کیا ہو تو اوپر کی ناپاکی تین مرتبہ دھونے سے دور ہو سکتی ہے ۔ جیساکہ شامی میں تصریح کی ہے لیکن سرایت کرنے نہ کرنے کی شناخت پورے طور پر ہونا ضروری ہے اور بہتر یہ ہے کہ آلائش نکالنے کے بعد پانی میں ڈالے یا بغیر پانی ڈالے پر الگ کر دے ، شبہ میں کیوں پڑے ۔

فقط عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۱۸ جمادی الاول ۵۴ھ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۔

بکری کے بچہ کو انسان کا دودھ پلایا گیا تو اس کا گوشت کھانا حلال ہے یا نہیں ؟

سوال : بکری کے بچہ کو انسان کا دودھ پلا کر پالا ہے اس بچہ کے گوشت میں حرمت یا کراہت تو

ع شامی ایچ ایم سعید ص ۳۴۱ ج ۶ (مرتب)

نہیں آئی۔

الجواب

یہ بچہ حلال ہے لیکن اگر صرف دودھ ہی غذا ہو اور دودھ پلانے کے زمانے میں ذبح کیا جائے تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر دودھ موقوف کرنے سے کچھ عرصہ بعد ذبح کیا جائے یا دودھ کے ساتھ اور غذا بھی دی جاتی ہو تو کراہت بھی نہیں۔

ونظیرہ ما فی الدر حیث قال حل اکل جدی غذی بلبن خنزیر لأن لا یتغیر وما غذی به یصیر مستهلکًا لا یبقی له أثر ونقل الشامی عن الخانیة أن الحسن قال لا بأس بأکله وأن ابن مبارك قال معناه اذا اعتلف ایامًا بعد ذالك کالجلالة قلت ذکر الشامی عن البزازیة ان حبس الجلالة شرط فی التی لا تأکل الا الجیف وأن مدة الحبس فی الشاة عشرة ایام۔

البتہ اگر دودھ پلاتے ہی فوراً ذبح کیا جائے تو مکروہ تحریمی ہے۔

کما فی الدر: ولو سقی ما یوکل لحمه خمراً فذبح من ساعته حل أکله ویکره زیلعی وشرح الوهبانیه وقال العلامة الشامی ظاهرہ ان الکراهة تحریمیة وما قال بعده من أن ینظر ما الفرق بینه وبین الجلالة التی لا تأکل النجاسة وغیرها والجدی فجوابه أن الفرق ظاهر لان هذه الجزئیة مقید بالذبح من ساعته بخلاف ما مر فی الجلالة وغیرها۔ والله اعلم۔

اس بکری کے بچے کہ جو جفتی اور بچہ جننے کے قابل نہیں کے دودھ نکلے تو اس کا پینا جائز نہیں۔

سوال: ایک بکری نے دو بچے دیئے۔ مالک نے ایک چگانے والے کو دے دیا۔ ایک بچہ اپنے واسطے رکھ لیا۔ اس بچہ کے چار یا چھ روز کے بعد تھنوں میں سے دودھ جاری ہے جس سے تعجب ہوا۔ اب دریافت طلب یہ ہے کہ اس بچہ کا دودھ شرعًا جائز ہے یا ناجائز۔ اکثر لوگ اس کو منحوس بتلاتے ہیں کہ اس کا گھر

رکھنا جائز اور ٹھیک نہیں۔ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

جو بکری کا بچہ کہ ابھی تک جُفتی کے اور بچہ جننے کے قابل نہیں ہوا اس کے جو دودھ نکلتا ہے وہ دودھ نہیں بلکہ پانی ہے۔

قال فی الشامیة: فی باب الرضاع فی حکم لبن البکر انها ان لم تبلغ تسع سنین فنزل لها لبن لا یحرم جوهره لانهم نصّوا علی ان اللبن لا یتصور الّا ممن تتصوّر منه الولادة فیحکم بأنه لیس لبناً اھ ص ۶۷۰ ج ۲۔

اور جب وہ دودھ نہیں ہے تو اس کا پینا بھی جائز نہیں۔ لأنه لا یحلّ من الحیوان الّا اللحم واللبن والجلا وهذا لیس منها۔ البتہ اس جانور کو منحوس کہنا غلط ہے۔ شریعت میں اس کے منحوس ہونے کی کوئی اصل نہیں۔ واللہ اعلم۔

حرّرہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ

۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۴۷ھ

اُلّو اور طوطا ماکول اللحم ہیں یا نہیں؟

سوال: جغد (الّو) ببتغا (طوطا) ماکول اللحم یعنی حلال ہیں یا نہیں؟

الجواب

الّو حرام ہے۔ طوطا حلال ہے اور شافعیہ کے نزدیک اصح یہ ہے کہ حرام ہیں ذکر حکمه الدمیری فی حیٰوۃ الحیوان وقال یحرم اکل جمیع انواعها اھ ج ۱/ ۷۱۴۔ وذکر القولین فی البغاج ۱/ ۱۰۴۔ وعلّل الحرمة لخبث لحمها۔ والحل بکونها تأکل الطیبات لیست من ذوات السموم ولا من ذوات المخلب ولا أمر بقتلها ولا نهی عنه اھ

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

سوال: جند بید ستر، بیر بہوٹی اور ریگ ماہی کا کھانا آئمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک جائز ہے یا نہیں ؟	جند بید ستر اور بیر بہوٹی اور ریگ ماہی کسی امام کے نزدیک حلال ہے یا نہیں ؟

الجواب

جند بید ستر امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق حلال ہے۔

قال الدمیری فی حیوٰۃ الحیوان: الجند بادستر حیوان کھیئۃ الکلب لیس ککلب الماء ولسمّی القندر وسمّی السمور ایضاً وھو علیٰ ھیئۃ ثعلب احمر اللّون الخ ص ۱۹۶ ج ۱۔

ثم قال فی باب السمور وحکمہ حلّ الاکل الحاقًا لہ بالثعلب ولأنہ لایأکل شیئًا من الخبائث اھ ص ۳۰ ج ۲۔

فان قیل ان الجند بادستر خصیتا ھذا الحیوان فالحکم بحلہ لایستلزم الحکم بحل خصیتہ قلنا خصیتا الحیوان الحلال حلال عند الشافعیؒ فقد قال العزیزی فی شرح حدیث کان یکرہ من الشاۃ سبعًا المرارۃ والمثانۃ والحیا (ای الفرج) والذکر والانثتین والغدہ والدم مانصّہ ای اکل سبع مع کونہا حلالًا اھ

وکذا قال الحفنی ان الکلام فی الحلال الذی تعافہ النفس (ج ۳/ ۱۷۱) اور بیر بہوٹی اور ریگ ماہی امام مالکؒ کے نزدیک حلال ہے۔ مع الکراھۃ لکونہما من حشرات الأرض قال فی رحمۃ الأمۃ ویحرم اکل حشرات الأرض کالفار عند الثلاثۃ وقال مالک بکراھتہ من غیر تحریم ومنہا الجراد ویؤکل میتا علیٰ کلّ حال وقال مالک لایؤکل منہ مامات حتف انفہ من غیر سبب بصنع بہ ومنہا القنفذ وھو حلال عند الشافعیؒ ومالک وقال ابوحنیفۃ واحمد بتحریمہ۔ وقال مالک لابأس بأکل الخلا والحیات إذا ذکیت

الخ ص ۶۰، ۶۱ وفی المدونہ لسحنون، قلت لابن القاسم أرأیت هوام الأرض کلها حشاشها وعقاربها ودودها وحیاتها واشبه هذا من هوامها آیؤکل فی قول مالك قال سمعت مالکاً یقول فی الحیات اذا ذکیت فی موضع ذکاتها أنه لابأس بأکلها من احتاج الیها قال ولم اسمع من مالك فی هوام الأرض أنهٗ اذا مات فی الماء أنه لا یفسد الماء والطعام ومالم یفسد الماء والطعام فلیس بأکله بأس إذا أخذ حیًا فصنع به ما یصنع بالجراد اھ ص ۲۷، ج ۱ قلت وانما یحرم من الجراد عنده مامات حتف انفه ومامات بصنع یصنع به ولو غیر الذبح یجوز عنده ۔ البتہ باوجود تتبع کتب یہ امر واضح نہیں کہ ریگ ماہی کا ذبح کرنا امام مالک کے نزدیک شرط ہے یا نہیں ۔ فلیحقق ۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۹ ذیقعدہ ۴۷ھ

میونسپل کمیٹی کی طرف سے گوشت کے پارچوں پر نشان لگانا اس کے مذبوحۂ مسلم ہونے کی دلیل نہیں ۔

سوال : یہاں میونسپل کمیٹی نے اپنی حدود کے اندر یہ حکم نافذ کر رکھا ہے کہ بکری کا جو گوشت مذبح سے باہر ہندو (کھٹیک) قصاب کی دوکان پر جائے اس پر گلابی خواہ دیگر رنگ کا نشان نمبر گوشت کے ہر ٹکڑے پر لگایا جائے جسے دیکھ کر مسلمان خریدار کو اطمینان رہے کہ یہ باقاعدہ ذبح کیا ہوا ہے ۔ اب اگر وہ ٹکڑے کسی وقت مسلم کی نظر سے غائب رہیں یعنی دوکان پر مسلم موجود نہ رہے تو شرعاً اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب من مفتی مدرسہ دیوبند

اس صورت میں جبکہ ذابح مسلمان ہے اور میونسپلٹی کا یہ قانون ہے کہ اس پر علامت لگا دی جائے تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ ذبیحہ مسلمان کا ہے ۔ کما یفهم من العالمگیریہ کتاب التحری ۔

ریاض الدین دار العلوم دیوبند، ۱۰ المحرم ۴۸ھ

الجواب من جامع امداد الاحکام

مفتی صاحب دیوبند نے جو جواب دیا ہے کہ جو گوشت مذبح سے باہر ہندو کھٹیک کی دوکان پر علامت لگا کر جاتا ہے تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ ذبیحہ مسلمان کا ہے اس لئے اس کا کھانا درست ہے الخ اس سے ہم کو اتفاق نہیں کیونکہ جب وہ گوشت مسلم کی نظر سے مخفی ہوگیا کہ دکان پر کوئی مسلم موجود نہ رہا تو اب اس کا ذبیحہ مسلم ہونا صرف اس ہندو کھٹیک کے قول سے معلوم ہوگا یا علامت سے۔ اور ہندو کا قول دیانات میں معتبر نہیں اور یہ علامت بھی قابل اعتبار نہیں دو وجہ سے ایک تو اس لئے کہ یہ علامت فی نفسہٖ ذبیحہ مسلم ہونے پر دال نہیں کیونکہ مذبوحہ یا ذبیحہ غیر مسلم پر بھی ایسا نشان بنایا جا سکتا ہے اور دوسری یہ کہ یہ علامت لگانے والے بھی ہمیشہ مسلمان نہیں ہوتا۔ کبھی کافر ڈاکٹر بھی ہوتا ہے تو اس کی علامت پر اعتماد کیونکر جائز ہے جبکہ خود اس کے قول پر اعتماد جائز نہیں ہے اور کتاب التحری میں جس علامت پر اعتماد جائز کہا گیا ہے اس سے مراد ایسی علامت ہے جو خود گوشت کی ذات میں موجود ہو۔ مثلاً ایک شخص کے پاس گوشت کے چند پارچے ہوں بعض مردار کے بعض مذبوحہ کے پھر وہ مخلوط ہو جائیں تو اسی علامت سے جو خود گوشت کی ذات میں ہو۔ مذبوحہ کو غیر مذبوحہ سے ممتاز کرنا جائز ہے۔ مثلاً پانی میں ان پارچوں کو ڈال کر دیکھا جائے مذبوحہ پانی میں تہہ نشین ہو جائے گا اور مردار تہہ نشین نہ ہوگا تو علامت ایسی ہے جو خود گوشت کے اندر موجود ہے ؏۔ بخلاف گلابی رنگ کی علامت کے جو میونسپلٹی کی طرف سے لگائی جاتی ہے کہ وہ خارجی علامت ہے خود وجہ امتیاز نہیں تو اب اس اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا، بلکہ علامت کنندہ پر اعتماد ہوا اور اس کا مسلم ہونا معلوم نہیں اور معلوم بھی ہو جائے تو مسلم علامت کنندہ کے سامنے جب تک وہ

؏: اس علامت سے مذبوحہ اور غیر مذبوحہ میں فرق ہو سکتا ہے مگر مذبوحہ مسلم و غیر مسلم میں فرق نہیں ہو سکتا۔ نیز ان علامات سے اسی وقت کام لے سکتے ہیں جبکہ اس گوشت میں غیر مسلم کا واسطہ نہ ہو ورنہ جائز نہیں ۱۲ منہ

پارچے موجود ہیں اس وقت تک اس کا قول معتبر ہے اور جب اس کی نظر سے مخفی ہو گئے اور کوئی مسلم ساتھ نہ رہا۔ اب اس کا قول بھی معتبر نہیں کیونکہ یہ علامت مثل تحریر کے ایسی نہیں ہوتی جس میں ہر شخص کا خط ممتاز ہو بلکہ کافر بھی ایسی علامت کر سکتا ہے۔

لا یقال ان خبر الواحد اذا حفت بالقرائن یفید العلم لانا نقول ذلک فی خبر الواحد العدل لا مطلقا کما یظهر من احکام الاحکام للآمدی ص ۴۹-۵۰-۵۱ ج ۲ وایضاً نفی قیام مثل تلک العلامۃ مقام الجز تأمل۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۸ صفر ۴۸ھ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل میں کہ تاڑی (جو عصارہ تاڑ یا کھجور سے بنائی جاتی ہے	تاڑی کی بنی ہوئی چیزوں کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

اس کے خمیر سے روٹی یا بسکٹ بنا کر کھایا جاتا ہے اس علم کے باوجود کہ یہاں اسی کے خمیر سے روٹی تنوری یا بسکٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ کھائیں تو عند الاحناف جائز ہے یا ناجائز۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مقدار قلیل میں کثیر آٹے میں ملایا جائے تو سکر نام کو بھی نہ ہو گا اور خمر بھی نہیں۔

الجواب

امام ابو حنیفہ کے قول پر اس میں گنجائش ہے مگر فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے اس لئے تاڑی کی بنی ہوئی چیزوں سے احتراز لازم ہے واللہ تعالےٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون ۴ ۲ جمادی الثانیہ ۴۸ھ

سوال: بعض لوگ تاڑ کا پھل پکنے سے پہلے کھا جاتے ہیں اس کا کھانا حلال ہے یا حرام؟	تاڑ کا پھل پکنے سے پہلے کھانا حلال ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر اس میں نشہ پیدا نہ ہوا ہو تو کھانا جائز ہے اور نشہ پیدا ہو گیا ہو تو قدر سکر سے کم کھانا جائز ہے۔ قدر سکر کھانا حرام ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ از تھانہ بھون

۱۷ محرم ۴۹ھ

دال میں پکنے کے بعد کیڑے نظر آئے تو اس کا کھانا کیسا ہے۔

سوال: دال میں اگر گھن لگ گیا ہو (یعنی جالا پڑ گیا ہو) اور پکنے کے بعد اس میں کیڑے نظر آتے ہوں تو ایسی دال کے کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب

لابأس بدود الزنبور قبل ان ينفخ فيه الروح لان مالا روح له لايسمّى ميتة (خانيه وغيرها) قال ط ويؤخذ منه ان أكل الجبن او الخل او الثمار كالنبق بدوده لا يجوز ان نفخ فيه الروح (شامی ج ۵/۲۹۹) سطر ۱۲۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کیڑوں میں جان پڑ گئی ہو تو دال کا مع کیڑوں کا کھانا جائز نہیں بلکہ کیڑوں کا صاف کرنا ضروری ہے اور جان نہ پڑی ہو تو جائز ہے"

ويجوز عند الشافعيه مطلقاً بدليل مارواه الطبرانى عن ابن عمر مرفوعاً نهى أن يفش التمر عما فيه قال العزيزى ان من نحو سوس و دود و يجوز اكل دود الفاكهة معها معسر تميزه ۔ (ج ۳/۴۰۸) قلت ولا يخفى ان دود الطعام والثمار ليس من حشرات الأرض المنصوص حرمتها فى المذهب وانما اخذ الطحطاوى تحريمه من مفهوم عبارة قاضى خان وغيره فليس من المنصوص تحريمه فى المذهب وقد ذهبت الشافعيه إلى أكل دود الفاكهة معها فكذا دود الطعام اذا تعسر تميزه والله اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۲۸ ربیع الثانی ۵۶ھ

کوّا حلال ہے یا حرام؟

سوال: عرض آنکہ غالباً مولانا رشید احمد صاحب مرحوم نے اپنے فتاویٰ میں ہر قسم کے کوّے کی حلّت کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ فقہ کی کتابوں سے تین قسم کے کوّے ثابت ہوتے ہیں۔ دو کے حلال ہونے کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ تیسرا جو زاغ سیاہ مردار خور اور غلیظ ہے اس کو ہر ایک نے حرام یا مکروہ لکھا ہے تو آیا یہ زاغ سیاہ مردار خور بھی حلال ہے اور کھانا جائز ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ کو ذرا وضاحت سے تحریر فرمائیے گا کیونکہ ادھر بہت شور برپا ہے۔

الجواب

قال فی الدّر: وحلّ غراب الزرع الّذی یأکل الحبّ والأرنب والقعق ھو غراب یجمع بین اکل جیف وحبّ والأصح حلّہ (ج۳/۸)

اس سے کوّے کی دو قسموں کا حلال ہونا معلوم ہوا۔ مولانا گنگوہیؒ نے بھی ان ہی دو قسموں کو حلال کہا ہے۔ ہر قسم کو حلال نہیں کہا۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں مولانا پر افتراء کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

حرّرہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ، شوال ۱۳۴۸ھ

مچھلی کو آلائش صاف کئے بغیر پکانے کا حکم

سوال: مچھلی میں کیا چیزیں حرام ہیں بعض مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ پتہ حرام ہے لہٰذا جو مچھلی بہت چھوٹی ہے پتہ کی تمیز کرنا ممکن نہیں ہے اس کا کھانا کیا مکروہ تحریمی ہے۔ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

قال فی رد المحتار: وفی سمک الصغار الّتی تقلی من غیر ان یشق جوفہ فقال اصحابہ (ای اصحاب الشافعیؒ) لا یحلّ اکلہ لأن رجیعہ نجسٌ و عند سائر الائمہ یحلّ (ج۵/۳۰۱)

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ چھوٹی مچھلی کو اگر بدون آلائش صاف کئے ہوئے بھی پکا لیا جائے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے اور امام شافعی کے نزدیک آلائش

صاف کرنے کے بعد جائز ہے اور صغار کی قید سے مفہوم ہوتا ہے کہ بڑی مچھلی کی آلائش صاف کرنا سب کے نزدیک واجب ہے۔ بدون صاف کئے کھانا جائز نہ ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں چھوٹی مچھلی کو بدون پیٹ صاف کئے ہمارے نزدیک کھانا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

خرگوش کی کون سی قسم حرام ہے اور کون سی حلال؟

سوال: خرگوش حلال ہے یا حرام اور خرگوش کتنی قسم کے ہوتے ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ اس کے ہرن کے پاؤں جیسی کھری ہوتی ہے وہ حلال ہے دوسرا جس کا پنجہ بلی جیسا ہوتا ہے وہ حرام ہے مگر اوّل قسم کا خرگوش کسی جگہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ فقط نام ہی نام ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کا خرگوش کھایا وہ کس قسم کا تھا۔

الجواب

خرگوش حلال ہے۔ قال فی الخلاصة وجمیع ھوام الأرض الا الارنب فانہ یحل أکلہ اھ (ج ۴/۲۰۴)

اور پہلی قسم کا خرگوش ہم نے بھی نہیں دیکھا۔ دوسری ہی قسم کا دیکھا ہے اور ہم اسی کو حلال سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرگوش تناول فرمایا باقی یہ تصریح کہیں نہیں دیکھی کہ وہ کس قسم کا تھا، بظاہر پہلی قسم کسی کی گھڑی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۱ شعبان ۱۳۴۲ھ

پیرو مرغ حلال ہے یا حرام

سوال: پیرو مرغ حلال ہے یا حرام؟

الجواب

حلال ہے لأنہ لیس من ذی مخلب ولا من الخبائث۔
واللہ اعلم

ماکول اللحم جانور کی کھال اور ہڈی کھانے کا حکم

سوال: چرم و استخوان حلال جانور کا کھانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

کھال کو بالوں سے صاف کرکے کھانا جائز ہے اور ہڈی کا کھانا بوجہ ضرر کے مکروہ ہے اگر دواءً کھائے تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ آدمی اور خنزیر کی نہ ہو۔ ماکول اللحم کی ہڈی تو دوا میں خشک و تر دونوں جائز ہیں اور غیر ماکول کی خشک جائز ہے۔ تر جائز نہیں۔ البتہ نرم ہڈی جس کو چبنی کہتے ہیں بوجہ عدم ضرر کے کھا لینا جائز ہے وان اضر فلا۔

قال فی العالمگیریة: قال محمد ولا بأس بالتداوی بالعظم إذا کان عظم شاة او بقرة أو بعیر او فرس أو غیره من الدّواب الّا عظم الخنزیر والآدی فإنه یکره التداوی بهما وماذکر من الجواب یجری علی اطلاقه إذا کان الحیوان ذکیًا لأن عظمه طاهر رطبًا کان أو یابسًا یجوز الانتفاع به جمیع انواع الانتفاعات امّا اذا کان الحیوان میتًا فانما یجوز الانتفاع به إذا کان یابسًا ولا یجوز الانتفاع به اذا کان رطبًا۔ (ج ۶/۲۳۶) واللہ اعلم

ظفر احمد عفی عنہ از تھانہ بھون

خشک مچھلی کھانے کا حکم

سوال: ہمارے ملک بنگال میں ماہی گیر لوگ ایک قسم کی مچھلی پکڑ کر مع اس کی آلائش کے سکھا کر فروخت کرتے ہیں۔ اس سوکھی ہوئی مچھلی کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر مچھلی چھوٹی ہو تب تو بدون غسل کے اس کا کھانا جائز ہے اور اگر بڑی ہو تو اندر سے خوب دھونے کے بعد کھانا جائز ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ ۲۲ ذی الحجہ ۴۲ھ

حرام مغز کا کھانا حلال ہے یا حرام

سوال: معروض اینکہ آیا مغز حرام مرغ و ماہی خوردن روا است یا نہ؟

الجواب

برحرمت مغز حرام ہیچ دلیل قائم نشد و اجزاء سبعہ از شاۃ مکروہ داشتہ اند دران ہم مغز حرام داخل نیست پس خوردنی آن حلال ست۔ واللہ اعلم

احقر ظفر احمد عفی عنہ

ایضًا - ایضًا

سوال: مسئلہ نخاع یعنی حرام مغز کی حرمت اکل تو کتب فقہ میں مصرح ہے۔ کیا وہ نجس بھی ہے یعنی اگر سالم مرغ کا یا اس کا ٹکڑا گوشت کے ساتھ پکا یا جائے اور پکانے سے قبل حرام مغز نہ نکالا جائے جو ایک گونہ دشواری بھی ہے تو اس صورت میں کیا کل گوشت سالن نجس ہو جائے گا۔ مثمن پکانے میں اکثر سالم رہتا ہے اس واسطے بعض علما اس دیار کے مثمن کو قطعی حرام بتاتے ہیں بعض علماء کہتے ہیں کہ حرام مغز کا کھانا تو حرام ہے مگر وہ نجس نہیں۔ کلا کا گوشت چھیل کر کھایا جائے اور ہڈی کو نہ چبایا جائے، حرام مغز کے ساتھ پھینک دے تو درست ہے جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب

حرام مغز کی حرمت کا مصرح ہونا ہم کو کتب فقہ میں نہیں ملا اگر آپ نے تصریح دیکھی ہو تو عبارت کتاب مع حوالہ صفحہ و جلد و باب لکھ کر مطلع فرمائیں اس کے بعد نجاست سے بحث کی جائے گی۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون

۶ جمادی الثانیہ ۱۳۴۵ھ

کچا پیاز، لہسن اور حقّہ کا حکم

سوال: کچا پیاز یا لہسن کھانا جائز ہے یا نہیں حقّہ پینا کیسا ہے؟

الجواب

کچا پیاز و لہسن کھانا اور حقّہ پینا جائز ہے لیکن مسجد میں بدون منہ صاف

کئے اور بدبو زائل کئے نہ جائے ورنہ کراہت تحریمہ کا مرتکب ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۷ رجب ۴۵ھ

جیوان کے انثیین کھانا حنفیہ کے نزدیک کیسا ہے

سوال: ماکول اللحم حیوانات کے (خصیتین) انثیین کا عندالاحناف کیا حکم ہے۔ اگر مکروہ ہیں تو کراہت کیسی ہے؟

الجواب

انثیین کا کھانا حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲ رجب ۴۳ھ

چھوٹی مچھلیوں کو چاک کئے اور آلائش صاف کئے بغیر کھانا جائز ہے یا نہیں؟

سوال: ملک بنگال میں نہایت چھوٹی اور بچی مچھلیوں کی آلائش شکم جس میں پتا اور گوہ وغیرہ بھی شامل ہوتا ہے ان کے پیٹ یا گلے کاٹ کر نہیں نکالی جاتی، بجائے اس کے انگلیوں سے ان کے پیٹ یا گلے زور سے دباتے ہیں جس سے پیٹ پھٹ کر وہ آلائش نکل جاتی ہے پھر پانی سے خوب تربتر دھو لیتے ہیں مگر کاٹی ہوئی جگہ سے پانی جس طرح اندر پہنچتا ہے اور آلائش دور کرتا ہے، پھٹی ہوئی جگہ سے ویسا ہونے میں شک ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طریقہ سے آلائش صاف کر کے جس میں بالکلیہ زائل ہونے میں شک ہے یہ مچھلیاں کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

بہت چھوٹی مچھلی کا کھانا بدون چاک کئے اور آلائش صاف کئے بھی حلال ہے کما فی الشامی: و فی اسمك الصغار التی تقلی من غیر ان یشق جوفه فقال اصحابه (ای الشافعی) لا یحل اکله لأن رجیعه نجس و عند سائر الائمه یحل اھ:

عبدالکریم گمتھلوی عفی عنہ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفی اللہ عنہ ۶ ذیقعدہ ۴۲ھ

یہ جواب لکھنے کے بعد سائل نے حاشیہ مالا بدمنہ کی عبارت ذیل سے اس پر شبہ کیا۔ ص ۱۱۴ حاشیہ مالا بدمنہ) والعبارۃ ہذہ۔ لکن ما ھی نہایت کوچک مکروہ تحریمی است و ھو الاصح ھکذا فی جواھر الاخلاطی ۲)

مگر اس کے بعد بھی حلّت ہی راجح معلوم ہوتی ہے۔

لما فی غایۃ الحواشی و انواع السمک سواءٌ کان اسماک صغیرا لا یمکن اخراج المرۃ عنھا او کبیرا کما فی السراج الوھاج، حیث قال کل نوع من انواع اسمک الغیر الطافی حلال صغیراً کان او کبیراً وفی مختصر الوقایہ والھدایۃ وحل انواع السمک وکذا فی غیرھا ولم ستثن فی المتون الصغیر الا الطافی ومقرر المتون یفتی علیہ کما فی جواھر الاخلاطی وفی المحرر ان وقع التعارض بین المتون والفتاوی فالترجیح للمتون فالروایۃ التی فی بعض الفتاوی ان اسمک الصغار التی لا یخرج المرۃ عنھا حرام لا عبرۃ بھا فانھا مرجوحۃ اھ کما فی امداد المسائل (ج ۳/۴۳)

پس جس چھوٹی مچھلی میں سے پتا وغیرہ نکالنا ممکن نہ ہو وہ تو بدون چاک کئے اور آلائش صاف کئے حلال ہے البتہ وہ چھوٹی مچھلی کہ جس میں آلائش نکل سکتی ہے مگر چاک نہیں کرتا بلکہ دبانے پر کفایت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ سوال میں درج ہے۔ اس کے متعلق یہ تفصیل ہے کہ جس کو اس طریق پر دھونے میں طہارت کا گمان غالب ہو اس کو کھانا جائز ہے اور جس کو طریق مذکور پر دھونے سے طہارت کا گمان غالب نہ ہو اس کو کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ جب اخراج نجاست ممکن ہے تو بدون اخراج نجاست بالاتفاق حرام ہے۔ فی تنویر الابصار سمکۃ فی سمکۃ فان کانت المظروفۃ صحیحۃ حلتا والا حل الظرف لا المظروف وقال صاحب الدر تحتہ کما لو خرجت من دبرھا

لا ستحالتها عذرة وقال الشامی تحت قوله عذرة فلو فرض خروجها غیر مستحیلة حلت ایضًا لان مناط الحرمة استحالتها لاخروجها من الدبر (۵/۳۰۱) والله اعلم۔ احقر عبدالکریم گمتھلوی عفی عنہ
۹ر ذیقعدہ ۴۳ھ

آوارہ مرغی کو تین دن تک بند رکھ کر ذبح کیا جائے یا اس کی ضرورت نہیں؟

سوال: آوارہ پھرتی ہوئی مرغی خرید کر اس کو ذبح کرکے کھانے میں کچھ حرج ہے یا اس کو تین روز تک بند رکھا جائے اور اس کا پالنا درست ہے یا نہیں۔

الجواب

آوارہ مرغی کو تین دن بند رکھنا افضل ہے اگر بدون بند رکھے ذبح کرلیا تو مکروہ نہیں۔ فی العالمگیریة (ج ۶/ ۱۹۴) ولا یکرہ إکل الدجاج المخلّی وإن کان یتنال النجاسة لأنهٗ لا یغلب علیه اکل النجاسة بل یخالطها بغیرها وهو الحب والافضل أن یحبس الدجاج حتی یذهب ما فی بطنها کذا فی البدائع وفی الدّر وقدر بثلاثة ایّام لدجاجة (ج ۵/ ۳۳۳)

البتہ اگر مرغی فقط نجاست ہی کھاتی ہو اور اس کی وجہ سے گوشت میں بدبو آنے لگے تو بند رکھنا ضروری ہے۔ کما فی الشامی (صفحہ مذکورہ)

وفی البزازیة: إن ذالک شرط فی الّتی لا تأکل الّا الجیف الخ. واللّٰہ اعلم

کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح
ظفر احمد، ۱۴ صفر ۴۴ھ

باب التداوی

گرگٹ اور چھپکلی کے روغن کو بطور دوا استعمال کرنا

سوال : ایک شخص کو گلے میں گلٹیاں ہیں اس کے واسطے طلاء گرگٹ و چھپکلی کو کڑوے تیل میں جلا کر اس میں حل کر کے اطباء تجویز کرتے ہیں۔ پس تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا ناجائز، تو اس کے لگے ہوئے ہونے کی صورت میں نماز وغیرہ ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں ہر وقت دھونا یا پونچھنا اور اس بات کی احتیاط رکھنا کہ کپڑے ملوث نہ ہوں نہایت دشوار ہے بعض گرگٹ و چھپکلی میں خون بھی ہوتا ہے نیز جلتے وقت بہت ہی خفیف مقدار میں خود ان میں سے دہنیت بھی نکل کر روغن تلخ میں ملے گی اس کے قریب قریب تمام ادویہ اسی قسم کی ہیں۔

الجواب

طبی جوہر مؤلفہ مولانا حکیم مصطفیٰ صاحب و مصدقہ حضرت حکیم الامت دام مجدہم" میں تحریر ہے۔ (مسئلہ) اگر تیل میں حشرات الارض جلا کر کوئلہ کر لئے گئے تو اس تیل کا کھانا اور لگانا اور اس جلے ہوئے کوئلہ کا کھانا اور لگانا سب درست ہے۔ کیونکہ بوجہ تبدیل ماہیت کے استخباث جاتا رہا صنہ۔ دلائل رسالہ مذکورہ میں مفصل موجود ہیں۔ پس صورت مذکورہ میں اس تیل کا استعمال جائز ہے اور کپڑے بھی اس کے لگنے سے ناپاک نہ ہوں گے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

۲۱ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

مٹی سے دانت صاف کرنے کا حکم

سوال : مٹی سے دانت ملنے سے اگر فائدہ ہو اور درد کی شکایت دور ہوتی ہے تو جائز ہے یا نہ ؟

الجواب

پاک مٹی سے دانت ملنا جائز ہے مگر اس کو حلق سے نیچے نہ اتارے کلی کر کے

تھوک دینا چاہیئے۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ
۱۸ محرم ۱۳۴۸ھ

انگریزی دوا کورو پسل کا حکم

سوال: ایک انگریزی دوا جس کا نام ہموگلوبن سیرپ یا شربت ہے اس کے اجزاء میں مسمیٰ بہ سرخ "کور و پسل" ہے اس میں یہ چیز مشکوک معلوم ہوتی ہے جس کے بارے میں استفسار کر رہا ہوں کور پسل وہ ریزہ ہے جو حیوان کے خون میں ہوتا ہے۔ یہ ایک سرخ ٹھوس چیز ہے خون کی طرح سیال نہیں۔ مگر خون کا ایک جز بنا رہتا ہے۔ فوق الذکر دواء کے بنانے میں اس چیز کا بھی استعمال کرتے ہیں اس کو بھیڑی کے خون سے بذریعہ فصد نکال کر لیتے ہیں اور خشک کر کے سفوف بناتے ہیں یا یونہی پیس لیتے ہیں۔ پھر اور ادویات مباحہ کے ساتھ ملا کر دوا تیار کرتے ہیں۔ کل اجزاء کو ملانے کے لئے غالباً آگ پر رکھ کر گرم بھی کرتے ہیں۔ یہ دوا قوت اعضاء رئیسہ اور بدن میں خون پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سرخ کور پسل کیا خون کا ایک جز ہونے کی وجہ سے بعنوان اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ الخ مانند خون کے اس کا استعمال حرام ہوگا یا صرف اس کے جزء ہونے کی وجہ سے جو شکل میں خون سے علیحدہ اور دواء کے دوسرے اجزاء کے ساتھ مل کر اس کی ہیئت بدل جاتی ہے جائز سمجھا جائے گا؟ اس سوال کے متعلق یہ کہہ دینا شاید بہتر ہوگا کہ کسی خاص شخص کے مرض میں یہ دوا مفید ثابت ہوئی ایسی حالت میں جبکہ دوسری کسی دوا نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ مرض عام کمزوری اور جسم میں قلت خون ہے۔ یہ اگرچہ مہلک نہیں مگر آئندہ باعث فساد جسمانی ضرور ہے۔ اس دوا کا استعمال پہلے کرایا گیا تھا مگر توہم کراہیۃ شرعیہ کی وجہ سے استعمال بند کر دیا گیا حکم ارشاد فرمائیں۔

الجواب

قال فی مراقی الفلاح: وکل شئ من اجزاء الحیوان غیر الخنزیر لا یسری فیہ الدم لا ینجس بالموت کالشعر والمنقار والمخلب وبیضۃ القشر ولبن ولا نفخۃ فان

کان الانفحۃ جامدۃ تطھر بالغسل والا تتعذر تطھیرھا اھ (ص ۹۷) چونکہ یہ ریزہ سخت اور ٹھوس بتلایا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں سریان دم نہ ہوگا جیسے عظم وغیرہ میں لہٰذا یہ جزء پاک ہے اس کو دھوکر دوا میں شامل کر کے استعمال کر سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۷ ر ذی الحجہ ۵۴ھ

حرام اشیائے سے دوا تیار کرنے کا حکم سوال: فی زماننا سلطنت کی بے توجہی سے طب یونانی قریب قریب رخصت ہوگئی۔ پھر نہ ویسا علم و حافظہ نہ اتنا ذہن و فطانت کہ قبض و قارورہ سے جدید امراض کا اطباء کو پتا چلے۔ اس پہ ایک طرف تو قوی ہیں کمزوری کہ بغیر سریع الاثر علاج تکلیف رفع نہیں ہوتی اور دوسری طرف مفلسی کہ ہر شخص یونانی دوا کی قیمت آسانی سے ادا نہیں کر سکتا۔ پھر گرانی اتنی کہ آمدنی قوت ہی کے لئے کفایت نہیں کرتی تو دوا کے لئے کیا بچے۔ ان وجوہ سے ہر شخص ڈاکٹر سے علاج کی طرف مائل بلکہ مضطر و مجبور ہے کہ اوّل تو ہر جگہ ڈاکٹر کا علاج آسان ہے پھر غریبوں کے لئے سرکاری ہسپتال ہیں جہاں دوا غذا بھی مفت ملتی ہے۔ اور یہ امر یقینی ہے کہ ڈاکٹری ادویہ داخلی یا خارجی کے استعمال میں شراب و شحم خنزیر شامل ہے۔ مثلاً برانڈی کہ یہ تو خاص اشربہ اربعہ میں سے ہے اور بہت سے مرہم ہیں کہ ان میں شحم خنزیر اپنے مخصوص آثار کی وجہ سے شامل ہے اور یہ سب اجزاء یقیناً بہ نصّ قطعی نجس و حرام ہیں، اس وقت دنیا کی حالت مجموعی طور پر ایسی ہے کہ " الا ما اضطررتم الیہ" میں داخل کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اگر تداوی بالمحرم پر فتویٰ ہو تو مناسب ہوگا کہ مسلمان بہت سی آفتوں سے بچ جائیں گے۔

(۲) اگر ان علماء کے قول پر عمل کیا جائے جو تداوی بالمحرم کے قائل ہیں تو ان کے نزدیک مسلمان کو ان ادویہ کی بیع بھی جائز ہے یا نہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ برانڈی تو خالص شراب انگور ہے جو کمزور مریض کو استعمال کرائی جاتی ہے اور شحم خنزیر کا مرہم بہت ہی شدید زہریلے زخموں میں کام آتا ہے اور اگر ان کی بیع جائز نہ ہو

تو مسلمان بغیر احتیاج کفار تداوی بالمحرم کے فتویٰ سے منتفع نہیں ہو سکتے آیا محض دواء ایسی ادویہ کی بیع مسلمان کو کسی طور پر جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

تداوی بالمحرم صرف اس وقت جائز ہے جبکہ کوئی طبیب مسلم حاذق یا مسلمان ڈاکٹر حاذق یہ کہہ دے کہ اس مرض کے لئے صرف ایک دوا ہے اس کے قائم مقام کوئی دوا نہیں۔ اگر اس کے قائم مقام کوئی دوا ہو مگر اس سے شفاء دیر میں ہوگی اور محرم میں جلدی ہوگی تو اس میں دو قول ہیں۔

قال فی الهندیه : وان مریضاً اشار الیه الطبیب بشرب الخمر روی عن جماعة من آئمه بلخ أنه ینظر ان کان یعلم یقیناً أنه یصح حل له التناول اھ یجوز لعلیل شرب البلول والدم واکل المیتة للتداوی اذا اخبره طبیب مسلم ان شفاءه فیه ولم یجد من المباح ما یقوم مقامه، وإن قال الطبیب یتعجل شفاءك" فیه وجهان هل یجوز شرب القلیل من الخمر للتداوی إذا لم یجد شیئاً یقوم مقامه فیه وجهان ۔ اھ (ج ٦/ ٢٣٦)

پس جن دواؤں میں برانڈی یا شحم خنزیر کا ہونا معلوم ہو ان کا استعمال بدون شرط مذکور کے جائز نہیں اور والا ما اضطررتم الیه" میں اس کو داخل کرنا عجیب فہم ہے۔ اضطرار اسباب یقینیہ میں ہوا کرتا ہے اور تداوی وعلاج اسباب مظنونہ میں سے ہے۔ فلا اضطرار فیه اصلاً حتیٰ لو ترك الدواء ومات لم یأثم، ولو شرب الخمر وهو عطشان ومات اثم لتیقن زوال العطش شربها وعدم تیقن زوال المرض به فافترقا۔

(٢) قال فی الهندیة : وأکل التریاق یکره إذا کان فیه شیٔ من الحیات وان باع ذالك جاز اھ

(ج ٦/ ٢٣٦)

اس سے ان ادویہ کا جواز بیع مفہوم ہوتا ہے جن میں شئی محرم ملی ہوتی ہے بیع خالص محرم کی ناجائز ہے جیسے خالص شراب یا خالص شحم خنزیر اور مخلوط بالحرام کی بیع جائز ہے۔ کالسرقین المخلوط بالشراب یجوز بیعہ۔

باقی یہ علت لغو ہے کہ مسلمان تداوی بالمحرم میں کفار کے محتاج ہوں گے۔ آخر کون سی تجارت ہے جس میں کفار سے مسلمانوں کو استغناء ہے۔ پس احتیاج الی الکفار میں حرج کیا ہے جبکہ ہم مباحات میں بھی ان سے مستغنی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر

ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۲۸ محرم ۴۳ھ

بحالت مجبوری بیوی کو مانع حمل دوا کھلانا

سوال: میری شادی کو ہوئے ۹ سال ہوئے اور آٹھ اولاد میرے گھر سے ہوئیں جن میں سے تین حیات ہیں اور پانچ فوت ہو گئے جو حیات ہیں ان کی عمر ایک کی آٹھ سال، ایک کی پانچ سال اور ایک کی گیارہ یوم ہے۔ سب سے پہلے میرے گھر میں ایک لڑکا ہوا جو حیات ہے۔ خدا کے فضل سے اس کی عمر آٹھ سال ہے۔ اس کے بعد ایک لڑکی ہوئی جو بچوں کی بیماری میں فوت ہو گئی۔ اس کے بعد ایک لڑکا ہوا وہ بھی مر گیا۔ اسی طرح باقی بچے بھی مر گئے ہیں اب کے جو بچی ہوئی اس نے بھی اپنی ماں کا دودھ نہیں پیا، بکری کا دودھ پی رہی ہے۔ حالانکہ میں نے اپنے گھر میں وقت حمل مولوی نذیر احمد صاحب دیوبندی کا علاج کرایا جو بچوں کے علاج میں اچھے مانے جاتے ہیں میری بیوی جو بچوں کو مرتے دیکھتی ہے اور صدمہ کرتی ہے جس کا اثر اس کے جسم اور صحت پر پڑتا ہے۔ قریب قریب ہر بچے کی پیدائش میں بیوی کو بخار اور کھانسی شروع ہو جاتی ہے۔ اب کی لڑکی پیدا ہونے پر تو اس کی زندگی کی بھی امید جاتی رہی تھی۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے کیا میں اپنے گھر میں ایسی دوا کھلا سکتا ہوں جس سے بچہ نہ پیدا ہو یا ایسی دوا جو دو تین چار سال تک بچہ پیدا نہ ہونے دے۔

الجواب

ویعزل عن الحرۃ باذنہا لکن فی الخانیہ انہ یباح فی

رما ننا لفساده قال الكمال فليعتبر عذرا مسقطا لاذنها اھ درمختار: وقال الشامی (تنبیہ) اخذ فی النهر من هذا ومما قدمه الشارح عن الخانیہ والكمال أنه يجوز لها سدّ فم رحمها كما تفعله النساء مخالفا لما بحثه فی البحر من أنه ينبغی ان يكون حرامًا بغير اذن الزوج قياسا علی عزله بغير اذنها قلت لٰكن فی البزازية أن له منع امرأته من العزل اھ نعم النظر إلی فساد الزمان يفيد الجواز من الجانبين اھ وقد بين الشامی قبل ذالك جواز اسقاط الحمل قبل نفخ الروح فيه لعذر ونصه قال ابن وهبان ومن الأعذار ان ينقطع لبنها بعد ظهور الحمل وليس لابی الصبی ما يستأجر به الظئر ويخاف هلاكه اھ (ج ۲/ ۶۶۳)

ولا يخفی ان الصورة المسئولة اهون من الاسقاط بكثير واهون من العزل بلا اذن ايضًا بل هو يشبه العزل برضا الجانبين فيجوز ای مع كراهة التنزية بلا عذر وبدونها به.

صورت مسئولہ میں عذر مذکور کی وجہ سے مانع حمل دوا کھلا دینا جائز ہے اور بدون عذر کے کراہت سے خالی نہیں۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ
۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۵ھ

ٹاڑی دوا اور سپرٹ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ تبدیل ماہیت سے حکم بدل جاتا ہے جیسے شراب انگوری سرکہ ہو جائے تو حلال و پاک ہو جاتا ہے۔ اب بعض ادویہ انگریزی کا حال بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ٹاڑی کو لکھا ہے کہ انگوری شراب کو پیپوں سے نکال کر جو تلچھٹ یا برابرون

بیں لگی رہتی ہے اس سے ٹاٹری بناتے ہیں کہ شراب ڈال کر ادویہ کو حل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو خشک جوہر بناتے ہیں تو ایسے شرعًا قلب ماہیت ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اور شراب مثلث حکم میں اسپرٹ کے آتا ہے یا نہیں بلکہ مثلث سے بظاہر اسپرٹ شراب میں یہ بات زیادہ ہے کہ اڑ جاتی ہے۔ ٹارٹرک ایسڈ یا ٹاٹری (ریا املی کاست یا انگور کاست) آب انگور کی شراب بننے کے بعد جو چیز شراب کے پیپوں میں لگی رہ جاتی ہے اس کو ٹارٹار یعنی درد شراب کہتے ہیں اسی درد شراب سے پوٹاسیم ٹارٹریٹ بنائی جاتی ہے۔

(منقول از کتاب غلام جیلانی ص ۵۰۲) اور اس پوٹاشیم سے ٹارٹرک ایسڈ جھنجریڈ کا فود اسپنن آب جنجر سونٹ ایک حصہ الکہال ع حسب ضرورت الکٹی فائڈ اسپرٹ میں سے کاربونیٹ آف پوٹاسیم یا کلورائڈ آف کیلشیم کے ذریعہ اس کو کشید کرنے سے خالص الکحل حاصل ہوتا ہے۔ (حصہ اول ص ۶۲۳)

ولایتی عرق لیمن یا لیمن جوس ــــــــــ، عرق لیموں زیادہ عرصہ تک رکھنے سے خراب ہو جاتا ہے۔ اگر اس میں دس فیصد الکہال ملا دیں تو وہ پھر بگڑتا نہیں۔

الجواب

ٹاٹری سے متعلق صرف تحریر غلام جیلانی سے اس امر کا انکشاف نہیں ہوا کہ ٹاٹری میں خمر کی حقیقت منقلب ہو جاتی ہے یا نہیں اس لئے بنانے والوں سے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ باقی اسپرٹ کو شراب مثلث پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ مثلث میں اجزاء خمریہ نکل جاتے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ مسکر باقی نہیں رہتا اور اسپرٹ میں سکر باقی رہتا ہے اور ابخرات شئ نجس کے جس چیز پر لگیں اگر ابخرات لگنے سے وہ شئ تر ہو جائے تو ناپاک ہے ورنہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ

۲۲ جمادی الثانیہ ۵۳ھ

ع۔ الکہال انگریزی لفظ ایلکہال مشتق ہے۔ عربی لفظ الکحول سے جس کے معنی اصطلاح کیمیا میں نہایت مقطر یا روح کے ہے مگر اب اس لفظ کا اطلاق مطلق روح شراب پر ہوتا ہے۔

"اوکاسا" دوا کے استعمال کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علما دین اس بارے میں کہ ایک دوائی جس کا نام "اوکاسا" ہے۔ جانوروں مثلاً بندر کے غدود سے تیار کی جاتی ہے اس میں سوکھا ہوا جگر بھی شامل کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ یہ دوائی جریان، احتلام اور نامردی وغیرہ جیسے امراض کو پہنچاتی ہے اس کے نافع ہونے کی تصدیق تمام دنیا کے مشہور ڈاکٹر کرتے ہیں۔ متعدد بین الاقوامی تمغہ جات اس کے موجد جرمن ڈاکٹر حاصل کر چکے ہیں۔ کیا کسی مسلمان کو اس کے استعمال کی شرعاً اجازت دی جاسکتی ہے۔

الجواب

تمغہ جات اور تصدیقات سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ جس مریض کے متعلق کوئی مسلمان طبیب یہ تجویز کردے کہ اس سے ضرور نفع ہوگا اور دوسری کوئی جائز دوا تیرے لئے مفید نہیں ہے تب ناجائز دوا کا استعمال جائز ہوجاتا ہے کما صرح بہ صاحب الدر المختار فی فصل فی البیع من الحظر والاباحۃ۔

تتمۃ السوال

اور اگر بالفرض معمولی حالات میں اس کا استعمال جائز نہ ہو تو کن خاص حالات میں اس کی اجازت ہوسکتی ہے مثلاً کسی شخص کو نامردی موذی جیسا مرض لاحق ہو۔

تتمۃ الجواب

اس میں ایذاء کہاں سے آئی

تتمۃ السوال

اور عام علاج سے کوئی فائدہ مرتب نہ ہوتا ہو تو اس کا مریض اس دوائی کے استعمال کا حق رکھے گا۔

تتمۃ الجواب

درحقیقت یہ مرض نہیں ضعف ہے اور تحصیل قوت کے لئے حرام دوائی کا استعمال کسی طرح جائز نہیں پس نامرد کسی حال میں اس دوا کو استعمال نہیں کرسکتا۔ کما فی الشامی تحت قول الدر (للتداوی) ای من مرض او نهزال الیہ لا لنفع ظاھر کالتقوی علی الجماع کما قدمناہ ولا للسمن کما فی العنایۃ (ج/۳۸۳)

احقر عبد الکریم عفی عنہ از تھانہ بھون ۱۵ شوال ۵۱ھ

کتاب اللباس والزینۃ

کرتے کی آستین کی لمبائی کتنی ہونی چاہیئے

سوال: کیا کرتے کی آستین کی لمبائی ہاتھ کے گٹے تک ہونی چاہیئے یا کہ گٹا بالکل چھپ جانا چاہیئے۔

الجواب

قال الملا علی القاری فی شرح الشمائل ص ۱۰۱ ج ۱ قال الجزری فیہ دلیل علی ان السنۃ ان لا یتجاوز کم القمیص الرسغ واما غیر القمیص فقالوا السنۃ فیہ لا یتجاوز رؤس الأصابع من جبۃ وغیرھا وفی شرح الشمائل للمناوی واخرج سعید بن المنصور والبیھقی عن علی رضی اللہ عنہ أنہ کان یلبس القمیص ثم یمد الکم حتیٰ اذا بلغ الاصابع قطع ما فضل ویقول لا فضل للکمین علی الأصابع اھ۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ کرتہ کی آستین گٹے تک ہونی چاہئے اور چونکہ غایۃ اکثر معنیۃ سے خارج ہوتی ہے اس لئے گٹے کا کھلا رہنا بہتر ہے اور ہاتھ کی انگلیوں سے آستین کا بڑھا ہونا خلاف سنت ہے۔ واللہ اعلم۔

احقر ظفر احمد عفی عنہ

۵ محرم ۱۳۴۰ھ

ولایتی کپڑوں کے جلانے اور مال کے ضائع کرنے کا حکم

سوال: ایک اسلامی اخبار میں ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا ہے جس کی سرخی یہ ہے کہ کپڑا جلانا اسراف بیجا نہیں) اور اس سرخی کے تحت لکھا ہے کہ حضرات علماء کرام کی آواز گاندھی کی سودیشی دفعہ پر متفق ہے۔ آگے چل کر صحیح مسلم کی ایک روایت لکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ثوبین معصفرین فقال ان ھذہ من ثیاب الکفّار فلا تلبسھما وفی روایۃ قلت اغسلھما قال بل احرقھما رواہ مسلم۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسم رنگ کے لباس کو آپؐ نے کفار کا لباس فرمایا اور جب عرض کیا کہ رنگ دھوڈالیں تو فرمایا کہ نہیں بلکہ جلا ڈالو۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ میرے نزدیک ایسے کپڑوں کا (مراد ولایتی کپڑا ہے) جلا دینا فرض ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ دشمن اسلام اسلام کو فنا کرنے کے لئے کسی طریقے کا پابند نہیں اسلام بھی مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم بھی مدافعت میں کسی خاص طریق کے پابند نہ رہو اب قابل دریافت یہ امر ہے کہ آیا بحالت موجودہ مسلمانوں کو ولایتی کپڑے کا جلا دینا جائز ہے یا اس سے بڑھ کر فرض واجب ہے یا کہ نہیں۔

الجواب

صورت موجودہ میں مسلمانوں کو اپنے کپڑے کو جلانا جائز نہیں۔

عن المغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ کرہ لکم ثلاثا۔ قیل وقال اضاعۃ المال وکثرۃ السوال: رواہ البخاری واللفظ لہٗ ومسلم وابوداؤد۔

باقی اخبار کے مضمون نگار نے جس حدیث سے اس کے جواز پر استدلال کر کے اس کو فرض قرار دیا ہے یہ استدلال بالکل صحیح نہیں کیونکہ جس حدیث سے اضاعت مال کی حرمت ثابت ہوتی ہے وہ عام ہے اور عبداللہ بن عمر کا واقعہ خاص ہے جو کہ احادیث میں مختلف الفاظ سے مذکور ہے جن میں باہم تعارض ہے۔ چنانچہ ایک طریق مسلم کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

انک امرتک بھذا فقلت اغسلھما قال بل احرقھما

اور روایت نسائی کے یہ الفاظ ہیں:

عن عبد اللہ بن عمر انہ اتی النبی صلی اللہ علیہ وعلیہ ثوبان معصغران فغضب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقال اذھب فاطرحہما عنک قال این یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی النار۔ وسکت عنہ النسائی اور ابوداؤد واحمد وابن ماجہ کے یہ الفاظ ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال ہبطنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ثنیۃ فالتفت الیّ وعلیّ ریطۃٌ مضرّجۃ بالعصفر فقال ما ھذہ الریطۃ علیک فعرفت ما کرہ فاتیت أھلی وھم یسجرون تنوراً لھم فقذفتہا فیہ ثم اتیتہ من الغد فقال یا عبد اللہ ما فعلت الریطۃ فاخبرتہ فقال أفلا کسوتہا بعض اھلک فانہ لا بأس بہا للنساء اھ رجالہ ثقات وعمرو بن شعیب الجمہور علی توثیقہ والاحتجاج بروایتہ عن ابیہ عن جدہ وکذا فی الترغیب للمنذری قال فی النیل قولہ لبعض اھلک یعنی زوجتہ او بعض نساء محارمہ واقاربہ وفیہ دلیل علی جواز لبس المعصفر للنساء وفیہ الانکار علی إحراق الثوب المنتفع بہ لبعض الناس دون بعض لانہ من اضاعۃ المال المنہی عنہا اھ۔

پس یہ روایت ابوداؤد اور روایت مسلم کے معارض ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عبد اللہ بن عمرؓ کو اس کپڑے کے جلا دینے کا حکم دیا تھا اور اس سے یہ معلوم ہے کہ جب انہوں نے اس کو جلا دیا اور حضورؐ کو اس کی اطلاع دی تو آپؐ نے اس پر انکار فرمایا کہ تم اپنے کسی گھر والے کو وہ کپڑا کیوں نہ پہنا دیا کیونکہ عورتوں کے لئے اس کے استعمال کی اجازت ہے اھ اب ان روایتوں کی تطبیق میں فقہا و محدثین نے مختلف توجیہیں بیان فرمائی ہیں۔ بعض نے ان سب روایات کو ایک ہی واقعہ پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ احتمال ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود حقیقۃً جلا دینا نہیں تھا بلکہ مطلب یہ تھا کہ ان کو اپنے پاس سے دور کر دو۔ خواہ بیچ دو یا کسی کو دے دو۔ آپ نے مبالغہ کے طور پر سختی انکار کے لئے اس مراد کو مجازاً احراق سے تعبیر فرمایا جیسا کہ ہمارے محاورہ میں ایسے موقع میں یہ کہا کرتے ہیں کہ چولہے میں ڈالو۔ جس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ سچ مچ جلا دو بلکہ صرف اظہار نفرت اور اس چیز کے علیحدہ کر دینے کی ترغیب مدنظر ہوتی ہے اور اس تاویل کی تائید روایت نسائی سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ قال اذھب فاطرحھما عنک۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمر سے فرمایا کہ جاؤ ان کپڑوں کو اپنے سے جدا کر ڈالو۔ قال این یارسول اللہ قال فی النار: انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ کہاں ڈال دوں، فرمایا کہ آگ میں جھونک دو، اس روایت میں صاف تصریح ہے کہ حضورؐ نے اوّلاً ان کو یہی حکم دیا تھا کہ ان کو اپنے سے جدا کر دو پھر جب صحابی نے دوبارہ سوال کیا تو آپؐ نے سختی کے ساتھ فرمایا کہ چولہے میں ڈالو۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ روایت نسائی اور روایت مسلم جس میں احرقھما کا لفظ ہے دونوں کے راوی طاؤس ہیں اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت احرقھما، بصیغۂ امر روایت بالمعنی ہے کہ فی النار کے بجائے اس کے مضمون کو صیغۂ امر سے راوی نے بیان کر دیا۔ غرض آپ نے تو فی النار یا احرقھما سے مجازاً ان کپڑوں کا علیحدہ کرنا مراد لیا تھا مگر عبداللہ بن عمر اس کے حقیقی معنی سمجھے اور جا کر ان کو جلا دیا۔ اگلے دن جب وہ آئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کے اس فعل پر انکار کیا اور فرمایا کہ تم نے اپنے گھر کی عورتوں میں سے کسی عورت کو وہ کپڑا کیوں نہ پہنا دیا۔ کیونکہ ان کے لئے اس کا مضائقہ نہ تھا۔

(مرقات ص ۱۲۱ ج ۴) میں ہے۔ قال القاضی قیل اراد بالاحراق افناء الثوبین ببیع او ھبۃ ولعلہ استعار بہ عنہ للمبالغۃ والتشدید فی النکیر وانما لم یاذن فی الغسل لأن المعصفر وان کان مکروھا للرجال فھو غیر مکروہ للنساء۔ فیکون غسلہ تضیعًا واتلافًا للمال ویدل علی ھذا التاویل ماروی انہ اُتی اھلہ وھم یسجرون التنور فقذ فھا فیہ ثم لما کان

الغد اتاہ فقال لہٗ یا عبد اللہ ما فعلت فأخبرہ فقال افلا کرتہا بعض اھلك فأنہٗ لا بأس بھما للنساء ثم قال فاتھما فعل عبد اللہ ما فعل لما رأی من شدّۃ کراھۃ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یفھمہ الظاھر أو لتوھمہ عموم الکراھتہ والحمل علی الاخیر اولی۔

اور بعض علماء نے ان روایات کو متعدد واقعات پر محمول کرکے تعارض کو رفع کیا ہے مگر یہ تاویل بعید ہے کیونکہ ایک صحابی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے بعد دوبارہ اسی فعل کا صادر ہونا بہت مستبعد ہے۔ بہرحال ان بعض علماء نے یہ توجیہہ بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار عبد اللہ بن عمرؓ کو نرمی سے منع فرمایا تھا کہ یہ لباس کفار کا ہے اس کو نہ پہنو مگر وہ بھول گئے اور دوبارہ پھر اس کو استعمال کیا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ غصّہ آیا اور آپ نے ان کو بطور سزا کے حکم دیا کہ ان کو جلا دو، تاکہ اس نقصان کے بعد یہ ممانعت بخوبی یاد رہے۔

قال النوویؒ واما الامر باحراقھا فقیل ھو عقوبۃ و تغلیظ لزجرہ وزجر غیرہ عن مثل ھذا الفعل و ھذا نظیر أمر تلك المرأۃ التی لعنت الناقۃ بارسالھا و أمر اصحاب بریرۃ بہ بیعھا و انك علیھم اشتراط الولاء و نحو ذالك. واللہ اعلم ص ۱۹۳ ج ۲ مسلم شریف۔

خلاصہ یہ کہ عبد اللہ بن عمرؓ کی جس روایت سے مضمون نگار نے کپڑوں کے جلانے کو بصورت موجودہ جائز بلکہ فرض قرار دیا ہے۔ یہ دین میں بہت بڑی تعدّی اور تحریف ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ آج کل بعض نام کے مولوی ہر وقت اس کوشش میں ہیں کہ گاندھی کے منہ سے جو کچھ نکلے اس کو گڑھ مڑھ کر شریعت میں ٹھونس دینا چاہیئے بھلا پھر اس صورت میں نصرتِ الٰہی مسلمانوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

اہلِ علم نے اس تفصیل سے بخوبی سمجھ لیا ہوگا کہ اس حدیث میں جس

سے مضمون نگار نے استدلال کیا ہے توجیہہ اوّل کی بنا پر تو احراق کا حکم ہی نہیں۔ بلکہ احراق سے مجازاً ان کپڑوں کا علیحدہ کرنا مقصود تھا۔ پھر دوسری روایت میں عبداللہ بن عمر کے فعل احراق پر حضورؐ کا انکار فرمانا مصرّح ہے اور دوسری توجیہہ بعید یہ اگر یہ مان لیا جائے کہ آپؐ نے ان کو احراق کا حکم دیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ عبداللہ بن عمرؓ نے حضورؐ کی ممانعت کے بعد ایسا رنگین لباس پہنا تھا جس کا پہننا مردوں کے لئے حرام اور اس کا استعمال کفّار کا شعار تھا (کما یظھر من قولہ انھما من ثیاب الکفّار) اس لئے آپؐ نے بطور سزا اور جرمانہ کے احراق کا حکم فرمایا۔ پس مستدل بتلائے کہ صورت موجودہ میں وہ مسلمانوں کو کپڑے جلانے کا حکم کس جرم کی سزا میں دے رہا ہے اور یہ بھی بتلائے کہ مسلمانوں پر جرمانہ مالی عائد کرنے کا آیا بجز امام کے کس کو حق ہے وہ ہرگز اس کو ثابت نہیں کر سکتا اور اگر وہ کہے کہ ہم کفّار کو جلانے اور غیظ دلانے کے لئے ولایتی کپڑے جلانے کا حکم دیتے ہیں تو اس کو یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمر کو احراقِ ثیاب کا حکم کفار کو غیظ دلانے کے لئے فرمایا تھا وہ ہرگز اس کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضورؐ بعد میں یہ نہ فرماتے کہ تم نے اپنے گھر کی کسی عورت کو وہ کپڑا کیوں نہ پہنا دیا اور اگر وہ واقعہ بنی نضیر سے استدلال کرے کہ حضورؐ نے یہود بنی نضیر کے باغات اور کھجوریں اور کھیتیاں جلوا دی تھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تک وہ مال مسلمانوں کے قبضہ میں نہ آیا تھا کیونکہ اس وقت تک آپ یہود کا محاصرہ کئے ہوئے تھے اور جنگ ختم نہ ہوئی تھی تو وہ مال کفار حربین کا مال تھا جو کہ معصوم نہیں۔ اس لئے اس کا جلا دینا جائز تھا۔ یہ کہیں ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کفّار کو غیظ دلانے کے لئے مسلمانوں کا مال جلا دیا ہو اور کسی کو یہ شبہ ہو کہ ان احادیث سے جواز احراق اگرچہ ثابت نہ ہو مگر مسلم کی روایت سے اتنا تو معلوم ہوا کہ ثیاب کفّار کا پہننا جائز نہیں (لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھذہ ثیاب الکفّار فلا تلبسھما) اور ولایتی مال بھی کفار کا لباس ہے کیونکہ ان کے ملک سے آتا ہے اور کفّار اس کو پہنتے ہیں اس لئے یہ بھی حرام ہونا چاہیئے اور اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث

مسلم میں ثیاب کفار سے یہ مراد نہیں ہے کہ چونکہ یہ کپڑا کفار کا بنا ہوا ہے اور ان کے ملک سے آیا ہے اس لئے اس کو نہ پہنو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس خاص رنگ کا استعمال مردوں میں ہونا کفار کا شعار ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ میں کسم کا رنگا ہوا کپڑا مردوں کے لئے اب تک حرام ہے اور معنی اوّل اس لئے غلط ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کفار کے ملک کا کپڑا بلا تکلف استعمال کرتے جو کفار ہی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ چنانچہ زاد المعاد جلد اوّل میں ہے:

وفی الصحیحین عن قتادة قلت لانس ای اللباس کان احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الحبرة والحبرة برد من برود الیمن فان غالب لباسھم کان من نسج الیمن لأنھا قریبة منھم وربما لبسوا ما یجلب من الشام ومصر کالقباطی المنسوجة من الکتان التی کانت تنسجھا القبط (ص۳۷ ج۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اکثر یمن کا کپڑا پہنتے تھے۔ کیونکہ وہ قریب تھا اور ظاہر ہے کہ یمن کے لوگ آپ کی حیات میں سب مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نیز آپ نے شام اور مصر کا کپڑا بھی استعمال کیا ہے حالانکہ وہ اس وقت خالص کفّار کا ملک تھا اور وہاں کا کپڑا کفار ہی کا بنا ہوا تھا۔ نیز آپؐ نے فارس کا بنا ہوا کپڑا بھی پہنا ہے اور یہ ملک تھا جہاں کے بادشاہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کے ساتھ گستاخی کی تھی اور اس وقت وہاں کے لوگ سب کافر تھے۔

وفی صحیح مسلم عن اسماء بنت أبی بکر قالت ھذہ جبة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فأخرجت جبة طباسیة کروانیة (وفی روایة خروانیة) لھا لبنة دیباج وفرجاھا مکفوفان الخ۔

پس کفّار کے ملک کا کپڑا یا ان کا بنا ہوا استعمال کرنا ہرگز حرام نہیں۔ البتہ ان کی وضع اور ہیئت اور شعار کو اختیار کرنا حرام ہے۔ اب آپ اس سے فیصلہ کر لیجئے کہ آج کل کپڑوں کے جلانے سے اتباع شریعت کہاں تک مقصود ہے کہ شریعت نے کفار کے ملک کا کپڑا اور ان کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرنا جائز کیا ہے اس کو تو یہ

لوگ حرام کر رہے ہیں اور شریعت نے کفار کی وضع قطع ہیئت کو منع کیا ہے اس کو یہ لوگ اختیار کر رہے ہیں کہ اگر گاڑھے کا کپڑا ہی پہنیں گے تو اس کو کوٹ پتلون کی وضع پر سلوائیں گے۔ نعوذ باللہ من ھذہ المعاندہ للشریعۃ المطھرۃ۔

پس ہمارے نزدیک دلائل شریعت سے ولایتی کپڑا کا استعمال بالکل جائز ہے مگر واجب بھی نہیں اس لئے اگر کسی مصلحت کے لئے ولایتی مال کو چھوڑ کر دیسی مال اختیار کر لیا جائے اور اعتقاداً اس کو بھی جائز سمجھا جائے تو یہ بھی جائز ہے بلکہ مصلحت پر نظر کر کے اچھا ہے۔ اس سے آگے بڑھنا شریعت کی تحریف ہے اور مضمون نگار نے آخیر میں جو لکھا ہے کہ دشمنِ اسلام اسلام کے تباہ کرنے کے لئے کسی طریق کا پابند نہیں۔ اسلام بھی مسلمانوں کو اجازت دیتا ہے کہ تم بھی مدافعت میں کسی خاص طریق کے پابند نہ رہو۔ الخ

اس پر میں مضمون نگار سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی یہ اجازت باین الفاظ ہم کو کہیں دکھلا دیں اور یہ بھی بتلا دیں کہ کیا شریعت نے اس کا بھی حکم کیا ہے کہ دشمن کی مدافعت میں تم جو کچھ کرو اس کو فرض و واجب بنا کر کرو اور دین میں تحریف کر دیا کرو۔ کیا مضمون نگار کے نزدیک اگر کسی وقت کفار مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے لگیں تو اسلام مسلمانوں کو بھی یہ اجازت دے گا کہ وہ بھی مدافعت میں کفار کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے لگیں اور کسی خاص طریق کے پابند نہ رہیں۔

افسوس مضمون نگار نے اسلامی تعلیم کو کس غلط طریقہ سے بُرے عنوان میں بیان کیا ہے اسلام کی تعلیم یہ ہے۔ ولا یجرمنکم شنآن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے، جس میں عدل وصبر کی غایت درجہ رعایت اور حد سے آگے بڑھنے کی پوری ممانعت ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ احقر الطلبہ
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۶ محرم ۱۳۴۰ھ

عینک کی کمانی سونے کی بنلانے کا حکم

سوال: چشمہ یعنی عینک جو کہ آنکھ میں بینائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا فریم یعنی کمانی اگر سونے کی ہو تو استعمال جائز

ہے یا نہیں؟

الجواب

عینک کی کمانی سونے اور چاندی کسی کی جائز نہیں۔

قال فی الدّر: وکذا الاناء المصبب بذهب أو فضّة والکرسی المصبب بهما وحلیة مرآة رو فی المنح والهدایة وغیرهما حلقة مراة بالقاف قال فی الکفایة والمراد بها التی تکون حوالی المرآة اه شامی) رمصحف لهما الی أن قال ولم یضع یده موضع الذهب والفضة الخ رص ۳۲۷ ج ۵)

پس عینک کی کمانی حلقۂ مراۃ کے مشابہ ہے اور وہ اس شرط سے جائز ہے کہ چاندی اور سونے کی جگہ پر ہاتھ نہ رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ عینک کا لگانا بدون کمانی کو ہاتھ لگائے دشوار ہے۔ اس لئے ناجائز ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد، ۲۶ محرم ۱۳۴۰ھ

ریشمی رومال اور ٹسر سے بنے ہوئے عمامہ کا حکم

سوال: (۱) کیا رومال ریشمی مردوں کو استعمال کرنا درست ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ درست ہے اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں، رومال لباس میں داخل نہیں۔ (۲) بھاگلپوری صافہ کو بعض لوگ کہتے ہیں ریشم ہے اس کا استعمال جائز نہیں۔ حضور تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

(۱) ریشمی رومال کا کندھے پر ڈال کر چلنا یا گلے میں باندھنا یا اس سے منہ ہاتھ پونچھنا جائز نہیں کہ یہ داخل استعمال ہے اور اگر اس میں روپے پیسے باندھ کر جیب میں ڈال لیں تو جائز ہے۔

قال فی الدّر: وکذا تکره القلنسوة وان کانت تحت العمامة والکیس الذی یعلق اه قال الشامی والظاهر ان اراد بالکیس المعلق نحو کیس التمائم المسمّاة بالحمائلی بخلاف کیس

الدراهم إذا كان يضعه في جيبه مثلاً بدون تعليق۔ وفي القنية دلال يلقي الثوب الديباج على منكبيه للبيع يجوز اذا لم يدخل يديه في الكمين وقال الكرابيسي فيه كلام بين المشايخ اھ ووجه الاول ان القاء الثوب على الكتفين انما قصد به الحمل دون الاستعمال فلم يشبه اللبس المقصود للانتفاع تأمل اھ (ج ۵/۳۴۷)

قلت ولا شك ان المنديل يلقى على المنكبين بقصد الاستعمال فيكره وفي القنية انه تكره اللفافة الابريسمية والظاهر ان المراد بها شي يلف على الجسد او بعضه لا ما يلف به الثياب تامل اھ

(۲) ہم کو بھی تحقیق ہوئی ہے کہ ٹسر ریشم ہے اور بھاگلپوری عمامے اکثر ٹسر ہی کے ہوتے ہیں۔ پس اگر تانا بانا دونوں ٹسر ہے تو استعمال ناجائز ہے اور اگر بانا سوت کا ہو تو جائز ہے۔ قال في الدر: ويحل ما سداه ابريسم ولحمته غيره كالكتان وقطن اھ (ج ۵/۳۴۹) واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد، ۱۰ ربیع الثانی ۴۰ھ

حلق، رخسار اور گردن کے بال مونڈنے کا حکم

سوال: مونچھ یا مونچھ کے نیچے یا حلق یا رخسار یا گردن کے بال استرہ سے بنوانا کیسا ہے۔

الجواب

قال في العالمگيرية ويأخذ من شاربه حتى يصير مثل الحاجب كذا في الغياثية وكان بعض السلف يترك سباله وهو اطراف الشوارب كذا في الغرائب ذكره الطحاوي في شرح الآثار ان قص الشارب حسن قال والحلق سنة وهو احسن من القص وهذا قول أبي حنيفة وصاحبيه (ج ۶/۲۳۸)

وفي هداية النور في احكام الشعور للمفتي سعد الله۔

حلق شعور بهروت بدعت است بر قول أصح ابو المکارم وشرح مختصر از زاهدی می ارد حلق الشارب بدعةٌ وقیل سنة اھ وفی النیل وذهب کثیر منهم الی منع الحلق والاستیصال والیه ذهب مالك وکان یری تادیب من حلقه وروی عنه ابن القاسم انهٗ قال احفاء الشارب بدعةٌ قال النووی المختار انهٗ یقصّ حتی یبدو طرف الشفة ولا یحفه من اصله اھ (ج ۱/ ۱۱۱) قال فی النهایة احفاء الشوارب أن یبالغ فی قصّها۔

پس مونچھوں کا مونڈنا اگرچہ ایک قول پر جائز ہے مگر راجح یہ ہے کہ بدعت ہے اور سنّت یہ ہے کہ قینچی سے کتروادے اور کترنے میں مبالغہ کرے کہ بال کھال سے مل جائیں۔

وفی هدایة الفور ایضًا محدث وهو در شرح صراط مستقیم فی آورد حلق طرفین عنفقة لا بأس به است وفیه ایضًا۔ وحد ش (یعنی سرحد) جانب قفا تا گردن است اما گردن خارج است اھ وفیه ایضًا ور مضمرات لا بأس بأخذ الحاجبین وشعور وجهه مالم یشبهه المخنث اھ وفی العالمگیریه عن ابی حنیفةؒ یکره ان یحلق قفاالّا عند الحجامة وفیه لا یحلق شعر حلقه وعن أبی یوسف لا بأس به اھ (ج ۶/ ۲۳۸)

بقیہ سوالات کا جواب ان عبارات میں موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گردن اور رخسار کے بال مونڈنا جائز اور حلق میں اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد

۲۶ ربیع الثانی ۴۰ھ

ولایتی اشیاء کے استعمال کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ ولایت کا بنا ہوا کپڑا یا دیاسلائی چاقو قلم کاغذ یعنی جو جو چیز ضرورت کی ہے اس کا استعمال کرنا جائز ہے کسی کتاب

سے حرمت ثابت ہوتی ہے کہ نہیں ؟

الجواب

ان سب چیزوں کا استعمال کرنا جائز ہے کسی کتاب سے حرمت ثابت نہیں ہے نہ شارع نے منع کیا ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۶ جمادی الاولیٰ ۵۱ھ

کرتے کالر لگوانے کا حکم

سوال: اکثر لوگ انگرکھے یا کرتے میں گلے کے پاس کالر لگواتے ہیں۔ زید کہتا ہے کہ یہ کالر نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہے۔ کالر وغیرہ کچھ نہیں لگوانا چاہیئے تو کیا واقعی یہ ممنوع ہے اور مشابہت بالنصاریٰ ہے یا نہیں ؟

الجواب

بے شک کالر لگانا مشابہت بالنصاریٰ میں داخل ہے اور ناجائز ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

ریشم کی جانماز پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: ریشم کی جانماز پر نماز پڑھنا جائز ہے یا ہے ؟

الجواب

قال فی الدر فی باب لبس الحریر من کتاب الحظر والاباحۃ مانصہ ویحل توسدہ وافتراشہ والنوم علیہ وقالا والشافعی ومالک حرام وھو الصحیح کما فی المواھب فلیحفظ ھذا الصحیح خلاف ما علیہ المتون المشھورۃ المعتبرۃ والشروح إلی ان قال (تتمہ) یجری الاختلاف المار بین الامام وصاحبیہ فی ستر الحریر وتعلیقہ علی الابواب کما فی الھدایۃ وکذا لایکرہ وضع ملاءۃ الحریر علی مھد الصبی وقدمنا کراھۃ استعمال اللحاف من الابریسم لانہ نوع لبس بخلاف الصلاۃ علی السجادۃ منہ لان الحرام ھو اللبس دون الانتفاع إلی ان قال لکن نقل الحموی عن شرح الھاملیۃ للحدادی أنہ

تکرہ الصلاۃ علی الثوب الحریر للرجال اھ قلت والاوّل اوجہ اذ لا فرق یظھر بین الافتراش للجلوس أو النوم او للصلاۃ تدبّر اھ (ص ۳۴۹ ج ۵) وفیہ ایضًا وانما حلّ ای التوسد والنوم علی الحریر ۱۲) لما روی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلس علی مرفقۃ حریر وکان علی بساط ابن عباس مرفقۃ حریر وروی ان انسًا رضی اللہ عنہ حضر ولیمۃ فجلس علی وسادۃ حریر ولان الجلوس علی الحریر استخفاف بہ ولیس لتعظیم فجری الجلوس علی بساط فیہ تصاویر منح عن السراج اھ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ریشم کے کپڑے پر بیٹھنا اور سونا اور تکیہ لگانا اور نماز پڑھنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸؍ ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ

بید سے بنی ہوئی ٹوپی پہننے کا حکم سوال: اس دیار بنگالہ میں بید سے تار نکال کر ٹوپیاں بناتے ہیں۔ یہ ٹوپی استعمال کرنا جائز ہے یا نہ۔

الجواب

جائز ہے لعدم ما یدلّ علی الحرمۃ۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲ جمادی الثانیہ ۱۳۴۱ھ

پائجامہ ٹخنوں سے نیچا رکھنا سوال: مرد کے لئے پائجامہ گھوٹی سے نیچا رکھنا نماز میں یا غیر نماز میں درست ہے یا نہیں؟

الجواب

سوال میں ایک لفظ گھوٹی سمجھ نہیں آیا اگر اس کے معنی ٹخنہ کے ہیں تو ٹخنہ سے نیچے پائجامہ یا لنگی کا رکھنا نماز و غیر نماز ہر حالت میں گناہ ہے۔

واللہ اعلم۔ ۴ رجب ۱۳۴۱ھ

عورتوں کے لئے بالوں کا جوڑا باندھنا جائز ہے

سوال: عورتوں کو سر کے بالوں کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا کہ مکروہ ہے۔

الجواب

عورت کے لئے بالوں کا جوڑا باندھنا مکروہ نہیں۔

قال فی رد المحتار روی الطبرانی انه علیه الصلاة والسلام نهی ان یصلی الرجل ورأسه معقوص اھ (ج ۱/ ۶۷۱) اس میں ممانعت مردوں کو ہے قال العزیزی واسناد صحیح (ج ۳/ ۴۰۲)

وفی حاشیة الحفنی خرج المرأة والخنثی فیطلب عقص شعرهما لطلب المبالغة فی سترهما، قلت وقواعدنا لاتاباه۔ واللّٰه اعلم۔ ظفر احمد عفی عنہ ۶ رجب ۱۳۵۱ھ

چہرہ اور ہتھیلیوں کا ضرورت کے وقت ستر واجب نہیں

سوال: پردہ کے بارے میں فقہاء کرام نے یہ کیسے لکھ دیا کہ اِلَّا وجهها وکفیها اور وَلَا تُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ سے مستنبط کرتے ہیں کہ زینت سے مواضع زینت مراد ہیں اور وجہ وکف موضع زینت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں عضو اعلیٰ درجہ کے موضع زینت ہیں یعنی وجہہ کی زینت پان مسّی سرمہ سے اور ناک کی زینت کیل اور نتھ سے کی جاتی ہے اور ہاتھ کی مہندی اور انگوٹھیوں سے کی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے عضو مستور مواضع زینت نہیں ہیں۔ کیونکہ نہ اس کے لئے خاص زیور ہے اور نہ کوئی خاص مصالحہ یا خضاب۔ پھر اگر فقہاء کا قول مان لیا جاوے تو مروجہ پردہ بالکل رخصت ہو جائے گا بلکہ امتثال امر بلکہ اجتناب بدعة کے طور پر اسے خود رخصت کرنا پڑے گا۔

الجواب

فقہاء کرام نے وجہ وکفین کا استثناء "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ سے مستنبط نہیں کیا بلکہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا فرمایا ہے۔

اس سے یہ استثناء مستنبط ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ زینت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک زینت خفیہ (جس کے اخفاء میں حرج نہیں) دوسری زینت ظاہرہ (جس کے اخفاء میں کام کرنے والی عورتوں کو حرج ہوتا ہے) پس وجہ وکفین بھی داخل زینت ہیں مگر وہ از قبیل زینت ظاہرہ ہیں۔ منجملہ زینت خفیہ کے نہیں اور یہ بات بالکل بدیہی ہے۔ غریب عورتوں کو کام کاج کے حرج کے واسطے اظہار وجہ وکفین کی سخت ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اس کو عورت نہیں قرار دیا گیا البتہ اگر خوف فتنہ ہو تو اس وقت اس کا چھپانا بھی واجب ہے۔ چنانچہ اس وقت کے لئے حکم ہے یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن (فی الجلالین جمع جلباب وھی الملحفۃ التی تشتمل بھا المرأۃ ای یرخین بعضھا علی الوجوہ اذا خرجن لحاجتھن الا عینا واحدۃ اھ (ص۳۵۵)

اور جس وقت باہر نکلنے کی ضرورت نہ ہو بلکہ اس سے استغناء ہو تو اس وقت کے لئے یہ حکم ہے وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ۔ وفی الجلالین تحت قولہ تعالیٰ ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا، وھو الوجہ والکفان فیجوز نظرہ لاجنبی ان لم یخف فتنۃ فی احد الوجھین والثانی یحرم لانہ مظنۃ الفتنہ ورجح حسما للباب۔

ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الخفیۃ وھی ما عدا الوجہ والکفین الخ اس سے معلوم ہو گیا کہ استثناء وجہ وکفین الا ما ظھر سے مستنبط ہے اور اس کو محل زینت سے خارج نہیں کیا گیا اور اس کا کھولنا بوقت ضرورت بقید امن عن الفتنۃ جائز ہے۔ ان عورتوں کو جن کو باہر نکلنے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو اس سے مستغنی ہوں ان کے لئے قرار فی البیوت کا حکم ہے۔ پس پردہ مروجہ کس طرح رخصت ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۹ رمضان المبارک

سونے، چاندی کے بنے ہوئے دانت لگانا اور اس حالت میں وضو وغسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ دانت خراب ہو جانے کی حالت میں

ان کی درستی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے اگر دانت بالکل اکھڑ گئے ہوں تو پتھر یا سونے یا چاندی کے مصنوعی دانت یا تو بالکل جما دیتے ہیں کہ وہ ہمیشہ جمے رہتے ہیں۔ بغیر ڈاکٹر کے نکالے نہیں نکلتے یا اس طرح لگا دیئے جاتے ہیں کہ جب چاہو خود ان کو نکال لو۔ اور جب چاہو لگا لو۔ اور اگر اصلی دانت اکھڑا ہوا نہ ہو بلکہ اور کچھ خرابی اس میں آگئی ہو تو اس پر چاندی یا سونے کا خول چڑھا دیتے ہیں کہ وہ ہمیشہ چڑھا ہوا رہتا ہے جب چاہو نکال لینے اور لگا لینے کی شکل اس میں نہیں اور اگر کیڑا وغیرہ لگ جانے کی وجہ سے سوراخ ہو گیا ہے تو اس میں چاندی یا سونا گلا کر بھر دیتے ہیں پس ارشاد ہو کہ جملہ صدر مذکورہ میں کون سی صورت جائز ہے اور کون سی ناجائز یا کل صورتیں شرعاً جائز ہیں خول چڑھانے یا چاندی سونا بھر دینے کی صورت میں بحالت غسل کوئی خرابی آئے گی یا نہیں۔

الجواب

(۱) پتھر کے دانت بالکل جائز ہیں سونے کے مسلم دانت جائز نہیں امام صاحب کے نزدیک اور امام محمدؒ کے نزدیک سونے چاندی دونوں کے جائز ہیں۔

(۲) چاندی یا سونے کے تاروں سے دانتوں کو مضبوط کر دینا جائز ہے تاکہ وہ حرکت نہ کریں باقی سونے کا خول نہ چڑھایا جائے گو جائز ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک سونے کا بھی چاندی کا بھی۔

(۳) دانت میں سوراخ ہو جائے تو اس میں چاندی یا سونے کو گلا کر بھر دینا جائز ہے جس سے دیکھنے میں مثل میخ اور کیل کے معلوم ہو۔ فقہاء نے مسامیر ذہب کی اجازت دی ہے۔

قال فی العالمگیریة: قال محمد فی الجامع الصغیر ولا یشدّ الاسنان بالذھب ویشدّھا بالفضة وھذا قول أبی حنیفةؒ وقال محمدؒ یشدّھا بالذھب ایضاً. قطعت انملة یجوز ان یتخذھا من ذھب او فضّة. بخلاف لو قطعت یدہٗ او اصبعہٗ اھ۔

(ج ۶/ ۲۲۵)

وفی الشامیة: اذا اجدع انفہٗ او اذنہٗ او سقط سنہ فأراد أن یتخذ سنًا آخر فعند الامام یتخذ ذلك من الفضّة فقط وعند محمد من الذهب ایضًا. اھ (ج ۵/۳۵۶)

جس وقت دانت اچھی طرح جمے ہوئے ہوں کہ بدون مشقت کے جدا نہ ہوسکیں تو ان کا منہ میں رہنا غسل کے لئے مضر نہیں جو حکم اصلی دانتوں کا ہے وہی حکم ان کا ہے اور اگر بسہولت جدا ہوسکیں تو غسل کے وقت ان کو نکال کر کلی کرنا چاہیئے۔ قلت ووجهه ما فی الهدایة، اذا کان حلیة السیف لا یعسر انفصالها منه لا یبطل البیع فی السیف بالافتراق قبل قبض ثمنه، واذا کان لا یتخلص الّا بضرر بطل البیع فیهما (ج ۳/۹۰) فعلم به ان ما لا یتخلّص الّا بضرر فهو کالمتصل وما یتخلص بغیر ضرر فهو فی حکم المنفصل واللہ اعلم۔

حرّرہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

تسبیح میں ریشم کا ڈورا ڈالنا سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ تسبیح کے ڈورے میں ریشم کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

جائز ہے لأن الحرمة فی لبس الحریر وهذا لیس من اللبس فی شئ۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۳ شعبان ۱۳۴۲ھ

کوٹ پتلون پہننے کا حکم سوال: نصاریٰ لوگ جو کوٹ پتلون وغیرہ پہنتے ہیں اس کا مسلمانوں کو پہننا اور چنڈول فٹ بال کا کھیلنا نصاریٰ کی مشابہت ہے یا نہیں۔ یہاں ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ریل، بندوق وغیرہ جو کچھ ان کی ایجاد کی ہوئی چیزیں ہیں ان کا استعمال کرنا، ریل پر سوار ہونا، بندوق رکھنا وغیرہ یہ بھی جائز نہیں

الجواب

کوٹ پتلون وغیرہ انگریزوں کا قومی شعار ہے لہٰذا اس کا پہننا مکروہ ہے۔

اور اگر تشبہ کی بھی نیت ہو تو حرام ہے۔ ریل، بندوق وغیرہ پر اس کا قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ وہ نصاریٰ کا قومی شعار نہیں۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۵ شعبان ۴۲ھ

لڑکی کا سر منڈانا کس عمر تک جائز ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ لڑکی کا سر منڈوانا کس عمر تک جائز ہے اور کتنی عمر تک اس کو بال رکھنا فرض ہے۔ ہمارے بعض لوگ دو سال اور بعض لوگ چار سال اور بعض لوگ پانچ سال تک کی لڑکی کا سر منڈواتے رہتے ہیں اور پھر اس کے بعد بال رکھوانا شروع کرتے ہیں تو یہ درست ہے یا نہیں؟ اس میں عذر یا عدم عذر وغیرہ کا کچھ خیال نہیں ہوتا محض دستور کے مطابق یہ بات جاری ہے۔

الجواب

قال الطحطاوی فی حاشیہ علی مراقی الفلاح قال فی السراج الصغیر جدا لا تکون له عورةٌ ولا بأس بالنظر الیها ومسّها. (ص ۱۳۹)

وفی الدرّ لا عورة للصغیر جدًا ثم ما دام لم یشتہ فقبل ودبر ثم تغلظ إلی عشر سنین ثم کبالغ اھ قال الشامی قوله الصغیر جدًا قال: وفسره شیخنا بابن اربع فما دونها ولم ار لمن غیرا اھ وحد الاشتهاء یعتبر بحال کل صبی وصبیة فاذا بلغ حد الشهوة وقدرهٗ بعضهم بسبع وبعضهم بتسع وسیاتی فی باب الامامة تصحیح عدم اعتباره بالسن بل المعتبر ان تصلح للجماع بان تکون عبلةً ضخیمةً فلهٗ حکم البالغین فیجب علی الولی أن یأمرهٗ بستر العورة هذا ما علمتهٗ من کلام الشامی (ج ۱/ ۲۲۳)

ان جزئیات سے معلوم ہوا کہ نابالغ لڑکی ستر عورۃ کے بارہ میں نو/دس سال میں اور جو اٹھان کی زیادہ ہو اور اس کی طرف خواہش ہونے لگی ہو تو اس سے پہلے ہی مثل بالغ کے شمار ہوتی ہے اور عورت بالغہ کو بلا عذر قوی کے سر منڈانا

جائز نہیں تو جو لڑکی بالغ ہے اس کا بھی یہی حکم ہوگا اور مناسب یہ ہے کہ جب لڑکی نو برس کی ہو جائے گو قابل شہوت نہ ہوئی ہو اس کا سر نہ مونڈا جائے کیونکہ یہ اقل مدت اس کے بلوغ کی ہے۔ باقی عذر کی وجہ سے تو بالغ عورت کا سر مونڈنا بھی جائز ہے۔ نابالغ کا بدرجہ اولیٰ اور عذر کی مثال یہ ہے کہ سر میں ایسا درد ہو جو بدون سر مونڈے اچھا نہ ہو یا سرسام وغیرہ پڑ جائے وغیرہ وغیرہ۔

قال فی العالمگیریة: فلو حلقت المرأة رأسها فإن فعلت لوجع اصابها لا بأس به وان فعلت ذالك تشبها بالرجال فهو مکروه اھ (ج ۶/ ۲۳۸) واللہ اعلم احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۰ ربیع الآخر ۴۲ھ

استرے سے مونچھوں کو صاف کرنے کا حکم

سوال: مونچھوں کے بالوں کو استرے سے صاف کرنا کیسا ہے؟

الجواب

مونچھوں کے بارے میں صرف اتنا ضروری ہے کہ جس قدر لبوں سے زیادہ ہوں وہ کتر دی جائیں۔ خواہ صرف قینچی سے یا اوّل استرا لبوں کے اوپر لگا کر پھر قینچی سے کتری جائیں۔ دونوں طرح جائز ہے۔

مردوں کے لئے ضفائر کا حکم

سوال: و فی جامع الترمذی ابواب اللباس المجلد الاوّل عن ام ہانی قالت قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی مکة وله اربع غدائر (او ضفائر) اس کی توجیہ کیا ہے۔ اس کا حکم منسوخ ہے یا اب بھی رجال کو ضفائر گوندنا جائز ہے۔

الجواب

مردوں کے لئے ضفائر اب بھی جائز ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اسی ہیئت پر نہ ہوں جس سے تشبہ بالنساء لازم آئے یعنی عورتیں ضفائر کو پیچھے پشت پر رکھتی ہیں مرد اس طرح نہ کریں بلکہ آگے یا شانہ پر رکھیں۔

قال الملا علی القاری فی شرح الشمائل له قال ابن حجر و

فیہ (ای فی حدیث ام ھانی) حل ضفر الشعر حتی للرجال ولیس تختص بالنساء الّا باعتبار ما اعتید فی اکثر البلاد فی ھذہ الازمنۃ المتأخرۃ ولا اعتبار بذلک۔ اقول عادۃ السادۃ فی بعض البلدان ایضاً ھی الضفر لکن علی غدیرتین واقعتین بین ایدیھم تفرقۃ بینھم وبین النساء اذ عادتھن وضع الضفائر خلفھن وھذا الفرق یکفی فی عدم التشبہ بھن واللہ اعلم۔ (ج۶/)

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲ جمادی الاخری ۱۳۴۵ھ

عورتوں کے لئے گرگابی پہننا جائز ہے یا نہیں

سوال: عرض ہے کہ ایک پابند صوم و صلاۃ عورت گرگابی جوتہ کو استعمال میں لا سکتی ہے، اگر اس کا ایک مسلمان عورت کے لئے استعمال کرنا جائز ہو تو واضح طور پر ارشاد فرمائیں تاکہ آئندہ انسداد کے لئے مستند دلیل قائم کرسکوں۔

الجواب

فی الحدیث لعن اللہ المترجلات من النساء والمتشبھین بالنساء من الرجال اوکما قال وقال صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقومٍ فھو منھم۔ چونکہ اس قسم کا جوتا عموماً وہ عورتیں پہنتی ہیں جو کافر ہیں یا کافر عورتوں سے تشبہ کرنے والی ہیں اس لئے اس کا پہننا مسلمان عورت کو زیبا نہیں البتہ اگر کسی جگہ اس کا رواج عام ہو تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ

حکم کلاہ زرین

سوال: ٹوپی میں زر کا کام کیا گیا۔ زر اگر دور میں انگشت سے کم ہے اور اوپر پورا زر ہے تو اس صورت میں اس ٹوپی کا پہننا روا ہے یا نہیں

الجواب

فی الشامی (ج ۵/ ۳۴۵) وظاھر المذھب عدم جمع المتفرق) ای الّا اذا کان خط منہ قز وخط منہ غیرہ بحیث یری کلا قزا فلا

یجوز کما سنذکرہ عن الحاوی ومقتضاہ حل الثوب المنقوش بالحریر تطریزاً او نسجاً اذا لم تبلغ کل واحد من نقوشہ اربع اصابع وان زادت بالجمع مالم یری کلہ حریراً۔ تأمل (۱) ھل حکم المتفرق من الذھب والفضہ کذلک یحرر۔

وفیہ ایضاً (۲) وبہ یعلم حکم الحرقیۃ المسمّاۃ بالطاقیۃ فاذا کانت منقشۃً بالحریر وکان أحد نقوشھا اکثر من اربع اصابع لا تحل وان کان اقل تحل وان زاد مجموع نقوشھا علی اربع اصابع بناءً علی ما مرّ من ان ظاھر المذھب عدم جمع المتفرق۔

وفیہ ایضاً (۳) تحت قول الدر لا یکرہ علم الثوب من الفضہ ویکرہ من الذھب قالوا ھذا مشکل رخص الشرع فی الکفاف الخ اقول: الظاھر أن وجہ الاستشکال ان کلا من العلم والکفاف فی الثوب انّما حل لکونہ قلیلاً وتابعاً غیر مقصود کما صرحوا بہ وقد استوی کل من الذھب والفضّۃ والحریر فی الحرمۃ فترخیص العلم والکفاف من الحریر ترخیص لھما من غیرہ ایضاً بدلالۃ المساواۃ ویؤید عدم الفرق ما مرّ من اباحۃ الثوب المنسوج من ذھب اربعۃ اصابع۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ اگر اوپر کا کام چار انگشت ہے تو اس ٹوپی کا استعمال جائز نہیں اور اگر اوپر کا کام بھی چار انگشت سے کم ہے تو جائز ہے۔ فقط واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

سونے چاندی کے بٹن کا حکم

سوال: آپ کی کتاب صفائی معاملات سے سونے چاندی کے بٹن یعنی پوتام لگانے کا مرد کے لئے جواز

---

(۱) ج ۶/ ۳۵۲، ایچ ایم سعید: مرتب (۲) ص: ۳۵۴، ایچ ایم سعید: مرتب
(۳ و ۴) ج ۶/ ۳۵۵ مرتب۔

معلوم ہوتا ہے لیکن دلائل جواز کی صراحت نہیں ہے اس واسطے اس کا بیان دلیل سے مطلوب ہے۔

الجواب

وفی الدر المختار مع الشامی (ج ۵/۳۴۸) (۱) لا بأس باز الدیباج والذھب الخ۔

اس میں تصریح ہے جواز گھنڈی کی اور اس کی وجہ سوائے تابع ثوب ہونے کے اور کیا ہوسکتی ہے اور بٹن بھی تابع ثوب ہوتا ہے۔ پس گھنڈی کی طرح بٹن بھی جائز ہے لیکن اس کے بعد بعض روایات سے خود مؤلف صفائی معاملات کو اس میں تردد ہوگیا اور یہ احتمال غالب ہوگیا کہ ازار سے کلابتون کی گھنڈیاں مراد ہیں کہ وہ تابع ثوب ہیں بخلاف بٹن کے کہ وہ منفصل اور مستقل ہیں۔ اشرف علی

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
۳۰ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ

سونے کی انگشتری مردوں کے لئے حرام ہے

سوال: ہمارے اس دیار میں سونے کی انگشتری کے استعمال کا زیادہ رواج ہے حتیٰ کہ مرد بھی زور شور سے پہنتے ہیں۔ عرصہ سے میں نے سنا ہے کہ سونے کی انگشتری کا پہننا مرد کے لئے حرام ہے۔ اب عرض خدمت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلقہ انگشتری کو سونے سے بنوادے اور نگینہ پتھر کا لگوائے تو درست ہے یا نہیں مع حوالہ کتب ارقام کریں۔

الجواب

سونے کی انگشتری میں پتھر کا نگینہ لگانے سے اس کا پہننا جائز نہیں ہوجاتا بلکہ حرام ہے۔

کما فی العالمگیریۃ (۶/۲۲۴) والتختم بالذھب حرام فی الصحیح کذا فی الوجیز للکردری وقال بعد اسطر والحلقۃ فی الخاتم ھی المعتبر لان قوام الخاتم بھا ولا معتبر بالفص حتی أنہ

(۱) ج ۶/ ۳۵۵ - مرتب

یجوز ان یکون حجرا و غیرہ کذا فی السراج والوہاج۔
فقط، کتبہ عبدالکریم عفی عنہ
الجواب صحیح — ۸ جمادی الاولیٰ ۴۶ھ
ظفر احمد عفی عنہ

بغرض شادی داڑھی منڈوانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کی عمر اس وقت تخمیناً ۲۸-۲۹ سال ہے اور اب تک بباعث غربت و مفلسی اس کی شادی نہیں ہوئی اور وہ ایک باشرع آدمی ہے۔ فی الحال چند بہی خواہانِ برادری نے اس کی نسبت ایک جگہ ٹھہرائی ہے لیکن جو شخص اس کا بانی ہے وہ یہ کہتا ہے کہ زید کی داڑھی چونکہ موافق شرع شریف ہے لہٰذا لڑکی کے وارث اس کی موجودہ صورت کو دیکھ کر اپنی لڑکی نہیں بیاہ سکتے۔ اگر زید شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ بالکل صفایا کرا دے اور بعد انجام شادی کے پھر وہ رکھ سکتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے۔ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خالفوا المجوس اعفوا اللحی واحفوا الشوارب، اخرجہ احمد ومسلم کما فی النیل (ج ۱/ ۱۱۱)

ڈاڑھی کا مونڈنا حرام ہے اور کتر کر ایک قبضہ سے کم کرنا بھی حرام ہے۔ اس لئے زید کو اس فعل کی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر ڈاڑھی ایک قبضہ سے زیادہ ہو تو اس کو ایک قبضہ کرے اور زیادہ کو کم کر دے اور قبضہ کے معنی کسی عالم سے زبانی معلوم کرے اگر اس طرح شادی ہو جائے تو کر لے ورنہ روزے بکثرت رکھا کرے اس سے ہیجان شہوت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ، ۲۴ ربیع الاول ۴۶ھ

سیاہ خضاب لگانا جائز نہیں ہے

سوال: قابل گزارش یہ ہے کہ ایک عالم صاحب نے ایک حدیث لکھ کر روانہ فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت میں سے وہ لوگ ہوں گے جو سیاہ خضاب لگائیں گے اور ان کو جنت کی خوشبو

نصیب نہ ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ خضاب لگانا بالکل مطابق گناہ شرک ہے۔ کیونکہ جنّت مشرک کے لئے حرام ہے۔ اب رہا یہ کہ کتاب درمختار ص ۲۳۲ باب الخضاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ سیاہ خضاب زینت کے لئے لگانا جائز ہے۔ علاوہ اس کے بعض لوگوں کے ہاں مکروہ لکھا ہے اور بعض کے ہاں مطلق مکروہ نہیں۔ اکثر علماء سے سیاہ خضاب لگانے والے کی نسبت دریافت کیا وہ فرماتے ہیں کہ ایسی حدیث کوئی نظر سے نہیں گزری۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ضعیف حدیث ہے اس لئے حضرت والا کے پاس یہ عریضہ روانہ کرکے جواب کا امیدوار ہوں سوال صرف سیاہ خضاب کے بارے میں ہے۔

الجواب

اخرج النسائی فی سننہ (ص ۲۷۷ ج ۲)

اخبرنا عبد الرحمٰن بن عبد اللہ الحلبی عن عبد اللہ وھو ابن عمرو عن عبد الکریم عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رفعہ انہٗ قال قوم یخضبون بھذا السواد آخر الزمان کحواصل الحمام لا یریحون رائحۃ الجنۃ اھ و قد اخرج بعدہٗ حدیث ابی قحافہ انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فیہ غیروا ھذا بشئ وجنبوہ السواد رواہ الجماعۃ الا البخاری والترمذی (نیل ج ۱ ص ۱۱۴) وھو حدیث صحیح۔

پس یہ حدیث تو صحیح ہے کہ سیاہ خضاب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض لوگ آخر زمانہ میں سیاہ خضاب لگائیں گے ان کو جنت کی خوشبو نہ پہنچے گی اور فتویٰ اسی پر ہے کہ سیاہ خضاب جائز نہیں۔ مگر یہ کہ جہاد میں دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے لگانا جائز ہے۔

قال فی العالمگیریہ اما الخضاب بالسواد فمن فعل ذالک من الغزاۃ لیکون رھیب فی عین العدو فھو محمود منہٗ اتفق علیہ المشائخ ومن فعل ذالک لیزین نفسہ للنساء ولیحبب نفسہ الیھن مکروہ (ای کراھۃ التحریم للاطلاق) وعلیہ

عامۃ المشائخ (ج ۶/۲۳۸) اور امام ابو یوسفؒ سے اس میں جو رخصت مروی ہے. جیسا کہ عالمگیری و شامی میں مذکور ہے۔ وہ روایت ضعیف ہے یا مؤول ہے اس خاص صورت کے ساتھ جبکہ کسی کے بال بوجہ مرض قبل از وقت سپید ہو جائیں۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ

بنگالی عورتوں کے متعارف لباس کا حکم

سوال: چہ می فرمایند دریں مسئلہ کہ زنان ایں دیار مثل زنان ہندو ثیاب دہ گزی پوشند ایں ہمہ بدعت منکر و مشابہ بالکفر شود یا نہ و زنان گویند کہ لباس مسنون یعنی لنگی یا قمیص و ردا مایاں نمی توانیم پوشید از جہت کہ غیر استعمال تکلیف می شود پس زنان را برائے اختیار کردن لباس مسنون در شریعت زجر و جبر کردن جائز است یا نہ۔

الجواب

اگر لباس متعارف زنان تشبہ بالکفار دارد یا دراں ستر کافی نباشد جبر بر ترک آں لازم است ہے۔ و اگر ازیں ہر دو مصون است جبر جائز نیست فانہٗ لا اکراہ فی المباحات۔ واللہ اعلم۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

غرہ جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ

سور کے بالوں کا برش استعمال کرنا جائز نہیں

سوال: ایک امر دریافت طلب ہے کہ قرآن شریف میں آیہ کریمہ "حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر الخ" ہے جس کی تشریح آپ پر واضح ہے۔ میرے دانتوں میں کیڑا لگ گیا ہے جس کے علاج کے لئے ڈاکٹر لوگ برش کا استعمال تجویز کرتے ہیں مگر تمام برش سور کے بال سے جو کیمیاوی اجزاء سے صاف کئے جاتے ہیں بنے ہوئے ہیں یہ وضاحت فرمائیں کہ اس قسم کے برش کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

جب دانتوں کے برش کے متعلق یہ محقق ہے کہ وہ سور کے بالوں سے بنتا ہے

تو اس کا استعمال جائز نہیں۔ امرتسر میں ڈاکٹر عزیز احمد صاحب دندان ساز خاص طور پر جائز برش تیار کرتے ہیں ان سے منگوائے جائیں۔ فقط

ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۲۰ شعبان ۴۶ھ

تذکرۃ الواعظین کے ایک مضمون کی تغلیط

سوال: ایک کتاب مسمی تذکرۃ الواعظین میں تحریر ہے کہ بروز شنبہ اور سہ شنبہ اور ناخن کٹوانے سے بیماری آتی ہے اور ان ایام میں کپڑا قطع کرنے سے اس کے استعمال تک مبتلاء رنج و مصیبت رہے گا۔ یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب

یہ مضمون غلط ہے اس پر ہرگز اعتقاد نہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفی عنہ، ۲۶ شعبان ۴۶ھ

مصنوعی دانت لگانا جائز ہے

سوال: مصنوعی دانت لگانے ضرورت خور دونوش وحسن تلفظ اور تزئین کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ اور اگر جائز ہیں نخود کے دانہ کے برابر چیز منہ میں ہوتے ہوئے نماز نہ ہونے کا مسئلہ عام مشہور ہے۔ سو عرض یہ ہے کہ مصنوعی دانت لگانے کے بعد نماز پڑھنے سے نماز درست رہے گی یا فاسد؟

الجواب

مصنوعی دانت لگانا جائز ہے اور ان کو لگا کر نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور نخود کے برابر کوئی چیز کھانے کی نگل جائے تو نماز نہیں ہوتی اور دانت کھانے کی چیز نہیں اور نہ اس کو نگلنے کے واسطے لگاتے ہیں اور کوئی چیز منہ میں رکھ کر نماز پڑھنا جب مکروہ ہے جبکہ اس کے منہ میں ہونے سے قرارت میں دشواری ہو اور مصنوعی دانت لگانے سے تو قرارت میں دشواری نہیں بلکہ سہولت ہوتی ہے۔ فقط واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر

ظفر احمد عفی عنہ

۱۱ رمضان ۴۶ھ

مصنوعی دانت بنوانا اور اس پر سونے کا خول چڑھانا

سوال: میرے دانت ہلنے لگے ہیں۔ ان کو اکھڑوا کر مصنوعی دانت لگوانے کا ارادہ ہے بعض ڈاکٹر مصنوعی دانتوں پر سونے کا خول چڑھا کر لگاتے ہیں اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آدمی کے منہ میں بغیر کسی بندش اور کمانی کے دانت جم جاتے ہیں اور آخر تک لگے رہتے ہیں۔ مثل اصلی دانتوں کے اور کسی انگریزی دوا کے ذریعے لگائے جاتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسے دانتوں کا لگوانا جائز ہے اگر سونے کا خول چڑھانے میں شرعاً کچھ خرابی نہ ہو۔ تو میں ایسے دانت بنواؤں ورنہ نہیں۔ آپ کی اجازت کا انتظار ہے۔

الجواب

فی الشامیة عن التاتارخانیة وعلی ھذا الاختلاف اذا جدع انفه او اذنه او سقط سنه فأراد أن یتخذ سنًا آخر فعند الامام یتخذ ذلک من الفضة فقط وعند محمد من الذھب ایضًا اھ وامام ابو یوسف فقیل معه وقیل مع الامام (ج۵/ ۳۵۶)

سونے کا خول چڑھانا مختلف فیہ ہے۔ امام صاحب نے اس کو منع کیا ہے اور صاحبین سے گنجائش منقول ہے پس تقویٰ احتیاط میں ہے اور فتویٰ جواز پر ہے اور بہتر یہ ہے کہ پتھر کے دانت بنوالئے جائیں یا ہلتے ہوئے دانتوں کو سونے کے تاروں سے مضبوط کر لیا جائے خول نہ چڑھایا جائے۔

تتمہ اور اگر سونے کا خول چڑھانے کے بعد دانت سہولت سے الگ ہو سکیں تو غسل کے وقت ان کو الگ کر کے کلی کرنا واجب ہو گا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲ رشوال ۱۳۴۶ھ

عورتوں کے لئے ان اشیاء کا استعمال کرنا کیسا ہے۔ گرگابی پہننا، واسکٹ پہننا، سلوکا پہننا وغیرہ الخ

سوال: عورتوں کے لئے اشیاء ذیل کا استعمال جن میں سے بعض کے استعمال میں تشبہ غیر قوم کا شبہ ہے اور بعض میں نئی روشنی کے اتباع کا ابہام ہوتا ہے (۱) پمپی پہننا (۲) گرگابی پہننا (۳) اونچی مانگ

کرنا (۴) ٹیڑھی مانگ کرنا (۵) کنگھا لگانا (۶) قمیص پہننا (۷) واسکٹ پہننا (۸) افشان چننا (۹) دوپٹہ چننا (۱۰) سر پر رومال باندھنا (۱۱) سلوکہ پہننا (۱۲) شلوار پہننا۔ (۱۳) ڈھیلے پائجامہ پہننا (۱۴) گیتی بنانا (۱۵) بیوہ کے لئے رنگا ہوا کپڑا پہننا ایام عدّت میں تیل استعمال کرنا (۱۶) سر پر جوڑا باندھنا۔ (۱۷) چشمہ لگانا۔

الجواب

ایک سے پانچ تک جائز نہیں۔ للتشبہ بالکفار فی البعض وبالرجال فی البعض اور ۶، ۷ جائز ہے مع الکراھۃ التنزیھیۃ۔ یعنی اس کا ترک اولیٰ ہے اور وجہ فرق یہ ہے کہ ان استعمال مردوں کے ساتھ یا غیر اقوام کے ساتھ خاص نہیں نہ ان کا شعار قوی ہے اور ۸ سے ۱۰ تک جائز ہے کہ محض زینت ہے البتہ افشان چننے کی حالت میں نماز کا وقت آجائے تو اس کو اتار کر وضو کرنا واجب ہے اور ۱۱، ۱۲، ۱۳ اس مقام پر جائز ہے، جہاں یہ لباس مردوں کے ساتھ خاص نہ ہو جیسا کہ پنجاب میں اور جہاں مردوں کے ساتھ خاص ہو وہاں تشبہ بالرجال کی وجہ سے ممنوع ہوگا اور ۱۴ سمجھ میں نہیں آیا۔ ۱۵ کے متعلق یہ ہے کہ بیوہ کو عدّت کے بعد لباس زینت حرام نہیں۔ ہاں عدّت کے اندر ممنوع ہے اسی طرح عدّت کے اندر سر میں تیل ڈالنا حرام ہے اگر دردِ سر کی وجہ سے ڈالا جائے تو جو تیل خوشبو دار نہ ہو جائز ہے۔ ۱۶ جائز ہے اور ۱۷ ضرورت سے جائز ہے۔ بلا ضرورت کے ممنوع ہے کہ تشبہ بالرجال ہے چشمہ لگانا اس وقت تک مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۸ رشوال ۴۶ھ۔

بواسیر کے علاج کے لئے چاندی کے چھلے یا انگشتری پہننا

سوال: مرض بواسیر و دیگر امراض کا علاج جو چاندی وغیرہ کے چھلوں یا انگوٹھیوں سے کیا اور کرایا جاتا ہے درست ہے یا نہیں؟ مخفی مباد کہ چاندی ۶ ماشہ ہوتی ہے بلکہ اس سے زائد بھی چھلے پاؤں کے دونوں انگوٹھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ انگوٹھی چاندی کی بھی ہوتی ہے اور دیگر دھاتوں کی بھی میرے ایک رشتے دار کے پیر

کے دونوں انگوٹھوں میں چھلّے ہیں ان کا بیان ہے چھلّے پہننے سے قبل ادویہ کا علاج کرایا گیا جس سے مرض میں کمی ہوجاتی۔ پھر چند دن بعد عود کرتا اور جب سے یہ چھلّے پہنے گئے ہیں مرض نہیں رہا اور نہ عود کیا۔

الجواب

بواسیر کا علاج انگوٹھی اور چھلّوں سے اس شرط سے جائز ہے کہ انگوٹھی اور چھلّے اس قدر سخت نہ ہوں کہ وضو اور غسل کے وقت پانی نہ پہنچ سکے بلکہ قدرے ڈھیلے ہوں کہ ہلانے سے ہل سکیں اور پانی کو اندر پہنچنے سے مانع نہ ہوں اگر پانی کو اندر پہنچنے سے مانع ہوں تو جائز نہیں اسی طرح اگر چھلّوں کے سوا کوئی دوسرا علاج اس کے مثل نافع ہو تب بھی یہ علاج جائز نہیں کیونکہ اس میں تشبّہ بالنساء ہے جو بدون سخت حاجت کے جائز نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۹ ربیع الثانی ۴۷ھ

عورتوں کے لئے سونے یا چاندی کی گھڑی کا استعمال

سوال: عورتوں کو سونے کی گھڑی خواہ جیبی ہو یا دستی استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ سونے چاندی کے تعویذات پہننا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب

جائز نہیں۔ اصلہ ماذکرہ الفقھاء فی خاتم الذھب اذا کان فیہ المراۃ لایجوز للمرأۃ أن تری وجھھا فیہ لکون الذھب حل لھنّ للزینۃ لا لغیرھا من الاستعمالات فکذا الساعۃ من الذھب یجوز لبسھا للنساء علی الید للزینۃ ولکن لایجوز او یتھا لمعرفۃ الوقت واما فی الجیب فلا یجوز اصلاً لعدم الزینۃ فیہ۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الثانیہ ۴۷ھ

جس عبا پر زری کا کام کیا گیا ہو اس کے پہننے کا حکم

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب ناظم تعلیمات دیوبند نے اپنا ایک عبا دکھلایا جس کی گردن اور پشت پر چار انگل سے بہت زیادہ زری کا سچا کام تھا مولانا نے اس کے اوپر سوت کے

دھاگے سے پھول بوٹے نکلوا کر زری کا کام مستور کر دیا تھا مگر اطمینان نہ ہوا اور
تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت کو دکھلایا کہ اس ترکیب کے بعد اس کا لبس
جائز ہو گیا یا نہیں ؟ اس کا جو جواب دیا گیا وہ حسب ذیل ہے۔

الجواب

آپ کے عبا کی بابت میں نے بہت غور کیا جو احقر سمجھا ہے اس کا حاصل
یہ ہے کہ جواز کی گنجائش تو اس صورت میں بھی ہے کہ زری کے کام پر کوئی سوتی
کپڑا اسی دیا جائے یا سوت کے دھاگے سے پھول بوٹے اس قدر نکالے جائیں کہ زری
کا کام مستور ہو جائے اور کسی جگہ چار انگشت سے زیادہ مکشوف نہ رہے اس صورت
میں زری کا کام بمنزلہ حشو کے ہو جائے گا مقصود نہ رہے گا کیونکہ مقصود ظہارۃ و بطانۃ
ہے اور جو شئ ظہارۃ و بطانۃ کے درمیان ہے وہ مقصود نہیں ہے محض تابع و حشو ہے۔
ھذا ھو ما ذکرہ الشامی ثم أمر بالتأمل فیہ مگر احوط وہی ہے جو
زبانی عرض کی گئی تھی کہ زری کے کام کو کاٹ کر درمیان میں سوتی کپڑے سے فصل
کر دیا جائے۔

قال فی الھندیۃ: عن فتاوی آھو سئل قاضی برھان الدین
اگر عنق را چکن کردند باکشیدہ از ابریشم فلبسہ قال ینبغی ان
لا یکرہ لأنہ صار مستھلکاً فیکون تبعاً و اشار شمس الائمۃ السرخسی
انہ یکون تبعا اھ و ھذا ھو مؤید للجواز المذکور اولاً و فیہ
ایضاً عن شرح القدوری عن ابی یوسف قال اکرہ ثوب القزیکون
بین الفرو ع بین الظھارۃ کذا فی المحیط (ج ۶/۲۲۷) واللہ تعالیٰ اعلم۔
وھذا مؤید لما جعلتہ أحوط فقط۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۷ رجب ۵۱ھ

ع: الظاھر الخز فصحفہ الکاتب بالفرفان الخز الذی کان فی الزمن
القدیم من دابۃ البحر کان جائزاً فان الحاصل أنہ کرہ جعل
الخز ای الحریر بین الخز و الظھارۃ و ھذا ھو ما اجازہ
الشامی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۲ منہ۔

عورتوں کے لئے بال کٹوانے کا حکم

سوال: اخبار مدینہ میں کسی کا فتویٰ شائع ہوا ہے جس میں مذکور ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی اپنے سر کے بال کانوں تک کٹواتی تھیں ایک روایت ہے کہ وفرہ کرتی تھیں جس میں کانوں تک معلوم ہوتا ہے کیا یہ روایت موضوع ہے یا اس کے معنی مطلب کچھ اور ہیں۔ امید ہے کہ اس کی تشریح سے بھی مطلع فرمائیں گے۔

الجواب

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ عورتیں بوقت ضرورت اپنے بالوں کو کتر کر کس قدر کم کر سکتی ہیں چنانچہ حج میں عورتوں کے لئے قصر بقدر انملہ جائز بلکہ تحلل کے لئے ضروری ہے۔ اور حضرات ازواج مطہرات کا فعل ضرورت ہی پر محمول ہے کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زینت ترک کر دی تھی (کیونکہ وہ عمر بھر کے لئے عدّت ہی میں تھیں۔ ان کو حضورؐ کے بعد عمر بھر کسی سے بھی نکاح جائز نہ تھا تو وہ معتدہ کی طرح عمر بھر زینت ترک کئے رہتی تھیں ۱۲) اور ترک زینت کے ساتھ بالوں کی خدمت دشوار ہوتی ہے جیسا کہ مشاہد ہے اس لئے وہ اپنے بالوں کو کچھ کم کر دیتی تھیں مگر پھر بھی ان کے بال مردوں کے برابر نہ ہوتے تھے بلکہ مردوں کے بالوں سے بڑے ہوتے تھے جس کی دلیل خود حدیث کا لفظ ہے کہ ان کے بال مثل وفرہ کے تھے۔ اور وفرہ وہ بال ہیں جو مونڈھوں سے نیچے ہوں تو جو بال کم کرنے کے بعد مثل وفرہ کے ہوں وہ اس سے بھی زائد ہوں گے۔ پس ازواج مطہرات کے بال کمی کے بعد بھی مردوں کے بالوں سے ممتاز اور زیادہ تھے اور ان کے کم کرنے کا منشا بھی ضرورت اور ترکِ زینت تھی۔ پس اس سے اس فعل کے جواز پر استدلال کرنا جو بلا ضرورت ہے (کیونکہ ازواج مطہرات کے سوا کسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن سے زیادہ نہیں) اور جس کا منشا تشبہ بنساء الکفار ہے اور جس میں تشبہ بالرجال بھی ہے اور ان دونوں پر سخت وعید وارد ہے کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۸ شوال ۴۷ھ

الدلیل علی الجواب

قال سفیان بن عیینه کان لنساء رسول اللہ صلی اللہ علیه

وسلم فی معنی المعتدات وللمعتدہ اسکنی فجعل لھن البیوت ماعش ولا یمکن رقابھا اھ ذکرالسیوطی فی الخصائص لہ فی تفسیر قولہ تعالیٰ وقرن فی بیوتکن وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجۃ الوداع لنسائہ ھذہ الحجہ ثم ظھور الحصر (ج۲/۲۵۱) وقال النووی الوفرہ الشیع واکثر من اللمہ واللمۃ ما یلم بالمنکبین من الشعر قالہ الاصمعی وقال العیاض رحمہ اللہ ولعل ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فعلن ھذا بعد وفاتہ صلی اللہ علیہ وسلم لترکھن التزین واستغنائھن من تطویل الشعر وتخفیفاً لمؤنۃ رؤسھن إلی ان قال وھو متعین ولا یظن بھن فعلہ فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم (ج۱۴۸/۱) فی شرح حدیث ابی سلمۃ بن عبدالرحمٰن قال دخلت علی عائشۃ انا واخوھا من الرضاعۃ فسألتہ عن غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی قولہ وقال ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یأخذ من شعورھن حتی تکون کالوفرۃ ۔ اھ ۔

پس اس حدیث سے اگر استدلال ہو سکتا ہے تو صرف اس پر استدلال ہو سکتا ہے کہ بیوہ عورت کو جائز ہے کہ اپنے سر کے بال زیادہ لمبے نہ کرے بلکہ وفرہ کے قریب کر دے اور وفرہ کے جو معنی ہم نے بیان کئے ہیں نوویؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے اور گو اس کے معنی میں اور بھی اقوال ہیں مگر جب احتمال پیدا ہو گیا تو اس کے خلاف پر استدلال نہیں ہو سکتا إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، اور نوویؒ کے قول، ولا یظن بھن فعلھن فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوا کہ شوہر کی زندگی میں عورت کو اپنے سر کے بال کم کرنا جائز نہیں ورنہ اس ظن کی نفی متعین نہ ہو گی۔ رہا یہ کہ ازواج مطہرات نے عدت کی وجہ سے ایسا کیا اور ان پر ترک زینت عمر بھر واجب تھی یا نہ تھی؎ دونوں احتمال ہیں مگر یہ متعین ہے کہ ان کا یہ فعل تو بوجہ ترکِ زینت

؎ قلت یرجح عدم وجوب ترک الزینۃ علیھن (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہی کے تھا اور ابن عیینہ کا ازواج کو بمنزلۃ المعتدۃ فرمانا احتمال اوّل کو مرجح ہے اور ترک زینت اسی عورت کو جائز ہے جس کے شوہر نہ ہو۔ شوہر والی کو جائز نہیں۔ پس اس سے مطلقاً قصر شعور کے جواز پر استدلال بہرحال باطل ہے۔ غایت ما فی الباب بیوگان کے لئے قصر شعور کی اجازت پر استدلال ہوسکتا ہے مگر یہ استدلال بھی مجتہد ہی کرسکتا ہے۔ غیر مجتہد نہیں کرسکتا کیونکہ غیر مجتہد کو قرآن و حدیث سے استنباط کا حق نہیں۔ وہو ظاہر۔ اور مجتہدین سے کہیں ثابت نہیں کہ انہوں نے شوہر والی عورت یا بیوہ کے لئے بلا ضرورت مرض و وجع و جع قصر شعر کی اجازت دی ہو بلکہ فقہاء نے عورتوں کو حلق و قصر رأس سے مطلقاً منع فرمایا ہے (ملاحظہ ہو اشباہ احکام الانثیٰ) اور نوویؒ کا اس حدیث کے تحت میں و فیہ جواز تخفیف اشعر للنساء فرمانا حجت نہیں کیونکہ وہ خود مقلد ہیں اور کسی مجتہد کی طرف اس قول کو منسوب نہیں کیا دوسرے ازواج مطہرات کے اوپر دوسری بیوہ عورتوں کو قیاس کرنا صحیح نہیں (کیونکہ ازواج مطہرات کو دوسرے شخص سے نکاح حرام تھا اور دوسری بیوہ عورتوں کو حرام نہیں۔ تیسرے تخفیف کے مراتب مختلف ہیں۔ مطلق تخفیف کے جواز سے تخفیف متکلم فیہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مافی الصحیحین عن زینب بنت ام سلمہ دخلت علی ام حبیبہ حین توفی ابوھا ابو سفیان فدعت بطیب فیہ اصفرۃ خلوق او غیرہ فدھنت منہ جاریۃ ثم مسّت بعارضیھا ثم قالت واللہ مالی بالطّیب من حاجۃ الحدیث (نیل ص ۲۴۵ ج ۶) قلت لیس فیہ الا مسّ الطیب فی الجملۃ لا استعمالھا ومثل ھذا القدر الیسیر لا تمنع المعتدۃ عنہ التطیب واستعمال الطیب ولیس ذالک منہ فی شیٔ ولئن سلّمھا فانّما فعلت ذالک لضرورۃ شرعیۃ وھو أنھا الاحداد علی الأب شیٔ یدل علی ترک الاحداد وقولھا وقولھا واللہ مالی بالطیب من حاجۃ یحتمل أن یکون اشارۃ إلی کونھا معتدّۃ بعدۃ وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔ فقط: ظفر۔

یہ جواب تو اس صورت میں ہے جبکہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرات ازواج مطہرات اپنے بال کتر کر کم کرتی تھیں مگر ہم کو اس حدیث سے اس مفہوم کو ثابت ہونا ہی مسلم نہیں کیونکہ اس کے راوی ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن تمام ازواج مطہرات کے محرم نہیں تو انہوں نے تمام ازواج مطہرات کا یہ فعل خود تو دیکھا نہیں۔ کسی سے سنا ہوگا اور وہ واسطہ مجہول ہے۔ لہٰذا حدیث حجت نہیں۔ رہا یہ کہ حضرت عائشہ کا فعل تو وہ دیکھ سکتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اس کی بھی تصریح نہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ کا قصر شعر خود دیکھا اور چونکہ روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سر کے بال بیماری کے سبب کم ہو گئے تھے اس لئے یہ احتمال غالب ہے کہ ابو سلمہ نے ان کے بال عام عورتوں سے کم دیکھ کر اپنے گمان سے یہ سمجھ لیا ہو کہ حضرت عائشہ بال کترتی ہیں اور بیماری سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بال کم ہو جانا شیخین کی روایت میں مصرح ہے۔ قالت .

(کذا فی جمع الفوائد (ص ۳۱۲ ج ۱)

اور ظاہر یہ ہے کہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد سب نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضؓ ہی مراد ہیں۔ تعظیماً واحد کو صیغہ جمع سے تعبیر کر دیا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۱ شوال ۶۷ھ

عورتوں کے لئے پیتل دھات وغیرہ کی انگشتری اور بالوں میں مخصوص قسم کے دھاگے کا جوڑا لگانے کا حکم

سوال: دو مسئلے دریافت طلب ہیں۔

(۱) عورتوں کو موباف یعنی قند کا سرخ پارچہ جس میں سر کے بال چوٹی کے نیچے لپیٹ کر دوہرا بل کر کے نیچے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نیز چوٹی جو سوتی تین دھاگوں سبز، سرخ سیاہ رنگین بنی ہوئی بازاروں میں بکتی ہیں اور نیچے چوٹی میں شامل کر کے چوٹی کی طرح تہرے بل سے ٹب کر نیچے چھوڑ دی جاتی ہے جائز الاستعمال ہے یا ناجائز کہ مستوصلات میں داخل ہے۔ یہ بال نہیں ہوتے اور نہ سر پر بندش نیچے کے بالوں میں جوڑ لگایا جاتا ہے۔ مگر بال اور دھاگا جدا جدا نظر آتا رہتا ہے۔

۲۔ انگشتری پیتل یا دھاگہ جدید جو میل قبول نہیں کرتا۔ پہننا مستورات کو جائز ہے یا

ناجائز۔ ولوحاتماً من الحدید کا کیا مطلب جبکہ مرد کو سوائے نقرہ کے اور عورت کو سوائے ذہب وفضّہ اور شے کی انگوٹھی حرام ہے نیز حرمت ہے یا کراہت۔

الجواب

(۱) قال فی العالمگیریۃ ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام سواءٌ کان بشعرها أو شعر غیرها ولا بأس لمرأۃ أن تجعل فی قرونها وذوائبها شیئاً من الوبر کذا فی قاضیخان (ج۶/۲۳۸) قلت فیجوز ان تجعل فی القرون خیوطا اولی۔ اھ

(۲) فی العالمگیریۃ التختم بالحدید والصفر والنحاس والرصاص مکروه للرجال والنساء وجمیعًا واما الشب ونحوه فلا بأس بالتختم به کالعقیق کذا فی العینی هو الصحیح کذا فی جواهر الاخلاطی التختم بالعظم جائز کذا فی الغرائب ولا بأس بان یتخذ خاتم حدید قدلوی علیه فضة (اوذهب) حتی لایری کذا فی المحیط (ج۶/۲۲۴)

قلت: والکراهة اذا اطلقت یراد بها کراهة التحریم وبالجملة فلا یجوز التختم لبشیٔ من المعادن للرجال الا بالفضّه وللنساء بها وبالذهب واما غیرالمعادن من الحجریات والعظم فیجوز التختم بها للنساء والمعدن الحدید مالظاهر من الاطلاق کراهة التختم به واما بالنظر الی العلّة وهو قوله صلی الله علیه وسلم لمن لبس خاتمامن شبه (ای صفر وهوضرب من النحاس لیشبه الذهب) مالی أجد علیك ریح الأصنام ولمن لبس خاتما من حدید مالی أری علیك حلیة اهل النّار۔ رواه ابوداود وسکت عنه (ج ۲/۲۲۹)

ولا بأس بالتختم بمالیس من هذین النوعین والنحاس والصفر نوع واحد وکذا الحدید والرصاص

واما المعدن الحديد فلعله غير هذه الانواع. والله تعالیٰ اعلم. والاحوط الترك واما قوله صلی الله علیه وسلم التمس ولو خاتما من حدید فلا یدل علی جواز اللبس وانما یدل علی جواز اعطائه للمرأة فی مهرها لتنتفع به بیعا ونحوه وقد حمله علمائنا الحنفیة علی المبالغة فی الالتماس فان المهر عندهم لا یکون اقل من دینار فمعناه التمس ولو شیئا قلیلا حتی تعجله فی مهرها. والله تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۶ ذیقعدہ ۴۷ھ

ترکی ٹوپی کا استعمال کیسا ہے؟

سوال: ترکی ٹوپی کے استعمال کا کیا حکم ہے اور اس کے پہننے کا کیا حکم ہے؟

الجواب

ترکی ٹوپی کا استعمال عام مسلمانوں کو جائز ہے مگر خواص علماء و صلحاء کو نہ پہننا چاہیئے کیونکہ ہنوز اس کا رواج صلحاء و علماء میں نہیں ہوا البتہ جس جگہ خواص میں بھی اس کا رواج ہو گیا ہو وہاں سب کو جائز ہے اور پہننا اگر ریشم کا ہو تو حرام ہے اگر ریشم کا نہ ہو تو جائز ہے. واللہ اعلم.

ظفر احمد عفی عنہ ۳ جمادی الاولیٰ ۵۳ھ

مردوں کو کون کون سے رنگ کے کپڑے پہننا منع ہے۔

سوال: کون کون سے سرخ و زرد رنگ کے کپڑے مردوں کو پہننا منع ہیں ایک تو وہ رنگ ہیں جو ولایت سے سفوف کی شکل میں آتے ہیں. دوسرے خود ولایت ہی سے رنگین کپڑے کچے یا پکے رنگ کے آتے ہیں، پھر ممانعت کس قسم کی ہے یعنی تنزیہی ہے کہ تحریمی حدیث سے سرخ و زرد کپڑے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے.

الجواب

سرخ رنگ صرف معصفر مردوں کو حرام ہے یعنی کسم کا رنگ ہو، اور

زرد صرف مزعفر حرام ہے جو زعفران سے رنگا گیا ہو۔ اس کے سوا زرد سب بلاکراہت جائز ہے اور سرخ خالص بکراہت تنزیہی اور سرخ مخلط بلاکراہت جائز ہے۔ رہا ولایتی اور دیسی رنگوں کا فرق سو وہ صرف اسپرٹ کے شبہ کی وجہ سے ہے ورنہ دونوں مساوی ہیں۔ واللہ اعلم　　　ظفر احمد عفا عنہ ۶ رمضان ۴۸ھ

تتمہ

اس کے بعد سائل کا دوسرا خط آیا جو مع سوال وجواب مذکور ہے۔

سوال: آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر مزعفر کی نہی کے علاوہ یعنی لفظ اصفر سے کوئی روایت نظر سے گزری ہو تو مطلع کرو لہٰذا درج ذیل کرتا ہوں۔

عن انس بن مالك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه كان عنده رجل به اثر صفرة قال وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يكاد يواجه احدا بشئ يكرهه فلما قال للقوم لوقلتم له يدع هذه الصفرة (شمائل ترمذی باب ما جاء فی خلق رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

الجواب

میرا مقصود یہ تھا کہ صفرہ مطلقہ سے نہی ہو اور اس حدیث میں تو یدع هذه الصفرة ہے جس سے صفرہ معینہ مفہوم ہوتا ہے جس کو احتمالاً بھی صفرہ خلوق یا زعفران کے ساتھ مقید کیا جا سکتا ہے اور حدیث انسؓ کے طرق جمع کرنے سے تو یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ مراد صفرت زعفران وخلوق ہے۔ قاله الشاح الشمائل العلامه الحنفی (ج ۲/۱۰۰)

اور ابو داؤد میں بھی ایک طریق حضرت انسؓ سے بلفظ تزعفر وارد ہوا ہے اور جس رجل مجہول کا واقعہ حضرت انسؓ نے بیان فرمایا ہے غالباً وہ حضرت عمار بن یاسر ہیں اور ان کا واقعہ ابو داؤد میں بلفظ خلوق وزعفران وارد ہے اور حمرت سے بعض احادیث میں مطلقاً کراہت وارد ہے۔ حتیٰ کہ حمرت مفرہ سے بھی ملاحظہ ہو۔ ابو داؤد جلد دوم کتاب اللباس والترجل واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ رمضان ۴۸ھ

بہشتی زیور کے اس مسئلہ کی دلیل کہ آرسی کا زینت کے لئے پہننا درست ہے لیکن آرسی میں منہ دیکھنا حرام ہے

سوال: عرض ہے کہ بہشتی زیور صفحہ چونسٹھ تیسرا حصہ مضمون سونے چاندی کے برتنوں کے بیان میں جو آپ نے تحریر کیا ہے کہ آرسی کا زینت کے لئے پہننا درست ہے لیکن آرسی میں منہ دیکھنا حرام ہے اس کے واسطے کوئی مستدل عطا فرمائیں. عین نوازش ہوگی۔

الجواب

فی الدر المختار۔ وحلیۃ مرآۃ وقال الشامی الذی فی المنح والھدایۃ وغیرھما. حلقہ بالقاف قال فی الکفایۃ المراد بھا التی تکون حوالی المرآۃ لانا نأخذہ المرآۃ بیدھا فانہ مکروہ اتفاقا (ج ۵ ص ۳۳۷)

ای استعمالھا دون لبسھا یدل علیہ کلامہ السابق فان الکلام فی الاستعمال والمراد بالکراھۃ کراھۃ التحریم للاطلاق۔

کتبہ عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ۶ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ

ظفر احمد عفی عنہ ۶ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ

مردوں کے لئے ریشمی اور سرخ رنگ کا کپڑا پہننا اور اس میں نماز ادا کرنا

سوال: یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ زرد کپڑا یا سرخ کپڑا یا ریشم کا کپڑا پہن کر آیا نماز ہو جاتی ہے یا نہیں اور اگر نیچے کپڑا سرخ ہو یعنی سوت کا اور اوپر ریشم ہو آیا یہ جائز ہے یا نہیں ایسا ہی سرخ کپڑے کے بابت عرض ہے مثلاً جیسے زرائی یا روئی کا کوٹ یا واسکٹ، روئی کی ہو نماز جائز ہو سکتی ہے یا کہ نہیں.

الجواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ریشم کا کپڑا مرد کو پہننا حرام ہے خواہ کسی کپڑے کے اوپر پہنا جاوے خواہ کسی کپڑے کے نیچے اور نماز پڑھنے کی حالت میں بھی حرام ہے اور پہن کر نماز پڑھیں تو نماز مکروہ ہو گئی. اور سرخ رنگ مردوں کے لئے بلا کراہت جائز نہیں ہے اگر کسم سے رنگا ہوا ہے تو حرام ہے اور اگر علاوہ کسم کے کسی اور چیز

سے سرخ رنگا ہے تو مکروہ تنزیہی ہے۔ کما حققہ فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ (ج ۲/ ۳۲۳) اور اس میں بھی ریشمی کپڑے کی طرح بہر حال بدرجہ مذکورہ ممانعت ہے خواہ نماز پڑھنے میں پہنا جائے خواہ نماز سے خارج میں پہنا جائے البتہ اگر کسی کپڑے میں سرخ دھاری ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں اور زرد رنگ بھی مکروہ ہے جبکہ زعفران یا اس سے رنگا ہوا ور اگر ان دو کے سوا کسی چیز سے رنگا ہو تو وہ جائز معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق جزئیہ نہیں ملا۔ ۱۲ منہ۔ واللہ اعلم

احقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ

۱۴ جمادی الثانیہ ۵۵ھ

مصنوعی دانت بنوانا اور ان پر سونے کا خول چڑھانے کا حکم

سوال: میں نے سامنے کے اوپر کے چار دانت ڈاکٹر کے مشورے سے مرض پائیریا کے احتمال سے نکلوا دیئے اور مصنوعی دانت تیار کرائے گئے ہیں ان دانتوں کی پشت پر سونے کی پٹی لگائی گئی ہے اور ان کے بازوؤں کے دو دانتوں پر (یعنی کو چلیوں پر) سونے کا خول چڑھا گیا ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ سامنے کے چاروں دانتوں کی گرفت رہے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے مصنوعی دانتوں کا استعمال ناجائز ہے اور چونکہ دو دانتوں پر خول چڑھا ہوا ہے اس لئے وضو اور غسل بھی نہیں ہو سکتا۔ براہ کرم اطلاع بخشی جائے کہ کیا یہ صحیح ہے۔ اگرچہ دانتوں کی تیاری میں میرے ایک سو بیس روپے صرف ہوئے ہیں اور ضرورتاً و دواءً دانتوں کو نکلوا کر مصنوعی دانت تیار کئے گئے ہیں مگر ناجائز ہونے کی صورت میں ان کو نکلوا دوں گا۔ بحالت موجودہ مصنوعی دانت بعینہ دانتوں کے ساتھ پختہ طور سے باندھ دیئے گئے ہیں اور وہ معمولی دانتوں کی طرح نہ تو نکل سکتے ہیں اور نہ ان کو نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے ناجائز ہونے کی صورت میں ان کو دندان ساز سے نکلوا کر معمولی چوکڑا ربر کے پشتہ کا تیار کرا لوں گا مگر ایسا چوکڑا نہ تو کسی کام کا ہوتا ہے اور نہ اس سے راحت ملتی ہے۔ پہلے میں نے ایسا ہی چوکڑا تیار کرایا تھا جو ہر وقت آسانی کے ساتھ علیحدہ ہو سکتا تھا مگر اس سے مطلق راحت نہیں ملتی تھی اور لگانے کے بعد سخت بے چینی رہتی تھی اور اس سے چوسنے تک کا

کام بھی نہیں لیا جا سکتا تھا اور بات کرتے وقت ان میں حرکت ہوتی تھی اس لئے حسبِ تفصیل صدر سونے کے پشتہ کا دوسرا چوکڑا تیار کرایا گیا۔

الجواب

دانتوں پر سونے کا خول چڑھا جائز ہے۔

قال فی الهداية عن الجامع الصغير ولا يشدّ الاسنان بالذهب ويشدّها بالفضّة وهذا قول ابی حنيفة وقال محمد يشدّها بالذهب ايضاً وذكر الحاكم فی المنتقى لوخاف سقوط السنّ فشدّها بالذهب او بالفضّة لم يكن بأساً عند أبی حنيفة وأبی يوسف وفيه ايضاً قطعت انمله يجوز أن يتخذها من ذهب أو فضّة بخلاف مالوقطعت يده او اصبعه كذا فی التمرتاشی اھ (ج ۶/ ۲۲۵)

وفيه دلالة على اتخاذ العضو الصغير من الذهب أو الفضّة دون العضو الكبير لاسيمّا إذا كان غير الذهب ينتن فی الفم ولا ينتن الذهب فلا بأس باتخاذ السنّ منه. والله اعلم۔

وفی رد المحتار عن التاتارخانية. وعلى هذا الاختلاف اذا جدع انفهٗ او أذنهٗ أو سقط سنهٗ فأراد ان يتخذ سنّاً آخر فعند الامام يتخذ ذالك من الفضة وعند محمدؒ من الذهب ايضاً وذكر فيه مساعدة الاتقانی لمحمدؒ واستدل لثبوت جواز الأنف من الذهب بحديث عرفجة لعلّة إنتان غيره. قال ولا نسلّم انها ترتفع فی السّن بالفضّة لأنها تنتن ايضاً (ج ۵ ص ۳۵۶)

رہا وضو اور غسل کا حکم تو اگر ان دانتوں کے نکالنے میں دقت ہوتی ہو تو غسل و وضو کے وقت ان کے نکالنا ضروری نہیں۔

قال فی الدّر: و يجب أی لفرض غسل ما يمكن من البدن بلا حرج لا غسل ما فيه حرج كعين وثقب انضمّ ولا داخل قلفه

بل بندب وھو الأصح وفی المسعودی ان امکن فتح القلفة بلا مشقة یجب والا لا (ج۱/۱۵۸)

ہاں دقت نہ ہوتی ہو تو ان کا نکالنا ضروری ہوگا اور دقت ہونے نہ ہونے کو مبتلی بہ خود سمجھ سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۲۷ محرم ۴۹ھ

دانتوں پر سونے کا خول چڑھانا کیسا ہے؟

سوال: دانتوں پر سونے کا خول چڑھا کیسا ہے اور خول پائیدار اور مستحکم اس قدر ہو کہ بغیر خاص اہتمام کے علیحدہ نہ کیا جا سکے تو کیا حکم ہے۔

الجواب

امام محمدؒ کے قول پر گنجائش ہے۔ امام صاحبؒ کے قول میں گنجائش نہیں۔ اور اگر خول سہولت سے اتر سکے تو غسلِ جنابت کے وقت اس کو اتار کر کلی کرنا ضروری ہے دقت ہو تو اتارنے کی ضرورت نہیں۔

فی الھندیة فی السن المجوف الذی تبقی فیه طعام ثم غسله علی الأصح و لدرن الباس فی الانف یمنع تمام الغسل إلی أن قال: وقیل کل ذالك یجزیھم للحرج والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة من قواعد الشرع کذا فی الظھریة ج۱/۹۔ وفیه ایضاً اذا تحرکت الاسنان وخیف سقوطھا۔ فأراد صاحبھا ان یشدھا۔ شدھا بالفضة لا بالذھب وھذا قول أبی حنیفة وقال محمدؒ یشدھا بالذھب ایضاً (ج۶/۲۲۴) والله اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ

۲۰ شعبان ۵۵ھ

بابُ اللعب والغناء والتصاویر

غیر ذی روح کی تصویر کا حکم

سوال: مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی رسالہ القاسم میں تحریر فرماتے ہیں کہ جن اشیاء غیر ذی روح کی پرستش ہوتی ہے جیسے چاند وغیرہ ان کی تصاویر کھینچنی ناجائز ہے اگر کوئی جزئیہ حضور والا کی نظر سے گزرا ہو تو مع حوالہ کتاب ارقام فرمائیں۔

الجواب

غیر ذی روح کی تصویر کھینچنی مطلقاً جائز ہے خواہ اس کی عبادت کفار کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔

قال فی الدر: أو لغیر ذی روح لا یکرہ لأنھا لا تعبد ای ھذہ المذکورات فحینئذٍ فلا یحصل التشبہ فان قیل عبد الشمس و القمر والکواکب والشجرۃ الخضراء قلنا عبد عینہ لا تمثالہ (ج ۱/ ۶۷۸)

لیکن اس دلیل سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چاند وغیرہ کی تصویر اس لئے جائز ہے کہ ان کی ذات کی عبادت کی جاتی ہے۔ تصویر کی عبادت نہیں کی جاتی۔ اس لئے لازم آتا ہے کہ اگر کسی غیر ذی روح کی عبادت کی جاتی ہو تو اس کا بنانا جائز نہیں نہ گھر میں رکھنا۔ چنانچہ صلیب کے بارہ میں یہ حکم مصرح ہے[۱]۔

قال فی الدر: ولبس ثوب فی تماثیل ذی روح اھ

قال الشامی اقول والظاھر أنہ یلحق بہ الصلیب وان لم یکن تمثال ذی روح لان فیہ تشبھا بالنصاری الخ ص ۶۷۷ ج ۱۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲٦ محرم سنہ ۴۷ھ

---

[۱] جواب تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل قدیم رجسٹر میں اتنا ہی جواب منقول ہے۔ واللہ اعلم۔ مرتب

گیند بلّا اور کبڈی کھیلنے کا حکم

سوال: زید کہتا ہے کہ کبڈی، گلی ڈنڈا یا گیند بلّا وغیرہ سراسر حرام ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ محض لہو و لعب ہیں اور خالد کہتا ہے کہ ان کے کھیلنے میں کوئی حرج نہیں تو کیا یہ سب لہو و لعب میں داخل ہیں یا نہیں۔ ان کا کھیلنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

کبڈی اور گیند بلّا وغیرہ سے کھیلنا اگر محض کھیل اور لہو و لعب کی نیّت سے ہو تو ناجائز ہے اور اگر قوت و شجاعت بڑھانے کی نیت سے ہو تو جائز ہے۔

قال فی الدّر: وا لمصارعة لیست ببدعة الا للتلهی فتکرہ برجندی وامّا السباق بلا جعل فیحل فی کل شیء کما یأتی۔ (ج ۵/۳۹۸) (۱)

وفی ردالمحتار: اقول قدمنا عن القهستانی جواز اللعب بالصولجان وهو الکرّة للفروسیة وفی جواز المسابقة بالطیر عندنا نظر وکذا فی جواز معرفة ما فی الید واللعب بالخاتم فانہ لهو مجرد وامّا المسابقة بالبقر والسفن والسباحة فظاهر کلامهم الجواز ورمی البندق والحجر کالرمی بالسهم، وامّا اشالة الحجر بالید وما بعده فالظاهر أنہ إن قصد به التمرن والتقوی علی الشجاعة لا بأس به۔ واللّٰہ اعلم:

ظفر احمد عفا اللّٰہ عنہ، ۷ رشوال سنہ ھ

ورزش کی نیت سے فٹبال کھیلنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ نصاریٰ لوگ جو جنڈول اور فٹ بال کھیلتے ہیں اسی طرح ہندو مسلمانوں کا مل کر یہ کھیل کھیلنا جائز ہے یا نہیں اور اس میں نماز کا اور اس کے وقت کا خیال تک نہیں کرتے بلکہ نماز فوت بھی ہو جاتی ہے

(۱) شامیہ مع الدّر (ج ۶/۴۰۴) ایچ ایم سعید۔ مرتب۔

الجواب

یہ کام نصاریٰ کے قومی شعار یا مذہبی رسوم نہیں ہیں اس لئے اگر ورزش کی مصلحت سے کھیلا جائے تو مضائقہ نہیں اگر نصاریٰ کے ساتھ تشبّہ کی نیت ہو تو مکروہ ہوگا اور نماز کے فوت کرنے کا گناہ تو ہر ورزش میں ہے خواہ یہ ہو یا کوئی اور لہٰذا ایسا مشغول ہوکر کھیلنا کہ نماز کا بھی خیال نہ رہے ہر حال میں نا جائز ہے واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۲۵ شعبان ۴۲ھ

سوال: گورنمنٹ برطانیہ کا قانون ہے کہ ہر وہ شخص جو افریقہ جانا چاہے اپنی پوری تصویر کھینچوا کر پاسپورٹ یعنی پروانہ راہداری حاصل کرے بغیر اپنا فوٹو دیئے ہوئے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ حضور والا ارشاد شریعت تحریر فرمائیں کہ فوٹو دینا کیسا ہے اور اگر آدھی تصویر کھینچوائی جائے تو کیا حکم ہے۔

سفر کے واسطے بضرورت شدیدہ نصف بدن کی تصویر کھینچوانی جائز ہے۔

الجواب

قال ابن حجر فی الصورة فاما لو کانت ممتهنته او غیر ممتهنه لکنها غیرت عن هیئتها اما بقطعها من نصفها أو بقطع رأسها فلا امتناع (۳۲۹)

وفی الشامیه: والتمثال خاص بمثال ذی روح ویأتی ان غیر ذی الروح لا یکره قال القهستانی وفیه اشعار بانه لا تکره صورة الرأس وفیه خلاف کما فی اتخاذها کذا فی المحیط۔

(ج ۱/ ٦٧٧)

وفی الدر: او کانت صغیرة لا تتبین او مقطوعة الرأس او الوجه أو ممحوة عضوا لا تعیش بدونه اھ (ج ۱/ ٦٧٨)

قال الشامی قوله: او ممحوة عضوا لخ تعمیم بعد تخصیص. وهل مثل ذالک ما لو کانت مثقوبة البطن مثلاً والظاهر أنه لو کان الثقب کبیرا یظهر به نقصها فنعم اھ (ج ۱/ ٦٧٨)

عبارت اولیٰ وثانیہ وثالثہ سے صورت مقطوعۃ النصف کا اقتناء یعنی گھر میں رکھنا جائز معلوم ہوتا ہے کیونکہ بدون بطن کے تعیش نہیں ہوسکتا اور مقطوعۃ النصف میں بطن کی تصویر نہیں ہوتی اور جزئیہ ثانیہ سے صورۃ رأس مجرد کے اتخاذ یعنی صنعت کا مختلف فیہ ہونا مستفاد ہوتا ہے اور گو ہمارے نزدیک صورۃ رأس بنانے میں راجح یہ ہے کہ جائز نہیں۔ کیونکہ تصویر میں اصل رأس ہی ہے لیکن ضرورت شدیدہ میں ضعیف قول پر بھی فتویٰ دینے کی گنجائش ہے پس جو تاجر افریقہ جانے میں مضطر ہو نہ جانے میں اس قدر ضرر عظیم ہو جس کا تحمل طاقت سے باہر ہو اس کو اپنی نصف تصویر اترواکر دے دینا جائز ہے مگر بار بار اتروانا جائز نہیں بلکہ جب سخت ضرورت سفر کی ہو۔ بدون جانے کے چارہ نہ ہو اس وقت گنجائش ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۰ صفر ۴۵ھ

گھوڑ دوڑ اور اس پر انعام لینے کی ایک صورت کا حکم

سوال: گھوڑوں کو ضد سے دوڑنا اور جیت جانے پر انعام کا روپیہ لینا شرعًا جائز ہے یا کہ نہیں۔ یہ انعام کا روپیہ ان لوگوں سے بطور ٹکٹ داخلہ وصول کیا جاتا ہے جو گھڑ دوڑ کو دیکھنے آتے ہیں اور کچھ روپیہ گورنمنٹ خود اچھے گھوڑوں کی نسل بڑھانے اور پالنے کے لئے اور رعایا کو ترغیب دلانے کے لئے دیتی ہے۔

الجواب

انعام کی جو صورت سوال میں درج ہے جائز ہے۔ گھوڑ دوڑ کا انعام وہ ناجائز ہے جس میں دونوں طرف سے شرط ہو کہ ایک جیتنے تو دوسرا اس کو اتنا دے اور دوسرا جیتے تو یہ اس کو اتنا دے اور اگر انعام دینے والا تیسرا ہو تو یہ صورت جائز ہے رہا یہ کہ انعام کا روپیہ تماشہ بینوں سے بطور ٹکٹ داخلہ لیتے ہیں تو اگر یہ ٹکٹ داخلہ کی رقم گورنمنٹ لیتی ہے اور وہ زمین جس میں گھوڑ دوڑ ہوتی ہے گورنمنٹ کی ملک ہے یا اس نے کرائے پر لے رکھی ہے تو اس رقم سے انعام لینا حلال ہے اور اگر ٹکٹ داخلہ کی رقم کوئی دوسرا لیتا ہے تو سوال

دوبارہ کیا جائے اور یہ بتلایا جائے کہ یہ رقم لینے والا کافر ہے یا مسلم اور زمین اس کی ملک ہے یا اجارہ میں اس نے لے رکھی ہے یا نہیں اور جو رقم گورنمنٹ بطور خود انعام میں دے ٹکٹ داخلہ کی رقم سے علاوہ اس کا لینا مباح ہے۔

واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۷ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ

ورزش کی نیت سے فٹبال کھیلنے کا حکم

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ اکثر طلباء بنیت صحت ابدان فٹ بال کھیلتے ہیں بعض مدرسین بھی اس نیت سے کھیلنے کو جائز بتلاتے ہیں۔ کیا فقہاء کرام نے جو کل لہو حرام کو عام بتلایا ہے اس سے عموم کا ابطال لازم آتا ہے۔

الجواب

کلّ لهو حرامٌ کے معنی یہ ہیں کہ جو لہو کے لئے موضوع ہو اور اس میں کوئی نفع بجز لہو کے نہ ہو اور اگر علاوہ لہو کے اس میں کوئی نفع شرعی بھی ہو تو قصد لہو سے حرام ہے اور قصد نفع سے حرام نہیں۔ کما دلّ علیه کلام الهندیة قال فی العالمگیریة: المصارعة هی بدعة وهل یترخص للشبان قالٗ لیست ببدعة وقد جاء الاثر فیها الّا ان ینظر ان اراد به التلهی، یکره لهٗ ذالك ویمنع عنه وان اراد تحصیل القوّة لیقدر علی مقاتلة الکفرة فانهٗ یجوز ویثاب علیه كذا فی جواهر الفتاوٰی قال القاضی الامام ملك الملوك اللعب الّذی یلعب الشبان ایّام الصیف بالبطیخ بان یضرب بعضهم بعضًا مباح غیر مستنکر کذا فی جواهر الفتاوٰی الباب السادس (۱) (ج ۶/۲۳۴)

قوت اور حفظِ صحت کے لئے جو کھیل کھیلا جائے وہ مباح ہے ہاں لہو

(۱) ہندیۃ: (ج ۵/۳۵۲) مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔ مرتب

لعب کی نیت سے کھیلا جائے تو مکروہ ہے۔ پس فٹ بال بھی حفظ صحت کے لئے مباح ہوتا مگر اس میں تشبہ بلعب الکفار کا شائبہ ہے۔ گو عادات کفار میں قصد تشبہ سے کراہت ہوتی ہے مگر بلا قصد بھی کراہت تنزیہیہ سے خالی نہیں۔ جبکہ اس سے احتراز متعذر نہیں۔ پس طلبا کو جو علم دین کے حامل ہیں ایسا کھیل مناسب نہیں حفظ صحت کے لئے دیسی کھیل بھی بہت ہیں۔ ان میں سے کسی کو اختیار کر لیں۔ فقط واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۲۱ جمادی الثانیہ ۴۵ھ

یہ حکم تو اس عمل کا فی نفسہ ہے مگر اہل علم کا اس میں مشتغل ہونا جن مفاسد کو مشتمل ہے۔ ان پر نظر کر کے اہل علم کے لئے اس فعل میں شدید ممانعت ہو گی۔ کیا اور طریق ورزش کے نہیں رہے جو اس کی طرف اضطرار ہو۔

اشرف علی

جاندار کی تصویر بطور مارکہ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں

سوال: اب سے تقریبًا ساٹھ ستر سال پہلے براہ راست دیسی تاجروں کا تعلق ولایت یعنی یورپ سے بالکل نہ تھا بلکہ جو اہل یورپ کی کمپنیاں ہندوستان میں تھیں دیسی تاجر انہی سے مال خرید کر تجارت کیا کرتے تھے جس میں دیسیوں کو بہت کم برائے نام نفع حاصل ہوتا تھا کیونکہ وہ کمپنیاں اپنی حسب منشا ڈیوڑھی دونی قیمتیں وصول کیا کرتی تھیں یوروپین کمپنیاں جو مال ولایت سے منگاتی تھیں اس مال پر خاص اپنا مارکہ لگایا کرتی تھیں جیسے کپڑے کے تھانوں میں تصویریں یا پھول وغیرہ خاص علامت کے طور پر ہوا کرتے ہیں۔ اسی مارکہ کی بناء پر اکثر اقسام مال کی شہرت ہو جاتی ہے جیسے کپڑے کے تھانوں میں نٹ مارکہ یا قینچی مارکہ وغیرہ اس کے بعد بڑے بڑے دیسی تاجروں نے بھی براہ راست ولایت کی ملوں اور کارخانوں سے مال منگوانا شروع کر دیا اور اپنے اپنے مارکے ڈلوانا شروع کر دیئے۔ بغیر اس کے دشواری تھی جاندار یا بے جان کسی کی خصوصیت کا خیال نہ تھا۔ جس کو جس مارکے میں عوام کے متوجہ ہونے کا غالب گمان ہوا وہی مارکہ اس نے اختیار کر لیا اور وہ رجسٹرڈ ہو گیا۔ پس ارشاد فرمائیں کہ ایسی حالت میں جاندار مارکوں

کو رہنے دینا جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

جاندار ماروں کے بنواتے میں کوئی گنجائش نہیں اگر اس کے ترک سے نقصان عظیم ہوتا ہو جس کے تحمل کی ہمت نہ ہوتی ہو تو استغفار اور توبہ کرتے رہیں اور اپنے کو گنہگار سمجھتے رہیں۔

قال فی الشامیة: وظاهر کلام النووی فی شرح مسلم الاجماع علی تحریم تصویر الحیوان وقال وسواء صنعه لما یمتهن اولغیر فصنعته حرام بکل حال لان فیه مضاهاة لخلق الله۔ وسواءٌ کان فی ثوب او بساط او درهم و اناء وغیرها (ج ۱/ ۶۷۷)

وفیه ایضاً۔

تنبیه: هذا کله فی اقتناء الصورة واما فعل التصویر فهو غیر جائز مطلقاً لانه مضاهاة لخلق الله تعالیٰ کما مرّ۔ قال فی النهر جوّز فی الخلاصة لمن رأی صورة فی بیت غیره ان یزیلها وینبغی ان یجب علیه ولو استأجر مصوّراً فلا أجر له لان عمله معصیة کذا عن محمد اھ ص (ج ۱/ ۶۷۹)

وفی حاشیة الاشباه للحموی تحت مسئلة اجیر القصّار أن عمل الاجیر منقول الیه لأنه عمل باذنه کذا فی الولو الجیه اھ (۲۷۹) ومقتضاه أن عمل المصور هناک منقول إلی مستأجره لکونه یعمل باذنه فلا وسعة فیه اللّٰهم الاّ ان یکون کالمضطر إلی اکل الحرام وهو محل النظر فی صورة السوال فافهم۔ والله اعلم۔ حرّرہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۵ محرم ۴۵ھ

ذی روح کی تصویر کا حکم اور اس سے متعلق چند سوالات

سوال: ذی روح کی تصویر بنانے کا خواہ دستی ہو خواہ عکسی خواہ مجسم مورت ہو خواہ کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر ہو) اور اسے رکھنے کا شرعاً کیا حکم ہے (۲) اور جس جگہ میں ذی روح کی

تصویر ہو وہاں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے۔ (۳) اور جس گھر میں تصویر یا کتا ہو وہاں فرشتے آتے ہیں یا نہیں (۴) تصویر کے محلل اور مجوز پر شرعاً کیا حکم عائد ہوتا ہے۔ اور تصویر کی تحریم میں سلف سے لے کر خلف تک تمام فقہاء اور محدثین اور مفسرین کی تغلیط و تضلیل کرنے والے کا کیا حکم ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

تصویر بنانا حرام خواہ وہ تصویر کپڑے پر بنائی جائے یا برتن پر یا دیوار پر کسی چیز پر بنانا جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ تصویر چھوٹی ہو یا بڑی کما فی الشامی (ص ۶۷۶ ج ۱)

فی البحر و فی الخلاصۃ و تکرہ التصاویر علی الثوب صلی فیہ اولا انتھی و ھذہ الکراھۃ تحریمیۃ۔ و ظاھر کلام النووی فی شرح المسلم الاجماع علی تحریم تصویر الحیوان وقال وسواءٌ صنعہ لما یمتھن اولغیرہ فصنعتہٗ حرام لکل حال لان فیہ مضاھاۃ لخلق اللہ تعالیٰ وسواءٌ کان فی ثوب اوبساط اودرھم و إناء وحائط وغیرھا اھ فینبغی ان یکون حرامًا لامکروھا ان ثبت الاجماع او قطیعۃ الدلیل متواترۃ اھ کلام البحر ملخصًا (وقال الشامی بحثًا) ان التصویر یحرم لو کانت الصورۃ صغیرۃ کالتی علی الدرھم اُوکانت فی الید او مستترۃ او مھانۃ وقال ایضًا ص ۶۷۹. ھذا کلہٗ فی اقتناء التصویر فھو غیر جائز مطلقًا لانہٗ مضاھاۃ لخلق اللہ تعالیٰ کما مرّ۔

پس تصویر بنانا ہرگز جائز نہیں۔ نہ تعظیم کے لئے نہ غیر تعظیم نہ چھوٹی نہ بڑی اور کسی بھی چیز پر بنائی جائے ہر طرح ناجائز ہے (اور عکسی و دستی میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ تصویر کا مقصود دونوں طرح حاصل ہے) اور یہ جو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بت یعنی مجسمہ ناجائز ہے اور کاغذ وغیرہ پر تصویر جائز ہے یہ غلط ہے۔

قال النووی فی شرح المسلم ولا فرق فی ھذا کلہٗ بین ماله ظل وما ظل لہٗ ھذا تلخیص مذھبنا فی المسئلۃ و بمعناہٗ قال جماھیر العلماء من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم

وهومذهب الثوری. ومالك وأبی حنيفةؒ وغيرهم وقال بعض السلف انّما ينهی عمّا كان له ظلّ ولا بأس بالصور الّتی ليس لها ظل وهذا مذهب باطل فان الستر الّذی انكر النبی صلی الله عليه وسلم الصورة فيه لا يشك احد أنه مذموم وليس له ظل مع باقی الاحاديث المطلقة فی كل صورة (مسلم ج ۲/ ۱۹۹)

(۲) اگر تصویر ایسی جگہ لٹکی ہے کہ نمازی کے سر پر ہوتی ہے یعنی چھت میں ہے یا نمازی کے آگے ہے یا اس کے دائیں بائیں یا سجدہ کی جگہ ہو تو نماز مکروہ ہے اور اگر نمازی کی پشت کی جانب ہے کراہت نہیں البتہ اگر پاؤں کے نیچے ہو تو نماز مکروہ نہ ہو گی (گو بنانا اس کا جائز نہیں) اسی طرح اگر تصویر بہت چھوٹی ہو کہ کھڑے ہوئے آدمی کو اس کے اعضاء معلوم نہ ہوں جبکہ وہ زمین پر رکھی ہو یا اس کا سر کٹا ہوا ہو یا کوئی ایسا عضو کٹا ہوا ہو کہ جس کے بدون زندہ نہیں رہ سکتا تو نماز مکروہ نہ ہو گی (وهذا كله من الدر المختار ج ۱/ ۶۷۷)

(۳) جس گھر میں تصویر یا کتا ہو اس میں فرشتے نہیں آتے جیسا کہ مسلم ونووی کی روایت سے ثابت ہے۔ (وهو قول جبريلؑ للنبیؐ انا لا ندخل بيتاً فيه كلب و صورة رواه مسلم)

(۴) وہ شخص فاسق ہے کیونکہ کافر جب ہوتا جب حرام قطعی کو حلال جانتے کما فی العالمگیریۃ (ج ۳/ ۱۶۴) انّما يكفر اذا كانت الحرمة ثابتة بدليل مقطوع به اما اذا كانت باخبار الآحاد لا يكفر كذا فی الخلاصة وفی ثبوت تواتره او الاجماع علی حرمته تامل وان ثبت الاجماع علی حرمته ماله ظل ولكن لا يكفر منكر كل اجماع والتفصيل فی حاشية فيكفر جاحده (ص ۲۲۱، ۲۲۲) فبحث الاجماع نور الانوار.

(۵) اس کا وہی جواب ہے جو ۱۲ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ
۱۴ شوال ۱۳۴۳ھ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۵ شوال ۱۳۴۳ھ

ظروف پر تصویریں بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

سوال : میں سیاہ قلم کے ظروف کی تجارت کرتا ہوں۔ سیاہ قلم کے سانپ بنتے ہیں جس پر موم بتی بنائی جاتی ہے اندرونی حصہ یعنی اس کا پیٹ خالی ہوتا ہے۔ ہر ایک آرڈر میں اس کی فرمائش اکثر ہوتی ہے اور فرمائش کی تعمیل نہ کرنے سے خریدار ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا بنانا اور فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز ؟ کسی برتن پر مور کی یا بطخ کی تصویر بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

چھوٹی بڑی ہر قسم کی تصویر بنانا منع ہے۔ البتہ چھوٹی تصویر کسی برتن پر ہو کہ بدون غور کے معلوم نہ ہوتی ہو تو ایسے برتن کا بیچنا جائز ہے اور جس برتن پر بڑی تصویر ہو اس کی تجارت کرنا ممنوع ہے (گو بیع کے بعد جو قیمت وصول ہو وہ حلال ہے مگر ایسے برتن کا رکھنا اور اس کی تجارت ممنوع ہے) ۱۲

کما فی الدر المختار : واختلف المحدثون فی امتناع ملائکة الرحمة بما علی النقدین فنفاہ عیاض واثبتہ النووی وفی الشامی (قولہ فنفاہ عیاض) ای وقال ان الاحادیث مخصصة بحر وھو ظاھر علمائنا فان ظاھرہ ان مالا یؤثر کراھة فی الصلوٰة لایکرہ ایضاءہ وقد صرح فی الفتح وغیرہ بان الصورة الصغیرة لاتکرہ فی البیت الخ وقال تنبیہ ھذا کلہ فی اقتناء الصورة واما فعل التصویر فھو غیر جائز مطلقاً۔ (۶۷۹/ج۱)

کتبہ الاحقر
عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفی عنہ

افطار و سحری کے وقت ساز و باجے کے ساتھ گانے بجانے کا حکم

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ چند لوگ باہم متفق ہو کر ماہ رمضان المبارک میں مع ساز و باجے کے گانا گاتے ہوئے گشت لگاتے ہیں۔ وقت افطاری جس مکان کا مکین مسجد میں افطاری

روزہ داران کے لئے بھیجتا ہے تو اس کے مکان پر سب گویئے مع ساز و باجے کے موجود ہوتے ہیں اور گانے بجاتے ہوئے مسجد تک آتے ہیں یہی شغل وقت سحری کا بھی ہے۔ گھر گھر جگاتے پھرتے ہیں کبھی اِس محلّہ اور کبھی اُس محلّہ اور یہی شغل عید الفطر کے بعد نماز پڑھ لینے کے بعد ہوتا ہے۔ کیا یہ امر جائز ہے؟ میں نے اس فعل کو بالکل بدعت سمجھ کر ممانعت کی۔

الجواب

گانا بجانا ساز وغیرہ سے شرعًا بالکل حرام ہے اور افطار کے وقت افطاری کے ساتھ لوگوں کا آنا محض اظہار تفاخر و ریاء ہے کہ ہمارے گھر سے افطاری جاری ہے جس کو مخلص کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ رات کو سحری میں جگانا جائز ہے مگر ساز و سامان سے گانا جائز نہیں۔ صرف آواز دے کر جگا دیں بشرطیکہ اہل محلّہ کو ناگوار نہ ہو اور وہ اس کے طالب ہوں کہ ان کو جگایا جائے اور آواز کافی نہ ہو تو نقارہ بجا دینا جائز ہے۔ عید الفطر کے دن کسی قدر لہو و لعب کی اجازت ہے غربال و دف سے گانا بھی جائز ہے بشرطیکہ گانے والا امرد یا عورت نہ ہو۔ اور گانا قاعدہ موسیقی پر نہ ہو اور دف یا غربال بھی قاعدہ موسیقی پر نہ بجایا جائے بلکہ ویسے ہی بلا قاعدہ بجایا جائے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۲۲ شعبان ۴۵ھ

شادی بیاہ وغیرہ میں عورتوں کے گانے کی حرمت کا بیان

سوال: در ملک ما رواج است کہ در مواقع شادی ولیمہ و ختنہ و ولادت اولاد وغیرہ اہل شادی نساء بلدہ را دعوت دادہ مجمع عودہ زنان تغنی می کنند و بہ آواز بلند قوامی کنند بطوریکہ آواز اوشاں بدور می رود و ایں قوالی را در عرف ما سحر ہا می مانند و ایں مجلس سحر ہا چند شب پیش از موقعہ شادی می کنند و مضمون سحر ہا ہم غالبًا مالایعنی می باشد و اگر کدامی مردے اہل خانہ خود را باین دعوت سحر ہا اجازت نہ دہد بہ سبب احتیاط آنرا الشخص قاطع فی پندارند و بایں مصیبت اشراف وذی مروت ہم مبتلا اند الحال سوال است کہ دریں چنیں مواقع ایں چنیں تغنی کردن زنان و سحر ہا موصوفہ علی الاجتماع سرائندن بطوریکہ آواز بگوش اجنبیاں

رسد شرعاً درست یا حرام۔ وعلی الشق الثانی جواب از احادیث کہ مشعر از حث علی التغنی استند مثلاً قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فلو بعثتم معہا من یقول أتیناکم اتیناکم فحیانا کم فحیاکم یا عائشۃ الا تغنین: کہ در مشکوٰۃ شریف در باب اعلان نکاح مذکور ند چیست بینوا توجروا۔

الجواب

جس غنا کی حالت سوال میں مذکور ہے یہ حرام ہے اس کے جواز کی گنجائش نہیں اور احادیث میں جس غناء کا ذکر ہے وہ غناء نسواں بآواز بلند نہ تھا بلکہ کلمات چند بطور مسرت استعمال کرنا مراد ہے جیسا کہ خود حضورؐ نے کلمات بیان فرمائے اتیناکم اتیناکم (۱) الخ تو اس طرح دو چار باتیں کہنا غناء محرم میں داخل نہیں اور عورتوں کا جو طریقہ سائل نے بیان کیا ہے اس کو حدیث سے کچھ مس نہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ خانقاہ امدادیہ، ۸ شعبان ۱۳۴۶ھ

سپ ٹیموں سے چندہ جمع کر کے کپ لا کر جیتنے والی ٹیم کو دینا قمار ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل صورتوں میں کہ (۱) آج کل لوگ انگریزی فیشن کی پیروی میں ورزش اور کسرت جسمانی بھی انگریزی کھیلوں کے ذریعے کرتے ہیں اور مناً مالی فائدے بھی حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی قیمتی دھات کا برتن نہایت خوبصورت بناتا ہے جس کو انگریزی میں کپ کہتے ہیں اور بائیس تمغہ جات بھی ساتھ ہی تیار کراتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ یہ کپ اور گیارہ تمغے فٹ بال یا کرکٹ یا ہاکی (انگریزی کھیلوں کے نام ہیں۔ جیت جانے والی ٹیم کو دیا جائے گا (ٹیم اس گروہ کو کہتے ہیں جس میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں اور ایک رقم مقرر کرتا ہے مثلاً دس یا پندرہ روپیہ جس کو فیس داخلہ کہتے ہیں۔ چنانچہ جو ٹیمیں رقم مقررہ ادا کرتی ہیں آپس میں مقابلہ کھیلتی ہیں۔ مثلاً دس ٹیمیں داخل ہوئیں۔ اس صورت میں کپ تیار کرنے والے کو سو روپے پہنچے اگر اس نے فیس داخلہ دس روپے مقرر کیا ہے۔ اب وہ ان دسوں

(۱) رقم الحدیث ۳۱۵۵
(مشکوٰۃ شریف باب اعلان النکاح الفصل الثانی) مرتب)

ٹیموں کے پانچ کھیل مقابلہ کراتا ہے یقیناً پانچ ہار جاتی ہیں اور پانچ جیت جاتی اب ان پانچ جیت جانے والیوں کا کھیل کراتا ہے غرضیکہ آخر میں دو ٹیمیں رہ جاتی ہیں پھر وہ کھیلتی ہیں۔ ان دونوں میں جو جیت جاتی ہے اس کو کپ اور گیارہ تمغے ملتے ہیں اور آخر باری بعد ٹیم کو صرف باقی ماندہ گیارہ تمغے ملتے ہیں اور باقی آٹھ ٹیمیں بالکل محروم رہتی ہیں گویا وہ ہار گئیں۔

مذکورہ بالا کھیلوں میں سے دو کھیل (فٹ بال اور ہاکی) جانگیا پہن کر کھیلے جاتے ہیں جس سے زانو جن کا کھولنا شرعاً حرام ہے کھلے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی مسلمان متقی ہو تو وہ پاجامہ پہن کر کھیلنے کا مختار رہے ورنہ غیر مسلم جانگیا پہن کر کھیلتے ہیں ایسے ہی عام مسلمان بھی دریافت طلب یہ امور ہیں کہ آیا یہ صورت جوا یا شرط دو طرفہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔ ان کھیلوں میں پاجامہ پہن کر کھیلنا جبکہ ساتھی زانو کھلے کھیل رہے ہوں مسلمان کے لئے کیسا ہے؟ اور دنگل وغیرہ کا بھی حکم بیان فرمائیے اس میں بھی پہلوان تقریباً ننگے ہی ہوتے ہیں۔ مفصل بیان فرمائیں چونکہ دہلی میں بہت سے مسلمان نوجوان جو متبع شریعت مشہور ہی نہیں بلکہ حقیقتاً شریعت کے پابند ہیں ان امور میں شامل ہوتے ہیں۔

الجواب

جب کھیلنے والی ٹیموں سے بھی فیس داخلہ کے نام سے رقم لی جاتی ہے اور انعام صرف جیتنے والوں کو دیا جاتا ہے تو یہ صورت قمار میں ہی داخل ہے اس لئے اس سے احتراز واجب ہے۔ مسلمانوں کو قمار ہرگز جائز نہیں۔

اور اگر قمار کی صورت نہ ہو تو فی نفسہٖ ورزش جس سے صحت جسمانی مقصود ہو جائز ہے۔ بشرطیکہ ستر نہ کھلے اور ستر کی حفاظت کی جائے اور اگر بطور قمار کے یہ کھیل کھیلتے ہوں تو ان کے کھیل کو دیکھنا بھی جائز نہیں کیونکہ دیکھنے والوں کی وجہ ہی سے ان کے حوصلے بڑھتے ہیں لہٰذا یہ بھی اس فعل میں ان کے معین ہیں اور کشف عورت کا گناہ اور بلا ضرورت نظر الی کشف العورت کا گناہ جدا رہا۔

قلت وان کان فی کشف الرکبۃ مندوحۃ عند غیر الاحناف وفی کشف الفخذ لعمل الارض ونحوہ سعۃ عند مالک

ولکن لا یفتی بغیر مذھبنا الا عند الحاجة ۔ ولا حاجة فی ذلك اصلاً۔ اس سے دنگل کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ اس کا دیکھنا بھی بصورت کشف عورت جائز نہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی کھیلوں میں فی الجملہ تشبہ بالکفار بھی ہے جس سے مسلمان کو احتراز چاہیئے۔ کیونکہ تشبہ بالکفار امور مذہبی میں حرام اور شعار کفار میں مکروہ تحریمی اور عادات کفار میں مکروہ تنزیہی ہے۔

قال فی الدر: دعی الی ولیمة و ثمة لعب او غناء قعدوا کل لو فی اعتدل دون المائدہ وان علم اوّلا یاللعب لا یخضر اصلاً و فی السراج دلّت المسئلة علی ان الملاھی کلھا حرام الی ان قال ومن ذالك ضرب النوبة تفاخرا فلو للتنبیه فلا ۱ھ الشامی فاللعب و ھو اللھو حرام بالنص قال علیه السلام لھو المؤمن باطل الا فی ثلث بفرسه و رمیه و اھله الخ (ص ۱۳۱ ج ۵)

قلت دل جزئیة النوبة علی ان اللھو لا یبقی لھوا اذا کان فیه نیة صالحة و انما اللھو ما کان علی قصد اللھو واللہ اعلم ۱۲ قال الشیخ معنی قولھم ان الملاھی کلھا حرام، مثل تلك الملاھی وھی ما کان بالمعازف والآلات المطربة والافقد رخص النبی صلی اللہ علیه و سلم بشئ من اللھو واللعب فی الاعیاد والاعراس وقد ورد فی النسائی ان جاریة کانت ترقص عند المسجد یوم العید فزجرھا عمر فنھاہ النبی صلی اللہ علیه وسلم و قال دعھم فانھم۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ ربیع الثانی ۵۲ھ از تھانہ بھون

ورزش کی مختلف قسمیں اور ان کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو نئے نئے اقسام کی ورزش اس ملک میں رائج ہو گئیں ان کے بارے میں شریعت کا کیا فیصلہ ہے۔ آیا یہ کہ چونکہ یہ ورزشیں صحت و قوت بدنی حاصل کرنے کا ایک بہتر ذریعہ ہے جن کا مرغوب فیہ

ومحبوب ہونا آیت کریمہ بسطۃ فی العلم والجسم۔ نیز حدیث شریف المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف وفی کل خیر سے معلوم ہوتا ہے تو بقاعدہ شرعیہ مقدمات الشئ فی حکم ملحقاتہا۔ کیا یہ ورزشیں بھی جائز بلکہ محبوب و مرغوب فیہ ہو جائیں گی یا نہیں۔ ذیل میں ان ورزشوں کے مختلف اقسام لکھی جاتی ہیں۔

(الف) فٹ بال، کرکٹ، ہاکی، پولو، ٹینس وغیرہ آج کل اس قسم کے کھیلوں میں دنیا بھر میں عموماً شرط بازی اور انگریزوں کا لباس جیسے چڈی وغیرہ جس میں زانو کے اوپر کا حصہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

(ب) فائیوں ہاتھوں سے فٹ بال کھیلنا جن میں نہ تو عموماً شرط بازی چلتی ہے ہے نہ تو لباس بدلا جاتا ہے۔ ان کا حکم بھی بتلا دیں۔

(ج) ایک ورزش ڈول (قواعد) جس میں بدن مختلف طرف سے ہلایا جاتا ہے یہ عموماً ہر سرکاری سکول میں ہر لڑکے سے جبراً کرایا جاتا ہے۔

(د) بعض ورزشیں سائنس وطب کے اصولوں کے موافق بنا کر بعض انگریزوں نے (مثلاً مسٹر سنٹنڈون مٹکفنڈن وغیرہ) نے ان ورزشوں کے نمونے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں اور فوٹو بھی دیئے ہیں اور یہ سمجھایا کہ اس قسم کی ورزش اس خاص مرض کا علاج ہے وغیرہ وغیرہ تو اگر کوئی شخص مسلمان ان صورتوں کو دیکھ کر یہ ورزشیں کرے تو اس کا کیا حکم ہے اور اگر فوٹو نہ دیکھے بلکہ کسی دوسرے آدمی سے سیکھ کر یہ ورزشیں کرے تو اس کا کیا حکم ہے۔

(س) انہی ورزشوں میں بعض خاص خاص اوزاروں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ جیسے ڈمبل، پیتل اور لوہے کی رسیاں وغیرہ جو کہ بعض طرق کے کرنے سے قوت بدنیہ میں خاص اور جلد اثر پیدا کرتی ہیں۔ بخلاف دوڑنے تیرنے وغیرہ کے تو ان کا بھی شریعت میں کیا حکم ہوگا۔

الجواب

ہر ورزش جس سے بدن کی قوت وصحت مطلوب ہو فی نفسہٖ جائز اور مباح ہے اگر اس میں حرمت یا کراہت آئے گی تو کسی عارض کی وجہ سے آئے گی۔ مثلاً

کسی کی نیت کفار کے ساتھ تشبہ کی ہو یا ورزش کے وقت لباس کفار کا پہنا جائے یا اس کا وقت ایسا مقرر کیا جائے جس سے نماز ضائع ہو یا اس میں خلل پڑے یا ورزش میں قمار کی صورت ہو کہ جانبین سے مال کی شرط ہو یا کسی ورزش میں کفار یا فساق کا اختلاط ناگزیر ہو یا کسی ورزش کا اثر طبائع پر یہ پیدا ہوتا ہو کہ اس کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں کفار کے ساتھ تشبہ کرنا معیوب نہ رہے بلکہ تشبہ کی رغبت پیدا ہو یا اس کے مثل اور کوئی عارض شرعی ہو۔ اس تفصیل سے تقریبًا تمام سوالات کا جواب ہو گیا۔ اب خلاصہ کے طور پر بطور فیصلہ کے ہم کہتے ہیں کہ انگریزی ورزشوں میں جو ورزش دوسروں کے ساتھ مل کر کی جاتی ہے جیسے فٹ بال، ہاکی وغیرہ ان سے تو ہم منع کرتے ہیں اور مدارس دینیہ عربیہ کے طلبہ کو سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں کیونکہ یہ عوارض مذکورہ بالا سے خالی نہیں۔ کم از کم ان کا یہ اثر تو ضرور ہوتا ہے کہ عربی طلبہ کے دلوں میں تشبہ بالکفار کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد انگریزی طلبہ کے ساتھ اختلاط بھی کرنے لگے ہیں نہ بقصد اصلاح و امر بالمعروف بلکہ بقصد موالات ولہو ولعب ولا یخفی ما فیہ من المفسدہ، اور جو انگریزی ورزشیں تنہا کی جا سکتی ہیں ان میں کچھ حرج نہیں جیسے بدن کو خاص طور سے حرکت دینا یا ڈمبل وغیرہ ہلانا بشرطیکہ ان ورزشوں کو تنہائی میں کیا جائے اور بعض کتاب میں ورزشوں کے اصول لکھے ہیں۔ ان کو دیکھنا پاس رکھنا بھی جائز ہے مگر تصویروں کا چہرہ پھاڑ دینا یا سیاہی وغیرہ سے چھپا دینا لازم ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲ رمضان ۴۷ھ

گراموفون سے کون کون سی آوازیں سننی جائز ہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل میں کہ گراموفون جو ایک مشہور ومعروف مشین ہے جس کو بعض لوگ مجذب الصوت بھی کہتے ہیں جس کے اندر ہر قسم کی آواز بھر دی جاتی ہے اور جب چاہو اس مشین کے ذریعے اس صوت کو سن لو۔ یہ مشین کی آواز سننا کیسا ہے اس میں راگ کلام مجید کی آوازیں غرض ہر آواز بھری اور سنی جا سکتی ہے۔ اس میں کون سی آواز سننا جائز ہے اور کون سی

ناجائز؟ چونکہ اس نواح میں شہرت ہے کہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے لہٰذا ضرورت ہوئی کہ حضرت کی منشاء خصوصیت سے معلوم ہو۔

الجواب

گراموفون میں تقریریں اور جانوروں کی آوازیں سننا جائز ہیں اور قرآن مجید سننا جائز نہیں کیونکہ یہ تلہی بالقرآن ہے جو جائز نہیں اور اسی طرح راگ عورتوں کا سننا بھی جائز نہیں کیونکہ اس سے اجنبیہ کے ساتھ التذاذ ہے اور التذاذ بالاجنبیہ ممنوع ہے اور مرد کی لاگ سننا جائز ہے بشرطیکہ رگ کے ساتھ ڈھول باجہ کی آواز بند نہ کی گئی ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم هذا کله من القواعد

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ ۱۵ ذی الحجہ ۴۸ھ

تتمہ: اس کے بعد حضرت اقدس حکیم الامۃ دام مجدہم کا جواب جو مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے سوال پر مفصل لکھا گیا ہے دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ جن آوازوں کا سننا گراموفون میں جائز بھی ہے اس میں بھی جواز کی دو شرطیں ہیں۔

(۱) یہ کہ وہ کسی حرام کی طرف مفضی نہ ہو۔ مثلاً نماز وغیرہ سے غفلت نہ ہو اور اس کے فعل سے عوام مطلقاً گراموفون کی ہر آواز سننے کے جواز پر استدلال نہ کریں جبکہ یہ شخص عوام میں دیندار یا دینداروں کا خاص متعلق شمار ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اصواتِ مباحہ کے سننے میں نیت محض تلہی کی نہ ہو بلکہ کوئی غرض صحیح ہو ورنہ مکروہ و خلاف اولیٰ ہوگا۔ (۱) حیرت ہے کہ اس قدر تفصیل کے بعد کس نے حضرت والا کی طرف گراموفون سننے کا جواز اطلاق کے ساتھ منسوب کر دیا۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ

۱۶ ذی الحجہ ۴۸ھ

تصویر اور فوٹو میں فرق اور کھینچنے اور کھنچوانے والے کی اقتدار کا حکم

سوال: بعض لوگ فوٹو اور تصویر میں فرق کرتے ہیں کہ فوٹو مثل آئینہ کے عکس کے

(۱) دیکھئے امداد الفتاویٰ (ج ۴/ ۲۴۵ تا ۲۵۱) مرتب

ہے۔ اس لئے جائز ہے اس کے متعلق شرعی حکم بتلایا جائے اور یہ کہ فوٹو کھینچنے والے اور کھنچوانے والے کی اقتدار کا کیا حکم ہے۔

الجواب

اشد الناس عذابًا المصوّرون اخرجہ الشیخان عن ابن مسعود مرفوعًا وفی الباب عن عمرو عن عائشۃ و ابن عباس و ابی ھریرۃ و علی و ابی طلحۃ و ابن عمر و میمونہ وغیرھم من الصحابہ۔ ولأجل ذالک قال صاحب الحجۃ القاھرۃ ان حرمۃ التصاویر متواترہ ولکن الاحادیث التی تثبت بھا الحرمۃ کلھا احاد فردًا فردًا الّا ان من مجموعھا تکون الحرمۃ متواترہ وفی التوضیح قال اصحابنا و غیرھم تصویر صورۃ الحیوان حرام اشدّ التحریم و ھو من الکبائر سواءٌ صنعہٗ لما یمتہن اولغیرہ (وان اختلف حکم الاستعمال فیھا) فحرام بکل حال وأما ما لیس فیہ صورۃ حیوان کالبحر ونحوہ فلیس بحرام (بشرطات لا یکون مما یعبد فیحرم) وبمعناہٗ قال جماعۃ العلماء مالک والشافعی و سفیان و ابو حنیفۃؒ وغیرھم وذکر الحافظ نحوہٗ عن النووی قال۔ وقال بمعناہٗ جماھیر العلماء من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم و ھو مذھب الثوری ومالک وابی حنیفۃ و غیرھم۔ (ص ۱۹۹ نووی مع مسلم) وعمدۃ القاری (ج۴/۳۰۵) وبالجملہ فالحرمۃ مجمع علیھا۔

تصویر کی حرمت احادیث متواترہ سے ثابت ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے۔ اس کے بعد چند مقدمات ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔ ایک یہ کہ جرائم کے مقدمات ومبادی بھی ہر قانون میں جرم سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں اور فساق و فجار کے ساتھ صورت و وضع میں بھی

مشابہت پیدا کرنا ممنوع ہے۔ یہ دونوں مقدمے عقل ونقل سے ثابت اور اسلام کے اہم مسائل میں سے ہیں۔

تیسرے یہ کہ حرام چیز کا نام بدل دینے سے وہ حلال نہیں ہوجاتی۔ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے لوگ شراب کا نام بدل کر اس کو پئیں گے اور بر سرِ مجلس راگ باجے اور گانے بجانے کا مشغلہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دیں گے اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنا دیں گے پس جس طرح سود کا نام منافع اور رشوت کا نام حق الخدمت اور شراب کا نام برانڈی یا اسپرٹ اور قمار کا نام بیمہ لاٹری اور گانے کا نام گراموفون رکھ دینے سے وہ حلال نہیں ہوجاتے اسی طرح تصویر کشی کا نام فوٹوگرافی یا عکاسی کہہ دینے سے وہ حلال نہ ہوجائے گی۔

چوتھے یہ کہ اگر کسی فعل حرام کا طریقہ ذریعہ ارتکاب بدل جائے تو اس سے بھی وہ حلال نہ ہوگا جبکہ حقیقت اور وجہ حرمت باقی ہے مثلاً قتل کا کوئی نیا طریقہ ایجاد ہوجائے کہ بجلی کی رو سے جان نکال دی جائے یا شراب کی کشید کا نیا طریقہ ایجاد ہوجائے جس طرح آج کل مشینوں سے مقطر شراب حاصل کی جاتی ہے اور پہلے یہ طریقہ نہ تھا یا قمار کا نیا طریقہ ایجاد ہوجائے جیسا آج کل بیمہ اور لاٹری کی قسم سے بہت صورتیں ایجاد ہوئی ہیں جو پہلے نہ تھیں یا زنا کا کوئی نیا طریقہ رائج ہوجائے جیسا آج کل یورپ میں بہت سی صورتیں رائج ہیں تو اس سے یہ فعل محرم حلال نہ ہوگا۔ پس اسی طرح جب تصویر کشی حرام ہے تو اس کی جو صورت بھی ایجاد ہوگی حرام ہوگی۔ نام بدلنے یا طریقہ بدلنے سے حرمت زائل نہ ہوگی کیونکہ حرمت تصویر کا جو سبب ہے وہ مبادی شرک سے ہے وہ یہاں بھی موجود ہے۔ نیز مشابہت کفار بھی اس میں موجود ہے کہ یہ کام مسلمانوں کا نہیں رہا یہ کہنا کہ فوٹو کی پرستش نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض جگہ ہوتی ہے اور نہ بھی ہو تو جب تصویر کا عام طریقہ آج کل یہی رہ گیا ہے تو اگر آج پرستش نہ ہوئی تو آئندہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیا ہاتھ کی تصویریں اور بت ایجاد کے دن ہی پوجے جانے لگے تھے۔ نہیں بلکہ کچھ مدت کے بعد ان کی پرستش ہوئی

اس لئے شریعت نے اس کو حرام کیا وہی سبب فوٹو میں موجود ہے۔ رہا یہ کہ فوٹو گرافی درحقیقت عکاسی ہے جیسے آئینہ اور پانی میں عکس اتر آتا ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے بڑا فرق تو دونوں میں یہی ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار نہیں ہوتا اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کر لیا جاتا ہے پس وہ اسی وقت تک عکس ہے جب تک مسالہ سے اسے قائم نہ کیا جائے اور جب اس کو کسی طریقہ سے قائم اور پائیدار کر لیا جائے وہی تصویر بن جاتا ہے۔ رہا یہ کہ فوٹو گرافر مسالہ لگاتے ہوئے اعضاء کی تخلیق نہیں کرتا اس کا جواب یہ ہے کہ سانچہ میں مورتیں اور مجسمے ڈھالنے والا بھی اعضاء کو نہیں بناتا تو کیا ڈھلی ہوئی مورتیں اور مجسمے بھی جائز کر دیئے جائیں گے اس کا تو حاصل وہی ہوا کہ آج کل تصویر کشی کا طریقہ وہ نہیں جو پہلے تھا۔ سو اوپر بتلا دیا گیا کہ ارتکاب محرم کا طریقہ نیا ایجاد کرنے سے وہ حلال نہیں ہو جاتا۔ پھر کون نہیں جانتا کہ فوٹو کھینچنے اور کھنچوانے سے وہی مقصود ہے جو پہلے تصویر کشی سے مقصود تھا اور اس میں بھی مصوّر اور مصوَّر کے فعل اختیار کو اسی طرح دخل ہے جس طرح تصویر کشی میں داخل تھا۔ پس دونوں حرمت میں برابر ہیں اور ان میں فرق کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہاتھ سے نچوڑی ہوئی شراب اور مشین سے مقطر شراب میں فرق کرنا۔ پس فوٹو کھینچنے والے اور کھنچوانے والے دونوں مرتکب حرام مرتکب گناہ کبیرہ اور بعض حدیثوں کی رو سے ملعون و فاسق ہیں۔ ایسے لوگوں کے نماز میں اقتداء مکروہ تحریمی ہے اور اس قسم کی تصویریں گھر میں یا اپنے پاس رکھنا سراسر گناہ اور حرام ہے مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ رسالہ احکام التصویر مصنفہ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی مفتی دارالعلوم دیوبند مرقومہ ذی قعدہ ۵۲ھ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

هذا هو الحق وماذا بعد الحق الا الضلال۔

کتبہ اشرف علی ۲۳ رجب ۵۶ھ۔

معاملات المسلمین باھل الکتاب والمشرکین

ہندوؤں کے جلسہ میں شرکت کا حکم

سوال: جس جلسے و مجمع میں لیکچرار ہندو اور عورتیں یا صرف ہندو مرد اور کچھ مولوی مدعو کئے جائیں اور سامعین ہندو مسلمان دونوں بلائے جائیں تو ایسے جلسے میں شرکت کرنی چاہیئے کہ نہیں۔

الجواب

ایسے جلسہ میں شرکت جائز نہیں۔

ہندوؤں کے میلہ میں جانے اور خرید وفروخت کرنے کا حکم

سوال: ہندوؤں کے میلہ میں جانا اور کوئی چیز خریدنا بیچنا اور اس کا کھانا یا استعمال میں لانا کیسا ہے۔ اگر کوئی مولوی میلہ کے اندر وعظ کہے تو اس کو میلہ کے اندر وعظ کہنا اور لوگوں کا وعظ کی نیت سے میلہ میں شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

ہندوؤں کا میلہ اگر مذہبی ہو تو اس میں شرکت جائز نہیں اور نہ مسلمانوں کو ان کے ایسے میلے میں اپنی دوکان لے جانی چاہیئے۔ باقی سودا خریدنے میں دونوں قول ہیں۔ بعض فقہاء نے اس کو بھی منع کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اگر معمول کے مطابق ضروریات خرید ہی جائیں اور اس میلہ کی وجہ سے خاص کوئی چیز نہ خریدی جائے تو جائز ہے مگر احتیاط اسی میں ہے کہ ان کے مذہبی میلہ میں سے کچھ بھی نہ خریدے کیونکہ خریداروں سے بھی میلہ کی رونق بڑھتی ہے اور کفار کے مذہبی میلہ کی رونق کو بڑھانا مناسب نہیں۔ ہاں اگر تجارتی میلہ ہو جیسے بعض جگہ جانوروں کی تجارت کے لئے میلہ لگتا ہے۔ اس میں جانے اور خرید وفروخت کرنے میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ ناچ رنگ وغیرہ سے دور رہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد

۲۴ جمادی الاولی ۵۳ھ

کفار جو مال حرام طریقے سے حاصل کریں اس کا حکم

سوال: عرض ہے کہ بندے اموال کفار کے متعلق بہت دریافت کیا، کتابوں کا مطالعہ بھی کیا لیکن مجھ کو تشفی حاصل نہیں ہوئی۔ اتنا حضرت اقدس کے ارشاد سے کچھ خلجان دور ہو گیا کہ ملازمین کو جو روپیہ دیا جاتا ہے اجرت وغیرہ میں یہ حلال ہے کسی اور شخص نے جو دلیل بیان کی ہے۔ نہایت شبہات پیدا ہو گئے۔ وہ دلیل یہ تھی کہ اموال ان کے اس واسطے حلال ہیں کہ کفار مکلف بالفروع نہیں چونکہ نورالانوار میں مجھ کو اس کے متعلق معلوم تھا مگر مطالعہ کر کے کچھ تشفی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ کفار مخاطب بالعقوبات و بالمعاملات و بالاعتقادیات تو ہیں۔ الغرض شبہات بہت ہیں پس سوال یہ ہے کہ کفار سے عام مراد ہیں خواہ ذمی ہو یا حربی پھر انہوں نے جس طریقہ سے مال کو کمایا ہو یعنی بیوع باطلہ فاسدہ سے غصب، چوری یا سود سے، اور معاملات میں مخاطب فقط آپس میں جو معاملات کرتے ہیں یا عام ہے خواہ آپس میں ہو یا ذمی کے ساتھ یا خواہ مسلم کے ساتھ چونکہ مجھ کو حضرت کی تصنیفات میں سے کوئی تصنیف معلوم نہ تھی۔ لہٰذا عرض کرنے پر آمادہ ہوا۔

جواب اوّل از حضرت مولانا مدّظلہ

اس کا پورا جواب تو مراجعت کتب کے بعد ہو سکتا ہے مجھ کو فرصت نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہ سوال مولوی ظفر احمد کو دے دیا جائے وہ تحقیق کر کے جواب لکھ دیں گے۔ باقی جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ کفار سے مراد عام ہیں اور حلت اموال بھی تمام عقود باطلہ و استیلاء کو عام ہے۔ سرقہ و خداع اس میں داخل نہیں اور غصب میں شبہ ہے ملحق باستیلاء ہے یا ملحق بسرقہ اگر آپ کو کہیں سے تفصیل مسئلہ کی تحقیق ہو جائے تو مجھ کو بھی اطلاع کیجئے۔ اور اگر خانقاہ ہی میں تحقیق ہو جائے تو مجیب سے کہہ دیجئے کہ مجھ کو بھی مطلع کر دیں۔

جواب دوم از مولوی ظفر احمد صاحب

قال فی الهداية: واذا تزوّج النصرانية علی ميتة أو علیٰ غير مهر وذالك فی دينهم جائز فدخل بها او طلقها قبل الدخول بها او مات عنها فليس لها مهر وكذلك الحربيان فی دار الحرب

وهذا عند ابی حنیفۃ وهو قولهما فی الحربیین واما فی الذمیة فلها مهر مثلها ان مات عنها او دخل بها والمتعة ان طلقها قبل الدخول بها وقال زفر لها مهر المثل فی الحربیین ایضًا لهٗ ان الشرع ما شرع ابتغاء النکاح الا بالمال وهذا الشرع وقع عامًا فتثبت الحکم علی العموم ولهما ان اهل الحرب غیر ملتزمین احکام الاسلام وولایة الزام منقطعة لتباین الدار بخلاف اهل الذمّه لانهم التزموا احکامنا فیما یرجع الی المعاملات کالرباء والزنا وولایة الالزام محققة لاتحاد الدار ولابی حنیفۃ ان اهل الذمة لا یلتزمون احکامنا فی الدیانات وفیما یعتقدون خلافه فی المعاملات وولایة الالزام بالسیف وبالمحاجة کل ذالک منقطع عنهم باعتبار عقد الزمّة۔ فانا أمرنا بان نترکهم وما یدینون فصاروا کاهل الحرب بخلاف الزنا لانهٗ حرام فی الادیان کلها والربا مستثنیٰ عن عقود هم لقوله علیه الصلوٰة والسلام الامن اربی فلیس بیننا وبینه عهد اه۔

وقال فی فتح القدیر۔ الهمام ان اهل الحرب غیر ملتزمین الاحکام ولیس لنا علیهم ولایة الإلزام بخلاف اهل الذمّة فانهم التزموها فی المعاملات وولایة الزام ثابتة فنعزرهٗ اذا زنی وننهاه عن الربا وتحکم بفساده والنکاح منها ولذا تجری علیهم احکامهٗ من لزوم النفقة والعدة وثبوت النسب والتوارث به وثبوت خیار البلوغ وحرمة المطلقة ثلثا و نکاح المحارم الخ وفیه ایضًا (قولهٗ ولابی حنیفۃ) حاصله منع المقدمة القائلة انهم (ای اهل الذمه) التزموا احکامنا فی المعاملات بل لیسوا ملتزمین بعقد الزمّة ما یعتقدون خلافهٗ منها الا ما شرط علیهم ولذا لا نمنعهم من بیع الخمر والخنزیر

ونكاح المحارم الخ (ج ۳/ ۲٦۰) وفى الهداية ايضًا واذا تزوّج
الكافر بلا شهود وفى عدّة كافر وذالك فى دينهم
جائز ثم اسلما أُقرّا عليه وهذا عند أبى حنيفة وقال
زفر النكاح فاسد فى الوجهين الّا انهٗ لا يتعرض لهم
قبل الاسلام والمرافعة إلى الحكام. قال ابو يوسف ومحمدٌ
فى الوجه الاوّل كما قال ابو حنيفة وفى الوجه الثانى كما قال زفر لهٗ
(اى لزفر ۱۲) ان الخطابات عامّة على ما مرّ من قبل فتلزمهم
وانما لا يتعرض لهم لذمّتهم اعراضًا لا تقريرًا فاذا ترافعوا
او اسلموا والحرمة قائمة وجب التفريق ولهما ان حرمة
النكاح ولهما ان حرمة نكاح المعتدة مجمع عليها فكانوا ملتزمين
لها وحرمة النكاح بغير شهود مختلف فيها ولم يلتزموا
احكامنا بجميع الاختلافات ولأبى حنيفة أن الحرمة لا يمكن
اثباتها حقًا للشرع لأنهم لا يخاطبون بحقوقه ولا وجه
الى ايجاب العدة حقًا للزوج لأنهٗ يعتقدهٗ الخ وفى الفتاوىٰ
السعيديات ولو ادان التاجر حربيهٗ او استدان من حربى او
غصب احدهما للآخر ثم خرجا إلى دار الاسلام وترافعا امّا
القاضى لا يحكم بشيءٍ لاحدهما على الأخر لعدم الولاية
والقضاء يعتمدها ففى وقت (للولاية) الادانة والاستدانة
معدومة وفى وقت القضاء الولاية معدومة على المستأمن
فيما مضى من فعله والتزامهٗ فيما يستقبل فى حق احكام
بياشرها فى دار الاسلام فلا طريق إلى الحكم ولكن بامر
المسلم ويفتى بالرد يعدا عن العذر والحربيان اذا فعلا
هذا فكذلك لو اسلما وخرجا إلى دار الاسلام وترافعا
عند القاضى قضى بينهما بالدين لصحة المداينة بتراضيهما
ولثبوت الولاية حال القضاء لانهما التزما احكام الشرع بالاسلام

ولا يقضی بالغصب لتملك الغاصب لورود اليد على المباح حتی لا يفتی بالرد (ج ۱/۲۵۳)

وفی الهداية ايضاً اذا تزوج المجوسی امه او بنته ثم اسلما فرق بينهما۔ وفی الكفاية وقال ابو يوسفؒ ومحمدؒ هذا النكاح باطل فی حقهم ولا يتعرض لهم بعقد الذمة لان الخطاب بحرمة هذه الانكحة شائع فی ديارنا وهم من اهل ديارنا فثبت الخطاب فی حقهم لأنه ليس فی وسع المبلغ التبليغ الی الكل وانما فی وسعه جعل الخطاب شائعاً فيجعل شيوع الخطاب كالوصول اليهم ولابی حنيفة ان الخطاب فی حقهم كانه غير نازل لأنهم يكذبون المبلغ ويزعمون أنه ليس برسول الله وولاية الالزام بالسيف او المحاجة وقد انقطعت بعقد الذمة فقصر حكم الخطاب عنهم وشيوع الخطاب انما يعتبر فی حق من يعتقد رسالة المبلغ فاذا اعتقدوا ذلك بان اسلموا ثبت حكم الخطاب۔

عبارت مذکورہ سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

(۱) امام زفرؒ کے نزدیک تمام خطابات عامہ واردہ فی الشرع دربارۂ معاملات کفار کو بھی شامل ہیں خواہ وہ حربی ہوں یا ذمی اور عموم خطاب کی وجہ سے حکم بھی عموماً ثابت ہوگا لہٰذا جو معاملات کفار اہل حرب و اہل ذمہ خلاف شرع کریں گے۔ ان پر حکم فساد لگایا جائے گا۔ گو اہل حرب سے بوجہ عدم ولایت و اہل ذمہ سے بوجہ معاہدہ کے تعرض نہ کیا جائے گا۔

(۲) صاحبینؒ کے نزدیک اہل حرب کے معاملات خلاف شرع ہیں ہر ایک پر حکم فساد نہ لگایا جائے گا کیونکہ انہوں نے احکام اسلام کا التزام نہیں کیا گویا ثبوت حکم کے لئے ان کے نزدیک عموم خطاب کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے اور وہ اہل حرب میں مفقود ہے لیکن اہل ذمہ کے جو معاملات اسلام کے مسائل متفق علیہا کے خلاف ہوں گے ان پر حکم فساد لگایا جائے گا کیونکہ وہ معاملات میں احکام اسلام کا التزام

کر چکے ہیں۔
(۳) امام اعظمؒ کے نزدیک اہل ذمّہ کے بھی معاملات خلافِ شرع پر حکم فساد نہ لگایا جائے گا بشرطیکہ وہ معاملات خود ان کے دین کے موافق ہوں کیونکہ اہل ذمّہ نے معاملات میں احکام اسلام کا التزام اپنے معتقدات کے خلاف میں نہیں کیا۔ ہاں اگر کسی معاملہ کی بابت معاہدہ ہی میں ان سے شرط کر لی جائے اس کا التزام ان کی طرف سے ہوگا۔ باقی معاملات شرعیہ جو ان کے معتقدات کے موافق نہیں اور نہ ان سے ان کے بارے میں کوئی شرط کی گئی ہے۔ ان میں اہل ذمہ کی طرف سے التزام نہیں پایا گیا لہٰذا ایسے معاملات جب وہ اپنے مذہب کے موافق کریں گے تو ان کو صحیح مانا جائے گا اور حکم فساد نہ دیا جائے گا۔ اس تفصیل سے شبہات مذکورہ سوال کا جواب ظاہر ہوگیا۔ اشکال کا منشا یہ تھا کہ جب کفّار مخاطب بالعقوبات و معاملات ہیں تو اگر وہ کوئی معاملہ خلاف شرع کر کے روپیہ حاصل کریں اس کو حلال نہ کہنا چاہیئے بلکہ حرام کہنا چاہیئے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ کفّار مخاطب بالفروع فی للعقوبات والمعاملات اگرچہ ہیں لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے لئے خطاب عام کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے۔ اہل حرب نے تو احکامِ اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا۔ نہ اپنے معتقد کے موافق ہیں اور نہ مخالف میں لہٰذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائیں خواہ رباء سے خواہ غصب سے خواہ بیوع باطلہ و فاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریق سے بہرصورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہو جائے گا اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے اور اہل ذمّہ نے احکام اسلام کا التزام اپنے معتقدات کے موافقات میں کیا ہے۔ مخالفات میں نہیں کیا۔ سوا ان امور کے جن کی شرط ان سے کر لی جائے۔ پس جو عقد اہل ذمّہ اپنے دین کے موافق کریں و شرائط معاہدہ کے بھی خلاف نہ ہو اس میں حکم صحت دیا جائے گا گو وہ شریعت کے خلاف ہو البتہ جو عقد ان کے دین کے بھی خلاف ہو یا شرائط معاہدہ کے خلاف ہو اس میں حکم فساد دیا جائے گا۔ ولعل الحق لا یتجاوز عن ذالک ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۹ ذی القعدہ ۱۳۴۸ھ

ہندو اگر اسلام کی مخالفت میں سنکھ بجانا شروع کردیں تو اس کو روکنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسئلہ میں کہ شوالہ اہل ہنود کے متصل مسجد اور مکانات اہل اسلام واقع ہیں کبھی سنکھ وغیرہ نہیں بجایا گیا مگر اب اہل ہنود نے اس امر کی تجدید کی ہے اور اہل اسلام کے مانع ہوتے کے باعث اہل ہنود کی جانب سے بغرض دل آزاری سنکھ بجانے کا عزم بالجزم کر لیا گیا۔

(۱) آیا اس جدید فعل کو محض دل آزاری کی غرض سے کرنے پر ہتکِ اسلام ہوگی یا نہیں۔

(۲) اگر ہتک اسلام ہو تو مسلمانوں کا ایسے موقع پر کیا فرض ہے۔

(۳) اگر حرمت اسلام برقرار رکھنے کے لئے مسلمان جد و جہد کریں اور نقصان جان ہو تو ان کو درجہ شہادت ملے گا یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

قال فی رد المحتار: علی انہ لو ارادوا ان یتخذ بیتا لھم معدا للکنی کنیۃ یجتمون فیہ یمنعون منہ لان فیہ معارضۃ للمسلمین وازدراء بالدین اھ اے لانہ زیادۃ معبد لھم عارضوا بہ معابد المسلمین۔

(۱) جب سنکھ بجانا ایک عرصہ سے ہنود نے بند کر رکھا ہے تو ان کا اس جدید امر کو ظاہر کرنا مسلمانوں کی اہانت و تحقیر ہے اور مسلمانوں کی اہانت سے مذہب اسلام کی اہانت بھی لازم آتی ہے۔

(۲) مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ اس موقعہ پر حکومت کی طرف صدائے احتجاج بلند کریں اور گورنمنٹ کو توجہ دلائیں۔ اگر حکومت نے مسلمانوں کے حق میں موافق فیصلہ کیا تو شکر کریں اور اگر خلاف فیصلہ کیا (العیاذ باللہ منہ) تو صبر کریں کشت و خون وغیرہ نہ کریں کیونکہ اس میں حکومت سے مقابلہ لازم آئے گا جس کی مسلمانوں میں قدرت نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۹ صفر ۱۳۴۱ھ

ہندوؤں کے طعام اور روغن کا حکم

سوال: ہندو (بنیہ) لوگ جو اکثر ہمارے ملک سندھ میں دوکاندار اور تونگر و باج غور لوگ ہیں ان کی روٹی اور شوربا گوشت اور مٹھی اور برنج وغیرہ کھانا درست ہے یا نہیں۔ نیز ان کا گھی (روغن زرد) اور مٹھائی جلیبی حلوا تیار کیا ہوا کھانا درست ہے یا نہ۔

الجواب

ہندو کی روٹی کھانا درست ہے لیکن گوشت کھانا درست نہیں اور چاول وغیرہ کھانا درست، گھی، مٹھائی وغیرہ کھانا درست ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

۱۶ ذی الحجہ ۴۲ھ

کافر کو سلام کرنے کا طریقہ

سوال: غیر مسلم سلام علیک کرتے ہیں ان کا جواب وعلیکم دینا چاہیئے یا نہیں۔ اب تک خاکسار سلام علیک کا جواب وعلیکم السلام دیتا رہا۔

الجواب

غیر مسلم اگر سلام کرے تو اس کے جواب میں صرف وعلیک کہہ دیا جائے زیادہ نہیں۔ فی البخاری: اذا سلمت الیهود علیکم فقولوا وعلیکم اھ اوکما قال۔ واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد

از تھانہ بھون، ۱۶ ربیع الثانی ۴۵ھ

کفار سے دوستی اور میل جول رکھنے کا حکم

سوال: کسی مرد غیر مذہب (انگریز جو اہل کتاب ہیں) کے ساتھ دوستی یعنی محبت پیار اچھا سلوک ہمدردی رکھنا کیسا ہے؟

الجواب

کفار سے معاملات بیع وشراء اجارہ وغیرہ جائز اور ظاہری میل جول میں بھی مضائقہ نہیں اگر میل جول کے بغیر چارہ نہ ہو باقی بلا ضرورت

میل جول کرنا جائز نہیں اور رابطہ محبت و دوستی بھی جائز نہیں۔ باقی معاملات ہر حال میں جائز ہیں۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۷ رجمادی الاولی ۴۵ھ

مرتدسے معاملات تجارت رکھنے کا حکم

سوال: مرتد سے معاملات تجارت قائم رکھنا جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

دارالحرب کے مرتدین کا حکم حربی مسالم کا حکم ہے فقہا نے جو مرتد کی ملکیت کے زوال کا حکم کیا ہے وہ دارالاسلام کے ساتھ خاص ہے کیونکہ علت زوال ملک کی اس کا بحکم میت ہوتا ہے۔ للأمر بقتله اور دارالحرب میں مرتد قتل نہیں ہوتا۔ لعدم الولاية الامام عليه فكان كالمرأة إذا ارتدت قال في البحر وقيد في المرتد لأن المرتدة لا يزول ملكها عن مالها بلاخلاف فيجوز تصرفاتها بالاجماع لانها لاتقتل فلم تكن ردتها سببا لزوال ملكها كذا في البدائع۔ وينبغي ان يلحق بها المرتد اذا لم يقتل من كان في السلامه شبهة كما قدمناه بجامع عدم القتل ولم أره صريحًا اھ (ج ۵ ص ۱۳۳) وفيه ايضًا لانه باللحاق (بدار الحرب) صار من اهل الحرب۔

ان تمام جزئیات کا مقتضا یہی ہے کہ مرتدین دارالحرب کا وہی حکم ہے جو دوسرے حربیین کا حکم ہے البتہ ان سے نفرت و کراہت زیادہ ظاہر کرنا چاہئے لکون کفرهم اشدُّ باقی شراء و بیع ان کے ساتھ جائز ہے البتہ ان کی دعوت و ضیافت نہ قبول کی جائے نہ ان کے ساتھ مدارات و ملاطفت کی جائے مگر یہ کہ تالیف قلب سے یہ امید ہو کہ اسلام کی طرف عود کر آئے گا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

۱۳ شوال ۴۶ھ

نمائشی میلوں میں جانے اور خرید و فروخت کرنے کا حکم

سوال: بلند شہر اور علی گڑھ کی نمائش میں چیزیں فروخت ہونے کے لئے آتی ہیں اور گھوڑے بھی

فروخت ہونے کے لئے آتے ہیں اور بعض چیزیں سستی بھی ملتی ہیں اور بعض چیزیں قصبہ اور دیہاتوں میں نہیں ملتی اور یہاں مل جاتی ہیں مگر جو چیزیں نمائش میں ملتی ہیں وہ بڑے شہروں میں بھی مل جاتی ہیں اگر کوئی شخص تماشہ نہ دیکھے صرف چیزیں خریدے یا مال فروخت کرنے یا گھوڑ دوڑ دیکھنے کو یا تفریح کو جائے تو درست ہے یا نہیں۔

الجواب

نمائش میں جو گورنمنٹ کے انتظام سے جابجا ہوتے ہیں محض تجارتی میلے ہیں۔ کفار کے مذہبی میلے نہیں ہیں اس لئے ان نمائشوں میں تجارتی مال لے جانا یا وہاں سے مال خریدنا دونوں جائز ہے اور تفریحاً جانا بھی جائز ہے بشرطیکہ کان اور نگاہ کی حفاظت دشوار نہ ہو۔ اگر دشوار ہو تو ایسی جگہ بلا ضرورت جانا جائز نہیں اور اہلِ علم اور مقتدا کو ایسے مقامات پر جانا مطلقاً ممنوع ہے کہ ان کے فعل سے عوام اس کی اباحت مطلقہ پر استدلال کرے گی اور حفاظت سمع اور بصر کو بھی ضروری نہ سمجھیں گے۔ هذا ما عندی ولعل عند غیری احسن منه۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۵ شوال ۵۷ھ

کفّار کی مذہبی دعوتوں میں شرکت جائز نہیں ہے

سوال: گزارش ہے کہ یہاں پر ایک ہندو اور اس کے لڑکے نے اپنی مذہبی رسم (یعنی ایصالِ ثواب) میں اہلِ شہر مسلم اور ہندو سب کو دعوت دی۔ مسلمانوں کو اس دعوت میں شرکت کرنا اور دعوت قبول کرنا یا بغیر شرکت کے اگر وہ کھانا خود بخود بھیج دے تو شرعاً وہ کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

مسلمانوں کو اس دعوت میں شریک ہونا جائز نہیں کیونکہ یہ دعوت ہندوؤں کی مذہبی دعوت ہے اور کفّار کی مذہبی دعوتوں میں شرکت جائز نہیں۔

ودلیله ما ذکرہ ابن تیمیة فی الاقتضاء ولقد سأل سعید المغافری مالکا عن الطعام الذی تصنعه النصاریٰ لموتاهم یتصدقون به عنهم أیأکله المسلم فقال لا ینبغی أن یأخذ

منهم لأنه انما یعمل تعظیماً للشرك فهو كالذبح للاعیاد والكنائس اھ ص ۱۱۰۔ اگر یہ دعوت مذہبی نہیں بلکہ ویسے ہی خوشی کی دعوت ہے تو اس میں شرکت جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ، ۱۵ شوال ۵۸ھ

(نوٹ) چونکہ سوال میں اس کو مذہبی رسم لکھا ہے اس بناء پر جواب دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

مسائل متفرقہ

ردی کاغذ کے استعمال کا حکم سوال: پراگندہ اوراق یا بوسیدہ قرآن مجید کو دفن یا دریا برد کیا جائے یا کس طرح نیز دیگر اوراق، انگریزی اخبارات وغیرہ کی رجن میں بعض مواقع پہ آیات اور انگریزی کتب یا اخبارات وغیرہ میں تصاویر بھی ہوتی ہیں) کس طرح تلف کیا جائے۔ الجواب

قال فی العالمگیریة، المصحف اذا صار خلقاً لا یقرأ منه ویخاف ان یضیع یجعل فی خرقة طاهرة ویدفن ودفنه اولی من وضعه موضعاً یخاف ان یقع علیه النجاسة اھ (ص ۲۱۶ ج ۶) وفیه (۲۱۷) المصحف إذا صار خلقا وتعذرت القرأة منه لا یحرق بالنار اشار الشیبانی الی هذا وبه نأخذ اھ۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو تو دفن کر دینا چاہیئے جلانا نہ چاہیئے باقی اوراق جن میں قرآن کی آیت یا خدا اور رسول کا نام ہو اس میں سے آیت اور خدا اور رسول کا نام نکال لینا چاہیئے۔ ان کو دفن کر دیا جائے اور باقی کو جلا دینا جائز ہے مگر قرآن اور خدا کے نام کو اس طرح دفن کیا جائے جس طرح بغلی قبر میں مردہ کو رکھا جاتا ہے تاکہ اس پر مٹی نہ پڑے۔ ویلحد له لانه لو شق ودفن یحتاج الی اهالة التراب علیه وفی ذالك نوع تحقیر الا اذا جعل فوقه سقف بحیث لا یصل التراب علیه فهو حسن ایضاً كذا فی الغرائب اھ

عالمگیریہ۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
۲۶ ربیع الثانی سنہ ۴۰ھ

اپنا نام چندہ دینے والوں کی فہرست میں لکھوا دینا ایک قسم کا وعدہ ہے

سوال: زید نے ایک مدرسہ کی مسجد کی تعمیر میں کچھ چندہ دینے کے لئے اپنا نام لکھوا دیا جس کو غالباً سات برس کا زمانہ گذر گیا۔ ایک بوجہ ناداری اور دوسرے کم توجہی اور تیسرے مدرسہ کے مدرسین نیچری معلوم ہوتے ہیں اس خیال سے زید نے اب تک چندہ کا روپیہ مسجد میں نہ دیا۔ گو مدرسہ کی جانب سے تقاضہ بھی نہیں تو آیا یہ چندہ لکھوا کر کے وسعت ہوتے ہوئے بھی یا کسی اور عارض کی وجہ سے نہ دے تو عند اللہ زید ماخوذ ہوگا کہ نہیں۔

الجواب

اگر کسی مدرسہ یا مسجد میں چندہ لکھوا دیا جائے تو اس کا حکم وعدہ کا ہے وعدہ کا ایفا کرنا بشرط قدرت واجب ہے اور بقول بعض سنت ہے اور اگر کوئی عذر ایفاء وعدہ سے مانع ہو جائے تو وعدہ خلافی کا گناہ نہ ہوگا اب وہ عذر خواہ چندہ لکھوانے والے کی جانب میں ہو کہ نادار ہو گیا یا چندہ لینے والوں کی جانب میں ہو کہ پہلے ان پر اعتماد تھا اب اعتماد نہ رہا۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۷ شوال سنہ ۴۰ھ

بکری کی رسّی پر چلنا

سوال: بکری کی رسی پر قدم رکھنا اور اس کے اوپر سے چلنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب

بکری کی رسی پر قدم رکھنا اور اس پر چلنا اس میں شبہ کی کیا بات ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا۔ واللہ اعلم۔

اس شخص کے مال کا حکم جس کی غالب آمدنی حرام یا غالب آمدنی حلال ہے۔

سوال: حضرت گنگوہیؒ یہ فرماتے ہیں کہ کثرت وقلت کا اعتبار وہاں ہے کہ جہاں خاص کھانے کی نسبت پر تحقیق نہ ہو

کہ یہ حلال ہے یا حرام اور جب اس بات کی تحقیق ہو کہ اس کھانے میں دودھ مثلاً حرام کا ہے یا گھی حرام کا ہے یا مٹھائی حرام کی ہے تو کھانا کسی طرح درست نہیں اس میں حرام گو کتنا ہی تھوڑا ہو۔ فقط از (فتاویٰ رشیدیہ جلد سوم ص ۱۲۶)

اور الاشباہ والنظائر میں "اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" مستقل قاعدہ بیان کیا ہے اور اسی بیان میں ص۹۱ میں ہے۔

اذا کان غالب مال المھدی حلالاً فلا بأس بقبول ھدیتہ واکل مالہ مالم یتبین أنہ من حرام۔

مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی کے فتاویٰ جلد سوم ص ۱۱۰ میں ہے۔ اگر غالب مال حلال باشد قبول کردن دعوت جائز است مگر اینکہ متیقن شود کہ این دعوت از حرام است ان زمان جائز نیست اھ۔

ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دار و مدار اشتباہ اور تیقن پر ہے اور مولانا سہارنپوری مدظلہٗ نے فرمایا ہے کہ مخلوط بالیقین میں اگر غالب حرام ہے تو حرام اور اگر غالب حلال ہے تو مکروہ تحریمی ہے۔

الجواب

قلت وذکر فی الاشباہ بعد قولہ المذکور قال فی القنیۃ من الکراھۃ غلب علی ظنہ ان اکثر بیاعات[ع] اھل السوق لا تخلو عن الفساد فان کان الغالب ھو الحرام تنزہ عن شرائہ ولکن مع ھذا لو اشتراہ یطیب لہ قال الشارح ووجہہ ان کون الغالب فی السوق الحرام لا یستلزم کون المشتری حراماً فجواز کونہ من الحلال المغلوب والاصل الحل اھ وفیہ ایضاً واما مسئلۃ ما اذا اختلط الحلال بالحرام فی البلد فانہ یجوز الشراء والأخذ الا ان تقوم دلالۃ علی

ع: قلت وھذا یفید جواز شراء البنج فی دیارنا وان کان غالب بیاعاتہ حرماً فافھم ۱۲ منہ۔

انہٗ من الحرام کذا فی الأصل اھ قال الشارح فی التمرتاشی فی باب المسائل المتفرقۃ من کتاب الکراھیۃ ما نصّہ لرجل مال حلال اختلطہ مال من الربوا والرشاد او الغلول او السحت او من المال الغصب او السرقۃ او الجفایۃ او من مال الیتیم فصار مالہ کلہ شبھۃ لیسَ لأحد ان یشارکہ او یبایعہٗ اولیستقرض منہ اویقبل ھدیۃ او یأکل فی بیتہٖ و کذا اذا منع صدقاتہ وزکاتہٗ وعشرہ صار مالہ شبیھۃ لما فیہ اخذہ من مال الفقیر و ینبغی ان نری الاشیاء حلالًا فی ایدی الناس فی ظاھرا لحکم مالم یتبین لک شئ مما وصفنا اھ ص ۹۲۔

وفی العالمگیریۃ من کتاب الکراھیۃ ما نصّہٗ رھدی الی رجل شیئًا و اضافہ ان کان غالب مالہ من الحلال فلا بأس الّا ان یعلم بانہٗ حرام فان کان الغالب ھو الحرام ینبغی ان لایقبل الھدیۃ ولا یأکل الطعام الا ان یخبرہ بانہٗ حلال ورثہٗ او استقرضہٗ کذا فی الینابیع ولا یجوز قبول ھدیۃ امراء الجور لان الغالب فی مالھم الحرمۃ الّا اذا علم ان اکثر مالہ حلال بان کان صاحب تجارۃ وزرع لان اموال الناس لایخلوعن قلیل حرام فالمعتبر الغالب وکذا أکل طعامھم قال الفقیہ ابو اللیث اختلف الناس فی اخذ الجائزۃ من السلطان قال بعضھم یجوز مالم انہٗ یعطیہ من حرام قال محمدؒ وبہٖ نأخذ مالم نعرف شیئًا حرامًا بعینہ وھو قول أبی حنیفۃؒ واصحابہ کذا فی الظھیریۃ اھ (ج۴/۲۲۸) وفیہ ایضًا اکل الربوا او کاسب حرام یھدی الیہ او اضافہ وغالب مالہٗ حرام لایقبل ولا یأکل مالم یخبرہٗ أن ذالک المال اصلہ حلال ورثہٗ او استقرضہٗ وان کان

ﻋﮧ قلت لعلہٗ جنی علی الورع کما یظھر من قولہ الأخیر ۱۲ ظ

غالب ماله حلالاً لا بأس بقبول هدیته والأکل منه کذا فی الملتقط۔

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ جس شخص کی آمدنی حلال اور حرام سے مخلوط ہو اس میں غالب کا اعتبار ہے۔ غالب حلال ہے تو اس کا ہدیہ وضیافت قبول کرنا جائز ہے لیکن اگر خاص ہدیہ یا طعام کی بابت یقیناً معلوم ہو جائے کہ اس میں کچھ حرام ملا ہوا ہے تو اس کا قبول کرنا حرام ہے اور کھانا بھی مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خلط استہلاک ہے اس لئے ان کے قول پر گنجائش ہے جیسا کہ بعض روایات سے ظاہر ہوگا اور اگر غالب آمدنی حرام ہے تو ہدیہ وضیافت قبول کرنا حرام ہے ہاں اگر اس طعام وہدیہ کی بابت اطلاع کر دے کہ یہ حلال ہے تو جائز ہے اس کی تکذیب یا تفتیش کی ضرورت نہیں اور جائزہ سلطان کے مسئلہ میں محمدؒ کے قول سے ظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس شخص کی غالب آمدنی حرام ہو تو ہدیہ قبول کرنا جائز ہے جب تک خاص اس شئ کی بابت حرام ہونے کا علم نہ ہو مگر یہ صحیح نہیں ہے بلکہ محمدؒ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی غالب آمدنی حلال ہو اور اس میں حرام مخلوط ہو اس وقت اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ مالم یعرف شیئاً حراما بعینہ کیونکہ امام محمدؒ کے زمانہ میں سلاطین کی غالب آمدنی حلال تھی۔ یدل علیہ ماذکرہ فی العالمگیریۃ بعد ما نصّہٗ وفی فتاوی اھل سمرقند رجلٌ دخل علی السلطان فقدم علیہ بشئ ماکول فان اشتراہٗ بالثمن اولم یشتر ذالک ولکن ھذا الوجل لا یفھم أنہ مغصوب بعینہ حل لہٗ اکلہٗ ھکذا ذکر والصحیح انہ ینظر إلی مال السلطان ویبنی الحکم علیہ ہکذا فی الذخیرہ (ج ۶/ ۲۲۹) واللہ اعلم۔

۲۷ جمادی الاولی ۱۳۴۸ھ

وفی الفتاوی السلطان اذا قدم شیئاً من الماکولات أن اشتراہ یحل وان لم یشترہ ولکن الوجل لا یعلم ان فی الطعام شیئاً مغصوبا بعینہ یباح أکلہٗ (ج ۴/ ۳۵۸) قلت وقیود الفقہ احتراز بہ فلو علم ان فیہ شیئاً مغصوبا بعینہ لا یحل

سواء کان غالبًا اور معلومًا یدل علی ذالک قولہٗ شیئًا بالتنکیر۔ وقال العلامہ عبدالحیؒ فی حکم المال المشکوک ما نصّہ واگر بدین وجہ مشکوک گرویدہ کہ مال حلال ومال حرام جمع کردہ شد وامتیازے باقی نماندہ پس اورا تصدق باید کرد۔ طحطاوی وحاشیہ درمختار می آورد والذی فی البزازیۃ انہٗ ان علم مال الحرام بعینہ لایحل لہٗ اخذہٗ وان لم یعلم بعینہ اخذ حکما واَمّا فی الدیانۃ فانہٗ یتصدق افادہ الحموی اھ (ص ۳۴۶ ج ۴) مع خلاصہ وقال فی موضع آخر وور رسالہ حفظ الاصغرین نوشتہ فان قلت کیف ساغ للفقیر تناول ما فیہ خبث قلت محلہ عدم علمہ بحقیقۃ الحال وان علم بہ فھو لغیرہ لایحل لہٗ اھ ج ۴/۳۵۶) قلت وقد علم من البزازیۃ ان المخلوط من الحلال والحرام إذا لم یتمیز یجب التصدق بہٖ دیانۃً وعلم بھٰذا ان الفقیر لو علم بذالک ای بان فیہ خبثًا لایحل التناول ایضًا وھذا یعمّ القلیل والکثیر، واعتبار الغلبۃ انما ھو حیث یعلم من حال الرجل انہٗ کاسب للحرام والحلال جمیعًا ولا یعلم ان ما اھداہ إلی بعینہ مخلوط من الحلال والحرام جمیعًا فلو علم یحرم علیہ التناول۔ واللہ اعلم۔ ھذا کلہ منبی علی قول أبی یوسفؒ ومحمدؒ واما علی قول ابی حنیفۃؒ فالمخلوط من الحلال والحرام حلال قلیلاً کان الحرام اوکثیرا لأن الخلط سبب الملک عندہٗ قال فی فتاویٰ قاضیخان واذا مات عامل من عمّال السلطان واوصی ان یعطی الحنطۃ للفقراء۔ (۱)

قدم چومنے کا حکم

سوال: تقبیل القدم ماں اور باپ اور پیر اور استاد اور خسر اور ساس کے، اس کی کوئی اصل ہے؟ ہمارے اطراف میں بعض بہیئت رکوع اور بعض بیٹھ کر قدم مس کرکے

(۱) مکمل عبارت ملاحظہ ہو فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیۃ (ج ۳/ ۴۰۰) افتخار

پیشانی پر لگاتے ہیں۔ آیا یہ طریقہ حسن ہے یا بدعت؟

الجواب

قال الطحطاوی فی حاشیۃ علی مراقی الفلاح وورد فی احادیث ذکرھا العینیؒ ما یفید ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل یدہ ورجلہ إلی قولہ ثم قال العینی فعلم عن مجموع ماذکرنا اباحۃ تقبیل الید والرجل والکشح والرأس والجبھۃ والشفتین وبین العینین ولکن کل ذالک اذا کان علی وجہ المبرۃ والاکرام واما اذا کان علی وجہ الشھوۃ فلا یجوز الا فی حق الزوجین اھ والسید وامتہ الخ (ص ۱۸۶)

ان نصوص سے معلوم ہوا اپنے مربیوں یا علماء و اساتذہ کے پیروں کو بوسہ دینا جبکہ بطریق مبرت و اکرام ہو جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

مگر تقبیل رجل میں صورت رکوع و سجود سے احتراز ضروری ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر مربی کے پیروں سے اپنے ہاتھ مس کر دے۔ فقط۔

حررہ الاحقر ظفر احمد بامر سیدی حکیم الامت دام مجدہم
۱۰ رجب ۱۳۴۶ھ

دولہا کا پالکی پر سوار ہونا اور عمدہ کپڑے پہننا جائز ہے

سوال: ہمارے اس ضلع نواکھالی میں مسئلہ مرقومہ ذیل کی بابت بین العلماء اختلاف واقع ہوا۔ اس واسطے حضور والا کو تکلیف دی جاتی ہے کہ فیصلہ کن تجویز سے سرفراز فرمائیں۔ مسئلہ معروضہ یہ ہے کہ نکاح کے دن نوشہ (دولہا) کا باپ بھائی وغیرہ مربیان صاحبان اس کو پالکی یا گاڑی پر سوار کر کے بغیر کسی ممنوع شرعی مثل ریاء اور سمعہ اور تفاخر اور بدون طواف اور گشت نمودانہ کے سنت نبوی نکاح کے ارادہ سے لے جا کر بعد عقد شرعی کے اسی طرح اپنے مکان میں لاتے ہیں اور چونکہ ہمارے اس ضلع میں خصوصاً پیر و مرشد

جناب مولانا کرامت علی صاحب مرحوم کی ہدایت سے بفضلہ تعالیٰ ممنوعات مرقومہ سے (جس سبب سے بھی ہو) مسلمان سب مامون ہیں اور وہ سواری مجرد زینت وتجمل مثل لباس احسن اور ماکولات ومشروبات تکلفانہ شادی کے دن کی نیت سے ہیں سو یہ سواری اس کے لئے درست ہے یا نہ. اور حال یہ کہ مولانا ممدوح کی حسین حیات میں اس کے متعلق کچھ بھی تنازع نہ تھا. اور اب بھی ہمارے اطراف کے کسی حصے میں نہیں. الّا اس گاؤں کے چند علماء کہ ان کے درمیان اختلاف ہورہا ہے بعض اس کو ریا اور بے ادبی مربیان کے سبب حرام کہتے ہیں اور اکثر علماء ہند وبنگلہ خصوصاً مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرسین ومحصلین اس کو بدعت مباحہ کہتے ہیں اور ایسا ہی مولانا عبدالحیٔ مرحوم کے مجموعہ فتاویٰ میں اس کو از قبیل بدعات مباحہ فرمایا. اور مدارک میں آیۃ "من حرّم زینۃ اللّٰہ" الخ کی تفسیر میں رکوب اور ماکولات اور مشروبات اور لباس احسن کو زینت وتجمل میں داخل کرکے اور فتاویٰ عالمگیریہ میں لابأس للانسان ان یذہب راکبا حیث شاء وایضاً فیہ کتاب الکراہیۃ میں چند روایات اظہار النعم اللّٰہ یہ بنا کر کے جائز کہتے ہیں لیکن بہشتی زیور کے رسومات کے بیان میں اس کا کچھ پتہ نہ ملا. اس لئے حضور کی خدمت میں معروض ہے کہ حضور رائے عالی سے شرف صدور فرمائیں طرفین رائے عالی کے منتظر ہیں.

الجواب

فی الحدیث الصحیح عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنہا ان نساء الانصار کن یستعرن منہا قمیصًا یجلون بہ العروس رواہ البخاری. وقال فی العالمگیریۃ وروی عن ابی یوسف انہ قال کما یعجبنی ان تتزین لی یعجبہا ان اتزین لہا. قلت فیجوز للرجل ایضًا ان یلبس احسن ثیابہ وقت البناء باہلہ. وفیہا ایضًا وعن ہذا قلنا لابأس للانسان ان یذہب راکبا حیث شاء وغلامہ یذہب معہ اھ (ص ۲۳۶ ج ۶)

وفيها ايضًا لبس الثياب الجميلة مباح اذا لم يتكبر وتفسيره ان يكون معها كما كان قبلها الخ (ج ۶/۲۲۲) وفى الحديث انه صلى الله عليه وسلم كان يتجمل للوفود ترجم به البخارى. وفى شرح الجامع الصغير للعزيزى كان صلى الله عليه وسلم اذا قدم عليه الوفد لبس احسن ثيابه وأمر علية أصحابه بذلك البغوى عن جندب الخ. قال الشارح وفيه طلب التجمل فى بعض الاحيان فلا ينافى خبر البذاذة من الايمان (ص ۱۳۳: ج ۳) قلت ويلحق به التجمل للنكاح ايضًا اظهار البشاشه والسرور وتوقيا عن امتهانه فى عيون اصهاره وقد ورد فى الحديث عن عبد الرحمن بن عوف قال راى على رسول الله صلى الله عليه وسلم اثر الصفرة فقال مهيم هل تزوجت متفق عليه قال الحافظ فى الفتح ان هذه الصفرة لعلها من كونه تطييب لطيب اهله. وقد ورد فى الحديث الصحيح انه صلى الله عليه وسلم ودع معاذا حين ارسله إلى اليمن واوصاه ومعاذ راكب ورسول الله صلى الله عليه وسلم يمشى معه تحت راحلة فلما فرغ قال يا معاذ انك عسى ان لا تلقانى بعد عامى هذا فبكى معاذ جشعا الحديث رواه احمد فى سنده (ج ۵/۲۳۵) وفى الحديث انه صلى الله عليه وسلم كان يقدم اصحابه ويمشى ورائهم ويقول اتركوا ظهرى للملائكة.

قال الطحطاوى فى حاشية على مراقى الفلاح بعد ما ذكر قصة الامام أنه صلى خلف أبى يوسف وذكر فوائد ها ما نصه منها ان تعظيم الاستاذ فى طاعة لا فيها يطعنه لأنه تقدم بأمر الامام كما هو القاعدة المشهورة ان الامتثال خير من الأدب. (ص ۳۱۴)

صورت مسئولہ میں دولہا کا پالکی یا گھوڑے پر سوار ہونا اور عمدہ لباس پہننا جائز ہے۔ سنت سے اس کی اصل موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفود کے لئے تجمّل فرمایا کرتے تھے۔ اور نکاح کے وقت بھی وافدین کا ہجوم ہوتا ہے۔ دوسرے عورت خود ایک اجنبی ہے جس کے پاس دولہا جاتا ہے۔ اس کے لئے تزین کرنا خود مشروع ہے۔ جیسا کہ عورت کو مرد کے لئے تزین کرنا مشروع ہے۔ رہا یہ کہ دولہا اس حالت میں سوار ہوتا ہے کہ اس کے اکابر پیادہ ہوتے ہیں سو اس کا مضائقہ نہیں جبکہ یہ امر اکابر اور مربیوں کی خوشی اور مسرت اور اذن سے ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رخصت کرتے ہوئے نصیحت فرمائی۔ درانحالیکہ حضرت معاذؓ سوار تھے اور حضورؐ پیادہ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی اسی میں تھی اس لئے اس کو بے ادبی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ پس نفس تجمل وتزیّن رکوب فی المحمل وقت نکاح کے بالکل جائز ہے۔ سنّت سے ان امور کی اصل نکلتی ہے۔ باقی اس کے علاوہ اگر کوئی رسم رسوم منکرہ سے ہوتی ہو تو اس سے احتراز لازم ہے۔ واللہ اعلم حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ بامر سیدی حکیم الامت دام مجدہم۔ ۱۱ رجب ۱۳۴۸ھ

زوجہ سے مجامعت کا حکم جبکہ بچہ برابر میں سو رہا ہو۔

سوال: میاں بیوی ایک پلنگ پر سوتے ہوں اور اس پر نابالغ بچہ سمجھدار خواہ شیر خوار بھی سویا ہو تو بیوی سے صحبت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر بچہ ایسا بے خبر سوتا ہو کہ اسے سونے کے بعد کچھ خبر نہ ہوتی ہو تو ایسے پلنگ پر مجامعت جائز ہے اور اگر اس کی نیند ہوشیار ہو کہ حرکت سے بیدار ہو جاتا ہو تو اس پلنگ پر مجامعت ناجائز ہے۔ بشرطیکہ بچہ سمجھدار ہو جو اس فعل کو سمجھتا ہو۔

قال فی الخلاصة وفی کراھة فضل بن غانم یجامع الرجل امرأته ومعه ناس نیام إذا علم انهم لا یعلمون (ج ۴/ ۳۶۷) واذا ابلغ الصبی او الصبیة عشر سنین یجب التفریق بینهما وبین اخیه واخته۔ وامه وابیه فی المضجع لقوله

علیه السلام و فرّقوا بینهم فی المضاجع وهم ابناء عشر و فی النتف اذا بلغوا ستاً قال الشامی خصوصاً فی ابناء ھذا الزمان فانهم یعرفون الفسق اکثر من الکبائر و امّا قوله وامه وابیه بان لا یترکاه ینام معهما فی فراشهما لانّه ربما یطلع علی ما یقع بینهما بخلاف ما اذا کان قائماً وحده اومع ابیه وحده او البنت مع امها وحدها اھ (ج ۵/ ۳۷۷)
واللہ اعلم حرره الاحقر

ظفر احمد عفی عنہ ۱۳ رجب ۱۳۴۱ھ

نامحرم عورت کو پڑھانا

سوال: زید کے روبرو نامحرم عورت کے آنے سے دل میں بدخیالات پیدا نہ ہوتے ہوں اور فتنہ فساد کا کچھ اندیشہ نہ ہو تو زید کو اپنی رشتہ دار نامحرم عورتوں کو کتاب تعلیم الدین بہشتی زیور و اصلاح الرسوم پڑھانا یا سنانا جائز ہے یا کہ بدعت ہے۔

الجواب

نامحرم عورت کو کتاب پڑھانے کے لئے عورت ہی بہتر ہے مرد کو نہ پڑھانی چاہیئے اور اگر مجبوری ہو تو خلوت میں ہرگز نہ پڑھائے بلکہ عورت کے عزیزوں کے سامنے پڑھائے اور پڑھنے والی پردہ میں ہونی چاہیئے۔ واللہ اعلم

۲۶ رجب ۱۳۴۱ھ

عورت کا نامحرم مرد کے ساتھ سفر کرنا

سوال: زید اگر شریعت کا پابند ہو اور فتنہ فساد کا کچھ اندیشہ نہ ہو تو نامحرم عورت کو زید کے ساتھ دس میل سفر کرنا یا ہزار میل ریل کا سفر کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب

نامحرم کے ساتھ مسافت سفر سے کم سفر جائز ہے مگر فساد زمان کی وجہ سے فقہاء نے اس کو بھی منع کیا ہے پس اگر زید نہایت متقی اور دیندار ہو تو اجازت دی جاتی گی۔ واللہ اعلم۔

۲۶ رجب ۱۳۴۱ھ

قطب ستارہ کی طرف پاؤں پھیلانا جائز ہے

سوال: ۷ صفر ۱۳۴۲ھ کو ایک سوال کیا تھا کہ سوتے میں قطب ستارہ کی طرف پاؤں کرنا جائز ہے یا نہیں تو آنجناب نے جواب دیا تھا کہ جائز ہے۔ حوالہ لکھنے کی فرصت نہیں مگر یہاں کے نیم ملاّں خدا ان سے پناہ میں رکھے بڑے ضدی ہیں تو جناب اگر کوئی دلیل ہو تو روانہ فرمائیں۔

الجواب

اس کے جائز ہونے کی یہی دلیل ہے کہ اس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں جو شخص عدم جواز کا دعویٰ کرے وہ دلیل پیش کرے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۱ شعبان ۱۳۴۲ھ

جبراً چندہ وصول کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسجد کی مرمت اور خرچ و اخراجات کے لئے اور بیوہ یتیم بچوں کے ختنہ وغیرہ کے لئے اور غریب غرباء کی شادیوں کے لئے اور پیش امام اور حافظ وغیرہ کی تنخواہوں کے لئے جبراً چندہ وصول کرنا یعنی کوئی شخص چار روپے دینے پر بخوشی آمادہ ہے۔ اس سے زیادہ جبراً وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہ۔

الجواب

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل مال امرء مسلم الا عن طیب نفس منہ (او کما قال) مسلمان کا مال بدون اس کی طیب قلب کے لینا جائز نہیں۔ پس جو لوگ چندہ میں جبر کرتے ہیں وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور حکماً غاصب ہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۵ شعبان ۱۳۴۲ھ

تالاب کو شرقاً غرباً طویل کرنا درست ہے

سوال: دستور ہے کہ مشرق کی طرف مسجد کے سامنے ایک تالاب کھدواتے ہیں جس میں رفع حوائج ضروریہ کر سکیں اور تالاب کو مغرب اور مشرق کی جانب باوجود گنجائش ہونے

کے ممنوع شرعاً یا عرفاً سمجھ کر لمبا نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ممکن ہو تالاب کی لمبائی جنوب و شمال کی طرف کرتے ہیں۔ آیا شرعاً ممنوع ہے یا نہیں؟

الجواب

شرعاً اس خیال کی کوئی اصل نہیں۔ تالاب کو شرقاً غرباً طویل کرنا درست ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

۲ ذی الحجہ ۴۲ھ

نومسلم بالغ کے ختنہ کا حکم

سوال: چالیس سالہ ہندو اگر مسلمان ہو تو اس کو ختنہ کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ زید کہتا ہے کہ بے ستری حرام ہے لہٰذا ترک ضروری ہے۔

الجواب

قال قاضیخان وللقابلة ان تنظر إلیٰ فرج المرأة عند اخذ الولد لمکان الضرورة وکذا الحجّام ان ینظر الی فرج البالغ عند الختان۔ (ج ۴/۳۶۸)

اس سے معلوم ہوا کہ بالغ کو ختنہ کرا لینا اور اس ضرورت سے حجام کے سامنے بدن کھولنا جائز ہے۔

ویؤیدہٗ ما رواہ البخاری عن ابن عباس انہٗ سئل مثل من انت حین قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال أنا یومئذٍ مختون وکانوا لاّ یختنون الرجل حتی یدرک (نیل الاوطار ص ۱۱۰ ج ۱)

قتادة قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأمر من اسلم ان یختتن وان کان ابن ثمانین سنة (رواہ الطبرانی فی الکبیر۔ ورجالہ ثقات، مجمع الزوائد ص ۱۱۷ ج ۱)

قلت ولا یمکن ذالک بدون الحجام عادةً واللہ اعلم۔

پس زید کا قول غلط ہے مگر ایسے نومسلم کو جسے ختنہ کرانے کی ہمت نہ ہو ڈر لگتا ہو اسے ختنہ پر مجبور نہ کیا جائے اگر وہ خوشی سے اس کی ہمت کرے

تو بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۳ ذی الحجہ ۴۲ھ

ریلوے کے مال کی چوری کا حکم

سوال: ریلوے کا سامان مثلاً لوہے کا سامان یا لکڑی کا یا پتھر وغیرہ جو ریلوے لائن میں لگائے جاتے ہیں اس کو چوری کرکے لے جا کر اپنے استعمال میں لانا کیسا ہے۔

الجواب

مطلقاً حرام ہے۔ چوری کا مال کسی طرح حلال نہیں خواہ کافر ہی کی چوری ہو۔ واللہ اعلم۔
ظفر احمد

ریلوے کا مسروقہ مال خریدنے کا حکم

سوال: ریلوے کے ذریعے جو مال کپڑا اناج وغیرہ سوداگر لوگ روانہ کرتے ہیں راستہ میں وہ اگر چوری ہو جائے تو ریلوے والے اس کا تاوان دے دیتے ہیں۔ اب یہ چوری شدہ مال چور سے خریدنے کا کیا حکم ہے۔

الجواب

درست نہیں یہ مال چوری کا ہے لینے والے کے لئے بھی حرام ہے اور جس کو وہ دے اس کو بھی حرام ہے۔ ریلوے کو کسی طرح واپس کر دینا واجب ہے۔ واللہ اعلم

جنگل کے درختوں کی چوری کا حکم جن پر حکومت نے قبضہ کر رکھا ہو

سوال: ہمارے ملک میں انگریز حکومت نے جنگل پر ملازم رکھے ہیں اور لکڑی کاٹنے کی پابندی ہے اگر کوئی کاٹ لے تو جرمانہ و سزا دی جاتی ہے۔ اب اس جنگل کی لکڑی وغیرہ چوری چھپے لے جانا یا ملازم کو رشوت دے کر اس کی اجازت سے لے جانا کیسا ہے۔

الجواب

مطلقاً حرام ہے۔ استیلاء کافر سے وہ سب درخت حکومت کے ملک ہو گئے ہیں۔ ان میں سے چوری کرکے لینا درست نہیں نہ رشوت سے نہ بغیر رشوت کے۔

ظفر احمد

اس جنگل کی لکڑی کاٹنے کا حکم جس پر حکومت نے قبضہ نہیں کیا مگر ممانعت کر رکھی ہے

سوال : بعض جنگلات پر کوئی محافظ وغیرہ نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ صرف لکڑی کاٹنے پر پابندی ہے اور پٹواری وغیرہ کو یہ کہا گیا ہے کہ کوئی آدمی اس جنگل سے سامان لے جائے تو اس کو گرفتار کرکے مقدمہ چلایا جائے اور قید یا جرمانے کی سزا دی جائے۔ اس جنگل کی لکڑی کو کاٹنا کیسا ہے؟

الجواب

اگر اس جنگل پر کسی خاص صورت سے جس کو عرفاً قبضہ کہا جاسکے گورنمنٹ کا قبضہ ہوگیا تو بدون اجازت یا خرید کے اس جنگل کی لکڑی کاٹنا درست نہیں اور اگر قبضہ نہیں ہوا ویسے ہی ممانعت ہے تو اگر زمین کسی کی مملوک نہیں اور درخت بھی خودرو ہیں تو ان کی لکڑی کاٹ لینا درست ہے مگر چونکہ اس میں مقدمہ قائم ہونے کا اندیشہ ہے جس میں ذلّت ہوگی اور مسلمان کو ذلّت سے بچنا واجب ہے۔ اس لئے اس صورت میں بھی چوری سے بچنا چاہیئے۔ ہاں پٹواری کی اجازت سے سامان لے سکتے ہیں۔ اور اگر زمین مملوک ہے یا درخت خودرو نہیں بلکہ لگائے ہوئے ہیں تو درست نہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد

۱۶ ذی الحجہ ۴۲؁ھ

کتب ناول اور ایسی کتابوں کی تجارت کا حکم جو موضوع روایات پر اور شراب بنانے کی تجاویز پر مشتمل ہوں

سوال : تجارت کتب ناول وقصہ کہانیاں جو اکثر غلط واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کتابوں کی تجارت جن میں روایات و احادیث موضوعہ ہوتی ہیں اور ان کتابوں کی تجارت جن میں صنعت اور ادویہ وغیرہ درج ہوتے ہیں اور بعض نسخہ جات شراب وغیرہ کی آمیزش کے بھی ہوتے ہیں۔ ایسی کتابوں کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں۔ مزید برآں بعض کتب پر تصاویر بھی ہوتی ہیں۔

الجواب

کتب ناول اور جھوٹے قصّے کی کتابیں بیچنا (بشرطیکہ ان جھوٹے قصّوں میں خدا اور رسولؐ پر جھوٹ نہ بولا گیا ہو) جائز تو ہے مگر اچھا نہیں۔

ووجه الجواز عدم تعلق الحرمة به بل مبناه علی نیة من طالعه فمن طالعه لغرض حسن مثلاً تعلم الادب ونحوه فلا بأس کالمقامات الحریریة وکلیله ومنه والف لیلة ومن طالعه لتهیج الشهوة وتعلل القلب به فلا یجوز۔

اور جن کتابوں میں موضوع روایات و احادیث ہیں ان کا بیع کرنا جائز نہیں۔ ہاں اس طرح جائز ہے کہ کتاب کے سرورق پر جلی قلم سے لکھ دیا جائے کہ اس کتاب میں روایات و احادیث موضوع و غلط ہیں۔ فان روایة الموضوع تجوز ببیان حالها فکذا البیع واللہ اعلم۔ اور جن کتابوں میں صنعت وادویہ کا بیان ہے۔ ان کا بیچنا جائز ہے۔ گو اس کی بعض دواؤں میں شراب وغیرہ بھی داخل ہو۔ لعدم تعلق الحرمة به بل علی استعمال المستعمل ان استعمله من غیر حاجة شدیدة فکان کبیع الأمرد ممن یلوط به ونحوه فقط۔ اور تصویر پر کاغذ چپاں کر دینا چاہیئے اور اگر ایسا نہ بھی کیا گیا تو چونکہ مقصود کتاب کی بیع ہے نہ کہ تصویر کی اس لئے بیع درست ہے مگر کراہت سے خالی نہیں۔ واللہ اعلم

ظفر احمد

غیر مسلم اگر مسلمان ملازم کو جانور کا گلا گھونٹنے پر مجبور کرے تو اس کو ایسا کرنا جائز نہیں

سوال: زید ایک انگریز کے پاس ملازم ہے اور اس کو کھانا پکا کر کھلاتا ہے اور وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ ہم کو مرغ یا پرندے یا بکرے کو ذبح کر کے مت کھلاؤ بلکہ گلا گھونٹ کر کھلاؤ کیونکہ ذبح کرنے سے خون نکل کر قوت زائل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں زید کو جو مسلمان ہے اس کے حکم کی تعمیل کرنا شریعت کے خلاف تو نہ ہوگا اور زید کو ایسا کرنا چاہیئے یا نہیں؟

الجواب

صورت مسئولہ میں اس خانسامہ کو جانور کا گلا گھونٹنا جائز نہیں بلکہ حرام ہے اور گلا گھونٹ کر جانور کا پکانا اور کسی کو کھلانا بھی جائز نہیں۔ اس کو انگریز سے عذر کر دینا چاہیئے کہ میرا مذہب مجھ کو اس فعل سے منع کرتا ہے اس لئے میں ایسا نہیں

کر سکتا۔ قال تعالیٰ: حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیہ الآیۃ وفی الحنق تحریم الحلال و ذالک لایجوز وفی حاشیۃ البخاری عن العینی قولہ ھل یؤجر الرجل نفسہ من مشرک فی ارض الحرب اورد فیہ حدیث خباب وھو اذ ذاک مسلم فی عملہ للعاص بن وائل وھو مشرک وکان ذالک بمکۃ وھی اذ ذاک دار الحرب واطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ذالک واقرہ قال المھلب کرہ اھل العلم ذالک الا لضرورۃ لبشرطین احدھما ان یکون یعمل فیما یحل للمسلم فعلہ والآخر ان لایعینہ علی ما یعود ضررہ علی المسلمین اھ (ج ۱/ ۳۰۴) قلت والحنق حرام لایفعلہ مسلم ولا لہ ذالک کما مر۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون۔

ادائے قرض کے واسطے صاحب جائیداد کو سوال کرنا جائز نہیں اگرچہ جائیداد اپنی حوائج کے لئے بھی کافی نہ ہو۔

سوال: اگر کوئی شخص مبتلائے قرض ہو اور قرض بھی سودی اور وہ شخص خود نوکری کرتا ہو اور کسی قدر جائیداد بھی رکھتا ہو لیکن آمدنی نوکری و جائیداد سے اس کے خانگی اخراجات نہیں چلتے چہ جائے کہ قرض ادا کرے تو ایسی صورت میں اس شخص کو ادائے قرض کے واسطے سوال کرنا جائز ہے یا نہیں اور وہ شخص سوال کرنے کو برا جانتا ہے اور نیز سوال کے بارے میں جو وعید حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے وہ بھی مد نظر ہے چونکہ اس شخص کو قرض کے بارے میں اطمینان قلب میسر نہیں۔ لہٰذا عبادت میں خشوع وغیرہ حاصل نہیں ہوتا اور سود لینے دینے کی بابت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے اس سے ہمیشہ دل بے قرار رہتا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ کسی صورت میں اس قرض سے خلاصی ہو۔

الجواب

اس شخص کو ابھی سوال جائز نہیں۔ اول اپنی جائیداد کو فروخت کر کے قرض ادا کردے اور نفقۂ عیال کے لئے نوکری یا تجارت کرے البتہ اگر جائیداد فروخت کر کے بھی قرض پورا ادا نہ ہو تو بقیہ قرض کے لئے سوال جائز ہے یا بعد بیع جائیداد کے نوکری وغیرہ اخراجات اہل وعیال کو کافی نہ ہو تو قوت کے علاوہ دیگر ضروریات کے لئے سوال کر سکتا ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس صورت میں بھی عام لوگوں سے سوال نہ کرے بلکہ خاص اعزہ واحباب سے سوال کرے۔

فی الدّر مع للشامیة: ولا یحلّ ان یسئل شیئًا من القوت من لہ قوت یومیہ بالفعل او بالقوّة کالصحیح المکتسب ویأثم معطیہ ان علم بحالہ لاعانتہ علی المحرم ولو سأل للکسوة او لاشتغالہ عن الکسب بالجہاد او طلب العلم جاز لو محتاجًا اھ ج۲ ص۱۱۱) قلت والسوال لاداء القرض ملحق بالسوال للکسوة: وفی الشامیة واذا کان لہٗ دارٌ یسکنہا ولا یقدر علی الکسب قال ظہیر الدّین لا یحلّ لہٗ السوال اذا کان یکفیہ مادونہا معراج، ثمّ نقل ما یدلّ علی الجواز وقال وھو اوسع وبہ یُفتی اھ قلت وھذا فی الدار لکونہا من الحوائج الاصلیة واما العقار فلیس ملحقًا بہا لکونہ من الزوائد فلا یحلّ السّوال مادام باقیًا واللہ اعلم

جس طالب علم کو مسجد سے کھانا ملتا ہو اس کو مدرسہ سے وظیفہ لینا اور مسجد کی آمدنی کا اخفا کیسا ہے

سوال: زید مدرسہ عربیہ میں تعلیم پاتا ہے اور خوراک مدرسہ سے اس قدر ملتی ہے کہ اس کو کافی نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ مقروض ہو گیا۔ زید نے ایک مسجد کا رہنا قبول کیا وہاں سے کھانا وغیرہ کا کافی انتظام ہو گیا لیکن اسے مدرسہ والوں کے تعلق واسطہ سے مسجد نہیں ملی بلکہ خود اپنی کوشش سے حاصل کی۔ اب اگر مدرسہ والوں کو معلوم ہو جائے کہ زید مسجد میں رہتا ہے تو خوراک بند کر دیں۔ اگر زید مدرسہ سے برابر خوراک حاصل کر کے اور فروخت کر کے اپنا قرض سابقہ ادا کر دے اور بعد اداء قرض کے مدرسہ

سے خوراک لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس رقم سے اسے قرضہ ادا کرنا کیسا ہے۔

الجواب

جب یہ بات معلوم ہے کہ اگر مدرسہ والوں کو خبر ہو جائے کہ زید مسجد میں رہتا ہے اور محلہ سے کھانا پاتا ہے تو وہ وظیفہ بند کر دیں گے تو معلوم ہوا کہ زید قاعدہ مدرسہ سے اس حالت میں وظیفہ کا مستحق نہیں اور وہ اس حالت میں بدون استحقاق کے وظیفہ لیتا ہے۔ لہٰذا مسجد سے کھانا پاتے ہوئے اس کو مدرسہ سے وظیفہ لینا جائز نہیں۔ نہ اس سے قرض ادا کرنا جائز ہے نہ لبعد ادائے قرض کے وظیفہ لینا جائز ہے۔ اس کی آسان صورت یہ تھی کہ زید اہل مدرسہ کو اطلاع کرتا کہ مجھے وظیفہ مدرسہ کا کافی نہیں ہوتا اور میں مقروض ہو گیا ہوں مجھے اجازت دی جائے کہ میں وظیفہ کے ساتھ کسی مسجد میں اپنے کھانے کا انتظام کروں اگر وہ اس کی اجازت دے دیتے تو پھر یہ جائز تھا۔

وفی الحدیث من غشّنا فلیس منّا، وقال الفقہاء بلزوم العمل باحکام الواقف وشروطہٗ وکذا باحکام المتولّی وشروطہٗ فی الاوقاف واللّٰہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد از تھانہ بھون
۲ جمادی الثانیہ ۱۳۴۵ھ

جو لوگ عمل کے ذریعہ مدفون کنواں کا پتہ دیتے ہیں ان سے کنواں دریافت کرانا اور انہیں انعام دینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ سیالکوٹ کے ہندو برہمن بت پرست ضلع لائل پور کی آبادی جدیدہ میں ہیں وہ اپنے کسی فن کے ذریعے سے جو غالباً سحر ہی معلوم ہوتا ہے قدیمی چاہ زمین دوز کا جا بجا پتہ نشان بتلاتے ہیں۔ پانچ سات ہاتھ کھودنے پر ان کے بتلائے ہوئے کے موافق چاہ کے نشانات معلوم ہو جاتے ہیں جب چاہ برآمد ہو جاتا ہے تب وہ دو سو روپیہ انعام کا بوجہ بتلانے چاہ کے لیتے ہیں۔ جا بجا چاہ زمین دوز برآمد ہو رہے ہیں اور وہ یہی بتلاتے ہیں ہمارے علم میں چاہ معکوس ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ بے کار ہو یا کار آمد سالم ہو یا خراب سب امور وہ پہلے ہی بتلا دیتے ہیں۔ واللّٰہ اعلم۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد یا کب

وہ باقاعدہ آبادی رہ چکی ہے (الحاصل) اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگرچہ ہنیم لوگ ہر چند ان کو غیب دان نہیں جانتے۔ عوام بھی ان کو عجوبہ کار جانتے ہیں مگر ان سے نشان چاہ دریافت کرنا اور ان کے کہنے کے موافق عمل کرنا زمین کھودنا اور پھر یہ انعام دینا تصدیق کاہن میں داخل ہو کر کفر ہے یا گناہ کبیرہ اس کا مرتکب فاسق ہے یا کیا حکم ہے۔

الجواب

اس صورت کو کہانت اور سحر سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا کہ اکثر تو زمین کو سونگھ کر جاننے والے بتلا دیتے ہیں کہ یہاں پانی ہے یہاں نہیں ہے اور بعض کو مسمریزم کے عمل سے یہ علم ہو سکتا ہے۔ پس جب تک کہ تیقن کہانت وسحر نہ ہو جائے اس وقت تک اس قسم کے لوگوں کے ذریعے سے کنواں دریافت کرنے اور ان کو اس کا انعام دینے اور اجرت دینے کو حرام نہیں کہا جا سکتا البتہ احتیاط کا امر کیا جائے گا۔ دع ما یریبك الی مالا یریبك ۔ واللہ اعلم۔

قال فی الدّر : ان دلّنی علی کذا فلہٗ کذا فدلہٗ فلہٗ أجر مثلہ ان مشی لأجلہ اھ قال الشامی: وفی البزازیۃ والولوالجیۃ رجل ضل لہ شئ فقال من دلّنی عملی کذا فھو علی وجھین ان قال ذالك علی سبیل العموم بان قال من دلّنی فالاجارۃ باطلۃ لان الدلالۃ والاشارۃ لیس بعمل یستحق بہ الأجر وان قال علی سبیل الخصوص بان قال لرجل بعینہ ان دللتنی علی کذا فلك کذا ان مشی لہٗ فدلّہٗ فلہٗ اجرالمثل وان دلّہٗ بغیر مشی فھو والاوّل سواء۔ قال فی السیرالکبیر قال امیرالسریّۃ من دلنا علی موضع کذا فلہٗ کذا یصح ویتعین الأجر فیجب الأجر اھ (ج ۵/ ۸۸)

پس صورت مسئولہ میں بھی کنواں بتلانے والا جبکہ اس کے لئے محنت اور عمل کرتا ہے اس کو کنواں بتلانے اور نکل آنے کے بعد اس عمل کا اجر مثل

دینا لازم ہے اور اجر مثل وہ ہے جو عرفاً اس کام کی اجرت ہو۔ یعنی جو اجرت معین کی ہے۔ وہ واجب نہیں بلکہ جس کنویں کی تلاش میں کم محنت ہوئی اس کی اجرت کم دی جائے اور جس میں زیادہ مشقت ہوگی اس کی اجرت زیادہ دی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۴ جمادی الثانیہ ۴۵ھ

جوان نامحرم عورت کو پڑھانے کا حکم

سوال: جوان مرد کا جوان عورت کو پڑھانا کیسا ہے۔ قرآن شریف یا دینی کتابیں پردے میں پڑھائے تو یہ درست ہے یا نہیں اور نابالغ لڑکی کا پڑھانا کیسا ہے؟

الجواب

ایک طرح درست ہے کہ پڑھانے کے وقت لڑکی یا عورت پردہ میں ہو اور ایک محرم لڑکی کا تعلیم کے وقت ان دونوں کے پاس ہو۔ یہ دونوں تنہا نہ ہوں۔ اگر دونوں تنہا ہوں گے تو جائز نہ ہوگا۔ گو لڑکی پردہ ہی میں ہو۔

لخوف الفتنة و فساد الزمان وقد وقع الفساد في الخلوة مع الحجاب ایضاً کثیراً فلا یجوز لان مقدمة الحرام حرام۔

اور نابالغ لڑکی اگر حد شہوت میں نہ ہو یعنی اس کی طرف میلان نہ ہوتا ہو تو پردہ اور محرم کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۴ جمادی الثانیہ ۱۳۴۵ھ

نابالغ لڑکا اگر مچھلی پکڑ کر گھر لائے تو گھر والوں کیلئے اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں

سوال: زید کا نابالغ لڑکا تالاب سے سیر دو سیر کے قریب مچھلیاں پکڑ کر لاتا ہے جس کو زید اور گھر کے سب لوگ مل کر کھاتے ہیں تو یہ کھانا جائز ہے یا ناجائز۔ اگر ناجائز ہے تو پھر کیسے کھاویں کیونکہ یہ بات میرے اوپر بھی اکثر ہوا کرتی ہے۔

الجواب

مباح مچھلیاں پکڑنے والے کی ملک ہو جاتی ہیں اس لئے نابالغ نے جو مچھلیاں پکڑی ہیں وہ اس کی ملک ہوگئی اگر اس کے والدین غریب ہیں تو ان کو کھانا

بالاتفاق جائز ہے اور اگر والدین امیر ہیں تب بھی امام محمدؒ کے قول کے موافق حلال ہے۔ بناءً علی التعامل۔ فی الشامیة (ج ۵/۴۳۴) ولو أمر صبیًّا أبوہ او امہ باتیان الماء من الوادی او الحوض فی کوز فجاءبه لا یحل لابویه ان شربا من ذالك الماء إذا لم یکونا فقیرین لان الماء صار ملکه ولا یحل لهما الأکل من ماله بغیر حاجة وعن محمد یحل لهما ولو غنیین للعرف والعادة حموی عن الدرایة وفی هذین الفرعین حرج عظیم اه قلت والحرج مدفوع ویتأید قول محمدؒ بان نفقة الصبی علی الوالدین انما اذا کان لا یملك شیئًا فاذا ملك شیئًا سقط النفقة عنهما بقدرہ فما زاد من السمك یأکله الوالدان یعوض ما یأکله الصبی من مالهما والله اعلم۔ والاحوط أن یؤدیا الیه القیمة أو شیئًا بعوضه ثم یأکلان۔ فقط

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا عنه

کتبه
عبدالکریم عفی عنه

تتمّه

وقال العلامة العینی فی العمدة تحت حدیث انس کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا خرج لحاجة أجی أنا وغلام معنا اداوة من ماء یعنی یستنجی به الخ ما نصه الثانی فیه استخدام الرجل الصالح الفاضل بعض اتباعه الاحرار خصوصًا اذا ارصدوا لذلك والاستعانة فی مثل هذا فیحصل لهم اشرف بذلك وقد صرح الرویانی من الشافعیه بانه یجوز ان یعیرہ ولدہ الصغیر لیخدمه من یتعلم منه وخالف صاحب العدة فقال لیس للأب ان یعیر ولدہ الصغیر لمن یخدمه لان ذلك هبة لمنافعه فاشبه اعارة ماله واوّله النووی فی الروضة فقال هذا محمول علی خدمة تقابل باجرة اما ما کان لا یقابل

بها فالظاهر والذی یقتضیہ اقوال السلف ان لا منع منہ وقال غیرہ من المتأخرین ینبغی تقیید المنع بما اذا انتفت المصلحۃ اما اذا وجدت کما لو قال لولدہ الصغیر اخدم ھذا الرجل فی کذا متمرن علی التواضع ومکارم الاخلاق فلا منع منہ وھو حسن اھ (ج۱/۲۰۷) قلت فلما جازت الخدمۃ المتقومۃ اذا کان فیھا مصلحۃ جاز أکل ما یأتیہ الصبی من السمك لوالدیہ وفی الدرر یباح لوالدیہ أن یاکلا من مأکول وھب لہ وقیل لا انتھی. وان غیر الماکول لا یباح لھما الا لحاجۃ۔

قال الشامی: قال فی التاترخانیۃ روی عن محمد نصًا انہ یباح اھ (ج۴/۷۸۴) قلت والاوسع قول محمدؒ والاحوط الاحتراز عنہ مثل ذلك واللہ الموفق وھو اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ نابالغ جو مچھلیاں پکڑ کر لائے ان کا کھانا ولی کو محمدؒ کے قول پر مباح ہے اور غیر ولی کو بھی مباح ہے۔ اگر ولی نے نابالغ سے اس قسم کی خدمت لینے کی اس کو اجازت دے رکھی ہو۔ باقی احوط یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے کیونکہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ

جو پرندہ پالنے سے مانوس نہیں ہوتا اس کو قفس میں رکھنا کیسا ہے اگر کسی نے ایسا کر لیا ہو تو اس پرندہ کو آزاد کرنا کیسا ہے؟

سوال: ایک شخص نے ایسا پرندہ پالا ہوا ہے جو اپنی ذات سے وحشی ہے اور پالنے سے مانوس بھی نہیں ہوتا جیسے طوطا۔ اس کو جنگل میں چھوڑنا جائز ہے یا نہیں اور یہ تسییب میں داخل تو نہیں اور ایسے پرندے جو پالنے سے مانوس نہیں ہوتے قفس میں مقید کرنا جائز ہے یا نہیں ایذار تو نہیں۔

الجواب

قال فی غنیۃ الناسك فی کراھۃ مختارات النوازل سیب

دابة فاخذها آخر فاصلحها فلا سبيل للمالك عليها ان قال
عند تسييبها هی لمن اخذها وان قال لاحاجة لی بها فلهٗ اخذه
والقول لهٗ بیمینه درار سال الصید لیس بمندوب کتسییب
الدابة بل هو حرام الا ان یبیح للناس اخذهٗ وقیل
حرام مطلقاً لانهٗ وان اباحهٗ فالاغلب ان لا یقع فی ید احدٍ
فیبقی سائبةً وفیه تضیع للمال. اللقطة ان کانت شیئاً یعلم
ان صاحبها لایطلبها کالنواة وقشر الرّمان یکون القاءهٗ
اباحة حتی جاز الانتفاع به من غیر تعریف ثم بالاباحة لا
یخرج عن ملکه قبل ان یاخذهٗ أحد فان أخذه بعد الاباحة
ملکهٗ وقیل لایخرج مطلقاً لان التملیک لمجهول لا
یصح مطلقاً الا لقوم معلومین فائدة اباحة حل الانتفاع
به مع بقاءه علی ملک المالک لقطة التاترخانیة: ترک دابة
لاقیمة لها من الهزال ولم یبحها وقت الترک واخذ رجل
واصلحها فالقیاس ان تکون للآخذ کقشور الرمان المطروحة
وفی الاستحسان یکون لصاحبها قال محمد لانا لوجوزنا ذلک
فی الحیوان لجوزنا فی الجاریة تری بالارض مریضة لاقیمة
لها فیأخذها رجل وینفق علیها فیطؤها من غیر شراء ولا
هبةٍ ولاارث ولاصدقة أو یعتقها من غیر ان یملکها و
هذا امرٌ قبیح وحاصلهٗ ان غیر الحیوان یکون طرحهٗ اباحة
ردالمحتار ملخصًا اه ص ۱۵۸) وفی الشامیة نقلاً عن الظهیریة
ارسال الصید لیس بمندوب کتسییب الدّابة بل هو حرام الا
ان مرسلهٗ للعلف اویبیح للناس اخذهٗ اه وعلّله بان فیه
تضیعًا للملک (ج ۳۶۱/۲) وقال فی تحریر المختار نقلاً عن السندی
لایخفی ان الحرمة لاتثبت الّا اذا سیبها بلا سبب شرعی واما
اذا دخل الحرم والصید فی یده اوکان صید الحرم ابتداءً

فقد وجب علیہ اطلاقہ کما فی المبسوط والمحیط وغیرہما لوجوب الامن لہ بالنص والامن لایتحقق الا بالارسال المطلق وما ذکرہ فی جامع الفتاوی (من حرمۃ التسییب) مفروض فی غیرہ اھ (ای غیر ماله سبب شرعی ۱۲) (ج ۱/ ۱۶۷) قلت فیه دلالة ان التسییب لیس بحرام مطلقًا بل قد یجب بسبب شرعی کما فی صید الحرم ولا یبعد ان یقال انه قد یستحب لسبب شرعی کما اذا کان فی حبسه تفریق بین الام وولدها او تضجیعها وقد ورد فی الحدیث من فرق بین والدة وولدها فرق الله بینه وبین احبته یوم القیامة رواہ الترمذی وحسنه (عزیزی (ج ۳/ ۳۵۰) وقوله صلی الله علیه وسلم۔ وفجعها فی افراخها قاله لرجل اخذ افراخ حمرة فجعلت تدور علی رأسه فالظاهر ان الارسال یستحب لأجل ذالک والله تعالیٰ اعلم وہل یلتحق بذلک ما اذا تضجع الرجل لکون الطیر محبوسا فی القفس واراد الارسال لالحاق المسرة الیه فالظاهر نعم ولم اره صریحًا والله اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۶ھ

ماں یتیم کے مال میں تجارت کر سکتی ہے یا نہیں؟

سوال: مسماۃ مریم بیوہ کے دو نابالغ لڑکوں کو متوفی باپ کے ترکے سے پانچ سو سے زائد روپیہ ملا تھا۔ وہ روپیہ ان کی ماں مریم کی سپردگی میں دیا گیا تو مریم نے یہ خیال کیا کہ اگر یہ روپیہ تجارت میں دے دیا جائے تو کچھ فائدہ ہی ہوگا ورنہ بلا تجارت جلدی ختم ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر پانچ سو روپے اپنے داماد زید کو دیا کہ اس کو تجارت میں لگائے جو کچھ نفع ہوگا اس میں سے باہم نصف نصف تقسیم کر لیا جائے گا تو زید نے پانچ سو روپیہ مریم سے لے کر خود کوئی مال نہیں خریدا بلکہ بکر کو دے دیا تو بکر نے پانچ سو روپے کا مال خرید کر فروخت کیا تقریبًا اسی ۸۰ روپے یا کچھ کم و بیش نفع ہوا

تو بکر نے اس منافع میں سے چالیس روپیہ خود لے لیا اور چالیس روپے زید کے حوالے کر دیئے۔ زید نے اس نفع کو لے کر اپنی ساس مریم کو دے دیا اور کہا کہ پانچ سو روپے کا مال بکر نے خرید کر بیچا ہے تو جس قدر نفع ہوا اس کا یہ نصف چالیس روپے ملا ہے اس کو تم لے لو تو مریم نے صرف بیس روپے لے لیا اور بیس روپے اپنے داماد زید کو دیا اور کہا کہ تم کو کچھ نہیں ملا تم بیس روپے اس میں سے لے لو میں اپنی خوشی سے دیتی ہوں اور تم اس پانچ سو روپے کے ذمہ دار رہو اور آئندہ بھی منافع کی کوشش کرتے رہو گے لیکن زید کو بیس روپے لینے میں تأمل ہے۔ صورت مذکورہ بالا میں بموجب خوشی ورضامندی مریم کے زید لے سکتا ہے یا نہیں۔

الجواب

قال فی حاشیة الھدایة نقلاً عن الزیلعی ومن ھذا النوع ما ھو متردد یحتمل ان یکون ضررًا کالاجارة والبیع لاستریاح لا یملکہ الا الأب والجد ووصیھما سواء کان فی ایدیھما اولا اھ (ج ۴/ ۴۶) باب الکراھیة۔

اس سے معلوم ہوا کہ غیر اب وجد و وصیہما کو (اور اسی میں ماں اور حاضنہ بھی ہے) یتیم کے مال میں تجارت کرنا جائز نہیں ہے مگر جو منافع ہوگا وہ سب یتیم کا ہوگا۔ پس صورت مسئولہ میں ماں کو یتیموں کے مال میں تجارت کرنا جائز نہیں اور وہ اس فعل سے گنہگار ہے اور جتنا منافع اس تجارت میں ہوگا وہ سب یتیموں کا حق ہے۔ پس صورت مسئولہ میں للعہ روپیہ جو یتیموں کے حصے میں آئے اس میں سے عنہ روپیہ ساس کا داماد کو دینا درست نہیں اور داماد کو بھی لینا درست نہیں۔ ہاں اگر ساس اپنی طرف سے یہ رقم دے اور یتیموں کی رقم ۴۰ روپے پوری ان کو دے دے تو کچھ حرج نہیں اور بکر کو اس صورت میں اجر مثل عمل ملے گا۔ مسمّٰی نہ ملے گا اگر اس کو معلوم تھا کہ یہ مال یتیم کا ہے۔ پس اگر اجر مثل عمل ۴۰ روپے سے کم ہو تو اس کو زیادت کا واپس کرنا لازم ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
۲۳ رجب ۴۶ھ

بھنگی اور چمار کے گھر کا پکا ہوا کھانا مکروہ ہے

سوال: ایک قوم خاکروب اور چمار جن کا پیشہ شب و روز اکثر اوقات مردار استعمال کرنے کا ہے اور سوائے اس کے ناپاک اور پلید چیزیں بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ اہل اسلام کا جانور بھی جب مرجاتا ہے تو ان کو کھانے کو دیتے ہیں۔ غرض اکثر اوقات مردار اور پلید چیزیں کھاتے ہیں۔ آیا ان کے گھر کا پکا ہوا انہیں کے برتنوں میں مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا مکروہ وغیرہ ہے۔ ایک فتویٰ سہارنپور دار العلوم اسلامیہ سے منگوایا تھا اس میں مکروہ تحریمی تحریر ہے۔

الجواب

ہاں دار العلوم کا فتویٰ صحیح ہے۔ ان لوگوں کے گھر کا پکا ہوا کھانا مکروہ ہے اور ان کے برتنوں کو جب تک خود پاک نہ کیا جائے ہرگز استعمال نہ کیا جائے کما فی الحدیث الذی رواہ ابوداؤد از صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن آنیۃ اھل الکتاب الذین یطبخون المیتۃ و یشربون الخمر فیھا فقال ان وجدتم غیرھا فلا تأکلوا فیھا والا فارحضوھا بالماء وکلوا فیھا الحدیث او کما قال وقد اجرجتہ فی الاستدراك الحسن واللہ اعلم والغالب علی الاقوام الذین سئل عنھم النجاسۃ۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۹ صفر ۴۷ھ

قانون ریلوے سے زائد سامان ریلوے ملازم کے معرفت بھیجنے کا حکم

سوال: بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ ریل گاڑی پر بلا کرایہ چڑھنا گناہ ہے اور قاعدہ کے موافق جو بوجھ سامان لے جانا درست ہے اس سے زیادہ لے جانا گناہ ہے۔ قیامت کے دن بجائے روپیہ کے نیک عمل دینا پڑے گا۔ اس لئے ہمارا یہ سوال ہے کہ اگر ملازم ریلوے کے معرفت زائد سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ ملازم گنہگار ہو گا یا مسافر؟

الجواب

ملازمان ریلوے نوکر ہیں۔ ریلوے کے مالک نہیں اس لئے دوسروں کی

چیز خلاف مرضی مالک مراعات فراہم کرنے کا ان کو کچھ حق نہیں پس جتنا سامان ساتھ رکھنے کا ملازم کو قانون ریلوے سے حق دیا گیا ہو اس میں تو ملازم گنہگار ہے نہ مسافر اور اس سے زائد رکھنے میں دونوں گنہگار ہوں گے ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

جعلی سکہ بنانے کا حکم

سوال : رائج الوقت سکہ مثلاً چونی دوانی بنا کر کام میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں خصوصاً جب کہ وہ اس دھات کی بھی نہ ہو جس سے حکومت سکے بناتی ہے ۔ جو شخص اس میں مبتلا ہو اس کا کیا حکم ہے بظاہر اصلی و نقلی میں کوئی فرق بھی نہیں ۔

الجواب

جائز نہیں لما ھی فیہ من الغدر و الغرار ۔ واللہ اعلم ۔

ہارمونیم ، گراموفون وغیرہ کی مرمت کا پیشہ اختیار کرنا کیسا ہے ۔

سوال : ہارمونیم ، گراموفون اور باجوں وغیرہ کی مرمت سے جو آمدنی ہو اس کا کیا حکم اور اس پیشہ کا شریعت میں کیا حکم ہے ؟

الجواب

یہ آمدنی علی الاختلاف جائز تو ہے مگر کراہت سے خالی نہیں اس لئے یہ پیشہ نہ اختیار کرنا اولیٰ ہے ۔

وبناء الجواز علی بیع العصیر ممن یتخذہ خمرا ونحو ذالک فان الحرمۃ إذا لم تقم بالعین بالفعل فلا بأس بثمن العین کما فی الدر وغیرہ ۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ ۲۴ جمادی الثانیہ ۴۷ھ

ریلوے کا ٹکٹ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا اور اس کو اپنی جگہ سوار کرنا جبکہ قانون ریلوے کی رو سے اس کی اجازت نہیں

سوال : ریلوے کا قانون ہے کہ جو ٹکٹ ایک شخص نے خرید لیا ہو اس کے لئے جائز نہیں کہ اس ٹکٹ کو

دوسرے کے ہاتھ فروخت کرکے اس کو اپنی جگہ سوار کردے شرعًا ایسا کرنا کیسا ہے۔ نیز بعض ایام میں واپسی ٹکٹ خاص رعایت سے ملتا ہے تو اگر کوئی شخص واپسی ٹکٹ خرید کر ایک جانب سے دوسرے کو ٹکٹ فروخت کرکے واپس بھیج دے تو شرعًا یہ جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

قال فی اجارات الدّر وان قید براکب اولابس فخالف ضمن (لانہ صار متعدیا لان الرکوب واللبس فما تیفاوت فیہ الناس فرب حفیف جاھل اضر علی الدّابۃ من ثقیل عالم ۱۲ شامی) ومثلہ فی الحکم ما یختلف بالمستعمل کالفسطاط (قال فی الدّر: حتی لو استأجر فدفعہ إلی غیر اجارۃ او اعارۃ فنصبہ وسکن فیہ ضمن عند ابی یوسف لتفاوت الناس فی نصبہ واختیار مکانہ وضرب اوتادہ وعند محمد لا یضمن لانہ للسکنیٰ فصار کالدار اھ شامی) وفیما لا یختلف فیہ بطل تقبیدہ بہ کما لو شرط سکنیٰ واحدلہٗ ان یسکن غیرہٗ لما مرّ ان التقیید غیر مفید اھ (ج ۵/ ۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ شئ مستاجر میں اگر استعمال مختلف نہ ہو تو مستاجر کو جائز ہے کہ دوسرے کو عاریت یا اجارۃً دے دے اور مختلف ہو تو جائز نہیں اور ظاہر یہ ہے کہ ریل میں استعمال مستعمل متفاوت نہیں۔ ۱۲

لہٰذا شرعًا ریل کا ٹکٹ دوسرے کو فروخت کرکے اس کو اپنی جگہ بھیج دینا جائز ہے مگر زیادہ داموں میں فروخت نہ کرے بلکہ مثل اجر مسمّیٰ یا اس سے کم میں فروخت کرے اور واپسی کے ٹکٹ کے فروخت کرنے میں تردد ہے۔ چند وجوہات سے (۱) یہ کہ اس صورت میں استعمال مختلف ہے کیونکہ اگر دوسرا شخص خود کرایہ کرتا تو اس کو زیادہ کرایہ دینا پڑتا اور واپسی والے کے ساتھ کرایہ میں خاص رعایت کی گئی ہے اور اس کے لئے مخصوص ہے۔ لہٰذا اس رعایت کو متعدی کرنا بظاہر جائز نہیں الّا بالاذن (۲) یہ کہ واپسی والا جس ٹرین کا ٹکٹ لے رہا ہے اس میں واپس

نہیں ہوتا بلکہ دوسری ٹرین بھی واپس ہوتا ہے اور ریلوے کی طرف سے یہ اذن عام ہے کہ اس ٹکٹ سے جس ٹرین میں چاہو واپس آجاؤ اسی شخص کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسروں کو اس تعمیم سے اس ٹکٹ میں منتفع کرنا بلا رضا کے جائز معلوم نہیں ہوتا۔

(۳) یہ کہ اگر اس ٹکٹ کو واپسی کے وقت زیادہ داموں میں فروخت کیا گیا تو یہ زیادہ کسی شئی کے عوض میں نہیں لہذا زیادت جائز نہیں۔

قال فی الدّر: ولو آجر المستاجر باکثر تصدق بالفضل الا فی المسئلتین اذا آجرها بخلاف الجنس او اصلح فیها شیئًا اھ بان حصّصها او فعل فیها مسنّاة وکذا کل عمل قائم لأن الزیادہ بمقابلة ما زاد من عنده حملا لامره علی الصلاح کما فی المبسوط ولکنس لیس باصلاح إن کری النهر قال الخصّاف تطیب و قال ابو علی النسفی أصحابنا متردد ون اھ (ج ۵/۲۷) (۱) مابالجملہ فالمعتبر الزیادة بعمل قائم دون غیره۔ واللہ اعلم۔

حرّرہ ظفر احمد عفا عنہ

۲۰ ذالحجہ ۱۳۴۷ھ

بلا اجازت کسی کی زمین سے استنجا کے لئے ڈھیلے لے کر استعمال کرنے کا حکم

میں نے خادم سے استنجار کے لئے ڈھیلے منگوائے وہ قریبی زمینداروں کی زمین سے کھودی ہوئی مٹی کے ڈھیلے لے آیا مجھے معلوم نہ تھا۔ معلوم کرنے پر اس نے بتایا میرا خیال ہے کہ اگر وہ کم مٹی ہو کہ مالک اٹھانے سے منع نہ کرے تو گنجائش ہو گی اور اگر مالک اٹھانے سے منع کرے تو جائز نہ ہو گی۔

حضرت والا میرے خیال کی تصحیح فرمائیں۔

الجواب

صحیح خیال ہے مقدار کثیر سے تو کھیت والے بھی منع کرتے ہیں۔ ہاں دو تین ڈھیلے سے عادةً کوئی نہیں روکتا فلا بأس به۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ ۱۳ رجب ۱۳۴۷ھ

(۱) (ج: ۶/۲۹) باب ما یجوز من الاجارة۔ شامی ایچ۔ ایم سعید: مرتب

باپ اور معلم نابالغ بچوں کو کس حد تک مار سکتے ہیں اس کے متعلق چند سوالات

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مسائل ذیل میں
(۱) کیا معلم کو جائز ہے کہ وہ اپنے نابالغ شاگرد کو چھڑی سے مارے اگر چھڑی سے نہیں تو کیا ہاتھ سے مار سکتا ہے اور کتنی ضرب مارنے کی اجازت ہے۔
(۲) کس صورت میں معلم اپنے شاگرد کو مارنے سے ضامن ہوتا ہے اور کس صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔
(۳) باپ اپنے بالغ لڑکے اور معلم اپنے بالغ شاگرد کو مار سکتا ہے یا نہیں۔

الجواب

(۱) معلم کے لئے جائز نہیں کہ اپنے نابالغ شاگرد کو چھڑی سے مارے البتہ ہاتھ سے مار سکتا ہے اور وہ بھی تین ضرب سے زیادہ نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرداس معلم سے فرمایا کہ تین ضرب سے زیادہ مت مارو اگر تم تین ضرب سے زیادہ مارو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے قصاص لے گا۔

وان وجب ضرب ابن عشر علیها بید لا بخشبة (در مختار علی هامشه الشامی ج ۱/ ۲۵۸ کتاب الصلوٰة۔ قال الشامی تعلیقاً علی قوله (بید) ای ولا یجاوز الثلاث وکذلك المعلم لیس له ان یجاوزها قال علیه الصلوٰة والسلام لمرداس المعلم ایاك ان تضرب فوق الثلاث فانك اذا ضربت فوق الثلث اقتص الله منك وما کونه لا بخشبة فان الضرب بها ورد فی جنایة المکلف (شامی ج ۱/ ۲۵۸)

(۲) معتاد ضرب سے زیادہ خواہ کیفاً خواہ کماً خواہ محلاً (جیسے چہرہ پر) مارنے سے ضمان واجب ہوتا ہے۔ ومحله فی الضرب المعتاد ای کماً وکیفاً ومحلاً فلو ضربه علی الوجه او علی المذاکیر یجب الضمان بلا خوف ولو سوطاً واحداً لانه اتلاف (الشامی ج ۵/ ۴۰۱) کتاب الجنایات۔ (۱)

(۱) شامی ۶: ۵۶۶/ ۔ ایچ ایم سعید ۔ مرتب (ع۵ شامیۃ ج ۱/ ۳۵۲)

اگر معلم اپنے شاگرد کو اس کے باپ یا وصی کی اجازت کے بغیر مارے تب بھی معلم ضامن ہوگا۔

ضرب الأب او الوصی او المعلم باذن الاب تعلیماً فمات لاضمان (ص مذکورہ)

قال الشامی تعلیقاً علی قولہ (باذن الأب) ای او باذن الوصی ولو ضرب بغیر اذنهما یضمن۔ اھ

اور اگر معلم اپنے شاگرد کو اس کے باپ یا وصی کی اجازت سے تعلیماً مارے تو ضامن نہ ہوگا مگر ضرب معتاد سے زیادہ نہ مارے ورنہ ضامن ہوگا جیسا کہ معلوم ہو چکا۔

(۳) بالغ لڑکا باپ کے لئے مثل اجنبی کے ہے۔ باپ اس کو تعزیر نہیں کرسکتا تو معلم کے لئے بطریق اولیٰ جائز نہیں کہ اپنے بالغ شاگرد کو تعلیم کی رو سے مارے۔

والأب یعزر الابن علیہ ای علی ترک الصلوٰۃ مثلها الصوم وان المراد بالابن الصغیر بقرینۃ مابعدہ اما الکبیر فکالا جنبی (شامی ج ۳/۲۰۷) باب التعزیر۔ ہاں متاخرین نے کہا ہے کہ ہر شخص دوسرے کو معصیت کے ارتکاب پر تعزیر کرسکتا ہے۔ اس بنا پر اگر بالغ لڑکا یا بالغ شاگرد معصیت کا ارتکاب کرے تو باپ یا معلم اس کو مار سکتا ہے۔

وزاد بعض المتاخرین ان الحد مختص بالامام والتعزیر بفعلہ الزوج والمولیٰ فکل من رای احدا یباشر المعصیۃ (شامی: ج ۳/۱۹۴) ج ۳/۱۹۴) باب التعزیر۔)

حررہ الاحقر محمد ابراہیم احمد آبادی غفرلہ
کرڈہ مسجد کھگول پٹنہ۔

الجواب من جامع امداد الاحکام

نابالغ بچوں کو چھڑی سے مارنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی کیونکہ آج کل معلم حد سے گزر جاتے ہیں اور ہاتھ سے مارنے میں حد سے گزرنا دشوار ہے کیونکہ خود اس کے بھی چوٹ لگے گی۔ عالمگیری میں بھی غالباً اسی کے مثل ہے اور ع۳

ہیں سے جو سمجھا گیا کہ بالغ کو چھڑی سے مارنا جائز نہیں۔ یہ صحیح نہیں بلکہ اس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ باپ کو اولاد کبار کی تعزیر کا حق نہیں مگر جبکہ اس سے معصیت کا صدور ہو۔ اس سے یہ سمجھنا کہ معلم کو بھی حق نہیں غلط ہے کیونکہ جب بالغ ولد طالب علمی کے لئے معلم کے پاس آتا ہے اور اس سے علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو حالاً و عملاً اس نے اپنے آپ کو معلم کے سپرد کر دیا ہے اور بالغ کا یہ فعل معتبر ہے لہٰذا معلم اس کو سزا بید دے سکتا ہے کیونکہ متعلم بالغ خود اس پر راضی ہے البتہ اگر کوئی متعلم بالغ سزا بید وغیرہ پر راضی نہ ہو تو اس کو ایسی سزا دینا جائز نہیں۔ لفوت الاذن والتفویض مگر ایسے شخص کو پڑھانا کیا ضروری ہے۔ معلم کو بھی حق ہے کہ جو سزا پر راضی نہ ہو اس کو نہ پڑھائے اور اولاد کبار اگر اپنے کو بلوغ کے بعد بھی باپ کے سپرد کر دے کہ ہماری اصلاح و تربیت کے لئے جو تصرف چاہو کرو خواہ قولاً یا حالاً تو اس صورت میں اولاد کبار کو بھی تعلیم وغیرہ پر والدین سزائے ضرب بالخشبہ وغیرہ دے سکتے ہیں اور یہی حکم اجنبی کا ہے جبکہ وہ اپنے کو کسی کے سپرد کر دے فالتشبیہ بالاجنبی لا یدل علی عدم جواز التعزیر مطلقا بل علی جوازہ باذنہ وعدمہ بغیر الاذن فافہم اور ارتکاب بالمعصیۃ میں مفتی بہ اس زمانے کے لئے متقدمین کا قول ہے کہ امام کے سوا اجنبی پر تعزیر جاری کرنے کا کسی کو حق نہیں کیونکہ اس میں فتنہ و فساد ہے۔ ہاں زوجہ پر اور والد ولد پر شیخ مرید پر معلم متعلم پر ارتکاب معصیت کے وقت تعزیر جاری کر سکتا ہے (شامی ۴۲۱/۵) کیونکہ اس میں غالب فساد نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ محرم ۴۸ھ

قبل از طعام کلی کرنے اور ہاتھ دھو کر پونچھنے کا حکم

سوال: قبل از طعام ہاتھ دھو کر پونچھنے اور کلی کرنے کے متعلق شرعی احکام کیا ہیں؟

الجواب

فی العالمگیریہ (ج ۶/ ۲۲۵) ولا یمسح یدہ قبل الطعام بالمندیل لیکون اثر الغسل باقیا وقت الأکل ویمسحہا بعدہ لیزال

اثر الطعام بالكلية كذا فی خزانة المفتين۔ وفی اليتمية سئل والدی عن غسل الفسم عند الأكل هل هو سنة كغسل اليد قال كذا فی التاتارخانية وفيه ايضًا بعد سطرين ويكره للجنب رجلًا كان او امرأة ان يأكل طعامًا او يشرب قبل غسل اليدين والفم ولا يكره ذالك للحائض والمستحب تطهير الفم فی جميع المواضع كذا فی فتاوىٰ قاضيخان۔

اس سے معلوم ہوا کہ ادب یہ ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر کپڑے سے صاف نہ کئے جاویں اور کھانے کے بعد صاف کر لئے جائیں اور کلی کرنا کھانے سے پہلے سنّت نہیں ہے (لیکن بدون سنّت سمجھے کرے تو جائز ہے۔ لعدم الدليل على منعه) اور اگر حالت جنابت میں ہو تو بدون کلی کئے کھانا مکروہ ہے۔ والظاهر ان الكراهة تنزهية لقوله صلى الله عليه وسلم لابی هريرة وكان جنبًا ان المؤمن لا ينجس۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا عنہ، ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ

بالغ کے ختنہ کا حکم | سوال: ختنہ کے واسطے جو کہ سنت ہے۔ ستر عورت جو فرض ہے ترک کرنا کیسا ہے؟ یعنی اگر کسی بالغ کا ختنہ نہ ہوا ہو تو کیا بلوغ کے بعد ختنہ کے لئے ستر کھول سکتا ہے۔

الجواب

یہ قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے مگر ختنہ کے متعلق فقہاء نے تصریح کی ہے کہ بالغ کا ختنہ کرنا اور بقدر ضرورت بدن کا دیکھنا چھونا جائز ہے البتہ ضرورت سے زائد بے پردگی جائز نہیں۔ اس واسطے ختان کے سوا کوئی نہ دیکھے اور باقی بدن کو ختان سے بھی چھپاتے رہے اور ختنہ صرف سنّت ہی نہیں بلکہ شعائر اسلام سے بھی ہے۔

کتبہ الاحقر

عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح۔ وما تضمنہ کلام السائل من ان الحرام لا یباح الا لأمر واجب غیر مسلم فان الفطر فی رمضان حرام ومع ذالک یباح لأمر جائز کسفر کذا فی فتح الباری (ج ۱/۲۹۱) قلت ولا اصل فیہ ما قالہ فقہائنا قد یغتفر ضمنا ما لا یغتفر قصداً الاشباہ ص ۹۶) واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ

۲۷ جمادی الاولیٰ ۴۸ھ

معلم کس حد تک بچوں کو مار سکتا ہے

سوال: معلم کے لئے متعلموں کو تنبیہاً لہو و لعب سے باز رکھنے کے لئے ضرب شدید لگانا جائز ہے یا نہیں۔ اگر جائز ہے تو کس حد تک اور کس طریقہ پر، اگر ناجائز ہے تو کس طریقہ پر ان کو تعلیم دی جائے۔

الجواب

فی الدر المختار: (ادعت علی زوجہا ضربا فاحشا وثبت ذالک علیہ عزر کما لو ضرب المعلم الصبی ضربا فاحشا) فانہ یعزر وفی رد المحتار (قولہ ضربا فاحشا) قید بہ لانہ لیس لہ ان یضربہا فی التادیب ضربا فاحشا وھو الذی یکسر العظم او یخرق الجلد او یسودہ کما فی التاتارخانیۃ قال فی البحر وصرحوا بانہ اذا ضربہا بغیر حق وجب علیہ التعزیر اھ ای وان لم یکن فاحشاً (ج ۳/ ۲۹۳) (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ بلا قصور مارنا تو بالکل جائز نہیں ہے اور قصور پر قصور کی کمیت و کیفیت کا لحاظ کر کے اس کے مناسب مارنا جائز ہے لیکن اس وقت بھی) حد سے زیادہ مارنا ممنوع ہے اور حد یہ ہے کہ نہ کوئی ہڈی ٹوٹے نہ کھال اکھڑے نہ کھال سیاہ ہو پس اگر اتنا مارا کہ کھال سیاہ ہو گئی یا کھال اکھڑ گئی یا ہڈی ٹوٹ گئی تو سخت گناہ ہوا اس حالت میں خود یہ معلم سزا پانے کے قابل ہے اور قول در مختار۔ لہ اکراہ طفلہ علی تعلیم القرآن وادب و علم سے معلوم ہوتا ہے کہ بے تمیزی کرنا اور سبق میں کوتاہی کرنا

(۱) شامی ایچ۔ ایم سعید کمپنی (ج ۴/۷۹) افتخار

دونوں قصور ہیں جن کی وجہ سے بچوں کو سزا دینا جائز ہے ۔ واللہ اعلم
کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
یکم شعبان ۸۶ھ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا عنہ ، ۵ شعبان ۸۶ھ

ختنہ کے لئے نصف سے زائد حشفہ کا ظاہر ہونا ضروری ہے

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں زید کی عمر تقریباً بیس سال ہے معروف نصف رسولیہ ہے یعنی عضو تناسل کی نصف سپاری کھال سے پوشیدہ ہے اب اس کو ختنہ کرانا واجب ہے یا نہیں. کیونکہ جس وقت والدین نے بچپن میں اس کا ختنہ کرانے کا ارادہ کیا تو حجام وغیرہ اور دیگر حضرات نے ان کو روک دیا کہ یہ رسولیہ ہے ۔ اس کے ختنہ کرانے کی ضرورت نہیں وہ رک گئے ۔ اب بعض کہتے ہیں کہ اس کا ختنہ کرانا ضروری ہے اگرچہ سالم رسولیہ ہو اور جو نصف رسولیا ہو اس کا تو ختنہ بدرجہ اولیٰ ضروری ہے .

الجواب

فی العالمگیریہ (ص ۲۳۷ ج ۴) غلام ختن فلم تقطع الجلدة کلّها فان قطع اکثر من النصف یکون ختاناً وان کان نصفا او دونهٗ فلا کذا فی خزانة المفتین و فی صلوٰة النوازل الصبی اذا لم یختتن ولا یمکن ان یمد جلده لیقطع الا بتشدید و حشفته ظاهرة فاذا رآه انسان یراه کانهٗ اختتن ینظر الیه الثقات واهل البصر من الحجامین فان قالو هو علی خلاف ما یمکن الاختتان فانهٗ لا یشدّد علیه ویترک کذا فی الذخیرة .

اس سے معلوم ہوا کہ نصف حشفہ کا ظاہر ہونا ختنہ کے لئے کافی نہیں ہے. اس واسطے اس لڑکے کا ختنہ کرنا چاہیئے البتہ اگر حجام یوں کہے کہ اب کھال کا کاٹنا ممکن نہیں یا کھال کو ختنہ کے واسطے کھینچنے میں سخت تکلیف ہوتی ہو تو

پھر ختنہ معاف ہے۔ فقط واللہ اعلم

احقر عبدالکریم عفی عنہ از تھانہ بھون ۱۶ صفر ۱۳۵۱ھ

جانوروں کی گردن میں گھونگرو وغیرہ ڈالنے کا حکم	سوال: بیلوں یا گھوڑوں وغیرہ کی گردن میں گھونگرو یا ٹالی ڈالنا کیسا ہے؟

الجواب

اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے حدیث نهی عن الجرس کو ظاہر پر رکھ کر مطلقاً منع فرمایا ہے اور احتیاط اسی میں ہے اور بعض نے نہی کو حالت غزوہ کے ساتھ مخصوص قرار دے کر دوسرے حالات میں اس کی اجازت دی ہے اور جواز حُدی سے اس کی تائید کی ہے اور اس پر عمل کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون، ۲ محرم ۱۳۴۹ھ

علم نجوم، نیز جھوٹے نجومی و حکیم اور فرضی عامل اور ان کی آمدنی کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم	سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص فرضی نجومی، فرضی

حکیم و فرضی عامل و بزرگ بن کر لوگوں کو گزشتہ و آئندہ کے حالات بتاتا ہے۔ فرضی دوائی دیتا ہے اور تکلیف، گردش، جادو بیماری وغیرہ کے رفع کرنے کی فرضی ترکیب بتا کر فرضی تعویذ دیتا ہے اور ان سب کاموں کے بدلے لوگوں سے رقم وصول کرتا ہے اس کی آمدنی حلال ہے یا حرام یہ دھوکہ ہے یا نہیں؟

(۲) اس کی اس آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں۔ یہ حق العباد ہے یا حق اللہ اگر حق العباد ہے تو اس کا ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں۔

(۳) اب وہ اس کام سے توبہ کرتا ہے۔ کوئی دوسرا کام وہ نہیں جانتا۔ اسی پرانی آمدنی کا مال اس کے پاس ہے۔ اگر اس روپے سے وہ کوئی تجارت کرے تو آئندہ آمدنی حلال متصور ہو گی یا نہیں۔ اگر سب روپیہ وہ ادائیگی حق العباد میں دے دے تب بھی تو ساری عمر کے کمائے ہوئے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ نیز وہ خالی ہاتھ ہو جائے گا اور بال بچوں کی پرورش کا بندوبست وہ کسی طرح نہیں کر سکتا۔ اس کی کیا شرعی صورت ہو سکتی ہے کہ گزارہ اور بچوں کی پرورش بھی ہوتی رہے اور حق العباد

بھی ادا ہوتا جائے۔ ایسی آمدنی سے صدقہ خیرات کرنا کیسا ہے۔

(۴) اور جو شخص فن نجوم جانتا ہے اس سے لوگوں کو غیب کی باتیں بتاتا ہو اس کا کیا حکم ہے۔ اس کی آمدنی کیسی ہے۔

الجواب

(۱) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث هن سحت حلوان الکاهن ومهر الزانية۔ الحدیث: پس اس شخص کی آمدنی حرام ہے اور دھوکہ ہے۔

(۲) زکوٰۃ واجب نہیں۔ بلکہ یہ حق العباد ہے جس کا واپس کرنا واجب ہے۔

(۳) توبہ کا طریق یہ ہے کہ جن لوگوں سے یہ رقم لی ہے ان کو ادا کرے یا ان سے معاف کرائے اگر کسی کا پتہ نہ لگے تو اس کی طرف سے خیرات کرے اگر یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کس کی رقم کتنی ہے تو اپنی پوری کمائی کا اندازہ کرکے اس کے برابر رقم خیرات کرے اور کہتا رہے کہ جس کا جتنا حق ہو اس کو اس کا ثواب اس کے حق کے برابر پہنچا دیا جائے۔ اگر ایک دم کل رقم خیرات نہ کر سکے تو جتنی گنجائش ہوتی جائے ادا کرتے رہے۔

اور اس رقم سے تجارت کرنا اس صورت میں جائز ہے جبکہ کسی اور صورت سے بال بچوں کی پرورش نہ کر سکے اگر ملازمت یا مزدوری سے بال بچوں کی پرورش کر سکے تو یہ کل رقم خیرات کر دے اور ملازمت یا مزدوری سے گھر کا کام چلائے اور اگر کوئی صورت میسر نہ ہو تو اس آمدنی سے تجارت کر سکتا ہے اور اس کے منافع سے ضروری خرچ نکال کر بقیہ کو خیرات کرتا رہے۔ یہاں تک کہ دل گواہی دے دے کہ حق العباد ادا ہو گیا ہوگا۔ اگر یہ شخص اس طرح ادائیگی میں لگ گیا اور حق العباد پورا کرنے سے پہلے مر گیا تو امید ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے اس کی توبہ کو کامل کر دیں گے اور اہل حقوق کے حقوق ادا فرما دیں گے۔

(۴) جو شخص فن نجوم جانتا ہو اس کا بھی اس رقم کی بابت وہی حکم ہے جو ۳ میں مذکور ہوا بس اس شخص کو دھوکہ دہی کا گناہ نہ ہوگا مگر فن نجوم سے کام لینے کا گناہ ہوگا اور اس کی آمدنی بھی حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

قال ابن القیم فی زاد المعاد وھذا یبتنی علی قاعدة عظیمة من قواعد الاسلام وھی ان من قبض مالیس لہ قبضة شرعًا ثم اراد التخلص منہ فان المقبوض قد اخذ بغیر رضا صاحبہ ولا استوفی عوضہ ردہ علیہ فان تعذر قضی بہ دینا یعلمہ علیہ فان تعذر ردہ علی ورثتہ وان کان المقبوض برضا صاحبہ وقد استوفی عوضہ المحرم فلا یجوز ان یجمع لہ بین العوض (المعوض ص۴۳۷ ج۲) قلت وھھنا لم یستون الدافع عوضہ فعلی القابض رد ما قبضہ الی الدافع بالطریق الذی مرّ ذکرھا۔ واللہ اعلم ظفر احمد عفا عنہ

۸ رجب ۵۶ھ

نابالغ کے مال میں اس کے لئے تجارت کا حکم

سوال: ہمارے چچا مرحوم کی نابالغ اولاد ہے۔ چچی کا خیال ہے کہ مرحوم کا ترکہ جو بچوں کے حصے میں ہے وہ تجارت میں لگا دیا جائے اس کے متعلق ارشاد ہو کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر مرحوم نے کسی کو وصی بنایا تھا یعنی اپنے ترکہ کے متعلق کسی قسم کی بھی وصیت کا نفاذ کسی کے سپرد کیا تھا تب تو اس وصی کو اختیار ہے کہ ان بچوں کا مال تجارت میں لگا دے گو مرحوم نے اس وصیت میں تجارت میں لگانے کی صراحةً اجازت بھی نہ دی ہو بشرطیکہ صراحتاً منع نہ کیا ہو۔

فی فتاوی قاضیخان مریض قال لغیرہ اقض دیونی یصیر وصیًا فی قول ابی حنیفة لان قضا والدین من اعمال الوصیة والوصایا لا یقبل التخصیص اذا کان من المیت وقال محمد لا یصیر وصیا بھذا القدر مالم یقل اقض دیونی وانفذ وصایای. (ج۴/۳۴۴) وفی الصفحة الآتیة منہ قال الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل اذا جعل الرجل رجلًا وصیًا علی ابنہ وجعل رجلًا آخر وصیًا علی ابنة اوجعل احدھما

وصیا فی مالہ الحاضر وجعل رجلاً آخر وصیاً فی مالہ الغائب فان کان
فی شرطان لا یکون کل واحد منہما وصیا فی ما اوصی الی الآخر
یکون الأمر علی ما شرط عند الکل وان لم یکن شرط ذالک
فحینئذٍ یکون المسئلہ علی الاختلاف والفتوی علی قول ابی
حنیفۃؒ وفیہ ایضاً ذکر شمس الأئمۃ الحلوانی فی شرح
الأدب القاضی اذا نصب القاضی وصیًا فی ذالک النوع خاصۃً
بخلاف الوصی الأب لہ کان وصی القاضی بمنزلۃ وصی
الأب، اذا جعلہ القاضی وصیًا ما فی الانواع کلھا فان جعلہ
وصیا فی نوع واحد کان وصیًا فی ذالک النوع خاصۃ بخلاف
وصی الأب فانہ لا یقبل التخصیص اذا اوصی الی رجل فی
نوع کان وصیًا فی الانواع کلھا (ج:۴/۴۳۷)

اور اگر مرحوم نے بالکل ہی وصی نہ بنایا تھا تو تجارت میں مال لگانا بدون
اذن قاضی جائز نہیں اور جج مجسٹریٹ وغیرہ کوئی اگر مسلمان حاکم علاقہ ہو اور
گورنمنٹ کی طرف سے اسے ایسے امور کا اختیار بھی ہو تو وہ قاضی کے قائم مقام
ہے اور اس کی اجازت سے یتیم کا مال تجارت میں لگانا جائز ہے۔ وھذا کلہ
ظاھر۔

کتبہ الاحقر
عبدالکریم عفی عنہ
۲۲ رجب ۵۳ھ

الفرار عن الطاعون (ای الاثم) بالقرار فی الطاعون

سوال : ایک بہت ہی ضروری مسئلہ جس میں حضرت والا کی تحقیق سے مستفیض ہونے کی بہت ضرورت ہے اس لحاظ سے بھی اس مسئلہ کی تحقیق ضروری ہے کہ طاعون میں جو پریشانیاں ہوتی ہیں وہ حضرت والا پر روشن ہیں۔ سب کے دل حضرت ابو عبیدہؓ کے دل کی طرح نہیں ہوتے باوجود علماء کی روک تھام کے ہزار میں ایک دو کا بھی فرار عن الطاعون سے بچنا مشکل ہے۔ اس عموم بلوی میں اس امت مرحومہ کی دستگیری آپ جیسے حضرات کے لئے ضروری ہو جاتی ہے۔ اس لئے نہایت عاجزی سے عرض پرداز ہوں کہ میں نے بہت ساری کتابوں کو خاص اس مسئلہ کے لئے دیکھا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ مثل اور مسائل کے فرار عن الطاعون کا مسئلہ بھی قدیم سے مختلف فیہ ہے۔

امام نووی نے شرح مسلم میں اس اختلاف کو تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ امہات المومنین اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرامؓ فرار عن الطاعون کو ناجائز فرماتے ہیں۔ اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کرتے ہیں جو مشہور ہیں مثلاً امام احمد کی روایت جو مشکوۃ شریف میں مرفوعاً مروی ہے۔ للفار من الطاعون کالفار من الزحف۔

امام نووی جو شافعی المسلک ہیں اس کے بعد کہتے ہیں کہ ھذا مذھبنا و مذھب الجمھور۔ یہاں جمہور سے مراد حنفیوں کے سوا ہے اس لئے کہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ومنھم من جوّز القدوم علیہ والخروج عنہ فراراً قال وروی ھذا عن عمر ابن الخطاب وعن ابی موسی الاشعری والمسروق والاسود بن ھلال انھم

ع یعنی الاثم تشبیھًا بہ فی التفتیت والتشتیت

فرّوا من الطاعون وقال عمرو بن العاص فرّوا عن ھذا الرّجز فی الشعاب والادویۃ ورؤس الجبال ملخصًا۔

اور امام طحاوی اور ابن عساکر و سفیان ابن عیینہ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ کے مشہور واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ جب شام میں طاعون شروع ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار شام کو بایں مضمون فرمان لکھا۔

اذا تاك کتابی ھذا فانی اعزم علیك ان اتاك مصبحًا لا تمسی حتی ترکب وان اتاك ممسیًا لا تصبح حتی ترکب الیّ فقد عرضت لی الیك حاجۃ لا غنائی عنك فیھا۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمان پڑھ کر فرمایا کہ امیر المومنین چاہتے ہیں کہ جو باقی رہنے والا نہیں اس کو باقی رکھیں۔ اس فرمان کا یہ جواب لکھا کہ دو مسلمانوں کو چھوڑ کر میں ہٹ نہیں سکتا وہ مجھ کو معلوم ہے۔ جب یہ جواب پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ لوگوں نے کہا ابو عبیدہؓ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے فرمایا نہیں پھر یہ فرمان لکھا کہ ان الاردن ارض عمقۃ وان الجابیۃ ارض نزھۃ فانھض بالمسلمین الی الجابیۃ۔ اس فرمان کی تعمیل شروع کی تھی اسی اثناء میں مبتلا طاعون ہو کر انتقال فرمایا۔

امام طحاوی جو حنفی ہیں اس کے بعد لکھتے ہیں۔

فھذا عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ قد أمر الناس ان یخرجوا من الطاعون ووافقہ علی ذالك اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس عبارت کے ملاحظہ سے ظاہر ہو گا کہ امام طحاوی اس سے اجماع صحابہ کو ثابت کر رہے ہیں۔

اس کے بعد امام طحاوی لکھتے ہیں۔

وروی عبد الرحمن بن عوفؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ع مگر ان میں حنفیہ کا نام کہیں بھی نہیں ۱۲ ظ

مایوافق ماذھب الیہ من ذالک۔ امام طحاوی کی اس تحقیق سے معلوم ہوا فرار عن الطاعون کا جواز حنفی مذہب میں ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت کے سوا فرار عن الطاعون کے جواز میں حنفی علماء ابوداؤد شریف کی ان دو روایتوں کو تائید میں پیش کرتے ہیں۔

عن انسؓ قال قال رجل یارسول اللہ انا کنا فی دار کثیر فیھا عددنا واموالنا فتحولنا الی دار قل فیھا عددنا واموالنا فقال صلی اللہ علیہ وسلم ذروھا ذمیمۃ۔

اور ابوداؤد شریف کی روایت میں یحییٰ بن عبداللہؓ سے مروی ہے۔ کسی نے کہا کہ یارسول اللہ ہمارے پاس وبائی زمین ہے۔ فقال دعھا عنک۔ اس کے متعلق روایات حنفیہ حسب ذیل ہیں۔ درمختار کے مسائل شتی میں ہے۔

اذا خرج من بلدۃ بھا الطاعون فان علم ان کل شئ بقدر اللہ تعالےٰ فلا بأس بان یخرج و یدخل وان کان عندہ لوخرج نجی ولو دخل ابتلیٰ بہ کرہ لہٗ ذالک فلا یدخل ولا یخرج صیانۃ لاعتقادہ وعلیہ حمل النبی فی الحدیث الشریف مجمع الفتاوی انتھی۔

اور اشباہ والنظائر میں لکھا ہے:

وفی البزازیۃ اذا تزلزلت الارض وھو فی بیتہ یستحب الفرار الی الصحراء لقولہ تعالےٰ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ وفیہ قیل الفرار مما لا یطاق من سنن المرسلین۔

بزازیہ کی یہ عبارت نقل کرکے اشباہ والنظائر میں ہے۔ فیفید جواز الفرار من الطاعون اذا نزل ببلدۃ۔ جب فرار عن الطاعون کا جواز حنفی مذہب میں ہے اور اس کی صاف اور صریح روایات موجود ہیں تو کم از کم حنفیوں کو فرار عن الطاعون کا فتویٰ دینا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کے جم غفیر کو پریشانی سے نجات ملے۔ اس سلسلے میں حضرت والا کی تحقیق و رائے مبارک کے سننے کے منتظر ہیں۔

(ف) یہ معروضہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ فقہی روایات اور اکثر آثار مطلق ہیں۔ جو فناء شہر اور دوسری بستی میں جانے کو شامل ہیں اور بعض آثار سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا حضرت ابو عبیدہؓ کو شام سے مدینہ منورہ کو بلانا اور فوجوں کو اردن سے جابیہ منتقل کرنے کے لئے حکم فرمایا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرار عن الطاعون کے بعد خواہ فناء شہر میں ٹھہرے یا دوسری بستی میں ٹھہرے یہ دونوں جائز ہے۔ فقط

ابو الحسنات سید عبداللہ کان اللہ لہٗ۔

الجواب

اوّلاً چند مقدمات ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

(۱) حفاظتِ اعتقاد سب سے ضروری ہے۔

(۲) اہلِ اسلام میں خصوصاً اہلِ سنت و جماعت میں کوئی فریق خدا کے سوا کسی شئ کو مؤثر بالذات نہیں کہتا۔

(۳) عدوی کے متعلق جو علماء میں اختلاف ہے تو باوجود اختلاف کے اس پر پر سب متفق ہیں کہ طبعاً ولزوماً کوئی مرض متعدی نہیں۔ لزوم تعدیہ کے قائل اہلِ جاہلیت تھے۔ جیسا کہ آج کل اہل سائنس ہیں۔

(۴) اگر کوئی مباح مفضی الی المعصیۃ ہو جائے تو حرام ہو جائے گا۔

(۵) اختلاف سے بہت کم مسائل خالی ہیں۔ دیکھنا یہ ضروری ہے کہ اہلِ اختلاف میں ہر ایک کے پاس دلیل قوی ہے یا کسی کی دلیل ضعیف بیّن ہے۔ اگر کسی کی دلیل ضعیف بین ہو تو اس کو اختیار کرنا جائز نہیں۔

(۶) نص قولی مرفوع افعال صحابہؓ سے مقدّم ہے۔ افعال صحابہؓ اگر نص مرفوع کے خلاف ہوں تو خود افعال صحابہ میں تاویل کی جائے گی۔ نص میں تاویل نہ کی جائے گی۔

وھذا اذا کان المخالف غیر من روی الحدیث فان کان المخالف ھو الراوی فمذھبنا ان مخالفۃ عمل الراوی لمرویہ جرح فیہ فتنبہ۔

اس کے بعد معروض ہے کہ سائل نے مذہب حنفی کی تدبر سے کام نہیں لیا، مذہب حنفی اس مسئلہ میں یہ ہے کہ دخول وخروج من الطاعون اس شخص کے لئے جائز ہے جس کے نزدیک دخول وخروج دونوں بدرجہ مساوی ہوں اور اگر موضع طاعون میں دخول کو مضر اور خروج کو نافع سمجھتا ہو تو ایسے شخص کے لئے مذہب حنفی میں خروج من مقام الطاعون ودخول فی موضعہ من خارج کی اجازت نہیں بلکہ مکروہ تحریمی ہے۔ الا لحاجۃ شدیدۃ لا بد منہا فان الحرج مدفوع بالنص۔

سائل نے عبارت طحاوی سے مذہب طحاوی کے سمجھنے میں عجلت سے کام لیا کہ ان کی پوری عبارت نہیں دیکھی بلکہ درمیان ہی سے ان کا مذہب اخذ کر لیا۔ امام طحاوی نے اس مسئلہ میں دو جماعتوں کے اقوال نقل کئے ہیں اولاً مجوزین فرار کے اور ان کی عادت یہ ہے کہ اول اپنے مخالفین کا قول مع دلائل کے نقل کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنا قول مع دلائل کے بیان کرتے ہیں۔ لیکون الآخر ناسخا للاول۔ چنانچہ جو عبارت سائل نے طحاوی سے نقل کی ہے۔ یہ طائفہ اولی مخالفہ کا قول ہے۔

ونصہ قالوا عمر رضی اللہ عنہ قد امر الناس ان یخرجوا من الطاعون ووافقہ علی ذالک اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ

یہ عبارت صاف بتلا رہی ہے کہ یہ قول طحاوی خود نہیں بلکہ دوسروں کا ہے۔

امام طحاوی نے اپنا قول اس کے بعد ص ۳۳۰ ج ۲ پر بعد ذکر خلاصۃ قول جماعۃ الاولی بلفظ قالوا فقد امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذہ الآثار ان لا یقدم علی الطاعون وذالک للخوف منہ اھ کے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

قیل لھم ما فی ھذا دلیل علی ما ذکرتم لانہ لو کان امرہ بترک القدوم للخوف منہ لکان یطلق لاھل الموضع الذی وقع الطاعون فیہ ایضاً الخروج منہ لان الخوف علیھم منہ کالخوف علی غیرھم فلما منع اھل الموضع الذی وقع

فيه الطاعون من الخروج منه ثبت ان المعنى الذى من اجله منعهم من القدوم غير المعنى الذى ذهبتم اليه۔ فان قال قائل فما معنى ذالك المعنى قيل له هو عندنا والله اعلم على ان لا يقدم عليه رجل فيصيبه بتقدير الله عز وجل عليه ان يصيبه فيقول لولا انى قدمت هذه الارض ما اصابنى هذا الوجع ولعله لو اقام فى الموضع الذى خرج منه لاصابه فامر ان لا يقدمها خوفا من هذا القول وكذالك امر ان لا يخرج من الارض التى نزل بها لئلا يسلم فيقول لو اقمت فى تلك الارض لاصابنى ما اصاب اهلها ولعله لو كان اقام بها ما اصاب به من ذالك شئ فأمر بترك القدوم على الطاعون للمعنى الذى وصفنا وبترك الخروج عنه للمعنى الذى ذكرنا اھ

یہ ہے طحاویؒ کا مذہب جو بعینہٖ درمختار میں مذکور ہے اور اس میں یہ بات قابل تنبیہ ہے کہ فان علم ان کل شئ بقدر اللہ تعالٰی سے مجرد اعتقاد تقدیر مراد نہیں بلکہ غلبہ استحضار اعتقاد مراد ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ نفی علم بالقدر سے نہیں کیا گیا بلکہ ان کان عندہٗ انہ لو خرج نجا ولو دخل ابتلی بہ۔ سے کیا گیا ہے جو اعتقاد تقدیر کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے کما لا یخفی پس لازم ہے کہ اس کے مقابل میں علم بالقدر سے وہ درجہ مراد ہو جو اس درجہ سے اعلٰی ہو۔ وهو ما قلنا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک قدوم وخروج من الطاعون کی اجازت صرف ان لوگوں کو ہے جن کے نزدیک موضع طاعون میں رہنا اور نہ رہنا مساوی ہو، خروج کو نافع ومنجی اور قیام کو مضر ومہلک نہ سمجھتا ہو، اور اس کا نام فرار نہیں۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ حنفیہ فرار کی اجازت نہیں دیتے بلکہ صرف راسخ الاعتقاد کو دخول وخروج کی اجازت دیتے ہیں اور جب یہ ہے تو بتلائیں کہ ان لوگوں کا فرار حنفیہ کے نزدیک کیونکر جائز ہو سکتا ہے جن کی پریشانی کا ذکر خود سوال میں ہے کہ باوجود علماء کی روک تھام کے ہزار میں سے ایک دو کا بھی فرار عن الطاعون سے بچنا دشوار ہے کیونکہ

یہ لوگ یقیناً فرار کو نافع ومنجی اور قیام کو مضر ومہلک سمجھتے ہیں اور ایسی حالت میں یقیناً حنفیہ فرار کو حرام کہیں گے بلکہ جن صحابہ نے فرار کو جائز کہا ہے وہ بھی اس اعتقاد کے ساتھ فرار کو منع کرتے ہیں۔ چنانچہ سائل نے ابوموسیٰ اشعریؓ کا نام مجوزین فرار میں نووی سے نقل کیا ہے۔ ان کا قول طحاوی میں بسند صحیح اس طرح مذکور ہے۔

ان ھذا الطاعون قد وقع باھلی فمن شاء منکم ان یتنزہ فلیتنزہ واحذروا اثنتین ان یقول قائل خرج خارج فسلم وجلس جالس فاصیب لوکنت خرجت لسلمت کما سلم آل فلان اولوکنت جلست لاصبت کما اصیب آل فلان اھ (ج۲ ص ۳۷۶)

اب غور کیجئے کہ آج کل معدودے چند اقرباء کے کون ایسا ہے جو فرار من الطاعون میں اس امر سے بچ سکے جس سے ابوموسیٰ اشعریؓ منع فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فرار کو نافع ومنجی اور قیام کو مضر ومہلک سمجھنے کے ساتھ مجوزین فرار بھی اس سے منع کرتے ہیں۔ یعنی جبکہ فرار کو نافع اور قیام کو مضر درجہ لزوم میں سمجھے اور آج کل عموماً لوگوں کا یہی خیال ہے کیونکہ ڈاکٹروں اور سائنس دانوں نے تعدیہ طاعون بدرجہ لزوم کا اعتقاد عام طور پر لوگوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے اور یہ اعتقاد باطل ہے۔

بحدیث لاعدوی ولا طیرۃ وھو حدیث صحیح من روایۃ یزید بن السائب وانس ابن مالک اخرجہ مسلم عنھما وبروایۃ ابی ھریرۃ اخرجہ مسلم ایضاً ولکن اختلف فیہ علیہ کذا فی العزیزی (ج ۳ / ۴۳۹) والطحاوی (ج ۲ / ۳۷۵)

رہا اشباہ والنظائر کا عبارت بزازیہ یہ " فیفید جواز الفرار من الطاعون " لکھنا اول تو یہ کوئی روایت صاحب مذہب سے نہیں بلکہ محض استنباط ہے اور استنباط اشباہ کے ہم مقلد نہیں جبکہ مذہب کے خلاف ہو۔" والمذھب فی الطاعون ماذکرہ الطحاوی ومثلہ فی الدر" اور ظاہر یہ ہے کہ صاحب اشباہ کی مراد فرار سے فرارِ مقید بالقید الذی ذکرہ فی الدر والطحاوی ہے، کیونکہ فرار مطلق تو کسی

کے نزدیک بھی جائز نہیں ۔ صاحب اشباہ کے کلام میں مطلق کا مراد لینا صحیح نہیں ۔

رہا حضرت عمرؓ کا واقعہ تو طحاوی نے دو واقعے بیان کئے ہیں ۔ ایک سرغ سے واپس لوٹ جانے کا اس میں تو فرار من الطاعون ہرگز نہ تھا کیونکہ طاعون شام میں تھا سرغ میں نہ تھا ۔ یہاں سے رجوع کو امتناع من الدخول علی موضع الطاعون کہہ سکتے ہیں ۔ فرار یا خروج من موضع الطاعون نہیں کہہ سکتے ۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا سرغ سے رجوع حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی اس حدیث کے سننے کے بعد ہوا ۔

قال ان عندی من ھذا علما انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا سمعتم بہ بارض فلا تقدموا علیہ واذا وقع بارض وانتم بھا فلا تخرجوا فرارا منہ قال فحمد اللہ عمر وانصرف (ج ۲/ ۳۷۵) وسندہ صحیح ۔

اگر حضرت عمرؓ کا یہ رجوع خروج من موضع الطاعون تھا تو یہ تو حدیث کے خلاف ہوتا اور پھر حمد کے ساتھ انصراف کے کیا معنیٰ بلکہ یقیناً قدوم علی الطاعون سے امتناع تھا ۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ کو اردن سے جابیہ کی طرف منتقل ہونے کا امر کیا تھا اور بظاہر یہ واقعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث معلوم کر لینے کے بعد حضرت عمرؓ سے صادر ہوا کیونکہ ظہور حدیث کے وقت حضرت ابو عبیدہؓ حیات تھے اور حضرت عمرؓ شام کی طرف جا رہے تھے اور اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ سے حضرت عمرؓ کی گفتگو زبانی ہوئی تھی اور اس دوسرے واقعہ میں حضرت عمرؓ نے خط لکھا ہے اور خط کی تعمیل سے پہلے حضرت ابو عبیدہؓ مطعون ہو کر شہید ہو گئے کما ذکرہ الطحاوی بسند حسن (ج ۲/ ۳۷۶)

پس یقیناً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث کو سن کر پھر بھی اس کے خلاف حکم دیا ۔ پس لازم ہے کہ اس واقعہ کی تاویل اس حدیث کے خلاف نہ کی جائے ۔ اور اس کی چند وجوہ ہیں ۔

(۱) ممکن ہے حضرت عمرؓ کو یہ خبر پہنچی ہو کہ اردن میں طاعون شروع ہو گیا ہے اور لشکر شہر سے فاصلہ پر تھا خود لشکر میں طاعون نہ آیا تھا ۔ حضرت عمرؓ نے لشکر

کے وہاں سے منتقل کرنے کا حکم دیا اور یہ فرار یا خروج من موضع الطاعون نہیں۔

(۲) ممکن ہے حضرت عمرؓ نے حدیث میں اذا کنتم بارض سے بلد یا قریہ غرض ارض عمران" مراد لی ہو وھو الظاہر اور لشکر شہر سے باہر جنگل میں رہتا ہے اور جنگل میں اگر طاعون شروع ہو جائے تو جنگل کے آدمیوں کو وہاں سے منتقل ہو جانا جائز ہے۔ کیونکہ جنگل میں علاج معالجہ تیمار داری وغیرہ کا انتظام دشوار ہوتا ہے۔ نیز جنگل والوں کا قیام کسی جگہ مستقل نہیں ہوتا۔ ان کے خروج کو فرار نہیں کہہ سکتے بلکہ انتقال من موضع الی موضع کہا جائے گا۔ فرار یہ ہے کہ انسان اپنے مستقر سے بلا وجہ چلا جائے۔

رہا یہ کہ فقہی روایات اور آثار مطلق ہیں جو فنارِ شہر کو بھی شامل ہیں الخ اس میں کلام ہے اس لئے کہ احادیث و فقہ میں ارض و بلد کا لفظ وارد ہے۔ اب اگر اس سے گھر مراد ہے تو چاہیئے کہ طاعون کے زمانہ میں گھر سے باہر نکلنا بھی جائز نہ ہو۔ اور اس کا کوئی قائل نہیں بلکہ ارض و بلد سے مراد وہ جائے آبادی ہے جہاں طاعون آیا ہے اور ملحقات آبادی کو فقہار کرام نے بہت سے احکام میں اس آبادی کے حکم میں سمجھا ہے کجواز الجمعۃ فی فناء المصر وکذا العیدین ونحوھما۔ پس اگر کوئی یوں کہے کہ فناء بلد اسی کے حکم میں ہے اس لئے فنار میں نکل آنا خروج من ارض الطاعون یا فرار من بلد الطاعون نہیں تو یہ قول فقہ سے بعید نہیں۔

رہا یہ کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو شام سے مدینہ بلایا تھا۔ الخ۔ سو اس واقعہ کا جو محمل ہے جس کو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اس کے مصداق کو ہندوستان سے مکہ بھی چلے جانے کی اجازت ہے مثلاً علاقہ حیدر آباد میں طاعون شروع ہوا۔ مگر سائل کے شہر یا قصبہ میں ابھی تک نہیں آیا تو سائل کو جائز ہے کہ وہ اسی وقت علاقہ حیدر آباد کو چھوڑ کر مکہ یا مدینہ چلا جائے کیونکہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو ہمارے نزدیک ایسی ہی حالت میں بلایا تھا جبکہ ان کو صرف علاقہ میں ظہور طاعون کی خبر ملی تھی خود معسکر میں دخول طاعون کی خبر نہ ہوئی تھی ورنہ وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث کے خلاف ہرگز نہ کرتے۔ ومن ادعی غیر ذالک فلیأت ببرھان۔ یا اگر لشکر میں دخول طاعون کی اطلاع بھی مل گئی تھی تو لشکر مغانہ و

صحرا میں مقیم ہوگا اور اہل صحرا کو جو قریہ اور بلد کے اندر مقیم نہ ہوں انتقال وارتحال جائز ہے لما ذکرناہٗ مفصلاً کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرار من الطاعون کو ہرگز جائز نہ سمجھتے تھے۔ کما روی الطحاوی، حدثنا ابن ابی داؤد ثنا علی بن عباس الحمصی ثنا شعیب بن ابی حمزہ عن زید بن اسلم عن ابیہ قال قال عمر بن الخطاب اللّٰھم ان الناس ینحلون ثلاث خصال وانا ابرأ الیک منھنّ زعموا انی فررت من الطاعون وانا ابرأ الیک من ذالک الحدیث۔ (ج ۲ ص ۳۸۰)

یہ تو تفصیلی جواب تھا اور اجمالی جواب مقدمات مذکورہ کی روشنی میں یہ ہے کہ:

(۱) ساری پریشانیوں کے انتظام سے مقدم حفاظت اعتقاد ہے اور فرار من الطاعون کے جائز کرنے میں حفاظت اعتقاد فوت ہوتی ہے لوگ طاعون کو متعدی اور مؤثر بالذات سمجھ لیں گے اور شریعت اس اعتقاد کا ابطال چاہتی ہے اور حضرات صحابہؓ نے جن کو فرار کی اجازت دی ہے ان پر ان کو اعتماد تھا کہ وہ ماھم بضارین بہ من احد الا باذن اللّٰہ پر جمے ہوئے ہیں اور درحقیقت ایسے راسخ الاعتقاد صحیح الیقین کو ہم بھی اجازت دیتے ہیں کما قالہ الحنفیۃ لیکن دوسرے صحابہ نے سدًّا للذریعہ ایسے اقویاء کے لئے بھی خروج من الطاعون کو گوارا نہیں کیا اور یہ سمجھا کہ گو یہ اس وقت راسخ الاعتقاد ہیں مگر فرار وخروج کے بعد ممکن ہے کہ ایسے واقعات رونما ہوں جن سے اعتقاد متزلزل ہوجائیں اور زمانہ موجودہ کے مسلمانوں کا رسوخ اعتقاد جیسا ہے معلوم ہے۔ ان کے لئے جواز فرار کی گنجائش کسی قول پر نہیں معلوم ہوتی اور ابوداؤد کی حدیثوں سے استنباط صحیح نہیں کیونکہ ان کا مطلب تو یہ ہے کہ جو جگہ آب وہوا کے لحاظ سے خراب ہو اس کو چھوڑ دو یعنی اس کے بجائے دوسری جگہ کو وطن بنالو۔ یہ مطلب نہیں کہ بیماری کے زمانہ میں بھاگ جایا کرو اس کے بعد پھر واپس آرہا کرو پس ان محمل تداوی وتدبیر بتبدیل وطن ہے اس کو فرار سے کچھ مس نہیں، خصوصاً فرار عن الطاعون سے کیونکہ طاعون کا منشاء شارع کے نزدیک خرابی آب وہوا نہیں بلکہ وخز الجن ہے۔ کما صرح بہ غیر ما حدیث۔ علاوہ ازیں جبکہ فرار عن الطاعون میں نہی صریح بلفظ خاص وارد ہے تو عمومات

احادیث اخریٰ سے اس کا معارضہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ فان الخاص قاض علی العام والمفسر علی المجمل فافھم۔

علاوہ ازیں فرار اغنیاء کے بعد غرباء کی جو فرار پر قادر نہیں ہوتے شہر میں جیسی بری گت بنتی ہے اس کو اسلام کیوں کر گوارہ کر سکتا ہے بلکہ بعض ظالم تو اپنی اولاد واقرباء کو بھی مبتلاءِ طاعون دیکھ کر ان کو چھوڑ کر شہر سے بھاگ گئے اور دوسروں نے ان کی تجہیز وتکفین کی۔ پس مقدمہ (۲ و ۳ و ۴) کی بناء پر بھی فرار من الطاعون جائز نہیں کیونکہ یہ مفضی الی ضعف الاعتقاد وارتکاب المعاصی کترک التعاضد بالمسلمین واختیار التقاطع بالاقربین ہے اور بناء بر مقدمہ (۵) غرض یہ ہے کہ اس مسئلہ میں جو اختلاف ہے۔ وہ محض نزاع لفظی ہے۔ حنفیہ نے ان کے اقوال میں تاویل کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ راسخ الاعتقاد کو جس کے نزدیک فرار وقرار بدرجہ مساوی ہے دخول وخروج جائز ہے اور ضعیف الاعتقاد کو یا جس پر خروج سے ضعف اعتقاد کا اندیشہ ہو جائز نہیں۔ اگر کوئی اس کو خلاف حقیقت سمجھے تو ہم کہیں گے کہ مجوّزین فرار کے پاس کوئی دلیل نہیں ان کے استدلالات سب ضعیف ہیں۔ چنانچہ طحاوی نے سب کا جواب نہایت خوبی سے دے دیا ہے اور مانعین فرار کے پاس ایک تو حدیث مرفوع جابرؓ کی ہے۔ الفار من الطاعون کالفار من الزحف، ذکرہ الحافظ فی الفتح وحسنہ اخرجہ وعبد بن حمید۔

دوسری حدیث عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی مرفوع ہے جس کو طحاوی نے حضرت سعد بن ابی وقاص واسامۃ بن زید وعکرمۃ بن خالد مخزومی رضی اللہ عنہم سے بطرق عدیدہ روایت کیا ہے اور یہ دونوں حدیثیں قولی مرفوع ہیں جن میں سے ایک میں مقام طاعون سے خروج کو منع کیا گیا ہے۔ دوسری میں اس کو فرار من الزحف کے مثل کہا گیا ہے جو اکبر الکبائر ہے۔ ایسی حالت میں اس حدیث سے بالکل قطع نظر کر لینا اور محض لفظ اختلاف کو کتابوں میں دیکھ کر جواز کی گنجائش نکال لینا مؤمن خائف کا کام نہیں، بلکہ لازم ہے کہ مجوّزین کے قول کو یا اس پر محمول کیا جائے کہ ان کو احادیث نہیں پہنچیں، یا انہوں نے راسخ الاعتقاد لوگوں کو اجازت دی تھی۔

امید ہے کہ اس تحریر سے سب اشکالات حل ہو گئے ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ

اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حررہ الاحقر
ظفر احمد عفا عنہ از خانقاہ امدادیہ
۶ رمضان ۱۳۴۶ھ

تتمہ: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مسائل طاعون کے متعلق ایک مبسوط تقریر فتح الباری میں درج فرمائی ہے جو غایت درجہ مفید ومستحسن ہے۔ اس کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتا ہوں۔

تحقیق معنی الطاعون واسبابہ

قال الحافظ فی الفتح وقال جماعة من الاطباء منهم ابو علی سینا الطاعون مادة سمّیة تحدث ورمًا قتالًا، یحدث فی المواضع الرخوہ والمغابن من البدن واغلب ماتکون تحت الابط وخلف الاذن او عند الارنبة قال وسببہٗ دم ردی مائل الی العفونة والفساد ویستحیل الی جوھر سمی یفسد العضو ویغیر مایلیہ ویودّی الی القلب کیفیة ردیّة فیحدث القئ والغشیان والغشی والخفقان وھو لرداءتہ لا یقبل من الاعضاء الّا ماکان اضعف بالطبع، اردأہٗ ما یقع فی الاعضاء الرئیسة والاسود منه قلّ من یسلم فیه واسلمہٗ الاحمر ثم الاصغر والطورعین تکثر عند الوباء فی البلاد الوبئة ومن ثم اطلق علی الطاعون وباء واما الوباء فھو فساد جوھر الھواء الّذی ھو مادة الروح ومددہ۔

قلت فھذا مابلغنا من کلام اھل اللغة واھل الفقه والاطباء فی تعریفہٖ والحاصل ان حقیقتہٗ ورم ینشاء عن ھیجان الدم وانصباب الدم الی عضو فیفسدہٗ وان غیر ذالك

ع. قلت وقد ذکر کلام اھل اللغة والفقه قبل ۱۲ ظ

من الامراض العامّة الناشئة عن فساد الهواء يسمّى طاعوناً بطريق المجاز لاشتراكهما فى عموم المرض به او كثرة الموت والدليل على ان الطاعون يغاير الوباء ماسيأتى فى رابع احاديث الباب ان الطاعون لا يدخل المدينة وقد سبق فى حديث عائشة قدمنا الى المدينة وهى او بأ ارض الله وفيه قول بلال اخرجونا الى ارض الوباء وما سبق فى الجنائز فى حديث ابى الاسود قدمت المدينة فى خلافة عمر وهم يموتون موتا ذريعا وما سبق فى حديث العرينيين انهم استوخموا المدينة وفى لفظ انهم قالوا انها ارض وبئة فكل ذلك يدل على ان الوباء كان موجودا بالمدينة وقد صرح الحديث الاوّل بانهٗ لا يدخلها فدلّ على ان الوباء غير الطاعون وان من اطلق على كل وباء طاعونا فبطريق المجاز والذى يفترق به الطاعون من الوباء اصل الطاعون الذى لم يتعرض له الاطباء والاكثر من تكلم فى تعريف الطاعون وهو كونه من طعن الجن ولا يخالف ذلك ما قال الاطباء من كون الطاعون ينشاء من هيجان الدّم او انصبابه لانه يجوز ان يكون ذالك يحدث عن الطعنة الباطنة فتحدث منها المادة السمية ويهيج الدم بسببها او ينصب وانما لم يتعرض الاطباء لكونه من طعن الجن لانهٗ امر لا يدركه العقل وانما يعرف من الشارع فتكلموا فى ذالك على ما اقتضتهٗ قواعدهم۔

المؤيّدات لكون الطاعون من وخز الجن	ومما يؤيد ان الطاعون انّما يكون من طعن الجنّ وقوعه غالبًا فى اعدل الفصول۔ و[۲] فى اصح البلاد هواء

واطيبها ماء ولانه لو كان [۳] بسبب فساد الهواء لدام فى الارض

لان الهواء یفسد تارۃ ویصح اخری وھذا یذھب احیانا ویجئ احیانا علی غیر قیاس ولا تجربة فربما جاء سنة علی سنة وربما ابطأ سنین وبانه لوکان کذالک لعم الناس والحیوان والموجود بالمشاھدۃ انه یصیب الکثیر ولا یصیب من ھم بجانبھم مما ھو فی مثل مزاجھم ولو کان کذالک لعم جمیع البدن وھذا یختص بموضع من الجسد ولا یتجاوزہ ولان فساد الھواء یقتضی تغییر الاخلاط وکثرۃ الاسقام وھذا فی الغالب یقتل بلا مرض او قال شیخنا ولان فساد الھواء لا یختص فی بلدۃ واحدۃ بمحلة منھا ولا یرد من محلة الی محلة المشاھد فی الطاعون دورانه وجولانه من مکان الی مکان ومن محلة منھا الی محلة حتی ان فی محلة حریق من الطاعون کحریق السعیر ومحلة اخری مطمئنة لا تشعر لشئ من ذالک (ثم یمشی وینتقل ھکذا من مکان إلی مکان کان له جولة بجولة العسکری من الأعداء) ۱۲ فدل علی انه من طعن الجن کما ثبت فی الاحادیث.

تحقیق حدیث الطاعون من وخز الجن

منھا حدیث ابی موسیٰ فناء امتی بالطعن والطاعون قیل یارسول الله ھذا طعن قد عرفناہ فما الطاعون قال وخز اعداء کم من الجن وکل فی شھادۃ اخرجه احمد ثم ذکر له الحافظ طرقا عدیدۃ وقال فالحدیث صحیح بھذا الاعتبار وقد صححه ابن خزیمة والحاکم واخرجاہ واحمد والطبرانی من وجه آخر عن ابی بکر بن ابی موسیٰ الاشعری قال سئلت عنه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال ھو وخز اعدائکم من الجن وھو لکم شھادۃ ورجاله رجال الصحیح الا ابا بلج واسمه یحی وثقه ابن معین والنسائی وجماعة

وضعفہ جماعۃ بسبب التشیع وذالک لا یقدح فی قبول روایۃ
عند الجمہور ولہ طریق ثالثۃ اخرجہا الطبرانی ورجالہ رجال
الصحیح الا کریباً وا باہ وکریب وثقہ ابن حبان . ولہ حدیث
آخر فی الطاعون اخرجہ احمد وصححہ الحاکم من روایۃ عاصم
الاحول عن کریب بن الحرث عن ابی بردۃ بن قیس اخی ابی
موسیٰ الاشعری رفعہ اللّٰھم اجعل فناء امتی قتلاً فی سبیلک
بالطعن والطاعون قال العلماء اراد صلی اللہ علیہ وسلم ان
یحصل لامتہ ارفع انواع الشہادۃ وہو القتل فی سبیل اللہ
بایدی اعدائہم اما من الانس واما من الجن (تنبیہ) یقع
فی الالسنۃ بلفظ وخز اخوانکم ولم ارہ بلفظ اخوانکم بعد
التتبع الطویل البالغ فی شئ من طرق الحدیث اھ (ج ۱۰/۱۰۱، ۱۰۲)

تحقیق الفرار عن الطاعون والقدوم ببلدۃ ہولہا

اخرج البخاری فی صحیحہ عن عبد الرحمٰن بن عوف سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم یقول اذا سمعتم بالطاعون بارض فلا تقدموا
علیہ واذا وقع بارض وانتم بہا فلا تخرجوا فراراً منہ اھ
قال الحافظ وقد اخرج الطحاوی بسند صحیح عن انس ان عمرؓ اتی
الشام فاستقبلہ ابو طلحۃ وابو عبیدۃ فقال یا امیر المؤمنین
ان معک وجوہ الصحابۃ وخیارہم وانا ترکنا بعدنا مثل حریق
النار فارجع العام فرجع وفی ہذا الحدیث جواز رجوع من اراد

ف قلت وبہذا زال ما یختلج فی صدور بعض العوام لاجل موت
المسلمین بالطاعون اکثر من موت المشرکین بہ فلیعلموا بان
ذالک لطلب نبیہم صلی اللہ علیہ وسلم فناءہم بالطعن والطاعون
لکن یفوزوا بدرجات الشہادۃ العالیۃ ۱۲ جامع .

دخول بلدة فنعلم ان بها الطاعون وان ذالك ليس من
الطيرة وانّما هی من منع الالقاء الی التهلکة او سدّ الذریعة
لئلّا یعتقد من یدخل الی الارض التّی وقع بها ان لو دخلها
وطعن العدوی المنهی عنه وقد زعم قوم ان النهی عن
ذلك انما هو للتنزیه وانه یجوز قدام علیه لمن قوی
توکله وصحّ یقینهٗ وتمسکوا بما جاء عمرؓ انهٗ ندم علی رجوعه
من سرغ[ا] کما اخرجه ابن ابی شیبة بسند جید عن القاسم بن
محمد عن ابن عمر قال جئت عمر حین قدم فوجدتهٗ قائلاً فی
خبائہ فانتظرتهٗ فی ظل الخباء فسمعتهٗ یقول حین تضرع
اللّٰهمّ اغفر لی رجوعی من سرغ واخرج الطحاوی بسند صحیح
عن زید بن اسلم عن ابیه قال قال عمر اللّٰهم ان الناس
قد نحلونی ثلثاً أنا ابرأ الیك منهن زعموا انّی فررت من الطاعون
وأنا ابرأ الیك من ذالك وذکر الطلاءم لمکس وقد ورد من
غیر عمر التصریح بالعمل فی ذالك بمحض التوکل فاخرج ابن
خزیمة بسند صحیح عن هشام بن عروة عن ابیه ان الزبیر
بن العوام خرج غازیًا نحو مصر فکتب الیه امراء مصر ان الطاعون
قد وقع فقال انما خرجنا للطعن والطاعون فدخلها فلقی
طعنا فی جبهته ثم سلم وفی الحدیث ایضًا منع من وقع
الطاعون ببلد هو فیها من الخروج منها وقد اختلف
الصحابة فی ذالك وقد اخرج احمد بسند صحیح الی ابی منیب
ان عمرو بن العاص قال فی الطاعون ان هذا رجز مثل
السیل من تنکبه اخطاءهٗ ومثل النار من اقام احرقتهٗ
فقال شرجیل بن حسنة ان هذا رحمة ربکم ودعوة

[ا] موضع بالشام ۱۲

نبیکم و قبض الصالحین قبلکم و فی معظم الطرق ان عمرو بن
العاص صدق شرجیل و غیرہ علیٰ ذالک ونقل عیاض جواز
الخروج من الارض التی یقع بہا الطاعون عن جماعۃ من الصحابۃ
منھم ابو موسیٰ الاشعری والمغیرۃ بن شعبۃ ومن التابعین
منھم الاسود بن ہلال ومسروق ومنھم من قال النھی
فیہ للتنزیہ فیکرہ ولا یحرم وخالفھم جماعۃ فقالوا یحرم
الخروج منھا لظاھر النھی الثابت فی الاحادیث الماضیۃ وھذا
ھو الراجح عند الشافعیۃ وغیرھم (کالحنفیۃ ۱۲) ویؤیدہٗ ثبوت
الوعید علی ذالک فاخرج احمد وابن خزیمۃ من حدیث
عائشۃ فی اثناء حدیث بسند حسن قلت یا رسول اللّٰہ فما الطاعون
قال غدّۃ کغدّۃ الابل المقیم فیھا کالشھید والفار منھا
کالفار من الزحف ولہٗ شاھد من حدیث جابر رفعہ الفار
من الطاعون کالفار من الزحف والصابر فیہ کالصابر فی الزحف
اخرجہ احمد ایضًا وابن خزیمۃ وسندہ صالح للمتابعات وقال
الطحاوی والذی یظھر واللّٰہ اعلم ان حکمۃ النھی عن القدوم
علیہ لئلّا یصیب من قدم علیہ بتقدیر اللّٰہ فیقول لولا انی قدمت
ھذہ الارض لما اصابنی ولعلہٗ لو اقام فی الموضع الذی کان فیہ
لاصابہ فامران لا یقدم علیہ حسما للمادۃ ونھی من وقع وھو
بھا ان یخرج من الارض التی نزل بھا لئلا یسلم فیقول مثلاً
لو اقمت فی تلک الارض لاصابنی ما اصاب اھلھا ولعلہ لو کان
اقام بھا ما اصابہ من ذالک شئ اھ ویؤیدہ ما اخرجہ الھیثم
بن کلیب والطحاوی والبیھقی بسند حسن عن ابی موسیٰ انہٗ قال
ان ھذا الطاعون قد وقع فمن اراد ان یتنزہ عنہ فلیفعل
واحذروا اثنتین ان یقول قائل خرج خارج فسلّم وجلس
جالس فاصیب لکن ابو موسیٰ حمل النھی علی من قصد الفرار محضًا

ولا شک ان الصور ثلث من خرج یقصد الفرار محضا فهذا
یتناوله النهی لامحالة ومن خرج لحاجة متمحضة لا لقصد
الفرار اصلا و یتصور ذالک فیمن تھیئا للرحیل من بلد کان
به الی بلد اقامته مثلا فاتفق وقوع الطاعون فی اثناء تجهیزه
فهذا لم یقصد الفرار اصلا فلا یدخل فی النهی و الثالث من
عرضت له حاجة فاراد الخروج الیها وانضم الی ذالک انه
قصد الراحة من الاقامة فی البلد التی وقع بها الطاعون (ولو لم
یقصد الراحة بل اراد الرجوع الی هذا الموضع فهو من اهل
الصورة الثابتة کما لا یخفی ۱۲ جامع) فهذا محل النزاع فمن
منع نظر الی صورة الفرار فی الجملة ومن اجاز نظر الی انه
مستثنیٰ من عموم الخروج فرارا لانه لم یتمحض للفرار وانما
هو لقصد التداوی وعلی ذالک یحمل ما وقع فی اثر ابی موسیٰ المذکور
ان عمر کتب الی ابی عبیده ان لی الیک حاجة فلا تضع کتابی
من یدک حتی تقبل الیّ فکتب الیه انی قد عرفت حاجتک
وانی فی جند من المسلمین لا اجد بنفسی رغبة عنهم فکتب الیه
اما بعد فانک نزلت بالمسلمین ارضا عمیقة فارفعهم الی ارض
نزهة فدعا ابو عبیدة فقال اخرج فارتد للمسلمین معزلا حتی انتقل
بهم فذکر القصه، وانه نزل بالناس[۲] فی مکان آخر فارتفع الطاعون

[۲] فیه دلیل جواز ما افتی به مشائخنا من خروج اهل المصر الی الفناء لا
لتقلاح الهواء فان ذالک لیس من الفرار بل من باب التداوی ۱۲ جامع

[۱] قلت فیه تصریح بان الفرار لقصد الفرار لیس بمختلف فیه بین العلماء ولا بین الصحابة
بل هو ممنوع وحرام اتفاقا وانما النزاع فی الخروج لا بقصد الفرار بل لحاجة اخریٰ
والجمهور فیه علی المنع واجازت الحنفیة الخروج فیها لمن کان الخروج
والقرار عنده سواء ای کان راسخ الاعتقاد بقوله تعالیٰ وما هم بضارین
به من احد الا باذن الله فافهم ۱۲ ظ

وقوله عميقة اى قريبة من المياه والنزور وذالك ممايفسد
غالبابه الهواء لفساد المياه والنزهة الفسيحة البعيدة عن
الوخم فهذا يدلّ على ان عمر رأى ان النهى عن الخروج انما
هو لمن تقصد الفرار متمحضا وقد كان امر عمر لأبى عبيدة
بذالك بعد سماعها للحديث المذكور من عبدالرحمن بن
عوف فتاول فيه عمر ما تاول وقال الخطابى ليس فى هذا
اثبات العدوى وانما هو من باب التداوى فان استقلاح
الاهوية من انفع الاشياء فى تصحيح البدن وبالعكس وقد ذكر
العلماء فى النهى عن الخروج حكما منهما ان لو شرع الخروج
فخروج الاقوياء لكان فى ذالك كسر قلوب الضعفاء وقد قالوا
ان حكمة الوعيد فى الفرار من الزحف لما فيه من كسر قلب
من لم يفروا وحال الرعب عليهم ومنها ما ذكره بعض الاطباءُ
ان المكان الذى يقع به الوباء تتكيف امزجة اهله بهواء
تلك البقعة وتألفها وتصير لهم كالاهوية الصحيحة
بغيرهم فلو انتقلوا الى الاماكن الصحيحة لم توافقهم
بل ربّما اذا استنشقوا هواءها استصحب معه الى القلب من
الابخرة الردئية التى حصل تكيف بدنه بها ما فسدته فمنع
من الخروج بهذه النكة وقال الشيخ ابن دقيق العيد الذى
يترجح عندى فى الجمع بينهما ان فى الاقدام عليه تعريض
النفس البلاء ولعلّها لا تصير عليه وربما كان فيه ضرب
من الدعوىٰ لمقام الصبر والتوكل فمنع ذالك حذرا من اغترار
النفس ودعواها ما لا تثبت عليه عند الاختيار واما الفرار فقد
يكون داخلاً فى التوغل فى الاسباب بصورة من يحاول النجاة بما
قدر عليه فامرنا الشارع بترك التكلف فى الحالتين ومن هذه المادة
قوله صلى الله عليه وسلم لا تتمنوا لقاء العدوّ واذا لقيتموهم

فاصبروا فامر بترك التمنی لما فیہ من التعرض للبلاء وخوف اغترار النفس اذ لا یؤمن غدرھا عند الوقوع ثم امرھم بالصبر عند الوقوع تسلیماً لامر اللہ تعالٰی اھ (ص ۱۶۰ ج ۱۰)

ترجمہ[1]: حافظ رحمہ اللہ تعالٰی نے فتح الباری میں فرمایا ہے کہ اطباء کی ایک جماعت جس میں ابو علی سینا بھی ہیں یہ کہتی ہے کہ طاعون ایک زہریلا مادہ ہے جو انتہائی مہلک ورم پیدا کرتا ہے۔ یہ مادہ بدن کے نازک اور پوشیدہ حصوں میں پیدا ہوتا ہے اور اکثر بغل کے نیچے یا کان کے پیچھے یا ناک کے بانسے کے پاس ہوتا ہے۔ اس کا سبب عفونت و فساد کی طرف مائل خراب خون ہوتا ہے جو ایک زہریلے مادے میں بدل کر کسی عضو اور اس کے آس پاس کی جگہوں کو فاسد کر دیتا ہے اور دل میں ایک ایسی جی خراب کرنے والی کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے قے، متلی، بے ہوشی اور خفقان کی نوبت آجاتی ہے۔ یہ مادہ چونکہ گندا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے اعضاء کو نشانہ بناتا ہے جو طبعاً کمزور ہوتے ہیں۔ طاعون کی سب سے مہلک قسم اعضائے رئیسہ میں ہونے والا طاعون ہے اور کالے طاعون سے مریض بہت کم ہی بچ پاتا ہے۔ سب سے ہلکی قسم سرخ طاعون ہے اس کے بعد زرد طاعون۔ طاعون کی یہ قسمیں زیادہ تر وبا زدہ علاقوں میں وبا کے وقت ہوتی ہیں اسی وجہ سے طاعون کو وبا بھی کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ درحقیقت ہوا اس جوہر میں فساد واقع ہونے کو کہتے ہیں جو مادۂ روح ہے (میں کہتا ہوں) یہ وہ باتیں ہیں جو طاعون کی تعریف کے سلسلے میں اہل لغت، فقہاء اور اطباء سے ہمیں معلوم ہوئی ہیں (اہل لغت اور فقہا کی عبارتیں پیچھے ذکر کی جا چکی ہیں) اور حاصل ان سب کا یہ ہے کہ طاعون کی حقیقت خون کے دباؤ اور عضو کی طرف اس کے بہاؤ سے پیدا ہونے والا ورم ہے جو اس عضو کو فاسد کر دیتا ہے اگرچہ اس کے علاوہ ہوا کے فساد کی وجہ سے پیدا ہونے والے عام

---

[1] قدیم مسوّدہ میں صرف عربی عبارات نقل کی گئی تھیں اور ایک نوٹ تحریر تھا کہ "وقت طباعت ان عبارات کا ترجمہ کرا لیا جائے" لہٰذا ان عبارات کا ترجمہ کر کے شامل اشاعت کر لیا گیا ہے۔ افتخار

امراض کو بھی مجازاً طاعون کہہ دیا جاتا ہے اس لئے کہ طاعون اور آب وہوا کے فساد دونوں ہی صورتوں میں مرض عام ہوتا ہے اور کثرت سے موت واقع ہوتی ہے طاعون اور وبا الگ الگ چیزیں ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ اس باب کی چوتھی حدیث میں آرہا ہے کہ طاعون مدینہ میں داخل نہیں ہوگا حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں یہ بات گذر چکی ہے کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہ سب سے زیادہ وبازدہ علاقہ تھا اسی سلسلہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کفار نے ہمیں وبازدہ زمین میں بسنے پر مجبور کردیا۔ اسی طرح جنائز میں ابوالاسود کی حدیث گذر چکی ہے کہ میں حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں مدینہ آیا تو وہاں متواتر اموات ہورہی تھیں اور عرنیین کی حدیث میں بھی گذرا ہے کہ انہیں مدینہ کی آب وہوا موافق نہیں آئی اس کا بھی ذکر آیا ہے کہ مدینہ کی سرزمین وبازدہ تھی۔ یہ تمام باتیں اس پر شاہد ہیں کہ مدینہ میں وبا موجود تھی حالانکہ پہلی حدیث یہ بتلا رہی ہے کہ طاعون مدینہ میں داخل نہیں ہوگا۔ تو یہ معلوم ہوا کہ وبا اور چیز ہے طاعون اور چیز ہے اور اگر کسی نے ہر وباء کو طاعون کہا ہے تو مجازاً کہا ہے۔ وبا اور طاعون میں فرق طاعون کی اصل حقیقت سے ہوتا ہے جس سے اطبائنے بحث نہیں کی طاعون کی تعریف کے سلسلے میں کلام کرنے والے اکثر حضرات نے اپنے قواعد کے مطابق کلام کیا ہے کہ طاعون جن کے کچوکا لگانے سے ہوتا ہے اطباء نے جو بات کہی ہے کہ طاعون خون کے دباؤ اور بہاؤ سے ہوتا ہے یہ تعریف اس کے منافی نہیں ہے اس لئے یہ ممکن ہے کہ اصل سبب تو وہی باطنی کچوکا ہو اور اس سے زہریلا مادہ اور اس زہریلے مادے سے خون کا دباؤ اور بہاؤ پیدا ہوجاتا ہو لیکن اطبائنے اس اصل سبب سے اس لئے بحث نہیں کی کہ کسی جن کے طاعون کا سبب ہونا عقل سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے یہ تو شارع ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔

طاعون کے جن کے کچوکا لگانے سے ہونے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عام طور پر اس کا وقوع انتہائی مناسب موسم (جو کسی وباء کا وقت نہیں ہوتا") اور بہترین آب وہوا والے علاقوں میں بھی ہوجاتا ہے اور پھر اگر آب وہوا کا فساد ہی اس

کا سبب ہوتا تو طاعون مسلسل کہیں نہ کہیں پایا جاتا اس لئے کہ ہوا تو بگڑتی درست ہوتی رہتی ہے حالانکہ طاعون کا ظہور کبھی کبھی ہوتا ہے اور وہ بھی اچانک بغیر کسی پیشگی اندازے یا تجربے کے چنانچہ یا تو سال بسال ہوتا ہے اور کبھی برسہا برس کا وقفہ ہوجاتا ہے نیز اگر کسی موسمی اثر کے ماتحت ہوتا تو انسان، حیوان سب اس سے متاثر ہوتے لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور ان کے آس پاس ان کے ہم مزاج لوگ متاثر نہیں ہوتے اور پھر اگر ہوا کی خرابی ہی سبب ہوتی تو پورے بدن میں بیماری پھیلنی چاہیئے تھی حالانکہ یہ جسم کے کسی ایک ہی مقام کے ساتھ مخصوص رہتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھتی مزید یہ کہ فسادِ ہوا کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جسم کے اخلاط میں تبدیلی واقع ہوتی اور کثرت سے امراض پھیلتے جبکہ طاعون عام طور پر بغیر کسی اندرونی مرض کے بھی باعث ہلاکت ہوجاتا ہے۔ (ہمارے شیخ نے فرمایا کہ وبا کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ وہ کسی شہر کے ایک محلہ کے ساتھ مخصوص رہے یا محلہ محلہ چکر لگائے جبکہ طاعون میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک محلہ سے دوسرے محلہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک محلہ تو طاعون کی شدید لپیٹ میں ہوتا ہے اور دوسرا محلہ بالکل پرسکون ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ محض موسمی اثرات سے پھیلنے والی وبا نہیں)

اس کے منتقل ہونے کا یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے گویا دشمن کی سپاہ گھومتی پھر رہی ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنات کے زیر اثر ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

اس حدیث کی تحقیق کہ طاعون جن کے کچوکا لگانے سے ہوتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ میری امت میں طعن (یعنی جہاد میں تیر لگنے) سے اور طاعون سے ہلاکت ہوگی۔ عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ یہ طعن تو سمجھ میں آگیا لیکن طاعون کیا ہے؟ فرمایا یہ تمہارے دشمن جنوں کی شرارت ہے اور دونوں سے ہونے والی موت شہادت ہے (اخرجہ احمد)

اس کے بعد حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے مختلف طرق ذکر کیے ہیں اور فرمایا ہے کہ ان طرق کے پیش نظر حدیث صحیح ہے اور ابن خزیمہ اور حاکم نے بھی اس

کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کے علاوہ احمد اور طبرانی نے بھی ایک دوسرے طریق سے اس کی تخریج کی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابوبکر نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کی بابت دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن جنوں کی شرارت ہے اور تمہارے لئے شہادت ہے۔ اس روایت کے تمام رجال سوائے ابوبلج کے معتبر ہیں۔ ابوبلج کا نام یحییٰ ہے۔ ابن معین نسائی اور ایک جماعت نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے جبکہ دوسری جماعت نے شیعہ ہونے کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن جمہور کے نزدیک صرف یہ بات روایت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ نہیں۔ اس روایت کا ایک تیسرا طریق وہ بھی ہے جو طبرانی نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کے رجال سوائے کریب اور اس کے والد کے صحیح ہیں البتہ ابن حبان نے کریب کی توثیق کی ہے۔ کریب کی طاعون کے بارے میں ایک اور حدیث ہے جس کی تخریج امام احمد بن حنبلؒ کی ہے اور حاکم نے اسے عاصم عن کریب بن الحارث عن ابی بردۃ بن قیس اخی ابی موسیٰ الاشعری رفعہ) کی سند نقل کر کے صحیح قرار دیا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اے اللہ میری امت میں قتال (جہاد) اور طاعون کے ذریعے اپنی راہ میں قتل ہو کر کمی فرمائیے۔ علماء نے فرمایا کہ اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے سب سے اعلیٰ درجہ کی شہادت طلب فرمائی ہے اور وہ یہ کہ راہ خدا میں انسان یا جنات دشمنوں کے ہاتھوں قتل کئے جائیں۔

(تنبیہ) وخز اخوانکم (تمہارے بھائیوں کی شرارت) کے الفاظ زبان زد عام ہیں لیکن بہت تلاش کے باوجود کسی بھی طریق میں مجھے یہ الفاظ نہیں مل سکے۔

طاعون سے بھاگنے یا طاعون والی جگہ جانے کی تحقیق

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوتے سنا ہے کہ جب تم یہ سنو کہ کسی جگہ طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر تم کہیں ہو اور وہاں طاعون آجائے تو اس سے بچنے کی خاطر وہاں سے نہ نکلو۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے حضرت انس کے حوالے سے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے جارہے تھے تو راستے میں حضرت ابو طلحہؓ و حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کا استقبال کیا اور عرض کی کہ امیر المومنین آپ کے ہمراہ معزز صحابہ کرام ہیں ہم پیچھے (شام میں) آگ کی مثل طاعون چھوڑ کر آرہے ہیں لہٰذا اس سال آپ وہاں تشریف نہ لے جائیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ واپس تشریف لے آئے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی علاقے میں جانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اس کو یہ علم ہو کہ وہاں طاعون ہے تو اس کے لئے لوٹ جانا جائز ہے اور یہ کوئی بدفالی نہیں بلکہ محض اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانا ہے۔ سدِّ ذریعہ ہے اس لئے کہ اگر کوئی اس طاعون والی جگہ چلا جائے اور طاعون کا شکار ہو جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ یہ اعتقاد کر بیٹھے کہ یہ مرض مجھے چھوت کی وجہ سے لگ گیا جبکہ یہ (اعتقاد) غلط ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی جگہ جانے سے روکنا احتیاطاً ہے۔ اگر کوئی مضبوط توکل اور یقین رکھتا ہو تو اس کے لئے جانا جائز ہے۔ یہ حضرات اس موقف کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرغ (شام کا وہ مقام جہاں سے حضرت لوٹ گئے تھے) سے واپسی پر افسوس کا اظہار فرمایا۔ جیسا کہ ابن ابی شیبہ نے ایک درست سند (قاسم بن محمد عن ابن عمر) کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب حضرت عمرؓ واپس تشریف لائے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو اپنے خیمے میں کچھ کہتے ہوئے سنا۔ میں خیمہ کے سائے میں رک کر انتظار کرنے لگا۔ تو میں نے سنا کہ دعا فرما رہے ہیں اے اللہ میرے "سرغ" سے واپس لوٹ آنے کو معاف فرمادے۔

اور امام طحاوی نے سندِ صحیح (عن زید بن اسلم عن ابیہ) سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ لوگ میرے بارے میں تین باتوں کا گمان کرتے ہیں میں آپ کے حضور ان سب سے براءت ظاہر کرتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں طاعون کے خوف سے بھاگ آیا ہوں میں اس سے اپنی براءت پیش کرتا ہوں۔ اسی طرح دو اور چیزیں (شبرے اور ٹیکس) کا

ذکر فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ بھی اور صحابہ کرام سے مروی ہے کہ اس سلسلے میں خالص توکل سے کام لینا چاہیئے چنانچہ ابن خزیمہ نے سندِ صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے کہ زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ مصر کی جانب جہاد پر روانہ ہوئے تو مصر کے امراء نے انہیں لکھا کہ یہاں طاعون آچکا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا ہم طعن (جہاد) اور طاعون دونوں ہی کے لئے نکلے چنانچہ مصر میں داخل ہو گئے اور ان کی پیشانی پر ایک تیر بھی لگا لیکن محفوظ رہے اور حدیث میں اس شہر سے نکلنے سے منع بھی کیا گیا ہے جہاں طاعون ہو۔ اس میں صحابہ کرام کا اختلاف اوپر گزر چکا ہے۔ حضرت امام احمد نے ابو منیب کی طرف نسبت کرتے ہوئے ایک سندِ صحیح سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے طاعون کے بارے میں فرمایا کہ یہ سیلاب کی مانند ایک عذاب ہے جو اس سے الگ ہو جائے گا یہ اس کو چھوڑ جائے گا اور آگ کی طرح ہے جو اس کے پاس کھڑا رہے گا اس کو جلا ڈالے گی اور شرجیل بن حسنہ نے کہا یہ تمہارے رب کی رحمت اور تمہارے نبی کی دعا کا اثر ہے اور تم سے پہلے اس نے بہت سے نیک لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ اکثر طرق میں یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے شرجیل وغیرہ کی اس بات کی تصدیق فرمائی اور عیاض نے طاعون والی زمین سے نکلنے کے جواز کو صحابہ کرام کی ایک جماعت جن میں ابو موسیٰ اشعری رضؓ، مغیرہ ابن شعبہ رضؓ جیسے صحابہ رضؓ ہیں اور تابعین کی ایک جماعت جس میں ابو الاسود بن ہلال اور سروق رحؒ وغیرہ ہیں، سے نقل کیا ہے اور انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس نہی کو تنزیہ پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نکلنا مکروہ ہے حرام نہیں جبکہ ایک دوسری جماعت ان کی مخالفت کرتی ہے اور طاعون والی بستی سے نکلنے کو حرام قرار دیتی ہے اس لئے کہ گزشتہ احادیث میں وارد ہونے والی نہی سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ شافعیہ وغیرہ (یعنی حنفیہ) کے نزدیک یہی رائے راجح ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ایسی جگہ سے نکلنے پر وعید آئی ہے۔

چنانچہ احمد و ابن خزیمہ نے حضرت عائشہ رضؓ کی ایک حدیث سندِ صحیح کے ساتھ نقل کی ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلعم یہ طاعون کیا ہے؟ یہ فرمایا کہ اونٹ کے غدود کی طرح ایک غدود ہوتا ہے اور جو طاعون والی جگہ میں ٹھہرا رہے

اور طاعون سے اس کی موت واقع ہوجائے وہ مثلِ شہید ہے اور جو وہاں سے بھاگ نکلے وہ ایسا ہے جیسے جہاد سے بھاگ کھڑا ہونے والا۔ اس حدیث کی تائید حضرت جابرؓ کی ایک مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاعون سے بھاگنے والا ایسا ہے جیسے میدانِ جنگ سے بھاگنے والا اور اس میں صبر کرنے والا ایسا ہے جیسے میدانِ جنگ میں جمارہنے والا۔

احمد و ابن خزیمہ نے سندِ صحیح کے ساتھ اس کے کچھ مزید متابعات بھی ذکر کئے ہیں۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ مجھے جو بات سمجھ میں آئی ہے واللہ اعلم وہ یہ ہے کہ طاعون والی جگہ جانے سے منع کرنے کی حکمت تو یہ ہے کہ جو وہاں جائے گا اگر اسے بتقدیرِ الٰہی طاعون لاحق ہوجائے تو وہ یہ کہے گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو یہ مرض نہ ہوتا حالانکہ مرض تو وہاں بھی لاحق ہوسکتا تھا جہاں پہلے تھا لہٰذا بداعتقادی کی اس جڑ ہی کو ختم کرنے کے لئے جو کہیں اور ہے اسے حکم دیا کہ وہاں نہ جائے جہاں طاعون ہے اور جو طاعون والی جگہ ہے اسے منع کردیا کہ وہاں سے نکلے نہیں اس لئے کہ اگر یہ باہر چلا گیا اور بچا رہا تو کہے گا کہ (بہت اچھا ہوا یہاں آگیا) وہاں رہتا تو مجھے بھی وہی مرض ہوجاتا جو وہاں والوں کو ہوا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ طاعون والی جگہ ہی میں رہتا اور پھر بھی مرض نہ ہوتا (اور بداعتقادی بھی پیدا نہ ہوتی ہے۔ امام طحاوی کی اس تحقیق کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو ہیثم بن کلیب، طحاوی اور بیہقی نے ابوموسیٰؓ سے سندِ صحیح کے ساتھ نقل کی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، دیکھو طاعون آچکا ہے جو اس سے بچنا چاہتا ہے بچ جائے لیکن دو باتوں سے احتیاط کرنا ایک یہ کہ کوئی یہ کہے فلاں باہر چلا گیا اس لئے محفوظ رہا یا کوئی یوں کہے کہ فلاں یہیں رہا لہٰذا مبتلا ہوگیا (اگر وہ بھی چلا جاتا تو محفوظ رہتا یا اگر یہیں رہتا تو مبتلا ہوجاتا) حضرت موسیٰؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طاعون والی جگہ جانے سے منع کرنے کا یہ مطلب لیا ہے کہ کوئی محض طاعون سے بھاگنے کی خاطر جاتے اس میں شک نہیں کہ یہاں تین صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ کوئی طاعون والی جگہ سے نکلے محض طاعون سے بچنے کی خاطر، یہ تو بہرحال حدیث کی رو سے منع ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بالکل دوسری ضرورت سے نکلے طاعون سے

چھٹکارا پانا مقصود نہ ہو مثلاً ایک شخص پہلے سے دوسری جگہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اتنے میں وہاں طاعون پھیل گیا تو (اس کے لئے جانا جائز ہے) اس لئے کہ اس کی نیت طاعون سے فرار حاصل کرنا نہیں ہے چنانچہ یہ ممانعت میں داخل نہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو کسی ضرورت سے جانا تھا لیکن ساتھ میں یہ بھی نیت ہے کہ طاعون والی جگہ رہنا نہ پڑے تو اس میں اختلاف ہے بعض لوگوں نے یہ دیکھ کر بہر حال کسی درجہ میں طاعون سے بچنے کی نیت ہے اس صورت کو ناجائز قرار دیا ہے اور بعض لوگوں نے اس دلیل کی بنیاد پر اسے جائز قرار دیا ہے کہ فرار کی نیت سے نکلنا منع ہے اور اس کا ارادہ صرف فرار حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ ضرورت بھی ہے اور اس تیسری صورت سے متعلق سمجھا گیا ہے حضرت ابو موسیٰ کے اس اثر کو جس میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو خط لکھا کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے آپ اس خط کو رکھنے سے پہلے ہی میری طرف چل پڑیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے جواب لکھا کہ میں آپ کی ضرورت خوب سمجھ گیا ہوں میں مسلمانوں کے لشکر میں ہوں ان سے جدا ہونے کی مجھے کوئی خواہش نہیں۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ لکھ بھیجا کہ آپ نے مسلمانوں کو پانی سے قریب زمین میں ٹھہرایا ہے ان کو لے کر کسی پُرفضا زمین میں چلے جائیے۔ تو یہ سن کر حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بلایا اور کہا کہ جا کر مسلمانوں کے لئے کوئی اور جگہ تلاش کیجئے تاکہ ان کو وہاں منتقل کر دوں پھر اس کے بعد آگے واقعہ مزید ہے اور اس میں یہ ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ مسلمانوں کو لے کر کسی دوسری جگہ تشریف لے گئے اور طاعون دور ہو گیا۔

عمیقہ ایسی زمین کو کہتے ہیں جو پانی سے قریب ہو اور پانی سے قریب ہونے کی وجہ سے عام طور پر آب و ہوا خراب ہو جاتی ہے اور "نزہۃ" کھلی پُرفضا جگہ کو کہتے ہیں جو مضر صحت اثرات سے خالی ہو، اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ سمجھا کہ طاعون والی جگہ سے باہر جانا اس شخص کے لئے منع ہے جو صرف فرار حاصل کرنا چاہتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے مذکورہ حدیث سن کر حضرت ابو عبیدہؓ کو حکم فرما دیا کہ اس زمین سے باہر چلے جائیں اور حدیث کا وہی مطلب لیا جو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے لیا۔ خطابی فرماتے

ہیں اس واقعہ سے بیماری کے متعدی ہونے کا نظریہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حضرت
عمرؓ نے جو کچھ فرمایا یہ محض علاج معالجے کے زمرے میں آئے گا اور اس میں کوئی
شک نہیں کہ تبدیلی آب و ہوا کو صحت اور مرض میں بڑا دخل ہے۔ علمائے جو ان
حضرات کے طاعون زدہ زمین سے نکلنے کو منع کرنے کی روایت کی ہے وہ بھی
اپنی جگہ درست ہے اس لئے کہ اگر علی الاطلاق نکلنا جائز ہو جائے تو جو لوگ صحت مند
ہیں وہ نکل جائیں گے (خواہ درست عقیدہ کے ساتھ نکلیں) لیکن اس سے کمزوروں
کی دل شکنی ہوگی۔ چنانچہ بعض حضرات نے میدان جنگ سے بھاگنے پر وعید
کی بھی یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ اس سے ان لوگوں کی ہمت شکنی ہوگی جو بھاگ
نہیں سکے اور وہ مرعوب ہو جائیں گے۔ بعض اطباء نے یہ بھی حکمت بیان کی
ہے کہ جس جگہ وباء آتی ہے وہاں لوگوں کے مزاج اس آب و ہوا سے مانوس ہو
جاتے ہیں اور ان کے لئے وہ آب و ہوا عام صحیح آب و ہوا کی طرح ہو جاتی
ہے۔ اگر اب وہ اس جگہ سے دوسری ایسی جگہ جائیں گے جہاں یہ وبا نہیں ہے تو
وہاں کی آب و ہوا انہیں موافق نہیں آئے گی بلکہ بہت ممکن ہے کہ جب وہ اس نئی
آب و ہوا میں سانس لیں تو ان کی سانسوں کے ساتھ وہ خراب بخارات
بھی باہر آجائیں جس کے لئے وہ عادی ہو چکے ہیں اور یہ بخارات یہاں کی آب و
ہوا کو خراب کر دیں لہٰذا اس لئے وباء زدہ علاقے سے نکلنا منع ہے۔ شیخ ابن
دقیق العید یہ فرماتے ہیں کہ دونوں طرح کے دلائل میں تطبیق دینے کی یہ صورت
مجھے زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی زمین میں آنے سے تو اس لئے روک
دیا گیا کہ اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں ڈالنا ہے جس کا شاید بعد میں تحمّل
نہ ہو سکے اور یہ گویا ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ مجھے مقام صبر و توکل حاصل ہے۔
لہٰذا یہ تو منع فرمادیا گیا تاکہ نفس دھوکہ میں مبتلا نہ ہو اور ایسے دعویٰ سے بچے
جو امتحان کے وقت ثابت نہ کیا جا سکے اور اس زمین سے نکلنے سے اس لئے
منع کیا گیا کہ یہ اسباب میں غلو سے کام لینے اور تقدیر سے بچنے کی کوشش
میں داخل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ شارع علیہ السلام نے ہمیں دونوں صورتوں (باہر سے اندر آنے

اور اندر سے باہر جانے) میں تکلف سے بچنے کا حکم فرمایا. آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی قسم کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو ہاں اگر مقابلہ کی نوبت آجائے تو ڈٹ جاؤ. چونکہ دشمن سے مقابلہ کی تمنا بھی اپنے آپ کو مصیبت کے لئے پیش کرنا ہے اور اس میں نفس کے دھوکہ کھانے کا بھی اندیشہ ہے کہ جب اصل موقع آئے تو بھاگ کھڑے ہوں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تمنا کرنے سے منع فرمادیا اور حکم دیا کہ اگر واقعی مقابلے کی نوبت آجائے تو تقدیر کا فیصلہ سمجھتے ہوئے اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر کے ڈٹ جاؤ۔

کتاب المتفرقات

کفار کے اس خزانہ کا حکم جو کسی کی زمین سے نکل آئے

السوال :- حضرت ایک مسئلہ میں احقر متردد ہے اس کا جواب عطا فرما کر رفع خدشہ فرماویں وہ یہ کہ ایک زمین جس کا مالک اعلیٰ سرکار بہادر ہے اس کے تحت ایک بڑا زمین دار ہے شیر علی خان اور اس کے ماتحت ایک رعیت ہے زید، اب زید نے اس کی زمین کو عمرو کے ہاتھ فروخت کیا۔ اب عمرو نے اس زمین کو نیچا کرنے کے لئے چند مزدوروں سے کھدوانا شروع کیا اور ان کا مشاہرہ بھی مقرر کیا۔ ان مزدوروں نے جب اس زمین کو کچھ کھودا تو کچھ چیز نمودار ہوئی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب سونا ہے۔ دو سو برس قبل جو قوم مُغ یہاں کے باشندہ تھے بوقت فرار از خوف سلطان مسلم دفن کر گئے۔ اس زمانے میں سونا بارہا لوگ پاتے رہے۔ اب مغوں کا پتا ملنا بڑا دشوار ہے، وہ سونا اس وقت جو پایا ہے وہ پچیس ۲۵، تیس ۳۰ ہزار روپے کی قیمت کا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا حقدار کون ٹھہرے گا؟ اس کا مصرف کون ہے؟ اگر مزدور اپنے تصرف میں لائیں تو یہ جائز ہوگا یا نہیں۔

تنقیح یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ احتمال نہیں کہ اس قوم کے بعد جو مسلمان آئے۔ انہوں نے وہاں دفن کیا ہو۔

جواب تنقیح پہلے سوال کے متعلق عرض یہ ہے کہ وہ سونا جو پایا گیا ہے اس میں زیورات بھی بہت سے ہیں جو مغوں کے طرز کے مطابق بنے ہوئے ہیں اس صورت کا زیور مسلمان نہیں بناتے۔

۲ : اور لوگوں میں نہایت شہرت کے ساتھ مشہور ہے کہ وہ مغوں کا مدفونہ ہے نہ کہ مسلمانوں کا کوئی مسلمانوں کا دفن کیا ہوا نہیں کہتا ہے۔

۳: یہاں کے فرار شدہ مغ اس وقت ملک اکیاب میں بستے ہیں۔ وہاں جانے والوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ بہت سے مال وہاں دفن کر آئے ہیں۔ اور اس کا نام ونشان بھی رکھتے ہیں۔ بعض ان کے خاندان میں سے ان کے ہمراہ آکر وہ دفینہ اٹھا کرلے بھی جاتے ہیں اور بعضوں کو پتا لکھا ہوا دیتا ہے وہ یہاں آکر اس پتہ کے مطابق کھود کر مال پاتا ہے اب بھی جو ان کے مکانات میں وہاں دفینہ ہونے کی شہرت ہے۔ مگر لوگ خوف سے اس کو کھود کر نہیں دیکھتے یہ جو مکان کھودا گیا تھا ان مغوں کا مکان تھا ان سب وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خزانہ مسلمانوں کا نہیں مجھے اس سے زیادہ کا علم نہیں۔

الجواب

قال فی الدر المختار: وما علیه سمة الکفر خمس ای سواء کان فی ارضه أو ارض غیره اوارض مباحة کفایة۔

قال قاضیخان: وهذا بلاخلاف لان الکنز لیس من اجزاء الدار فامکن ایجاب الخمس فیه بخلاف المعدن۔

شامی: وباقیه للمالك اول الفتح او لوارثه لوحیا والا فلبیت المال علی الاوجه (وذلك لما فی البحر من ان الکنز مودع فی الارض فلما ملکها الاول ملك ما فیها ولایخرج ما فیها عن ملکه ببیعها کالسمکة فی جوفها درة انتهی شامی) وهذا ان ملکت ارضه والا فللواجد اھ ج ۲ ص۷۵۔

جب قرائن سے غالب یہ ہے کہ سونا کفار کا دفن کیا ہوا ہے تو اس کا پانچواں حصہ پانے والے کا ہے اگر صاحب زکوٰۃ نہ ہو اور باقی اس مسلمان کا ہے جس کا قبضہ مالکانہ اس زمین پر کفار کے بعد سب سے پہلے ہوا ہے۔ اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کے ورثاء کو دیا جائے، صورت مسئولہ میں سرکار کی ملکیت تو بظاہر ملک تصرف ہے جو قبضہ مالکانہ کا اثر ہے۔ پہلا مالک مسلمان اس زمین کا شاید موجود زمیندار شیر علی خان کا کوئی مورث اعلیٰ ہے تحقیق کرلی جاوے بہر حال وہ ہو یا اور کوئی جو مسلمان مالک اول ہو بقیہ چار حصے اس کے ورثاء کا حق ہے۔

ع ۱- دلیله فی الدر: للواجد صرف الخمس لنفسه واصله وفرعه واجنبی بشرط الفقر ج ۲، ص۷۷ ظفر احمد عفی عنه

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی اللہ عنہ
۵ / ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

قیامت کے دن لوگ ماں کے نام سے پکارے جائیں گے یا باپ کے نام سے

السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ قیامت کے روز خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور طوائفوں کی اولاد کے باپ کے نام سے پکارے گا اور دو اشخاص مذکورہ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور اولاد طوائف کو ماں کے نام سے پکارے گا۔ اور ساتھ ہی صحاح ستہ کا حوالہ بھی دیتا ہے۔) اور عمرو کہتا ہے کہ ایسا نہیں تم غلط کہتے ہو۔ آپ فرمائیے کہ دونوں میں سے کون صادق اور کون کاذب ہے۔

دوسرے اس مسئلہ کے بابت آپ اپنا خیال ظاہر فرمائیے کہ آیا قیامت کے دن خداوند تعالیٰ بندوں کو پکارے گا یا نہیں۔ اگر پکارے گا تو کس صورت میں۔ ساتھ ہی اگر کتاب اور باب کا حوالہ ہو تو بہت اچھا، ورنہ خیر۔ بینوا توجروا۔

الجواب

أخرجه ابوداؤد فی سننه عن ابی الدرداء قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انکم تدعون یوم القیامة باسمائکم واسماء آبائکم فاحسنوا اسمائکم۔ رجاله ثقات الا انه منقطع کما نبه علیه، ابوداؤد، ج ۴، ص ۴۴۲ مع عون المعبود۔

قال فی العون وروی الطبرانی بسند ضعیف کما قوله ابن القیم فی حاشیة السنن : عن ابن عباسؓ ان الله یدعوا الناس یوم القیامة بأمهاتهم ستراً منه علی عباده قال العلقمی ویمکن الجمع بان حدیث الباب فمن هو صحیح النسب وحدیث الطبرانی فی غیره اویقال تدعی طائفة باسماء الآباء وطائفة باسماء الامهات اھ

وفی قوله تعالیٰ (إذ قال الله یٰعیسی ابن مریم قولان ان ذلك کان اذا رفعه وقال بعضهم یکون ذلك یوم القیامة ذکرها السیوطی فی درمنثور ـــ اھ

ج ۲، ص ۳۴۹

بعض احادیث میں یہ ہے کہ سب آدمی ماؤں کے نام سے پکارے جاویں گے۔ اور بعض میں یہ ہے کہ باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاوے جاویں گے۔ اور غالباً پکارنے والے ملائکہ ہوں گے، باقی اولاد طوائف کی خصوصیت حدیث سے معلوم نہیں ہوتی، بعض علماء کا قول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ماں کی طرف منسوب ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ غالباً اس طرح حشر میں پکارے جائیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۶ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

عورتوں کے باہم سلام کا طریقہ اور انحناء کا حکم کیا ہے۔

السوال: زنانہ را طریقہ سلام چگونہ است آیا مشابہ رجال اندیانہ در بعض دیار مروج است زناں ہمچو رکوع سرنگوں کردہ بدست اشارہ نمودہ۔ علی الانفراد جمیع حاضرین را بلا آواز خفیۃً سلام میدہند بایں طریق سلام کردن موافق شرع جائز است یا نہ۔ بر تقدیر عدم جواز مرتکب ایں فعل گنہگار باشد یانہ، بینوا توجروا۔

المستفتی

محمد شمس الحق عفا اللہ عنہ

از سہارنپور مدرسہ مخزن العلوم

الجواب

عورتوں کے لئے بھی باہم سلام کا طریقہ وہی ہے جو مردوں کے لئے ہے۔ جو طریقہ عورتوں کے سلام کا سوال میں مذکور ہے یہ بدعت ہے اور گناہ ہے۔ سلام میں جھکنا نہیں چاہئے۔ البتہ شابہ کو مکروہ ہے کہ وہ نامحرم مرد کو سلام کرے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون

۴ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

اس شبہ کا جواب کہ قرآن میں پورا کلمہ ایک جگہ کیوں نہیں

السوال :- ایک اہل ہنود یہ سوال کرتا ہے کہ کلمہ طیبہ قرآن شریف میں بمعہ محمد رسول اللہ کے ایک جگہ اکٹھا نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ اسی کلمہ کو پڑھ کر ہر شخص مسلمان ہوتا ہے۔ صاف طور سے سمجھا کر تحریر فرماویں۔ کئی جگہ اس مسئلہ کو دریافت کیا مگر صاف طور پر حل نہیں ہوا۔

المستفتی

آپ کا خادم محمد حنیف راجپور

الجواب

پورا کلمہ ایک جگہ اکٹھا ہونے کی کیا ضرورت ہے کافر کا مسلمان ہونا اس پر موقوف نہیں ہے کہ وہ پورے کلمہ کا ایک ساتھ اقرار کرے بلکہ اگر ایک شخص لا الہ الا اللہ کا آج اقرار کرے اور محمد رسول اللہ کا کل اقرار کرے تو اس طرح بھی وہ مسلمان ہوجائے گا۔ اگر مسلمان ہونے کے لئے دونوں کا ایک ساتھ جمع کرنا ضروری ہوتا تب تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ قرآن میں ایک جگہ اکٹھا کیوں نہیں۔ اور جب مسلمان ہونا کلمہ کی تفریق کے ساتھ بھی درست ہے تو اب قرآن میں کلمہ کی تفریق پر کیا شبہ ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

طالب علم کے لئے اس کے مربی کا گاؤں والوں سے سوال کرنا جائز نہیں ہے

السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید مدرسہ عربیہ میں علم حاصل کررہا ہے۔ اور اس کے والد، رشتہ دار چونکہ اپنی حالت اچھی نہیں رکھتے، لہٰذا لوگوں سے مانگ مانگ کر روپیہ پیسہ لے کر زید کا خرچہ بھیجتے ہیں اس صورت میں ان مربیوں کے لئے سوال کرنا جائز ہے یا نہیں۔ نیز یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ خود اگر زید لوگوں کے پاس اپنی ضروریات کے لئے روپیہ مانگے اور والد اور دیگر مربیان کا مذکورہ طریقہ سے وصول کیا ہوا روپیہ لے لے تو جائز ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

المستفتی

محمد حبیب اللہ میمن سنگی
متصل سفید مسجد دیوبند
۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کو سوال کرنا جائز نہیں ہے اور اس کے مربیوں کو بھی زید کے واسطے سوال جائز نہیں ہے۔ اور زید کو اپنے مربیوں سے سوال کا روپیہ وصول کیا ہوا لینا بھی جائز نہیں ہے۔ اور اور در مختار وغیرہ میں جو طالب علم و غازی کے لئے سوال جائز کہا ہے اس سے مراد وہ طالب علم ہے جو بقدرِ ضرورت طلب علم میں مشغول ہو جس کا حاصل کرنا فرض ہے۔ اور علم بقدر فرض تحصیل علوم عربیہ پر موقوف نہیں۔ بلکہ اردو فارسی رسائل پڑھنے سے بھی بقدر فرض[ع] علم حاصل ہو جاتا ہے پس جو طلباء مدارس عربیہ میں علم حاصل کرتے ہیں وہ بقدر فرض سے زائد میں مشغول ہیں ان کو سوال جائز نہیں۔ نہ اُن کے مربیوں کے واسطے سوال جائز ہے۔ فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ
۱۸ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

ع فان قیل تحصیل العلوم العربیۃ فرض علی الکفایۃ فی کل مسافتہ قصر علی اھلھا فینبغی جواز السؤال للطالب لکونہ مشتغلا بفرض الکفایۃ کالغازی یجوز لہ السوال مطلقاً سواء کان الغزو فرضا علیہ عینا او علی الکفایۃ یدل علیہ اطلاقھم فی الغازی قلنا نعم ولکن بشروط احدھا ان لایکون فی بلاد الطالب عالم بالعلوم الشرعیۃ الی مسافۃ القصر۔ وثانیھا ان لا یکون طالب غیرہ مشتغلا بتحصیلھا۔ وثالثھا ان یکون ھٰذا الطالب ممن یرجی استغناء اھل بلادہ بعلمہ بان یکون صحیح الاستعداد سلیم الطبع متوقد الاغبیا الموج الطبع ویعتبر فی ذلک قول معلمیہ ۱۲ منہ

اقول وعلم منہ ان الغازی لایجوز لہ السؤال ایضاً اذا حصل الکفایۃ بدونہ فافھم ۱۲ احقر عبد الکریم عفی عنہ

سرکاری ملازم کو سیکنڈ یا انٹر کلاس کا کرایہ ملے تو وہ تیسرے درجہ میں سفر کر کے بقیہ رقم کو اپنے مصرف میں لاسکتا ہے۔

السوال :۔ خدومی ومکرمی جناب حضرت مولانا مدفیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بندہ عرض گذار ہے کہ آنجناب سائل مندرجہ ذیل کا جواب ازروئے شریعت مطہرہ ارقام فرماویں اور احقر کو مشکور وممنون فرماویں۔ اور عنداللہ ماجور ہوں۔

۱ سائل کو گورنمنٹ سے یا کورٹ آوف وارڈس سے ریل کا سفر سیکنڈ یا ڈیڑھ درجہ کا ملتا ہے۔ ایسی حالت میں سائل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ تھرڈ درجہ ریل میں سفر کرے اور اپنی کفایت شعاری سے کچھ بچالے اور پھر اپنے ذاتی مصارف میں بچی ہوئی رقم کو خرچ کردے اس صرفہ کی بازپرس کچھ نہیں ہوتی ہے اور نہ آج تک کسی سے واپس ہوئی ہے۔

۲ : اگر بچی ہوئی رقم اپنے ذاتی مصارف میں لانا جائز نہ ہو تو ایسی حالت میں کفایت شعاری سے کام لینا تو واجب نہ ہوگا۔

۳ : جو مدارس اردو ڈسٹرکٹ، میونسپل بورڈ سے جابجا قائم ہیں۔ ان میں افسر مدرسین کو کچھ رقم تنخواہ کے ساتھ اس لئے دی جاتی ہے کہ قلم دوات کاغذ روشنائی وغیرہ یا اس طرح کے مصارف میں خرچ کی جائے۔ چنانچہ اکثر رقم مقررہ سے کچھ بچ رہتی ہے جس کو افسر مدرس اپنے ذاتی مصرف میں لے آتے ہیں کسی سے واپس نہیں کی جاتی۔ اور ساتھ ہی اس کے اگر کسی مہینے میں اگر کچھ زیادہ صرف ہوجائے تو نہیں دی جاتی مثل ٹھیکہ کے ہے۔ اگر رقم مقررہ کم ہوجائے جو کافی نہ ہو تو افسر مدرس کی رپورٹ کرنے پر تحقیقاتِ مناسب کے بعد کچھ رقم دیدی جاتی ہے مستقلاً اضافہ کر کے تو ایسی حالت میں افسر مدرس جو رقم بچ رہتی ہے اس کو اپنی ملکیت سمجھ کر اپنے صرفہ میں لاسکتا ہے یا نہیں۔ فقط والسلام

الجواب

۲،۱ :۔ ہمیں ملازمین سے تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ رقم گورنمنٹ یا محکمہ کورٹ کی طرف سے ملازمین کی ملک کردی جاتی ہے اس لئے باوجود اس علم کے کہ فلاں شخص سیکنڈ یا انٹر میں سفر نہیں کرتا اس پر کوئی جرم قائم نہیں ہوتا نہ اس علم کے بعد گورنمنٹ اس کو سیکنڈ وانٹر کے کرایہ سے محروم کردیتی ہے بلکہ بدستور اسی قاعدہ سے کرایہ دیتی ہے۔ اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو سائل کو تھرڈ درجہ میں سفر کرنا اور بقیہ رقم کو اپنی ذاتی مصارف میں صرف کرنا جائز ہے۔ اس پر کفایت شعاری کر کے

اس رقم کو بچانا واجب نہیں بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ جس درجہ کا کرایہ دیا جاتے اسی درجہ میں سفر کرے۔

ع ۳ :۔ اس میں بھی ہم کو یہی تحقیق ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ رقم مدرسان کو بطور تملیک اور ٹھیکہ کے دی جاتی ہے۔ گورنمنٹ کی نیت واپسی کی نہیں ہوتی، جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے متعلق افسر مدرس وغیرہ کسی سے حساب کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ اور جو پیشگی رقم ملتوی طور پر دی جاتی ہے تملیکاً نہیں دی جاتی۔ اس میں حساب کا مطالبہ ہوتا ہے، جیسا کہ بھتہ وغیرہ کی رقم کا قاعدہ ہے پس اگر تحقیق صحیح ہے تو اس صورت میں بھی جو رقم مصارف دوات و قلم وغیرہ سے بچے اس کو اپنے تصرف میں افسر مدرس لا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴ رجمادی الثانی ۱۳۴۵ھ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

رسالة التدقیق

الاقوام فی تحقیق السواد الاعظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السوال :- باہم علماء میں جب اختلاف ہو کہ علماء کی کثیر جماعت کسی مسئلہ میں ایک طرف ہو اور معدودے چند علماء اس سے اختلاف رکھتے ہوں اور ہر ایک اپنے مسلک کی صحت پر دلائل شرعیہ قائم کرتا ہو، ایسی صورت میں مسلمانوں کو جماعت کثیرہ کا اتباع کرنا واجب ہے یا جماعت قلیلہ کا اتباع بھی جائز ہے۔ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ جماعت کثیرہ کا اتباع واجب ہے اور دلیل میں یہ احادیث پیش کرتے ہیں۔

۱ :- عن علیؓ قال قلت : یارسول ان نزل بنا امر لیس فیه بیان امر ولا نهی فلا تأمرنی قال تشاور والفقهاء والعابدین ولا تمضوا فیه رأی خاصة رواه طبرانی فی الاوسط ورجاله موثقون من اهل الصحیح مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۸۔

۲ :- أنس بن مالك یقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان امتی لا تجمع علی ضلالة فاذا رأیتم اختلافاً فعلیکم السواد الاعظم۔ ابن ماجه ص ۲۹۱ و ص ۲۹۲ وفی العزیزی قال الشیخ حدیث صحیح ج ۱ ص ۲۵۸۔

۳ :- علیکم بالجماعة وایاکم والفرقة فان الشیطان مع الواحد وهو من الاثنین ابعد من اراد بحبوحة الجنة فلیلزم الجماعة رواه الترمذی عن عمر مرفوعاً وقال حدیث صحیح حسن غریب ج ۲، ص ۳۹

ان احادیث سے جماعت کثیرہ کا اتباع لازم اور فقہاء و عابدین سے مشورہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کی رائے کا اتباع کرنے سے حدیث اول منع کرتی ہے، پس حدیث و فقہ سے یہ بتلادیا جائے کہ مسائل شرعیہ میں جب علماء اختلاف کریں تو کیا واحد کی رائے صحیح ہوسکتی

ہے اور اس کا اتباع جائز ہے۔ بینوا توجروا۔ (سائل ایک مسلمان)

الجواب واللہ الموفق للصواب

علماء میں جب اختلاف ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں یا وہ اختلاف احکام شرعیہ و مسائل دینیہ میں ہے یا امور انتظامیہ میں شق اول پر یا وہ اختلاف اعتقادیات میں ہے یا فروع میں اسی طرح شق ثانی کی بھی دو صورتیں ہیں یا مسلمانوں کا کوئی امام ہو یا امام نہ ہو۔ صورتِ اولیٰ کی دوسری قسم میں یعنی جبکہ اختلاف مسائل شرعیہ فرعیہ میں ہو جماعت کثیرہ کا اتباع لازم نہیں۔ جماعت قلیلہ یا عالم واحد کی رائے جمہور کے خلاف بھی ہو تب بھی اس میں احتمال صواب کا اسی طرح ہے جس طرح جمہور کی رائے میں احتمال صواب کا ہے۔

م ۱:- علماء امت کا زمانہ صحابہ سے اس وقت تک تعامل چلا آرہا ہے کہ انہوں نے مسائل مختلف فیہا میں کسی امام کے قول کو اس وجہ سے ترک نہیں کیا کہ یہ قول جمہور کے خلاف ہے اور شخصِ واحد یا جماعتِ قلیلہ کا قول ہے۔

قال ابن القیم فی زاد المعاد واما المقام الثانی وھوان الجمھور علی ھذا القول فی وجدنا فی الادلۃ الشرعیۃ ان قول الجمھور حجۃ مضافۃ الی کتاب اللّٰہ وسنۃ رسولہ واجماع امتہ ومن تأمل مذاھب العلماء قدیمًا وحدیثًا من عھد الصحابۃ رض الی الآن واستقراء اموالھم وجدھم مجمعین علی تسویغ خلاف الجمھور ووجد لکل منھم اقوالاً عدیدۃ الفرد بھا عن الجمھور ولا یستثنیٰ من ذلک احدٌ قط ولکن مستقل ومستکثر فمن شئتم سمیتموہ من الائمۃ ثم تتبعوا مالہ من الاقوال

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں فرمایا ہے رہا دوسرا مقام وہ یہ کہ جمہور کا قول یہی ہے تو اس سے بھی کچھ نہیں ہوتا) ہم نے دلائل شرعیہ میں (کہیں) یہ بات پائی نہیں کہ قول جمہور بھی کوئی ایسی حجت ہے جو کتاب اللہ و سنت رسول و اجماع امت کے ساتھ ملحق ہو اور جس نے مذاہب علماء میں تامل کیا ہے خواہ ہو وہ متقدمین ہوں یا متاخرین صحابہؓ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک (جتنے بھی علماء ہوتے ہیں) اور ان کے احوال کا تتبع کیا ہے وہ ان سب کو جمہور کی مخالفت کے جواز پر اجماع کئے ہوتے پائے گا اور ہر ایک کے متعدد اقوال اس کو ایسے ملیں گے جن میں وہ جمہور سے الگ ہے اور اس کلیہ سے ہرگز کوئی بھی مستثنیٰ

التی خالف فیها الجمهور ولو تتبعنا ذلك وعودناه لطال الكتاب جداً وخس نحیلكم علی الكتاب المتضمنة لمذاهب العلماء واختلافهم اھ (ج ۲، ص / ۲۵۱)

نہیں ہے ہاں بعضے جمہور کی مخالفت کم کرتے ہیں اور بعض زیادہ کرتے ہیں (بس اتنا ہی فرق ہے اس سے زیادہ نہیں) پس تم ائمہ میں سے جس کا نام چاہو لے لو پھر اس کے ان اقوال کا تتبع کرو جن میں اس نے جمہور کی مخالفت کی ہے (تو تم کو ایسے اقوال ہر امام کے پاس ملیں گے) اور اگر ہم ان کا تلاش کرنا اور گننا شروع کریں تو کتاب بہت زیادہ طویل ہو جائے گی اور ہم تم کو ان کتابوں کے حوالہ کرتے ہیں جن میں مذاہب علماء اور ان کے اختلافات کا ذکر موجود ہے۔

علامہ ابن القیم کی یہ عبارت صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ مسائل فرعیہ میں مخالفت جمہور کے جواز پر علماء امت کا صحابہ سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں اجماع رہا ہے اور کوئی امام مخالفت جمہور سے بچا ہوا نہیں ہر امام کے متعدد اقوال جمہور علماء کے خلاف موجود ہیں جن کو اس کے مقلدین نے مخالفت جماعت کثیرہ کی وجہ سے ہرگز رد نہیں کیا اور حنفیہ کے تو بہت سے مسائل اس شان کے ہیں جن میں امام ابوحنیفہ جمہور امت سے متفرد ہیں جیسے نفاذ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً وجواز ربو فی دار الحرب وقول بالمثلین فی وقت الظہر وغیرہ اور ان اقوال کو حنفیہ نے اس عذر کی وجہ سے کبھی رد نہیں کیا کہ امام صاحب ان میں متفرد ہیں۔

۲: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یزال طائفة من امتی علی الحق منصورین لا یضرھم من خالفھم حتی یأتی امر اللہ۔ رواہ مسلم وغیرہ

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی جس کی حق پر مدد کی جاوے گی ان کو وہ لوگ ضرر نہ دے سکیں گے جو ان کے مخالف ہوں گے یہاں تک کہ خدا کا حکم یعنی قیامت آجاوے۔ (بخاری ومسلم)

طائفة من الشئ قطعہ شی کا ہوتا ہے جو قلت پر دلالت کرتا ہے پس حضور فخر دو عالم صلی اللہ علیہ [ع۱]

ع۱: اس حدیث کی تقریر براھین قاطعہ مصنفہ قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہ میں قابل ملاحظہ ہے۔ ۱۲ منہ۔

وسلم کا خود ارشاد ہے کہ طائفہ قلیلہ خواہ رجل واحد ہی کیوں نہ ہو حق پر ہو سکتا ہے اور اس کے مخالف تمام دنیا بھی ہو تو اس کا قول باطل ہوگا۔

قال فی مجمع البحار الطائفة الجماعة من الناس ویقع علی الواحد کانه اراد نفسا طائفة ابن راهویة هی دون الالف وسیبلغ هٰذا الامر الی ان یکون عدد المستمکین بما کان علیه النبی صلی الله علیه وسلم واصحابه الفا سلی بذالك ان لا یعجبهم کثرة اهل الباطل اه (ج ۱، ص ۳۳۰)

مجمع البحار میں کہا ہے کہ طائفہ آدمیوں کی ایک جماعت کو کہتے ہیں اور شخص واحد پر بھی اس کا اطلاق آتا ہے (ابن راہویہ) طائفہ ایک ہزار سے کم کو کہتے ہیں۔ اور عنقریب یہ دین اس حالت کو پہنچ جاتے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اصحاب کے طریقہ کے ساتھ تمسک کرنے والے ہزار (کے قریب) رہ جائیں گے اس حدیث سے آپ نے ان لوگوں کو تسلی دی ہے کہ وہ اہل باطل کی کثرت سے تعجب کریں۔ اھ

اس میں صاف تصریح ہے کہ اہل حق قلیل اور اہل باطل کثیر ہو سکتے ہیں۔ پس کسی کی طرف مسئلہ شرعیہ میں جماعت کثیرہ کا ہونا اس کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

۳: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من أحیاء سنة من سنتی قد امیتت بعدی فان له من الاجر مثل أجور من عمل بها الحدیث قال الترمذی حسن مشکوٰة مع التنقیح ج ۱، ص ۶۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری سنتوں میں سے ایسی سنت کو زندہ کرے جو میرے بعد مردہ کردی گئی تھی اس لئے اس قدر ثواب ہے جتنا اس سنت پر سب عمل کرنے والوں کو ملے گا (یعنی اس کو تنہا سب کی مجموعی مقدار کی برابر ثواب ملے گا۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

من احیاء عام ہے جو کہ واحد کو بھی شامل ہے بلکہ آئندہ کلام میں ضمیر واحد کا اس کی طرف راجع ہونا ارادۂ واحد کو مرجح ہے نیز سنت کی امامت کے معنی یہی ہیں کہ عام طور سے اس پر عمل متروک ہو گیا ہو اس حالت میں اس کا احیاء کرنے والا شخص واحد یا جماعت قلیلہ ہی ہوگی۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں متبع سنت قلیل اور مخالفِ سنت کثیر ہوں گے لہٰذا کسی طرف جماعت کثیرہ کا ہونا اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

۴:- قال رسول الله صلی الله علیه وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری

من تمسك بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهيد۔ رواه مشكوٰة وفی التنقیح رواه ایضًا الطبرانی باسناد حسن ج ۱ ص ۴۲

امت کی حالت خراب ہونے کے وقت میرے طریقہ پر جما رہے اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ تنقیح الرواۃ میں کہ اس حدیث کو طبرانی نے بھی اسناد حسن سے روایت کیا ہے۔ اھ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں اکثر امت فساد میں مبتلا ہو جائے گی اور متبع سنت بہت کم ہوں گے۔ اس لئے ان کی اس درجہ فضیلت ہے لہٰذا ایسے زمانہ میں کسی جانب علماء کی کثرت ہرگز حقانیت کی دلیل نہ ہوگی کیونکہ اس وقت علماء کا بھی زیادہ حصہ فسادِ اہواء میں مبتلا ہوگا۔ ان میں متبع سنت کم ہوں گے۔ کما هو مشاهد

۵:۔ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من اكل طيبًا وعمل فی سنة وأمن الناس بوائقه دخل الجنة فقال رجل یا رسول الله : ان هذا اليوم لكثير من الناس قال : وسیکون فی قرون بعدی رواه الترمذی مشكوٰة وفی تنقیح الرواة بعد الفحص لذا حتجاج واخرجه ایضًا الحاكم واسناده صحیح۔ ج ۱ ص ۴۲۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص حلال روزی کھاتا رہے اور سنت کے موافق عمل کرتا رہے اور لوگ اس کی آفات سے محفوظ رہیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ : آج کل تو ایسے لوگ تو بہت ہیں۔ آپؐ نے فرمایا عنقریب میرے بعد قرنوں میں ایسا آدمی ہوا کرے گا۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ) تنقیح الرواۃ میں اس کے رجال پر بحث کر کے کہا ہے کہ حدیث احتجاج کے قابل ہے اور اس کو حاکم نے بھی تخریج کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح ہیں۔ اھ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ متبع سنت قرون مابعد میں قلیل ہوں گے اس کی تائید حدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم یفشو الکذب سے بھی ہوتی ہے پس ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں کثرت اہل باطل ہی کی ہوگی، اہل حق قلیل ہوں گے۔ لہٰذا کسی طرح جماعت کثیرہ کا ہونا اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے۔

۶:۔ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال سیأتی علیکم زمان لا یکون فیه شیء اعز من ثلث۔ درهم حلال او

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عنقریب تم پر ایسا زمانہ آئے گا جس میں تین چیزوں سے زیادہ کوئی چیز نایاب نہ ہوگی،

أخ يستأنس به اوسنة يعمل بها رواه الطبرانی فی الأوسط وفيه روح بن صلاح ضعفه ابن عدی وقال الحاكم ثقة مامون وذكره ابن حبان فی الثقات وبقية رجاله موثوقون مجمع الزوائد ج ۱، ص ۶۹

(ایک) درہم حلال (دوسرے) یا ایسا بھائی جس سے انس حاصل کیا جاوے (تیسرے) یا ایسی سُنت جس پر عمل کیا جاوے اس کو طبرانی نے معجم الاوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں (ایک راوی) روح ابن صلاح ہے جس کو ابن عدی نے ضعیف کہا ہے اور حاکم نے ثقہ ومامون کہا ہے اور ابن حبان نے بھی اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور بقیہ رجال سب ثقات ہیں۔ مجمع الزوائد

اس حدیث میں جس زمانہ کی خبر دی گئی ہے کوئی صاحب بصیرت شک نہیں کر سکتا کہ یہ زمانہ اس کا مصداق ہے اور حدیث میں تصریح ہے کہ اس وقت عمل بالسنۃ بہت نادر ہوگا۔ لہٰذا ایسے زمانہ میں اہل باطل ہی کی کثرت ہوگی پس کثرت قائلین حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

۷:۔ عن ابن عباس رضی الله عنهما ما اتی علی الناس عام إلا احدثوا فيه بدعة واماتوا فيه سنة حتی تحی البدع وتموت السنن رواه الطبرانی فی الكبير باسناد رجاله موثوقون۔ ص۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں پر کوئی سال نہیں گزرتا مگر وہ اس میں ایک بدعت ایجاد کر لیتے ہیں اور ایک سُنت کو مردہ کر دیتے ہیں یہاں تک کہ بدعت ہی زندہ رہے گی۔ اور سنتیں سب مردہ ہو جائیں گی۔ اس کو طبرانی نے ایسی سند سے روایت کیا ہے جس کے رجال ثقات ہیں۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ زمانہ نبوت سے جس قدر بعد ہوتا جائے گا۔ بدعت کی کثرت اور سنت کی قلت ہوتی جائے گی اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کسی جانب میں اکثر کا ہونا ہرگز دلیل حقانیت نہیں ہو سکتی۔

۸:۔ عن ابن عمر رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم ما اختلفت امة بعد نبيها الا ظاهر اهل باطلها علی اهل حقها

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی امت نے اپنے نبی کے بعد اختلاف نہیں کیا مگر ان کے اہل باطل اہل حق پر غالب ہوئے (یعنی کثرت وغیرہ میں)

رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه موسی ابن عبیدة وهو ضعیف اھ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۶۲ ۔ قلت وثقه ابن سعد و حدث عنه وکیع وقال کان ثقة کذا فی التهذیب ج ۱۰ ص ۳۵۹ والاختلاف فی التوثیق لا یضر۔

اس کی طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں موسیٰ بن عبیدہ کو ابن سعد نے ثقہ کہا ہے کہ وہ ثقہ تھے۔ اور تہذیب التہذیب میں اسی طرح ہے۔ اور توثیق میں اختلاف مضر نہیں ہوتا۔ اھ

اس حدیث میں تصریح ہے کہ جب امت میں اختلاف ہوگا تو اہل باطل اہل حق پر (کثرت) غالب ہوں گے۔ لہٰذا کثرت قائلین حقانیت کی دلیل نہیں ہوسکتی

۹ :۔ عن علی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیه وسلم یوشك أن یأتی علی الناس زمان لا یبقی من الاسلام الا اسمه ولا یبقی من القرآن الا اسمه مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدٰی علماءهم شر من تحت ادیم السماء من عندهم تخرج الفتنة وفیهم تعود رواه البیهقی، فی شعب الایمان مشکوٰة وقال فی تنقیح الرواة وله شاهد عند الحاکم فی المستدرك عن انس باسناد حسن وعند ابی داؤد واحمد والحاکم عن ابن عمر وعند الدیلمی عن معاذ وتعدد الطرق یشد بعضها بعضاً ثم قال صدق اللّٰہ وصدق رسوله صلی اللّٰہ علیه وسلم کل ما هو فی الحدیث رأیناه فی زماننا هذا والی اللّٰہ المشتکی اھ ص ۵۸

اس حدیث میں تصریح ہے کہ ایک زمانہ میں علماء کی حالت عام طور پر خراب ہوگی اور اس سے مراد اکثر علماء ہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ایک طائفہ کا حق پر ہونا دوسری حدیث سے ثابت ہے اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اکثر علماء کا کسی مسئلہ میں ایک طرف ہونا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔

۱۰ :۔ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من یعش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیرًا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهتدین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ الحدیث، قال الترمذی حسن صحیح ورواه ایضًا ابن حبان فی صحیحه والحاکم وقال صحیح علی شرطهما ولیس له علة

ورجال احمد رجال الحسن اھ ۔تنقیح الرواۃ ۔ ج ر ۱، ص ر ۴۰ ۔

وفیہ ایضاً : قال بعض العلماء ھم الخلفاء الاربعة یقولہ صلی اللہ علیہ وسلم الخلافة بعدی ثلثون سنة اھ ۔

اس حدیث میں تصریح ہے کہ جب امت میں اختلاف پیدا ہو تو سنت نبوی اور سنت خلفاء الراشدین کا اتباع واجب ہے کثرتِ جماعت وقلت جماعت کا اعتبار ہرگز نہیں کیا جاوے گا ۔ اگر ایک شخص متبع سنت ہو تو عالم دنیا کا اختلاف اس کو مضر نہ ہوگا ۔ باقی جن احادیث کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے ۔ ان کا مطلب عنقریب واضح ہو جاتے گا ۔

۱۱ :۔ عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین بعثہ الی الیمن فقال کیف تصنع ان عرض لك قضاء قال اقضی بما فی کتاب اللہ قال فان لم یکن فی کتاب اللہ قال فبسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم یکن فی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اجتھد برأیی لا آلو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدری ثم قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رواہ الترمذی وغیرھما ورجالہ ثقات الاحرث بن عمرو ا فی المغیرۃ بن شعبة مختلف فیہ ذکرہ ابن حبان فی الثقات وضعفہ آخرون کما یظھر من التھذیب ج ر ۲، ص ر ۱۰۲ ۔ والحدیث منقطع ایضاً والانقطاع (۱) یضر عندنا ۔

ـہ : قلت یؤیدہ ما فی فتح الباری وعمر ھو الذی کتب الی شریح النظر ما تبین لك من کتاب اللہ فلا تسئل عنہ احداً فان لم تبین لك من کتاب اللہ فاتبع فیہ سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما لم تبین لك من السنة فاجتھد فیہ رأیك واخرج ابن ابی شیبة سند صحیح عن ابن مسعود نحو حدیث عمر من روایة الشیبانی وقال فی آخر فان جاءہ ما لیس فی ذلك فلیجتھد رأیہ فان الحلال بیّن والحرام بیّن فدع ما یریبك إلی ما لا یریبك اھ ملخصا ج ر ۱۳ ص ۲۴۴ واللہ اعلم

اس حدیث میں تصریح ہے کہ اگر کوئی حکم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں نہ ملے تو مشورہ کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنا ہر مجتہد کو جائز ہے اگر اس صورت میں مشورہ کرنا واجب ہوتا جیسا کہ حدیث ۱ مندرجہ سوال سے معلوم ہوتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ضرور حکم فرماتے کہ اپنے رفقاء ابو موسیٰ اشعری علاء بن حضرمی وعلی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے ان امور میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں مگر آپ نے ایسا نہیں فرمایا پس ہر عالم کو جب مسئلہ کتاب و سنت میں مصرح نہ ہو تو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا اس حدیث سے جائز ہوا گو دوسرے علماء اس کے خلاف ہوں۔

۱۲ ۔ روی العسکری عن سلیم بن العامری قال سأل ابن الکواء علیا عن السنۃ والبدعۃ والجماعۃ والفرقۃ فقال یا ابن الکواء حفظت المسئلۃ فافھم الجواب السنۃ واللہ سنۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم والبدعۃ ما فارقھا۔ والجماعۃ واللہ جماعۃ اھل الحق وإن قلّوا والفرقۃ مجامعۃ اھل الباطل وإن کثروا کذا فی منتخب العمال ج ۱ ص ۱۰۹ قال الذھبی فی المیزان عبد اللہ ابن الکواء من رؤس الخوارج اھ وفی لسان المیزان انہ قد رجع عن مذھب الخوارج وعاود صحبتہ علی وباقی رواتہ لم اعرف وعلی تراجمھم لم اقف وانما ذکرت عـہ الحدیث متابعۃ وقال الحافظ فی الفتح تحت حدیث ابن عباس فی قصۃ وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وخطبۃ ابی بکر من کان یعبد محمدًا فان محمدًا قد مات الخ ما نصہ فیؤخذ منہ ان الاقل عددًا فی الاجتھاد قد یصیب ویخطئ الأکثر فلا یتعین الترجیح بالاکثر ولاسیما ان ظھر ان بعضھم قلد بعضًا ج ۸، ص ۱۱۲۔

اس حدیث میں صاف تصریح ہے کہ اہل حق گو قلیل ہوں ان کے ساتھ رہنا جماعت کے

عـہ ۱ یمن میں یہ حضرات بھی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور بعض ان کے پیچھے کچھ ایام کے فاصلہ سے بھیجے گئے تھے۔ واللہ اعلم۔ ۱۲ منہ۔

عـہ ۱ قلت ولہ شاھد صحیح من قولہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یزال طائفۃ من امتی علی الحق منصورین الخ فالجماعۃ واللہ مجامعتھم وان قلّوا والحدیث یدل بعبارتہ علی قلتھم فافھم ۱۲ منہ

ساتھ رہنا ہے اور اہل باطل خواہ کثیر ہوں ان کے ساتھ رہنا جماعت سے فرقت ہے پس کسی مسئلہ میں جس کی دلیل کتاب وسنت واقوال فقہاء سے زیادہ قریب ہوگی وہ حق پر ہوگا خواہ وہ شخص واحد ہی ہو اور جو لوگ دلائل سے فیصلہ نہ کرسکیں وہ یہ دیکھیں کہ تقوی اور علم ومحبتِ دین وخوف حق ودیانت ورجحان عقل میں کون زیادہ ہے پس جو شخص ان کے اعتقاد میں ان اوصاف میں دوسروں سے ممتاز ہو اس کا اتباع کریں کیونکہ ایسا شخص سنت نبویہ کا زیادہ متبع ہوگا۔

قال فی العالمگیریۃ :۔ واذا کان المبتلی فقیہا له رأي فاستفتی فقیها آخر فافتاه بخلاف رأیه یعمل برأی نفسه واذا کان المبتلی جاهلا فانه یأخذ بفتوی افضل الرجال عند عامة الفقهاء ج ۴، ص ۱۸۴

اس سے دو باتیں معلوم ہوتیں۔ (۱) جب انسان خود فقیہ ہو تو مسئلہ نازلہ میں اس کو اپنی رائے پر عمل کرنا واجب ہے۔ دوسرے فقہاء کی رائے اگر اس کے خلاف ہو اس پر اس کو عمل جائز نہیں ہے۔ (گو وہ شمار میں کتنے ہی ہوں یدل علیه اطلاق الجواب)

(۲) عام لوگوں کو مسئلہ نازلہ میں اس شخص کے فتوی پر عمل کرنا واجب ہے جو ان کے اعتقاد میں سب سے افضل ہو۔ اھ اس میں یہ حکم نہیں بتلایا گیا کہ جدھر زیادہ ہوں ادھر ہونا چاہئے بلکہ صاف تصریح ہے کہ عالم افضل کے فتوی پر عمل کرنا چاہئیے جو ان کے اعتقاد میں سب سے افضل ہو۔

۱۳ :۔ وفی المنار ونور الانوار فی تعریف الاجماع هو اتفاق مجتهدین من امة محمد صلی الله علیه وسلم فی عصر واحد امر قولی او فعلی وخلاف الوحد مانع لخلاف الاکثر اھ

وقال فی کشاف اصطلاحات الفنون واحترز بلفظ المجتهدین بلام الاستغراق عن اتفاق بعضهم وعن اتفاق غیرهم من العوام والمقلدین فان موافقتهم ومخالفتهم لا یعبأ بها اھ ج ۳، ص ۲۳۸۔

نور الانوار کی عبارت میں اس کی تصریح ہے کہ خلاف واحد بھی اسی طرح مانع انعقاد اجماع ہے جس طرح خلافِ اکثر اس سے معلوم ہوا کہ مخالفت جمہور کی صورت میں شخص واحد کا قول بھی اسی طرح محتمل صواب ہے جس طرح قول جمہور کی مخالفت ناجائز ہوتی۔ اور اختلاف

کے وقت مشورہ کرنا مسائل شرعیہ میں واجب ہوتا ہے اور جمہور کے خلاف قول ہمیشہ باطل ہوا کرتا تو خلاف واحد ہرگز قادح اجماع نہ ہوتا بلکہ اس کو موافقتِ جمہور پر مجبور کیا جاتا حالانکہ یہ کسی کا مذہب نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ جمہور سے خلاف شخص واحد کا قول صحیح ہوسکتا ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کل کے علماء اگر کسی مسئلہ شرعیہ میں اتفاق کرلیں تو اس کو اجماع شرعی نہ کہیں گے۔ کیونکہ وہ مقلدین کا اجماع ہوگا۔ جو کہ غیر معتبر ہے پس چار سو یا تین سو علماء کے اتفاق کو اجماع کہنا تو کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔ جبکہ ان کے خلاف بھی علماء کی ایک جماعت موجود ہے۔ گو وہ ان کے زعم میں قلیل ہی ہوں۔

فان قلت: قال البیری تحت قاعدۃ الاصل الحقیقۃ ما نصہ متی اختلف فی المسئلۃ فالعبرۃ بما قولہ الاکثر۔ فتاوی حامدیہ ج ۲/ -

قلت ھذا متعلق بباب النقل دون الفھم والاستنباط والعمل بقول الاکثر فی باب النقل متعین فان الخبر المشھور مقدم علی الآحاد والمتواتر مقدم علی کلیھما ودلیل ھذا التقید ما ذکرہ فی ھذہ الفتاوی۔ ج ۲، ص / ۳۲۴

بما نصہ وما نقلہ الشرنبلالی عن العینی فی استنباط الاحکام من جواز لبس الاحمر من الحدیث الشریف فذاک من حیث الاستنباط لا من حیث نقل المذھب والا فنا قل الکراھۃ کثیر بل اکثر والقیاس أن یعمل بما علیہ الاکثر الی ان قال علی ان الذی یجب علی المقلد اتباع مذھب امامہ والظاھر أن ما نقلہ ھؤلآء الآئمۃ ھو مذھب الامام اھ

ولا یخفی ان اختلاف علماء زماننا فی مسئلۃ لیس من باب النقل عن الامام بل انما ھو من باب الاختلاف فی الفھم ولا عبرۃ فیہ للکثرۃ۔

یہ گفتگو تو صورت اولیٰ کی قسم اول میں تھی، رہی دوسری قسم یعنی جبکہ مسائل شرعیہ اعتقادیہ میں اختلاف ہو تو اس صورت میں اکثر کا اتباع کرنا چاہئے یعنی خیر القرون میں جس طرف زیادہ علماء ہوں اس کا اتباع واجب ہے کیونکہ اعتقادیات زمانہ خیر القرون میں مکمل ہوچکے ہیں۔ نیز اس وقت عام طور پر خیر اور حق کا غلبہ تھا اس زمانہ میں اعتقادیات میں جس طرف زیادہ جماعت ہوتی تھی اس طرف غلبہ خیر کا ہوتا تھا اور اعتقادیات کا مدار محض نقل و سماع پر ہے اجتہاد سے اعتقادیات کا ثبوت نہیں ہوسکتا اور علوم نقلیہ کی تکمیل خیر القرون میں ہوچکی ہے اب اعتقادیات میں کسی مسئلہ کا

اضافہ نہیں ہو سکتا خیر القرون کے بعد اعتقادات میں بھی کثرت قائلین کا اعتبار نہیں کیونکہ ان میں غلبۂ خیر نہیں رہا اور چونکہ اعتقادیات کی تکمیل زمانہ صحابہ وتابعین میں ہو چکی ہے اس لئے ان کے خلاف جو قول ہوگا۔ مردود ہوگا۔ گو قائلین کتنے ہی زیادہ ہوں۔

فی المرقات: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اتبعوا سواد الاعظم یعبّر بہ عن الجماعۃ الکثیرۃ والمراد ما علیہ اکثر المسلمین قیل وھٰذا فی اصول الاعتقاد کأرکان الاسلام واما الفروع کبطلان الوضوء بالمس مثلاً فلا حاجۃ فیہ إلی الإجماع بل یجوز اتباع کل واحد من المجتھدین کالائمۃ الاربعۃ ج ۱، ص ۲۰۵۔

اس عبارت سے پہلے جواب کی بھی تائید ہوگئی کہ مسائل فرعیہ میں اکثر کا اتباع ضروری نہیں بلکہ کسی ایک مجتہد کا اتباع بھی جائز ہے۔ گو اس کا قول اکثر کے خلاف ہو فافہم۔

رہی شق ثانی یعنی جبکہ امور انتظامیہ میں اختلاف ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی امام ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی اطاعت کر چکی ہو تو امام کا اتباع اور اس جماعت کی موافقت واجب ہے ان سے امور انتظامیہ میں الگ ہونا اور اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔ البتہ اگر وہ احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کریں تو ایسے کاموں میں ان کی موافقت نہ کی جاوے لانہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق بلکہ خیر خواہی کے ساتھ ایسے امور میں بقدر استطاعت ان کی مخالفت کی جاوے لیکن اس طور پر ان کی مخالفت نہ کی جاوے کہ امام کا مقابلہ کر کے مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ منتشر کیا جاوے ہاں اگر امام اور اس کی جماعت سے کفر صریح کا صدور ہو تو پھر اس کا مقابلہ کرنا اور اس کی جمعیت کو منتشر کرنا بھی جائز ہے۔ بلکہ بقدرِ استطاعت واجب ہے اور اگر مسلمانوں کا کوئی امام نہ ہو تو فقہاء وعابدین ومسلمین صالحین کے مشورہ سے کسی کا امام مقرر کرنا واجب ہے اس صورت میں رائے خاصہ پر عمل جائز نہیں ہے بلکہ جماعت علماء صالحین وجمہور مسلمین جس شخص پر اتفاق کریں اسی کو امام بنانا واجب ہے۔ کیونکہ امامت اشراف واعیان وجماعت مسلمین کی بیعت کر لینے سے ثابت ہوتی ہے۔ ایک دو شخص کی بیعت سے کوئی امام نہیں بن سکتا لہٰذا اس معاملہ میں اہل حل وعقد کی جماعت کے اکثر افراد کا اتفاق معتبر ہے شخص واحد کی رائے معتبر نہیں بلکہ شخص واحد کو جماعت سے اختلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر جماعت علماء وجمہور مسلمین کسی شخص واحد کی رائے پر اس معاملہ کو چھوڑ دیں تو اس صورت میں رائے خاصہ پر عمل جائز ہوگا۔ کیونکہ وہ شخص جماعت مسلمین کا وکیل ہے اس کی رائے گویا سب کی رائے ہوگی۔ اسی طرح اگر خلیفہ سابق اپنے بعد کے لئے کسی خاص شخص کو خلیفہ

بنا جاوے تو اس صورت میں بھی اس کی رائے کا اتباع جائز بلکہ ضروری ہے۔ بشرطیکہ جس کو نامزد کیا گیا ہے نا اہل نہ ہو۔

پس اگر مشورہ وغیرہ سے کسی ایک امام پر اتفاق ہو گیا تب تو اس کے احکام وہی ہیں جو شق اول کے احکام ہیں کہ پھر امام اور جماعت مسلمین کی مخالفت امور انتظامیہ میں کسی کو جائز نہیں بتفصیلہ الذی ذکرناہ آنفاً، اور اگر مشورہ سے کسی ایک امام پر اتفاق نہ ہوا بلکہ اختلاف پیدا ہو گیا تو ان سب جماعتوں سے الگ ہو جانا چاہیئے اس صورت میں کسی جماعت کا اتباع واجب نہیں، عزلت بہتر ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رأی من امیرہ شیئاً یکرھہ فلیصبر علیہ۔ فانہ من فارق الجماعۃ شبراً فمات الامات میتۃ جاھلیۃ رواہ البخاری فتح الباری ج ۱۳، ص ۵

وفی الفتح، قال ابن بطال فی الحدیث حجۃ فی ترک الخروج علی السلطان ولو جار وقد اجمع الفقھاء علی وجوب طاعۃ السلطان المتغلب والجھاد معہ و ان طاعتہ خیر من الخروج علیہ لما فی ذلک من حقن الدماء وتسکین الدھماء وحجتھم ھذا الخبر وغیرہ مما یساعدہ ولم یستثنوا من ذالک الا اذا وقع من السلطان الکفر الصریح فلا تجوز طاعتہ فی ذلک (الوقت) بل تجب مجاھدتہ لمن قدر علیھا ج ۱۳، ص ۵

وعن عبادۃ بن الصامت قال دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ فقال فیما اخذ علینا ان بایعنا علی السمع والطاعۃ (الی ان قال) وان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان اھ مختصراً رواہ البخاری کذا فی الفتح ج ۱۳، ص ۶۔

وفی الفتح عن عبادۃ مرفوعاً سیکون علیکم امراء یامرونکم بما لا تعرفون و یفعلون ما تنکرون فلیس لاولئک علیکم طاعۃ اھ قال الحافظ والذی یظھر حمل روایۃ الکفر علی ما اذا کانت المنازعۃ فی الولایۃ فلا ینازعہ بما یقدح فی الولایۃ الا اذا ارتکب الکفر وحمل روایۃ المعصیۃ علی ما اذا کانت المنازعۃ فیما عدا الولایۃ فاذا لم یقدح فی الولایۃ نازعہ فی المعصیۃ بان ینکر علیہ برفق ویتوصل الی

تثبیت الحق لہ بغیر عنف ومحل ذلك اذا كان قادرًا، واللہ اعلم

ونقل ابن التین عن الداود قال الذی علیہ العلماء فی امراء الجور انہ ان قدر علی خلعہ بغیر فتنۃ ولاظلم وجب والا فالواجب الصبر وعن بعضہم لایجوز عقد الولایۃ لفاسق ابتداء فان احدث جورًا بعد ما كان عدلا فاختلفوا فی جواز الخروج علیہ والصحیح المنع الا ان یکفر فیجب الخروج علیہ، اھ ج ر ۱۳، ص ر ۶۔

وعن حذیفۃ فی حدیث طویل قلت: فھل بعد ذالك الخیر من شر قال نعم: دعاۃ علی ابواب جہنم من اجابہم الیہا قذفوہ فیہا قلت یا رسول اللہ صفہم لنا قال ہم من جلدتنا ویتکلمون بالسنتنا قلت فما تأمرنی ان ادرکنی ذلك قال تلزم جماعۃ المسلمین وامامہم قلت فان لم یکن لہم جماعۃ ولا امام قال: فاعتزل تلك الفرق کلہا ولوان تعض باصل شجرۃ حتی یدرکك الموت وانت علی ذلك رواہ البخاری وفی الفتح قال الطبری اختلف فی ھذا الامر وفی الجماعۃ فقال قوم ھو للوجوب والجماعۃ السواد الاعظم وقال قوم المراد بالجماعۃ الصحابۃ دون من بعدہم وقال قوم المراد بہم اھل العلم لان اللہ جعلہم حجۃ علی الخلق والناس تبع لہم فی امر الدین قال الطبری والصواب ان المراد من الخبر لزوم الجماعۃ الذین فی طاعۃ ای اجتمعوا علی تامیرہ فمن نکث بیعتہ خرج عن الجماعۃ قال وفی الحدیث انہ حتی لم یکن للناس امام فنفرق الناس احزابا فلا یتبع احدا فی الفرقۃ ویعتزل الجمیع ان استطاع ذلك خشیۃ من الوقوع فی الشر اھ ج ر ۱۳، ص ر ۳۱۔

واخرج الطبری وصححہ ابن حبان عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف بك یا عبد اللہ بن عمرو اذا بقیت فی حثالۃ من الناس وقد مرجت عھودھم واماناتھم واختلفوا فصاروا ھکذا وشبك بین اصابعہ قال فی تامرنی قال علیك بخاصتك ودع عنك عوامہم فتح الباری ج ر ۱۳، ص ۳۲۔

اس تمام گفتگو کے بعد ان احادیث کا مطلب سمجھنا چاہیئے جو سائل نے بیان کی ہیں۔ حدیث

اول جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے اور مجمع الزوائد میں مذکور ہے۔ وہ ہمارے نزدیک ان مسائل شرعیہ پر جن کا حکم کتاب وسنت یا اجماع امت یا قیاس سے معلوم ہو چکا ہے محمول نہیں۔ بلکہ امور انتظامیہ اور امور مسکوت عنہا فی الشرع کے متعلق ہے، پس مسائل حاضرہ میں اس حدیث سے استدلال کر کے مشورہ کو واجب کہنا اور جماعت کثیرہ کے مشورہ پر عمل کو لازم کہنا اس پر موقوف ہے کہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ شریعت میں مسائل حاضرہ کے احکام موجود نہیں اس لئے ان میں مشورہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کو ہر گز کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ہر فریق اپنے مسلک کو دلائل شرعیہ سے ثابت کر رہا ہے۔ یا یہ مان لیا جاوے کہ مسائل حاضرہ کا تعلق محض امور انتظامیہ سے ہے مسائل شرعیہ کی قسم سے نہیں ہے۔ مگر سائل اس کو بھی تسلیم نہیں کرتا اگر اس کو تسلیم کر لیا جاوے تو پھر ان علماء کی غلطی یقیناً تسلیم کرنا پڑے گی جو ان تحریکات سے علیحدہ رہنے والی جماعت کو فاسق وغیرہ کا خطاب دیتے ہیں کیونکہ امور انتظامیہ جو محل مشورہ ہیں ان میں مشورہ پر عمل کرنا اس وقت واجب ہے۔ جبکہ مسلمانوں کا کوئی امام مسلم ہو اور مشورہ کی جانب اس کی رائے کی موافقت سے مؤید ہو چکی ہو اور اگر امام نہ ہو تو امور انتظامیہ میں بھی کسی کے مشورہ پر عمل کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ وجوب و فرضیت کا ثبوت دلائل شرعیہ سے ہی ہو سکتا ہے اور دلائل شرعیہ۔ کتاب وسنت اجماع امت و قیاس میں منحصر ہیں۔ مشورہ کو کسی نے دلائل شرعیہ سے بیان نہیں کیا۔ جس سے وجوب عمل کو ثابت کیا جاوے۔ وسیأتی ذلك مفصلاً۔

پس حدیث مجمع الزوائد کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت کسی کو خلیفہ یا امام بنایا جاوے یا امور حرب درپیش ہوں یا کسی امر میں نصوص سے جانب فعل یا ترک کو ترجیح نہ ہو، اس میں فقہاء وعابدین سے مشورہ کیا جائے، کسی شخص واحد کی رائے اس میں نافذ نہ کی جاتے، اور اس پر چند قرائن ہیں۔

اول تو خود اس میں لفظ تشاوراس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ حکم ایسے امر کے متعلق ہے جو محل مشورہ ہے اور محل مشورہ مسائل شرعیہ نہیں۔ اور ایسے امور محل مشورہ کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ نص صریح موجود ہے۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔ وما فرطنا فی الکتاب من شیء۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے دین کے متعلق کوئی بات کتاب میں نہیں چھوڑی اور یہ ظاہر ہے کہ صراحۃً تمام جزئیات کے احکام قرآن میں نہیں اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام صراحۃً ہیں اور بعض دلالۃً واشارۃً جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

بعد علماء و مجتہدین نے سمجھا اور فقہ میں بیان کیا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے لعلمه الذین یستنبطونه منهم جس میں علماء کو قیاس کی اجازت دی گئی ہے الغرض مسائل شرعیہ کے احکام بأسرها شریعت میں موجود ہیں وہ ہرگز محتاج مشورہ نہیں ہیں۔ اور اگر کسی مسئلے مسائل شرعیہ میں مشورہ ثابت ہو تو وہ محض تطییب قلب یا استمداد کے طور پر تھا ضرورت کے درجہ میں نہ تھا بلکہ مثل مشورہ امور دنیوی ہیں یا امور انتظامیہ متعلق امامت و خلافت و جہاد وغیرہ بشرطیکہ حکم شرعی اس کے متعلق دلائل شرعیہ سے معلوم نہ ہوا ہو یا وہ امور ہیں جن سے شریعت میں سکوت ہے۔ اور قیاس سے کسی جانب کو ترجیح معلوم نہیں ہوئی نہ ترک کو اور نہ فعل کو اگر معلوم ہو جائے تو پھر وہ بھی محل مشورہ نہیں۔

قال الحافظ فی الفتح وقد اختلف فی متعلق المشاورة فقیل فی کل شیء لیس فیه نص وقیل فی الامر الدنیوی فقط: وقال الداودی انما کان صلی اللّٰه علیه و سلم یشاورهم فی امر الحرب مما لیس فیه حکم لان معرفة الحکم انما تلتمس منه قال ومن زعم انه کان یشاورهم فی الاحکام فقد غفل غفلة عظیمة واما فی غیر الاحکام فربما رأی غیره او سمع مالم یسمعه اویره کما کان یستصحب الدلیل فی الطریق اھ ج/۱۳، ص/۲۸۳۔

وقال البخاری رحمه اللّٰه فی صحیحه: وکانت الائمة بعد النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یستشرون الامناء من اهل العلم فی الامور المباحة لیاخذوا بأسهلها فاذا وضح الکتاب او السنة لم یتعدوه الی غیره اقتداء بالنبی صلی اللّٰه علیه وسلم ورأی ابوبکر قتال من منع الزکوٰة فقال عمر: کیف تقاتل وقد قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم أمرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا الحدیث فقال ابوبکر واللّٰه لاقاتلن من فرق بین ما جمع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ثم تابعه بعد عمر فلم یلتفت ابوبکر الی مشورة اذ کان عنده حکم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی الذین فرقوا بین الصلوٰة والزکوٰة وارادوا تبدیل الدین واحکامه وقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم من بدل دینه فاقتلوه الخ فتح الباری ج/۳، ص/۲۸۶۔

وقال الحافظ فی شرح قوله فی الامور المباحة لیأخذوا بأسهلها اذا لم یکن

فيها نص بحكم معين وكانت على اصل الاباحة فمراده ما احتمل الفعل والترك احتمالا واحداً واما ما عرف وجه الحکم فيه فلا اھ ج ۱۳، ص ۲۸۵۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسائل شرعیہ جبکہ ان کا حکم کتاب وسنت اجماع یا قیاس سے معلوم ہوچکا ہو۔ محل مشورہ ہرگز نہیں ہاں وہ امور جو بوجہ سکوت شارع کے بظاہر اباحتِ اصلیہ پر ہوں اوران میں فعل اور ترک دونوں کا احتمال مساوی ہو وہ محل مشورہ ہیں۔ اور اگر ان میں بھی ایک جانب کا حکم دلیل شرعی سے معلوم ہوجائے تو پھر وہ بھی محل مشورہ نہیں۔ لہٰذا مجمع الزوائد کی حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ جب علماء میں کسی مسئلہ شرعی میں اختلاف ہو تو اہل مشورہ اور جماعت کثیرہ کا قول واجب الاتباع ہے اور جماعتِ قلیلہ یا شخص واحد کا قول قابل ترک ہے کسی طرح تام نہیں ہوسکتا پھر ہم بطریق تنزل کہتے ہیں اس حدیث کو عموم پر ہی رکھا جائے اور مسائل شرعیہ کو بھی محل مشورہ مان لیا جائے پھر بھی مستدل کو یہ ثابت کرنا لازم ہے کہ مشورہ کرنا اور مشورہ میں جس طرف کثرت رائے ہو تو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ حالانکہ وہ اس کو ہرگز ثابت نہیں کرسکتا، محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مشورہ کا امر آیت قرآنیہ وشاورھم فی الأمر وأمرھم شوریٰ بینھم میں استحباب اور ندب کے سے ہے۔ پھر اس حدیث کو استحباب پر کیوں محمول نہ کیا جائے۔ رہی یہ بات کہ مشورہ میں جس طرف زیادہ جماعت ہو اس پر عمل کرنا واجب ہے یہ بھی غلط ہے بلکہ اگر کسی عالم کا اجتہاد سب کے خلاف ہو تو اس کو دوسروں کا اتباع جائز نہیں کیونکہ مشورہ دلائل شرعیہ سے مثل اجماع وقیاس کے نہیں ہے۔ بلکہ محض معین کے درجہ میں ہے۔

قال الحافظ فی الفتح وعد کثیر من الشافعية المشاورة من الخصائص واختلفوا فی وجوبها فنقل البيهقی فی المعرفة الاستحباب عن النص وبه جزم ابو نصر القشيری فی تفسيره وهو المرجح ج ۱۳، ص ۲۸۳

وفيه ايضاً: قال الشافعی انما يؤمر الحاکم بالمشورة لکون المشير ينبهه علی ما يغفل عنه ويدل علی ما لا يحضره من الدليل لا ليقلد المشير فيما يقوله فان الله لم يجعل هذا الامر بعد رسول الله صلی الله عليه وسلم اھ ج ۱۳، ص ۲۸۵

؎ اس رسالہ میں شافعیہ کے جو اقوال لکھے گئے ہیں وہ قواعد حنفیہ کے موافق ہیں۔ ۱۲ منہ

وفیہ ایضاً : عن الشافعی واذا قاس من له القیاس فاختلفوا وسع کلا أن یقول بمبلغ اجتهاده ولم یسعه اتباع غیره فیما اداه الیه اجتهاده اھ ج ۱۳، ص ۲۵۲
اور اگر تھوڑی دیر کے لئے امر مشورہ کو وجوب پر ہی محمول کیا جائے تو پھر سائل کو یہ بتلانا چاہیئے کہ مشورہ کرنا صرف علماء حاضرین سے واجب ہے یا غائبین سے بھی یقیناً وہ دوسری شق کو ثابت نہیں کر سکتا۔ اور مسائل حاضرہ میں جو مقدس عالم جمہور سے الگ ہیں ان کی بابت یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ان مسائل میں ان علماء سے بھی مشورہ نہیں کیا جو ان کے پاس حاضر تھے ہم کو خوب معلوم ہے کہ انہوں نے ان مسائل میں جو رائے قائم کی ہے وہ علماء حاضرین کے مشورہ کے بعد قائم کی ہے۔ اور دنیا بھر کے علماء کے مشورہ کا وجوب کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ لہٰذا ان کو حدیث مجمع الزوائد سے کسی طرح مخالف نہیں کہا جا سکتا۔

رہی دوسری حدیث جو ابن ماجہ سے بروایت انس بن مالک رضؓ سوال میں مذکور ہے یعنی فاذا رأیتم اختلافاً فعلیکم بالسواد الاعظم اور جس کو عزیزی میں ابن ماجہ کے رمز سے نقل کر کے حدیث صحیح کہا ہے اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ حدیث بروایت ابن ماجہ صحیح نہیں ہے۔ اور عزیزی کا ابن ماجہ کے حوالہ سے نقل کر کے اس کو صحیح کہنا غایت تساہل ہے کیونکہ ابن ماجہ کی سند میں ایک راوی ابو خلف اعمی موجود ہے جس کو ابو حاتم نے منکر الحدیث اور ابن معین نے کذاب کہا ہے۔

ففی تهذیب التهذیب: فی ترجمته قال ابوحاتم: منکر الحدیث لیس بقوی الی ان قال نقل ابن الجوزی عن ابن معین انه قال فی الاعمی عن انس حازم بن عطاء وانه تفرد بالحدیث الذی أخرجه ابن ماجه اھ ج ۱۲، ص ۸۷، ۸۸

مشکوٰۃ میں اس حدیث کو ابن عمر کی طرف منسوب کر کے دوسرے الفاظ سے نقل کیا ہے لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں لکھا بلکہ بیاض چھوڑ دی۔ میرک شاہ نے اس میں رواہ ابن ماجہ عن انس ملحق کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث بروایت ابن عمر ان کو نہیں ملی اور حدیث انس کا ضعیف ہونا معلوم ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہ بھی کچھ مفید نہ ہوئی۔ لیکن مقاصد حسنہ میں حدیث لایجمع امتی علی ضلالۃ کے طرق جمع کرتے ہوئے حافظ سخاوی نے فرمایا ہے۔

وابونعیم فی الحلیة والحاکم فی مستدرکه واعله واللالکائی فی السنة وابن مندة ومن طریقه ایضاً فی المختارة عن ابن عمر رفعه ان الله لایجمع هذه الامة

علی ضلالة ابداً وان ید اللہ مع الجماعة فاتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شذ فی النار وھکذا ھو[عـہ] عند الترمذی ولکن بلفظ ھٰذہ الامة او قال امتی اھ ص ۲۱۵

اس سے معلوم ہوا کہ ابن عمر سے اس حدیث کو ضیاء مقدسی نے بھی مختارہ میں نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ قریب قریب مشکوٰۃ ہی کے الفاظ ہیں۔ لیکن اس پر کلام یہ ہے کہ ترمذی نے ابن عمر سے جس سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے اس میں ایک راوی سلیمان بن سفیان متفق علیہ ضعیف و منکر الحدیث ہے۔ تہذیب میں کسی سے بھی اس کی توثیق نقل نہیں کی۔ اِلیٰ ان قال وذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال کان یخطئ۔ اور عبداللہ بن دینار سے تو اس کی روایت خصوصیت کے ساتھ منکر ہے۔ قال ابو زرعة منکر الحدیث روی عن عبداللہ بن دینار ثلثة احادیث کلھا یعنی مناکیر اھ (ج ۴، ص ۱۹۴) ترمذی نے حدیث بیان کرکے کہا ہے کہ ھٰذا حدیث غریب من ھٰذا الوجه وسلیمان المدینی ھو عند سلیمان بن سفیان اھ (ج ۲، ص ۳۹)

پس اگر ضیاء مقدسی نے بھی مختارہ میں اسی سند سے حدیث کو روایت کیا ہے تب تو وہ ہرگز قابل احتجاج نہیں اور اگر دوسری سند سے نقل کیا ہے تو یہ معلوم نہیں کہ ضیاء مقدسی کے الفاظ کیا ہیں کیونکہ اصحاب اطراف وجامعین طرق کی عادت ہے کہ وہ فی الجملہ مشارکت معنی سے ایک حدیث کو متعدد مخرجین کی طرف منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ الفاظ ہر ایک کے جدا جدا ہوتے ہیں۔

چنانچہ اسی جگہ حافظ سخاوی نے اس حدیث کو ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ ترمذی میں فاتبعوا السواد الاعظم کا لفظ نہیں ہے۔ مگر چونکہ حافظ کو لایجمع امتی علی ضلالة کے طریق کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون ترمذی میں تھا اس لئے اس حدیث کو ترمذی کی طرف منسوب کر دیا تو ممکن ہے کہ اسی طرح ضیاء فی المختارہ نے بھی لایجمع امتی علی ضلالة کے مضمون کو بدون لفظ فاتبعوا السواد الاعظم کے روایت کیا ہو۔ اس لئے ضیاء مقدسی کے مختارہ کی طرف اسی حدیث کا منسوب ہونا بلفظِ مذکور اس کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ حافظ سخاوی نے حدیث ابن عمر کو جن الفاظ سے نقل کیا ہے ضیاء مختارہ کے بھی الفاظ ہیں تب بھی یہ حدیث سائل کو مفید نہیں کیونکہ اس میں اختلاف کا ذکر نہیں جس سے یہ مضمون مستنبط کیا جائے کہ اختلافِ علماء کے وقت سواد اعظم کا اتباع واجب بلکہ اس سے سواد اعظم کا

عـہ: لیس عند الترمذی قوله فاتبعوا السواد الاعظم ۱۲ منه

وجوب بطریق اطلاق ثابت ہوتا ہے جو ہمارے نزدیک حالت اتفاق پر محمول ہے یعنی جب سواد اعظم یعنی جمع علماء امت کسی مسئلہ پر اتفاق کرلیں تو اس کا اتباع واجب ہے اور اس سے اجماع کی حجیت ثابت ہوتی ہے نہ کہ اختلاف علماء کے وقت قول جمہور کی حجیت۔ اختلاف کے وقت سواد اعظم کا اتباع ہونا صرف ابن ماجہ کی حدیث سے معلوم ہو رہا ہے۔ جس کا ضعیف ہونا اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اور حافظ سخاوی نے ابن ماجہ کے ساتھ مسند عبد کی طرف بھی ان الفاظ کو منسوب کیا ہے۔ مگر مسند عبد کی سند معلوم نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ مسند عبد میں بھی یہ حدیث بروایت انس ہے جس سے ظاہر یہ ہے کہ اس میں بھی ابوخلف اعمیٰ موجود ہے۔ کیونکہ دارقطنی نے حدیث انس مذکور فی ابن ماجہ کو افرادِ ابی خلف سے بتایا ہے۔ لہٰذا بایں الفاظ یہ حدیث حجت نہیں ہوسکتی۔ اور بعد تسلیم کے ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ حدیث ابن ماجہ سے بھی سائل کا مدعی حاصل نہیں کیونکہ اس میں بھی یہ تصریح نہیں کہ جب علماء میں اختلاف ہو تو علماء کی جماعت کثیرہ کا اتباع لازم ہے بلکہ اس کا مضمون اس قدر ہے کہ میری امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہوسکتی پس جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کا اتباع کرو۔

ہمارے نزدیک سواد اعظم سے صرف علماء مراد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب جہلاء امت علماء سے اختلاف کریں تو علماء کا اتباع واجب ہے۔ یہ مطلب اس سے نہیں نکلتا کہ علماء میں اختلاف ہو تو ان کی جماعت کثیرہ کا اتباع لازم ہے۔ بلکہ علماء میں سے ہر واحد کا اتباع جائز ہے خواہ وہ واحد ہو یا جماعت کثیرہ۔ کیونکہ ہم اس سے پہلے زاد المعاد کی عبارت نقل کر چکے ہیں کہ صحابہ کے وقت سے اس وقت تک مخالفت جمہور کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے اور کسی نے کسی امام کا قول یہ کہہ کر رد نہیں کیا کہ یہ قول جمہور کے خلاف ہے اس لئے رد ہے۔ لہٰذا اس حدیث ضعیف کو اسی معنی پر محمول کرنا واجب ہے جو ہم نے بیان کئے ہیں تاکہ اجماع کی مخالفت لازم نہ آئے فافہم اور علماء کا ہی اختلاف مراد ہو تو اس میں اختلاف فی الفروع مراد نہیں بلکہ اختلاف فی الاصول الاعتقادیات مراد ہے جیسا کہ مرقات سے یہی تفصیل ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ مرقاۃ میں اس کے بعد سواد اعظم کے چند معنی اور لکھیں ہیں۔

وقیل المراد جمع المسلمین الذین ھم فی طاعۃ الامام وھو سلطان الاعظم اھ۔

اس صورت میں اختلاف مذکور فی الحدیث سے امور انتظامیہ میں اختلاف مراد ہوگا نہ کہ

مسائل شرعیہ میں۔ اس کے بعد لکھا ہے۔

وقیل کل عالم عامل بالکتاب والسنۃ فی الازھار اتبعوا السواد الاعظم یدل علی ان اعانھم الناس العلماء ولم یقل الاکثر لان العوام والجھال اکثر عددا اھ

ج ر ۱، ص ر ۲۰۶

اس سے یہ معلوم ہوا کہ سواد اعظم سے ہر وہ عالم مراد ہے جو کتاب وسنت پر عامل ہو نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کثرت قائلین معتبر نہیں کیونکہ کثرت تو جہال ہی کی ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد اعظم فرمایا۔ سواد اکثر نہیں فرمایا۔ اور بعض علماء نے سواد اعظم کی تفسیر کو صحابہ کے ساتھ خاص کیا ہے۔ لہٰذا اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے یہ حدیث جس کی صحت پر بھی کلام ہے کسی طرح سائل کو مفید نہیں ہو سکتی۔

رہی تیسری حدیث جو سائل نے ترمذی سے نقل کی ہے۔ علیکم بالجماعۃ وایاکم والفرقۃ الخ اس سے اجماع علی الامام مراد ہے۔ یعنی جب ایک جماعت مسلمانوں کی کسی شخص کو امام تسلیم کرلے تو ان سے اختلاف مت کرو۔ اس سے بھی امور انتظامیہ میں اتباع جماعت کا امر معلوم ہوا بشرطیکہ مسلمانوں کا کوئی امام بھی ہو اور دلیل اس مراد کی بخاری کی یہ حدیث ہے۔

من رأی منکم من أمیرہ شیئا یکرھہ فلیصبر علیہ فانہ من فارق الجماعۃ شبرًا فمات الامات میتۃ الجاھلیۃ اھ ج ر ۱۳، ص ر ۵ فتح الباری۔

اس حدیث میں مفارقت عن الجماعۃ کی وعید کو صبر علی الامام پر مرتب فرمانا صاف بتلا رہا ہے کہ جس مفارقت جماعت کی ممانعت ہے وہ امام سے مفارقت ہے پس علیکم بالجماعۃ وایاکم والفرقۃ کا مطلب بھی واضح ہو گیا کہ موافقت امام کا امر ہے۔ اور اس کی مخالفت اور مفارقت سے ممانعت ہے ہم پہلے فتح الباری کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ طبری نے علیکم بالجماعۃ کی اس تفسیر کو صواب قرار دیا ہے۔ اور بعض علماء نے جماعت سے خاص جماعتِ صحابہ کو مراد لیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی اس مضمون پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی کہ اختلاف علماء کے وقت جماعت کثیرہ کا اتباع واجب ہے اور جماعتِ قلیلہ یا عالم واحد کا اتباع جائز نہیں۔

اب میں چند واقعات پر اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ کہ مسائل شرعیہ میں کثرت کی رائے پر حقانیت کا مدار نہیں رکھا گیا۔ بلکہ ہمیشہ قوت دلیل پر مدار رکھا گیا ہے۔ گو وہ شخص واحد کا قول ہو یا جماعتِ قلیلہ کا۔

۱ : اساریٔ بدر کے واقعے میں حضرت عمرؓ وسعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے تمام صحابہؓ کے خلاف تھی اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک بھی عام آراء کے ساتھ تھی مگر وحی سے حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق فیصلہ ہوا۔ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار نہیں کیا گیا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی مفضول کی رائے فاضل کی رائے سے اصوب ہو سکتی ہے۔ گو اس کو بھی فاضل کا فعل شمار کیا جائے۔ حدیث پر نظر رکھنے والے اس واقعہ کو خوب جانتے ہیں۔

۲ : جنگ اُحد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمیوں کو ایک مورچہ کی حفاظت کے لئے متعین فرمایا اور ان سے یہ فرمایا تھا کہ تم کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم پر کچھ بھی حالت گذر جائے۔ جب مسلمانوں کا لشکر کفار پر غالب آگیا اور اہل مکہ بے تحاشا بھاگنے لگے تو ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا اکثر کی رائے یہ ہوئی کہ اب مورچہ پر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دشمن مغلوب ہو چکا ہے ہم کو بھی غنیمت کا مال لوٹنا چاہئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا بطور مبالغہ و تاکید کے تھا۔ اور مقصود یہ تھا کہ وقت ضرورت تک یہاں سے نہ ہٹنا۔ اب ضرورت نہیں رہی بعض کی رائے یہ ہوئی کہ نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ممانعت کے بعد ہمیں یہاں سے نہ ہٹنا چاہیئے۔ اس اختلاف کے بعد چالیس آدمیوں نے مورچہ چھوڑ دیا اور دس آدمی وہیں جمے رہے، وحی سے ان دس آدمیوں کی رائے صائب (درست) قرار دی گئی اور چالیس کی رائے کو معصیت میں داخل کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف علماء کے وقت جماعت قلیلہ کی رائے بھی حق ہو سکتی ہے۔ بخاری و فتح الباری سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز عبداللہ بن جبیر کے جو ان پچاس تیراندازوں کے افسر تھے اور سب کی بھی رائے ہوئی کہ ہم کو لشکر میں شامل ہو کر غنیمت لوٹنی چاہیئے۔

۳ : سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور دفن کے بعد سب سے پہلا کام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفۂ اول نے یہ کیا کہ لشکر اسامہؓ کو شام کی طرف بھیجنا چاہا جس میں مہاجرین اولین و اجل صحابہ شامل تھے تقریباً تمام صحابہ نے ان کی اس رائے سے مخالفت کی اور عرض یہ کیا کہ اس وقت قبائل عرب میں اختلاف وارتداد کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ آپ کو اس لشکر کے مدینہ میں رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر حضرت صدیق اکبر نے یہ کہہ کر اُن کی رائے کو رد کر دیا۔

واللہ لا احل لواء عقدھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ۔

بخدا میں اس جھنڈے کو کبھی نہ کھولوں گا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے باندھا ہے۔ اور ابن اثیر نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

والذی نفسی بیدہ لوظننت ان السباع تختطفنی لانفذت جیش اسامۃ کما امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھ ج ر ۲، ص ر ۱۶۱۔

قسم اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اگر مجھ کو اس کا بھی یقین ہو جائے کہ اس لشکر کے بھیجنے کے بعد مجھ کو درندے پھاڑ ڈالیں گے جب بھی میں جیشِ اسامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق بھیج کر رہوں گا۔ چنانچہ لشکر روانہ ہوا اور کسی صحابی نے حضرت صدیق رضؓ سے یہ کہنے کی جرأت نہ کی کہ یہ مسئلہ اختلافی ہو گیا ہے اس میں آپ کو تنہا اپنی رائے پر نہ اڑنا چاہیئے۔ جماعت کے مشورہ پر عمل کرنا چاہئے۔ بلکہ بعد میں سب کو اقرار کرنا پڑا کہ جیشِ اسامہ کے بھیجنے میں حضرت صدیق رضؓ کی رائے صحیح تھی۔

دیکھو کامل ابن الاثیر ج ر ۲، ص ر ۱۶۲۔

۴ : اسی طرح حضرت صدیق رضؓ کی رائے وصال نبوی کے بعد یہ ہوئی کہ جن قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے ان پر جہاد کیا جائے اس میں بھی تمام صحابہ کی رائے ان کے خلاف تھی کہ جب وہ لوگ کلمۂ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہیں تو ان سے چند اونٹوں اور بکریوں کے لئے کیونکر جہاد کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے بھی حضرت صدیق رضؓ کی رائے سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ آپ کو اس معاملہ میں نرمی اور تالیف قلوب سے کام لینا چاہیئے۔ جس کا جواب نہایت سختی کے ساتھ حضرت صدیق رضؓ نے ان لفظوں میں دیا۔

" أجبارٌ فی الجاھلیۃ وخوارٌ فی الاسلام انہ قد انقطع الوحی وتم الدین أینقص وأنا حیی رواہ رزین مشکوٰۃ ج ر ۱، ص ر ۵۷۵۔

اے عمر یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو ایسے زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے۔ وحی منقطع ہو چکی ہے اور دین مکمل ہو چکا تو کیا میری زندگی ہی میں اس میں نقصان آجائے گا بالآخر صحابہ نے حضرت صدیق کی رائے کے آگے گردنیں جھکا دیں۔ اور کسی نے جرأت کر کے یہ عرض نہ کیا کہ مسئلہ اختلافی ہو گیا ہے اس میں آپ کو جماعت کثیرہ کی رائے پر عمل کرنا چاہیئے۔ تنہا اپنی رائے کو نہ چلانا چاہیئے۔ بلکہ بعد میں صحابہ نے اس کا اقرار کیا کہ اگر اس وقت ابوبکر نہ ہوتے تو ہم سب ہلاکت میں پڑ چکے تھے۔

قال عبد اللہ بن مسعود لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما کدنا ان نھلک فیہ لولا ان اللہ من علینا بأبی بکر اجمعنا علی أن لا نقاتل علی بنت مخاض وابنۃ لبون ولعبد اللہ حتی یأتینا الیقین فعزم اللہ لابی بکر علی قتالھم

الخ۔ کامل ابن الاثیر ج ۲، ص ۱۶۵۔

اس واقعہ سے فقہاء کے اس قول کی تائید ہوگئی کہ خلاف واحد بھی قادح اجماع ہے کیونکہ اس وقت بجز صدیق اکبرؓ کے اور تمام صحابہ کی رائے تھی کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال نہ کرنا چاہئے۔ مگر سب کی رائے غلط تھی اور حضرت صدیق ہی کی رائے صواب تھی۔

نیز ان واقعات سے ان لوگوں کو بھی اپنی غلطی کی اصلاح کرنا چاہئے جو یوں کہتے ہیں کہ اسلام نے جمہوری حکومت کی تعلیم دی ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ارسال جیش اسامہ وقتال اہل ردت کے معاملے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کس دلیری کے ساتھ اپنی شخصی رائے پر عمل کیا اور تمام صحابہ نے کس اخلاص کے ساتھ اُن کی رائے کا اتباع کیا۔ اسلام میں یہ تعلیم ضرور ہے کہ خلیفہ وامام جماعت مسلمین کے مشورہ سے مقرر ہونے چاہئیں۔ بشرطیکہ خلیفۂ سابق نے کسی کو اپنی نیابت وخلافت کے لئے نامزد نہ کیا ہو۔ ورنہ پھر مشورہ کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خلیفہ کا مقرر کردہ شخص اگر نااہل نہ ہو تو سب سے مقدم ہوگا۔ بعد خلیفہ مقرر ہوجانے کے تمام نظم ونسق سلطنت کا اس کی ذاتی رائے پر ہوگا۔ البتہ خلیفہ کو اصحاب علم وفہم سے مشورہ کرتے رہنا مستحب ہے لیکن مشورہ کا قبول کرنا اس کے ذمہ[ع] لازم نہیں اگر اس کی رائے مشیرین کی رائے سے موافقت کرجائے تو قبول کرلے ورنہ اپنی رائے پر عمل کرنے کا اسے کامل اختیار ہے۔ اور مسلمانوں کو اس کا اتباع واجب ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی معصیت لازم نہ آتی ہو۔ لانہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق ومر ذکرہ سابقاً فتدبر۔

۵: حضرت علی کرم اللہ وجہہ وحضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان میں تقریباً تمام صحابہ کی رائے تھی کہ صاحب حق کی اعانت کرنا چاہئے چنانچہ جس طرح ان کی ایک بڑی جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ اسی طرح کثیر جماعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی تھی لیکن معدودے چند صحابہ کی یہ رائے تھی کہ دونوں سے الگ رہنا چاہئے، جیسے عبداللہ بن عمر، ابوموسیٰ اشعری، ابومسعود انصاری، ابوبکرہ اور احنف بن قیس مگر کہیں یہ بات ثابت نہیں کہ ان معدودے چند حضرات کو کسی نے مخالفت جمہور کی وجہ سے فاسق وفاجر یا بزدل کا خطاب دیا

ع یؤیدہ قولہ تعالیٰ: وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ لم یقل فاذا عزمتم فدل علی ان الامام یستبد فی العزم بعد الشوریٰ ولیس للمشیرین فی العزم بنصیب ۱۲ منہ

ہو۔ معلوم ہوا کہ مسائل شرعیہ میں جمہور کا قول و فعل حجتِ ملزمہ نہیں ہے۔ ورنہ یہ معدودے چند صحابہ جمہور کی مخالفت نہ کرتے۔

نیز معلوم ہوا کہ اگر کسی عالم کا قول جمہور کے خلاف ہو تو وہ فاسق وغیرہ نہیں بن جاتا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اسی کی رائے صواب ہو اور جمہور کی رائے غلط ہو۔

۶:۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد بجز عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ و امام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے تمام صحابہ و تابعین نے یزید کی بیعت قبول کر لی تھی اور اجلہ صحابہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو یزید پر خروج کرنے سے بہت زور کے ساتھ منع بھی فرمایا تھا جیسا کہ تاریخ دیکھنے والوں سے یہ واقعہ مخفی نہیں۔ پس اگر کثرت رائے پر حق و باطل کا مدار کیا جائے اور مشورہ جماعتِ کثیرہ پر عمل کو واجب کہا جائے تو نعوذ باللہ حضرت امام علیہ السلام سبط رسول کا باطل پر ہونا لازم آئے گا اور اس کو ہرگز کوئی مسلمان قبول نہیں کر سکتا معلوم ہوا کہ قول جمہور حجت ملزمہ شرعیہ نہیں بلکہ اس کی مخالفت جائز ہے۔ اور ممکن ہے کہ جمہور کے خلاف جماعتِ قلیلہ یا شخص واحد کی رائے صحیح ہو۔

۷:۔ مامون الرشید خلیفہ عباسی نے جس وقت خلقِ قرآن کے مسئلہ میں علماء وقت کا امتحان لیا تو بجز احمد رضی اللہ عنہ کے اور سب علماء نے طوعاً یا کرہاً یا توریۃً قرآن کو مخلوق کہہ دیا تھا۔ چنانچہ بجز امام کے اور سب رہا کر دیئے گئے اور حضرت امام بن حنبلؒ کو سالہا سال حبس اور ضرب کی مصیبت جھیلنا پڑی اگر کثرتِ رائے پر حق کا مدار ہو تو امام احمد بن حنبلؒ کا قول غلط ہونا چاہیئے حالانکہ امت مابعد کا اجماع ہے کہ اس مسئلہ میں امام ہی کا قول صحیح ہے اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر امام بھی قرآن کو مخلوق کہہ دیتے تو ہمیشہ کے لئے ساری امت اسی غلط مسئلہ کی قائل ہو جاتی۔ معلوم ہوا کہ

مہ قال القاضی الشوکانی فی النیل قال فی الفتح وقد اجمع الفقهاء علی وجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه وان طاعته خیر من الخروج علیه لما فی ذلك من حقن الدماء وتسکین الدهماء ولم یستثنوا من ذلك الا اذا وقع من السلطان الکفر الصریح فلا تجوز طاعته فی ذلك بل تجب مجاهدته لمن قدر علیها کما فی الحدیث اھ ولکنه لا ینبغی لمسلم ان یحط علی من خرج من السلف الصالح من العترة وغیرهم علی ائمة الجور فانهم فعلوا ذلك باجتهاد منهم وهم اتقی الله واطوع لسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم فمن جاء بعدهم من اهل العلم اھ ج ۷، ص ۸۲

جمہور کے خلاف قول شخص واحد صحیح ہوسکتا ہے۔

ف۸: انوار ساطعہ میں عبد السمیع رامپوری نے جواز مولد نبوی بہئیت کذائیہ مبتدعہ واستحسان قیام بوقت ذکر ولادت شریفہ نبویہ علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والتحیۃ پر علاوہ دیگر دلائل کے ایک دلیل یہ بھی لکھی تھی کہ اس پر جمہور علماء حرمین ومصر وعراق وشام وہند کا اتفاق ہوچکا ہے۔ لہٰذا اس کی ممانعت اجماع کی ممانعت ہے۔ اس کے جواب میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہ نے علاوہ دیگر جوابات کے ایک یہ بات بھی لکھی ہے کہ جن علماء کے اتفاق کا انوار ساطعہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری ان کے ہم عصر ہیں اوران کا فتوی اس کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ اتفاق قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ خلاف عالم واحد بھی قادح اجماع ہے۔ ملاحظہ ہو براہین قاطعہ۔ معلوم ہوا کہ جمہور علماء کا کسی مسئلہ میں اتفاق کرلینا جبکہ ایک عالم محقق بھی اُن کے خلاف ہو حجت نہیں۔ اور شخص واحد کا قول بھی جمہور کے خلاف صحیح ہوسکتا ہے۔

ف۹: روی البخاری عن عبد اللہ بن عمرو سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ لا ینزع العلم بعد ان اعطاکموہ انتزاعًا ولکن ینتزعہ منہم مع قبض العلماء بعلمہم فیبقی الناس جہالًا یستفتون فیفتون برائیہم فیضلون ویضلون اھ فتح الباری ج/۱۳، ص/۲۴۱۔

قال الحافظ فی شرحہ وقد أخرج ابن عبد البر فی کتاب العلم من طریق عبد اللہ بن وھب سمعت خلاد بن سلمان الحضرمی یقول حدثنا دراج ابو السمح یقول یأتی علی الناس زمان یسمن الرجل راحلتہ حتی یسیر علیہا فی الامصار یلتمس من یفتیہ بسنۃ قد عمل بہا فلا یجد الامن یفتیہ بالظن فیحمل علی ان المراد الاغلب بالاکثر فی الحالین (ای فی حال وجود المجتہدین المقیدین وبقاء المقلدین الاقربین الی بلوغ درجۃ الاجتہاد المقید کما یفہم من کلامہ سابقًا) وقد وجد ھذا شاھدًا ثم یجوز ان یقبض اھل تلک الصنعۃ ولا یبقیٰ الا المقلد الصرف وحینئذٍ یتصور خلو الزمان عن مجتہد حتی فی بعض الابواب بل فی بعض المسائل ولکن یبقی من لہ نسبۃ الی العلم فی الجملۃ ثم یزداد حینئذٍ غلبۃ الجہل وترئیس اھلہ ج/۱۳، ص/۲۴۳۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں علماء کم ہوجائیں گے اور جہلاء ہی زیادہ رہ جائیں گے۔ لوگ جہلاء کو سردار بنالیں گے۔ اوران سے استفتاء کریں گے۔ وہ محض اپنی رائے سے

ان کو جواب دیں گے جس سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کے قول سے معلوم ہوا کہ یہ حالت اس زمانہ میں ہوگی جبکہ اجتہاد مطلق ختم ہو جاتے گا اور اجتہاد مقید باقی رہ جاتے گا۔ یا ایسے مقلدین رہ جائیں گے جن میں بعض اجتہاد مقید کے قریب ہوں گے۔ اس زمانہ میں غالب حالت یہی ہوگی۔ جو حدیث مذکور میں ہے۔ گو بعضے سنت کے موافق جواب دینے والے بھی ہوں گے۔ پھر بھی ممکن ہے کہ یہ حالت بھی رہے۔ اور بعض ابواب بلکہ بعض مسائل میں بھی اجتہاد کرنے والے نہ رہیں گے بلکہ صرف خالص مقلدین رہ جائیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جن کو فی الجملہ علم سے نسبت ہوگی۔ اس وقت جہل کا غلبہ زیادہ ہو جاتے گا۔ اور لوگ جہلاء کو ہی اپنا سردار بناویں گے۔ اھ

میں کہتا ہوں کہ صاحب بصیرت پر یہ بات مخفی نہیں کہ یہ زمانہ اسی حالت کا مصداق ہے جس کو حافظ رحمہ اللہ نے سب سے آخر میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ اجتہاد مقید کے درجہ پر کوئی نہیں بلکہ اس کے قریب بھی نہیں۔ پس اکثر علماء محض مقلد ہیں اور حافظ رحمہ اللہ کے قول کے موافق مشاہدہ ہو رہا ہے کہ آج کل جہلاء کو زیادہ تر سردار بنایا جا رہا ہے۔ جس نے درسیات ختم کر لیں۔ محض وعظ و تقریر کی مشق کر لی اس کو مولانا کا خطاب اور مقتدا کا لقب دے دیا گیا خواہ اس کو قرآن و حدیث کی فہم حاصل ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔ بلکہ افسوس یہ ہے کہ آج کل تو بعض ان لوگوں کو بھی مقتدیٰ بنایا جاتا ہے جس کو متنبی اور ابو نواس کی طرح عربی لکھنے اور بولنے کی کسی قدر مشق ہو گئی ہو اور ان کا تمام سرمایۂ عمر بجز عربی بولنے اور تاریخ لکھ لینے اور معقول و فلسفہ کی باتیں بیان کر دینے کے کچھ نہیں۔ جہلاء تو در کنار افسوس ہے کہ اہل علم بھی اُن کے تبحر و ہمہ دانی کے معتقد ہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث اور فقہ سے ان کو ذرا بھی مس نہیں۔ اور عمل کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک حالت یہ ہے کہ بعض لوگ جن کی ساری عمر انگریزی خوانی میں صرف ہوتی ہے۔ حدیث و فقہ اور تفسیر کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن فطری طور پر ان کو بیان اور تقریر پر کسی قدر قدرت حاصل ہے ان کو بھی آج کل مقتدیٰ اور پیشوا مانا جاتا ہے عوام تو عوام حیرت یہ ہے کہ بعض اہل علم بھی ان کو فخر قوم، مولانا فلاں کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ اور اپنے قلم سے اُن کو مولانا لکھ کر عامۃ المسلمین کو دھوکہ دیتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی

پس یقیناً یہی وہ زمانہ ہے جس کی نسبت حدیث میں پیشنگوئی ہے کہ ایک وقت ایسا آتے گا کہ لوگ جہلاء کو سردار بنائیں گے جو اپنی رائے سے مسائل شرعیہ کا جواب دیا کریں گے جس سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ ایسے زمانۂ غلبۂ جہل میں کسی طرف علماء کی زیادہ تعداد

کا ہونا کیونکہ حقانیت کی دلیل ہو سکتی ہے۔

۱۸ ؎: قال الحافظ فی شرح البخاری تحت حدیث لا تزال طائفۃ من امتی الخ ناقلا عن النووی ولا یلزم ان یکونوا مجتمعین فی بلد واحد بل یجوز اجتماعھم فی قطر واحد وافتراقھم فی اقطار الارض ویجوز أن یجتمعوا فی البلد والواحد أن یکونوا فی بعض منہ دون بعض ویجوز اخلاء الارض کلھا من بعضھم اولا فاولی الی ان یبقی الا فرقۃ واحدۃ ببلد واحد اھ ج ۱۳، ص ۲۵۱۔

امام نووی کے قول سے معلوم ہوا کہ کسی وقت ایسا ممکن ہے کہ تمام زمین اہل حق سے خالی ہو جائے۔ اور بجز ایک فرقہ کے جو ایک شہر میں ہو کوئی حق پر نہ رہے۔

اہل انصاف غور فرمائیں کہ جب امت میں ایسی حالت کا ظہور بھی ممکن ہے تو اس وقت کسی طرف جماعت کثیرہ کا ہونا ان کی حقانیت کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے۔ پس حدیث اتبعوا السواد الاعظم کا اگر وہ مطلب بھی تسلیم کر لیا جاوے جو بعض لوگ بیان کرتے ہیں تو اس کو زمانہ خیر القرون پر محمول کرنا لازم ہے تاکہ دیگر حدیث سے معارضہ لازم نہ آئے۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ لا یأتی زمان إلا والذی بعدہ شر منہ حتی تلقوا ربکم سمعتہ من نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم۔ جو زمانہ آتا ہے اس سے اگلا زمانہ اس سے بدتر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تم خدا تعالیٰ سے ملاقات کرو۔ میں نے اس کو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ انتہی فتح الباری ج ۱۳، ص ۱۷۔

اس سے معلوم ہوا کہ زمانہ نبوت سے جس قدر بُعد ہوتا جاتا ہے غلبہ شر ہوتا جاتا ہے پھر ایسی حالت میں جس طرف قائلین کی کثرت ہو اس طرف خیر اور حقانیت ہونے کی کیا دلیل ہے۔ اور جماعت قلیلہ یا شخص واحد کے قول کو محض مخالفت جمہور کی بناء پر غلط کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ جب تک کوئی دلیل شرعی قطعی یا ظنی اس پر قائم نہ کی جاوے محض مخالفت جمہور غلطی کی دلیل نہیں شرعاً۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم وھذا اخیر ما اردت ایرادہ فی ھذہ العجالۃ وصلی اللہ علی سیدنا محمد خاتم فص الرسالۃ وعلی آلہ واصحابہ رجال الامانۃ ولیوث البسالۃ والحمد للہ اولا وآخراً وباطناً وظاہراً وانا العبد المفتقر الی رحمۃ الصمد عبد المذنب۔

ظفر احمد وفقہ اللہ لتزود لغد وغفر لہ و

لوالدیہ ومشایخہ واخوانہ وأقربائہ وأخلائہ یوم لا یجزی والد عن ولد ولا یغنی احد عن احد فقط۔

تمت۔ یکم ذی الحجۃ الحرام ۱۳۴۰ھ

نقشہ نعل شریف کا شرعی حکم

السوال: نقشہ نعل مبارک جو کہ خدمت والا میں مرسل ہے ایک رنگونی متمول سیٹھ صاحب نے مستقل طور پر کثیر تعداد میں چھپوا کر یہاں رنگون میں مسلمانوں میں تقسیم کیا اس غرض سے کہ اس کا ادب وتعظیم بجالا کر فوائد دارین حاصل کریں۔ غیر مقلدین اور بعض مقلدین نے یہ چرچا دیکھ کر بہت کچھ شور وشغب اور چھیڑ چھاڑ شروع کر دی بعضوں نے غلو کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ ایک تو یونہی لوگوں کے ایمان میں کمزوری تھی صرف رائی برابر ایمان باقی رہ گیا تھا اب اس نقشہ مزید ملونہ بالوان مختلفہ کی بدولت وہ رہا سہا رائی برابر ایمان بھی جاتا رہا اس کے علاوہ ان لوگوں نے اپنے اعتراضات کی تقریر بطور ذیل کی اس میں ہدایات مطبوعہ کے مطابق سروں پر رکھ کر بوسہ وغیرہ دیکھ اس سے زیادہ معظم ومکرم چیزیں نیچی پڑ گئیں۔ حتی کہ قرآن پاک وکتب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر آثار وعلامت کی وقعت وعظمت ان کے عمل درآمد سے نظر آنے لگے جو مسلمان ان کی جیسی تعظیم وتکریم بجانہ لاتے اس کو بنظر حقارت دیکھیں۔ اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کریں، اس کو بے ادب وگستاخ بتائیں۔ **التزام مالا یلزم** اور حدود شرعیہ سے تجاوز کا پورا منظر پیش نظر ہو جاتے پھر تعجب پر تعجب ہے کہ یہ لوگ جو کہ اپنے آپ کو متبع سنت اور اہل حق کہہ کر بہت سے امور کو جس کو اہل بدعت بدعات حسنہ یا شعائر اظہار محبت رسول وغیرہ قرار دیتے ہیں بنا بر مفاسد عینیہ کے ناجائز وحرام شرک وبدعت قبیحہ کہتے ہیں۔ اور نقشہ نعل مبارک کو بایں آب وتاب چھپوا کر ذریعۂ نجات بتاتے ہیں باوجودیکہ عوام کالانعام کی حالت اور اس کے صدہا امثال ونظائر میں ان کی افراط وتفریط خود بھی مشاہدہ کر چکے اور کر رہے ہیں۔

نقشہ مذکور کے گرد اگرد اشعار وعبارات فضائل وغیرہ ہوتے ہوتے یہ عذر کرنا کہ ہم نے نقشہ مذکور کے نیچے یہ بھی چھاپ دیا ہے مگر خلاف شرع غلو نہ کریں الخ بالکل لچر ہے خواہشات نفسانیہ کا غلبہ ہوتے ہوتے اور رفع حاجاتِ دنیوی کا سہل نسخہ ہاتھ آتے ہوئے عوام کا حدود شرعیہ پر قائم رہنا قطعاً خلافِ بداہت ومشاہدہ ہے۔ اتنی عبارت کا لکھ دینا ہرگز کافی نہیں اور نہ اس کا شائع کنندہ مسلمانوں کو ایک نئے فتنے میں پھنسانے کی وجہ سے مواخذہ اخروی سے

بری الذمہ ہوسکتا ہے۔ اس مطبوعہ نقشۂ نعلینِ مبارک میں اثبات مدعا کے لئے کتاب فتح المتعال فی مدح النعال کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی اثبات مطلوب کے لئے کافی نہیں ہے اھ تقریر المخالفین وفق ماصدر منہم اکثرہ بلسان القال واقلہ بلسان الحال پس جناب والا کی خدمت میں امور ذیل معروض ہیں۔

م ۱: مخالفین کی تقریر مذکور کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط ہے۔

م ۲: نقشۂ مرسلہ کی وجہ سے عوام کا مفاسد میں مبتلا ہوجانا محتمل قوی ہے یا نہیں۔

م ۳: نقشۂ مرسلہ کو بوسہ دینا و سر پر رکھنا وغیرہ کے مشروع ہونے پر دلیل شرعیہ کیا ہے۔ اگر بطور عمل اور حصول برکت کے لئے جائز کیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ رسوم مروجہ، تعزیہ و نقشہ ہائے موئے مبارک و جبہ و عمامہ مبارک وغیرہ بے شمار اعمال کے بارے میں اسی وجہ کو کیوں ناکافی سمجھا بلکہ ان میں سے بعض اعمال کو بدرجہ اولیٰ کیوں جائز قرار نہ دیا۔ اور اگر نہیں تو ما بہ الفرق کیا ہے۔

م ۴: قرونِ ثلثۂ مشہود لہا بالخیر و زمانہ مجتہدین عظام میں اس طرح بوسہ دینے، سر پر رکھنے وغیرہ کا دستور تھا یا نہیں۔ خاص موئے مبارک و ملبوساتِ شریفہ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ فیوض و برکات حاصل کرنا امر آخر ہے۔ اور شبیہ دوسری چیز ہے۔ اس لئے یہ امر قابلِ خیال ہے کہ اس کے ساتھ کسی خاص برتاؤ کا دکھلانا وہی برتاؤ نقل کیلئے ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہوگا۔

م ۵: جبکہ نقشۂ نعل شریف اس درجہ واجب التعظیم قرار پائے کہ سر پر رکھ کر اس کے وسیلہ سے دعا مانگنا باعث قبول و برکت ہو تو دوسری صورت میں اگر کوئی مثل نقشۂ نعل چرمی یا چوبی نعل بنوا کر اتباعاً پہننا چاہے جس کا پاک و ناپاک جگہ آمد و رفت میں ملوث ہونا ظاہر ہے کیا حکم رکھتا ہے۔

م ۶: کیا اصل نعلین کے ساتھ کسی صحابی کا یہ معاملہ کرنا ثابت ہے جو اس کی نقل کے ساتھ تجویز کیا گیا ہے۔ فقط

الجواب

قال الحافظ الکبیر زین الدین العراقی فی الفیۃ السیرۃ النبویۃ علی صاحبہا افضل الصلوٰت والسلام ونعلہ الکریمۃ المحصونۃ طوبیٰ لمن مس بہا جبینہ لہا

قابلان بسیر وھما + سبیتتان سبتوا اشعرھما + وطولھا شبر واصبعان +
وعرضھا ممایلی الکعبان + سبع اصابع وبطن القدم + خمس وفوق ذا فست
فاعلم + وھٰذہ مثال تلک النعل + ودورھا اکرم بھا من نعل + اھ ملخصا من
العزیزی شرح الجامع الصغیر للسیوطی ج ۳، ص ۱۷۲۔

قال الحافظ السیوطی فی حسن المحاضرۃ مترجما للعراقی ھو الحافظ الامام الکبیر
زین الدین ابوالفضل عبدالرحیم بن الحسین بن عبدالرحمٰن حافظ العصر عنی بالفن
فبرع فیہ وتقدم بحیث کان شیوخ عصرہ یبالغون فی الثناء علیہ بالمعرفۃ کالسبکی
والعلائی وابن الکثیر وغیرھم انتھی ملخصًا۔ ج ۱، ص ۱۵۱۔

قلت وھو شیخ حافظ ابن حجرؒ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مثالِ نعالِ نبوی سے اکابر
محدثین جو غایتِ متبع سنت تھے سلف عن الخلف شغف رکھتے آئے ہیں۔ اور اس کو اپنے پاس
رکھنا موجب برکت سمجھتے تھے اس لئے اس کے ساتھ تعظیم وتبرک کا معاملہ شرعًا جائز ہوگا۔
بشرطیکہ حدِ شرعی میں ہو۔ اس کی تقبیل بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس کا منشا محض محبت ہے۔ رہا یہ
شبہ کہ یہ تو تمثال ہے اصل نعل نہیں ہے تو اس کی تقبیل میں کیا محبت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آخر یوم ولادتِ نبوی جو ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو آتا ہے کیا بعینہٖ وہ
دن ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ محض مثال ہے۔ مگر تمام
مسلمان اس دن کو متبرک سمجھتے ہیں اسی طرح یہاں سمجھو اور تعزیہ وغیرہ کو اس پر قیاس کرنا غلط
ہے۔ یہی فرق کافی ہے کہ اس کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے علماء امت سے ثابت نہیں۔ اور
تمثال نعال کے ساتھ۔ حافظ عراقی بہت بڑے محدث ہیں اور متبع سُنت ان کا قول مجتہد
کے قول کے مثل ہے۔ حضرات صحابہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے ساتھ عظمت ومحبت
کا معاملہ بکثرت ثابت ہے۔ نعالِ نبوی بھی انہیں میں داخل ہیں۔ اس کے لئے صراحت اور تخصیص کی
کیا حاجت ہے۔ اہل محبت جانتے ہیں کہ محبوب کی تصویر کا بھی دل پر وہی اثر ہوتا ہے جو اس کی
ذات سے ہوتا ہے۔ باقی اس نقشہ پر چرمی جوتا بنا کر استعمال کرنا گو شرعًا جائز ہے مگر ادب
ومحبت کے خلاف ضرور ہے۔ باقی ہر تعظیم وادب میں غلو سے بچنا اور حدودِ شرعیہ پر قائم رہنا ہر مسلمان
پر لازم ہے۔ اگر کسی جگہ نعل نبوی کے ساتھ عوام غلو کرنے لگیں تو اُن کی اصلاح کے لئے خواص کو
بھی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ ترک کر دیں جس کی یہ صورت نہیں کہ نعوذ باللہ بے

ادبی کریں۔ والسلام

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۴ رجمادی الثانی ۱۳۴۵ھ

مسجد میں عورت کے وعظ کہنے کا حکم

السوال:۔ محلہ کی مسجد میں ایسے اہتمام وانتظام سے کہ کوئی مرد داخل مسجد نہ ہوسکے عورتوں کو اجتماع کی جائے کہ ایک وعظ عورت کا کہلوایا جائے۔ اور عام اعلان کیا جائے کہ فلاں روز فلاں وقت واعظہ کا وعظ ہوگا۔ حاضرین میں سے جو چاہیں اپنی مستورات کو استماعِ وعظ کی غرض سے بھیجیں یہ اجتماع و اعلان کیا ہے آیا منجملہ حسنات کے ہے یا سیئات کے فقط۔ بینوا توجروا۔

الجواب

یہ صورت جائز نہیں گو کیسا ہی اہتمام کیا جائے۔ کسی زنانہ گھر میں وعظ کہنے کا مضائقہ نہیں بشرطیکہ واعظہ علوم شرعیہ سے واقف ہو اور ناواقف ہونے کی صورت میں نہ مرد کو وعظ کہنے کی اجازت ہے اور نہ عورت کو۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۲ رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

تعمیر کے وقت معمار کے ہاتھ سے چیونٹیوں وغیرہ حیوانات کا مرنا موجب جرم نہیں۔

السوال:۔ یکے از محبان کہ از اہل سلوک اُمت کار معمار می کنند سوائے ایں کار دیگر کار نمے داند عیال می دارد خرچہ عیال بریں کسب حلال داشتہ است بوقت کندیدن اساس دیوار و پُرکردن آں اساس مورچہا و دیگر حیوان ذی روح مردہ مشود، بسبب کثرت حیوان پرہیز ناممکن است و صاحب مکان راسوائے ایں مکان دیگر چارہ نیست و بوقت کہگل کردن صحن مکان و سقف مکان نیز مورچہا بسیار زیر کہگل می آیند و مردہ می سوند بسبب ایں ضرورت و عدم امکان صورتِ دیگر ایں جرم معاف است یا خود جرم نیست یا ازیں کسب توبہ کردہ ترک کردہ آید و عیال اطفال را در فاقہ گذارد مفصل بجزی حوالہ کتاب عنایت فرمائید۔ عارض محمد بخش از چوٹی ضلع ڈیرہ غازی خان۔

الجواب

قال فی الاشباہ : الضرورات تبیح المحظورات وفرع علیہا جواز الرمی ای کفار تترسوا بصبیان المسلمین اھ (۷۶) والعلۃ ھی الضرورۃ ولایخفی ان مراعاۃ النملۃ فی البناء لو کانت واجبۃ لتعطل البناء ولحضر اصلاً فالظاھر الجواز نعم التقوی والورع ان لایرتکب قتلھا عمداً کما الیہ الاشارۃ فی قولہ تعالیٰ لایحطمنکم سلیمان وجنودہ وھم لایشعرون اخبر بانھم ما کانوا لیفعلوا ذلک عمداً وقد صرح فی العالمگیریۃ بجواز قتل النملۃ اذا ابتدأت بالأذی والا فیکرہ (باب الکراھۃ) وصرح أیضاً: بجواز احراق الفیلہ بالشمس للضرورۃ فانھا لاتزول۔

صورتِ مسئولہ میں اس معمار کو مورچہ و دیگر حیوانات کی رعایت واجب نہیں۔ اگر حیوان کھگل و عمارت سے مرتے ہیں تو اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوگا۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ

مردوں کے لئے چرخہ کاتنے کا حکم

السوال :- سررشتہ تعلیم کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ پاٹھشالہ اور مکاتیب کے مدرسین چرخہ کی تعلیم حاصل کر کے پاٹھشالہ اور مکاتیب میں بچوں کو تعلیم دیں ہندو مدرسین کو اس میں کوئی عذر نہیں۔ مگر مسلمان مدرسین نے عذر کیا ہے کہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے کہ مسلمان مرد چرخہ کاتیں۔ اس پر افسر سررشتہ تعلیم نے اس امر کا ثبوت طلب کیا ہے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ مہربانی فرما کر اس کی نسبت جو حکم شرعی ہو تحریر فرماویں۔

الجواب

فی الدر المختار: غزل الرجل علی ھیئۃ غزل المرأۃ یکرہ۔ قال الشامی تحت قولہ یکرہ: لما فیہ من التشبیہ بالنساء وقد لعن علیہ الصلوٰۃ والسلام المتشبھین والمتشبھات کما قدمناہ۔ ج ۵، ص ۴۲۱۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کی طرح چرخہ کاتنے کا شغل کرنا مردوں کے لئے مکروہ ہے۔ اور

زمانۂ قدیم سے یہ کام عورتوں کے ساتھ مخصوص چلا آرہا ہے۔ اس لئے مردوں کا اسے اختیار کرنا تشبہ بالنساء ہے۔

البتہ چرخہ کے علاوہ کوئی اور آلہ ایجاد کیا جاوے جو چرخہ سے مشابہ نہ ہو تو اس میں مردوں کو سوت کاتنا بلا کراہت جائز ہو گا۔ کیونکہ اس میں تشبہ بالنساء نہ ہو گا۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۵/ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو شب معراج میں عذاب میں مبتلا دیکھا تھا اُن میں مسلمان بھی تھے یا نہیں۔ اور اس روایت کے منکرین کا کیا حکم ہے

السوال:۔ کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ میں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج کو بہشت و دوزخ کی سیر کی اور دوزخ میں تین رنگ برنگ عذاب میں لوگوں کو مبتلا دیکھا وہ لوگ اپنی امت کے تھے یا غیر۔ وہ عذاب واقعی تھا یا نمونہ۔

الجواب

یہ عذاب عالم برزخ میں دیکھا جو عالم آخرت اور دنیا کے درمیان واسطہ ہے۔ اور یہ معذبین بعض اس امت کے بھی تھے اور پہلی امتوں کے بھی۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۶/ شعبان ۱۳۴۴ھ

ان کارڈوں کا حکم جن میں مکتوب الیہ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ بھی اس کی نقل دوسروں کو لکھیں

السوال:۔ نہایت مؤدبانہ التماس ہے کہ مسئولہ پوسٹ کارڈ دو چار روز قبل بندہ کو موصول ہوا ہے۔ اور بندہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس قسم کے خطوط لوگوں میں عام طور پر مروّج ہیں۔ مگر یہ پہلا موقع کا خط ہے کہ مجھے ایسا خط دیکھنے کا اتفاق ہوا یہ کس حد تک جائز ہے۔ یا ناجائز ہے۔ براہ مہربانی مفصل طور پر جواب تحریر فرمائیں۔ اور اگر ناجائز ہے تو بندہ کا ارادہ ہے کہ اس خط کو اور آنجناب کے جواب دونوں کو ایک دو اخباروں میں شائع کروایا جاتے تاکہ مسلمانوں کے پیسے کم از کم اس زائد

خرچ سے محفوظ رہیں۔ گناہ تو در کنار۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایاک نعبد وایاک نستعین۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین الخ

مکرم بندہ

اگر ممکن ہو سکے تو آپ بھی چار عدد کارڈ اپنے دوست واحباب کو تحریر فرماویں کیونکہ جیسے ذات ربی نے مجھے اپنی مہربانی وعنایت سے خوشیاں بخشی ہیں آپ کو بھی ویسے ہی راحت وخوشی نصیب ہو (آمین)

والسلام

الراقم بندہ شیر محمد سیکنڈ کلرک برٹش

قونسلیٹ ستیان ڈاکخانہ میرجاوہ بر بلوچستان

الجواب

کارڈ مرسلہ دیکھا شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ بوجوہ چند ایسے کارڈ لکھنا جائز نہیں۔

ا :۔ اس میں اعتقاد ہے اس امر کا کہ ایسے کارڈ لکھنے سے راحت وخوشی نصیب ہوگی۔ اور یہ اعتقاد بے دلیل ہے۔ بے دلیل امر کا اعتقاد جائز نہیں۔

۲ :۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کارڈ کی نقل اپنے احباب کے پاس نہ بھیجیں گے تو ہم کو کوئی ضرر پہنچے گا۔ کسی بات میں بلاوجہ ضرر کا اعتقاد ناجائز ہے۔

۳ :۔ اکثر لوگ اس کو تو دین کا کام سمجھتے ہیں۔ اور جو بات شریعت میں بے اصل ہو اس کو دین اور ثواب سمجھنا بدعت محرّمہ ہے۔

۴ :۔ اس میں بلاوجہ کارڈوں کا صرف ہے جو داخلِ اسراف ہے اور اسراف شرعاً حرام ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۴ ر شعبان سنہ ۴۵ھ

چولہے میں اسپرٹ جلانا جائز ہے

السوال: ماقولکم ایھا العلماء رحمکم اللہ تعالیٰ فی ھذہ المسئلۃ۔ کہ یہ جو اسپرٹ برقی چولہے میں استعمال کیا جاتا ہے مشہور ہے کہ اس میں شراب کے ساتھ اور چیز بھی ملی ہوتی ہے۔ ضرورت کے مقام پر سہولت کی غرض سے اس کو استعمال کرتے ہیں۔ حسب شرع کوئی ناجائز عمل تو نہیں۔ بینوا توجروا۔

المستفتی
احقر محمود حسن ڈھاکوی
طالب علم مدرسہ دارالعلوم دیوبند ۱۵ رشعبان

الجواب

یہ اسپرٹ جو چولہے میں جلائی جاتی ہے گھٹیا قسم کی ہے۔ [ع۵] جو خمورِ اربعہ کی روح ہرگز نہیں ان کے سوا کسی اور معمولی خمر کی روح ہوگی اور اس وقت عموم ابتلاء کی وجہ سے گھٹیا اسپرٹ کے استعمال کی اجازت پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ رنگ اور پڑیا بہت سی اشیاء میں اس کی آمیزش ہے۔ جس سے احتراز دشوار ہے۔ جب ابتلاء عام کی وجہ سے گھٹیا اسپرٹ کو مباح الاستعمال قرار دیا گیا تو ہر جگہ اس کے لئے حکم حلت واباحت وطہارت کا ہوگا۔

الشئ إذا ثبت ثبت بلوازمه؛

البتہ بلا ضرورت استعمال سے جہاں تک ہوسکے بچنا اولیٰ وافضل ہے۔ پس اگر چولہے کی اسپرٹ میں شبہ اسپرٹ ہی کی وجہ سے تھا تو اس کا جواب تو ہوگیا اور اگر دوسری شئی کی وجہ سے شبہ ہے تو جب تک دوسری شئی کی حقیقت واضح نہ کی جاوے اس وقت تک جواب

ع۵: طبی جوہر مطبوعہ اشرف المطابع صد ۱۶۰ جدید پر تصریح ہے کہ اسپرٹ کی تین قسمیں ہیں۔ اور ہندوستان میں گھٹیا قسم کی اسپرٹ بنتی ہے جو آلو۔ بیر۔ گیہوں۔ جو وغیرہ کی شراب سے بنتی ہے۔ اور اعلیٰ اسپرٹ ولایت میں بنتی ہے جیسے انگور، سیب، آنار۔ منقی۔ کی شراب کی روح ہے اور اعلیٰ قسم کی اسپرٹ قیمتی ہے جو دواؤں میں ڈالی جاتی ہے ۱۲ منہ

نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ر شعبان سنہ ۴۹ھ

استفتاء مشتمل بر چند سوالات مختلفہ

السوال:۔ جس وقت جناب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تھی تو راستہ میں ایک عورت کے گھر سے گزرے یعنی ام معبد بنت خالد کے مکان سے گزرے ان کی ایک بکری جو دودھ ہرگز نہ دیتی تھی آپؐ نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیر دیا۔ وہ دودھ سے بھر گئے۔ اس واسطے آنجناب سے گذارش ہے کہ آیا یہ حدیث صحیح ہے یا کہ نہیں۔ دیگر اونٹ کا بولنا۔ بھیڑیا کا جنگل میں بولنا، ابوجہل کے ہاتھ میں پتھروں کا بولنا۔ یہ حدیث صحیح بھی ہے۔ اور حضرتؐ سے مسکرانے سے بی بی صاحبہ کا سوئی پرولینا آیا حدیث ہائے صحیح ہیں یا کیونکر۔ جواب جلدی تحریر فرماویں۔

السائل

مستری حافظ احمد بخش ملتان شہر

اندرون حرم گیٹ۔ ملتان

الجواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کے وقت خباء ام معبد پر گزرنا اور اس کی دودھ کی بکری کے تھنوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دودھ دوھنا حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے اور اس کو متواتر صحیح الاسناد کہا ہے۔ واما الذهبی فقد تکلم علی الاسانید من حیث الصحۃ ولم ینکر التواتر۔ (ج ۳، ص ۱۰)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹوں کا کلام کرنا خصائص کبری ج ۲، ص ۵۶ تا ۵۸ میں طرق متعددہ سے مذکور ہے۔ پس یہ بھی بے اصل ہرگز نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھیڑیئے کا ایک شخص سے کلام کرنا اور اس کا مسلمان ہوجانا۔ نیز بھیڑیئے کا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنا خصائص کبری میں (ج ۲، ص ۶۲) بطرق متعددہ مذکورہ ہے۔ جس میں پہلے قصہ کی تصحیح بھی حاکم وبیہقی وغیرہ سے مذکور ہے۔ اور کنکریوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں بولنا پھر ان کو ابوبکر، عمر، عثمان کے ہاتھ میں رکھ دیا ان کے ہاتھوں میں بھی بولنا۔ چند طرق

خصائص کبریٰ۔ ج ۲، ص ۷۴، ص ۴۵ میں مذکور ہے۔ اور ایک طریق کی بیہقی نے بھی تخریج کی ہے اور وہ موضوعات کی روایت کبھی نہیں کرتے۔ فقد التزام ان لا یروی موضوعاً۔ ذکرہ السیوطی فی اللآلی۔ اھ

اور آپؐ کے ہنسنے سے بیوی صاحبہ کا سوئی پرولینا روایت میں نہیں ملا ہے ہاں ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے وقت تین دفعہ گھر میں نور کا روشن ہونا خصائص ج ۱، ص ۸۱ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۱۰ رمضان ۴۵ھ

کیا آیت تخییر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زوجۂ مطہرہ کو طلاق دی تھی۔

السوال:۔ آیت تخییر کے بعد آیا سردار دوجہاں نے کسی عورت کو طلاق دی۔ کسی روایت سے لوکان ضعیفاً سے اس کا پتہ چلتا ہے اگر نہیں تو جس کتاب میں یہ مسئلہ اس کے متعلق خیال عالی سے مطلع فرماویں۔

الجواب

فی الدر المنثور: اخرج ابن سعد عن عمرو بن سعید عن ابیہ عن جدہ قال لما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسائہ بداء بعائشۃ رضی اللہ عنہا قال ان اللہ خیرک فقالت: اخترت اللہ ورسولہ ثم خیر حفصۃ فقلن جمیعاً اخترن اللہ ورسولہ غیر العامریۃ اختارت قومہا فکانت بعد تقول انا الشقیۃ وکانت تلقط البعر تبیعہ وتستاذن علی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقول: انا شقیۃ واخراج ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ قال: امر اللہ تعالیٰ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم أن یخیر نسائہ فی ہذہ الآیۃ فلم تختر واحدۃ منہن نفسہا غیر الحمیریۃ۔

واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم: عن قتادہ والحسن رضی اللہ عنہما کان تحتہ یومئذ تسع نسوۃ خمس من قریش عائشۃ وحفصۃ وام حبیبۃ

وسودة بنت زمعة وأم سلمة۔ وكانت تحته صفية بنت حيي الخيبرية وميمونه بنت الحارث الهلالية وزينب بنت جحش الاسدية وجويرية بنت الحارث المصطلقه وبدأ بعائشة رضی الله عنها۔ فلما اختارت الله ورسوله ودار الآخرة۔

روى الفرح فی وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فتتابعن كلهن على ذلك فلما خيرهن اخترن الله ورسوله ودار الآخرة۔ وشكرهن الله على ذلك ان قال لا يحل لك النساء من بعد ولا أن تبدل بهن من ازواج ولو اعجبك حسنهن فقصره الله تعالىٰ عليهن وهن التسع الاتی اخترن الله ورسوله اھ (ج/۵، ص/۱۹۵)

وفی الصحیح: عن عائشة: بعد قولها ففی ای هٰذا استامر ابوی فانی ارید الله ورسوله والدار الآخرة قالت ثم فعل ازواج النبی صلى الله عليه وسلم مثل ما فعلت اھ

قال الحافظ فی الفتح واستدل به بعضهم على ضعف ماجاأن من الازواج حينئذٍ من اختارت الدنيا فتزوجها وهی فاطمة بنت الضحاك لعموم قوله ثم فعل الى اخره اھ ج/۸، ص ۴۰۲۔

وفی الاصابة فی ترجمة فاطمة بنت الضحاك الكلابية قال: ابن الحق تزوجها رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد وفات ابنته وخيرها حين نزلت الآية التخيير فأختارت الدنيا۔ قال أبو عمر هذا عندنا غير صحيح لان ابن الشهاب يروى عن ابی سلمة وعروة عن عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين خير ازواجه بدأ بها فاختارت الله ورسوله وتتابع ازواجه رسول الله صلى الله عليه وسلم كلهن على ذلك۔ وقال قتادة وعكرمه كان عنده حين خيرهن تسع نسوة وهن الاتی توفی عنهن وكذا قال جماعة ان الاتی كانت تقول أياشقية وهی التی استعاذت واختلف فی المستعيذة اختلافاً كثيرة۔ وقد قيل: ان الضحاك بن سفيان عرض عليه ابنته فاطمة وقال انها لم تصدع قط فقال لاحاجة لی بها۔ قال الحافظ: اخرجه فی الصحيح وقد قيل انه تزوجها سنة ثمان اھ ج/۸، ص/۱۶۲۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ بعض ضعیف روایات میں یہ آیا ہے کہ وقت نزول آیت تخییر کے ایک بیوی نے جس کو بعض نے کلابیہ کہا ہے اور بعض عابریہ اور حمریہ اور نام فاطمہ بنت ضحاک بیان

کیا ہے۔ دنیا کو اختیار کیا۔ اس لئے ان پر طلاق واقع ہوگئی۔ کما ھو الحکم فی تخییر الازواج انھن اذا اخترن انفسھن وقع علیھن تطلیقۃ بائنۃ۔ لیکن بعد میں پھر ان سے نکاح ہوگیا اور وہ اُن ازواج کے علاوہ ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑ کر وصال فرمایا۔ پس اگر ان سے وہی نکاح ہوا تو ظاہر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کا وصال ہوگیا ہوگا۔ مگر یہ روایت نہایت ضعیف ہے۔ صحیح روایت کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے قابل اعتماد نہیں صحیح یہ ہے کہ نزول تخییر کے وقت حضورؐ کی وہی نو ازواج تھیں جن کو چھوڑ کر آپ نے وصال فرمایا ۔ اور ان میں سے کسی نے دنیا کو اختیار نہیں کیا اور نہ کسی پر تخییر کی وجہ سے طلاق واقع ہوگی۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ

التنبیہ علی الخطا من : مصنف برحلۃ المصطفٰی

السوال :۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کتاب رحلتِ مصطفٰی : مؤلف عبدالرزاق ملیح آبادی صـ۷۹ میں مندرجہ ذیل عبارت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تقریر بحوالہ ابن سعد درج ہے۔

پھر کہا لوگوں نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح بگڑ جاتے گا جس طرح تمام آدمیوں کا بگڑ جاتا ہے۔ رسول اللہ بلاشک وفات پاچکے۔

۲ ؛ صـ۹۲ پورے ڈیڑھ دن اور ایک رات لاش رکھی رہی صحابہ کو آپؐ کی وفات میں شک تھا۔ پھر احتیاط بھی اسی میں سمجھی گئی کہ دفن میں دیر کی جاوے تاکہ موت پوری طرح یقینی ہوجاوے۔ نیز یہ بھی وجہ تھی کہ سب مومنین کو نماز جنازہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہو غرض کہ لاش رکھی رہی یہاں تک کہ شکم مبارک پھول گیا۔ اور چھنگلیا میں کجی دکھائی دی۔ ناخنوں کا رنگ تبدیل ہوکر سبز ہوگیا۔ حوالہ ابن سعد۔

ان امور کے متعلق گذارش ہے کہ حضرت عباسؓ کا یہ خطبہ اور یہ الفاظ ابن سعد نے کہاں سے لئے۔ جبکہ حدیث صحیحہ میں اس کا ذکر نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کا رنگ متغیر ہونا اور شکم مبارک کا پھولنا احادیث کے مخالف ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں کتاب الصلوٰۃ میں ہے۔

حرام علی الارض أن یاکل اجساد الانبیاء وغیرہ وغیرہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی

تفسیر مظہری میں زیر آیت ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ الآیہ۔ کہ شہداء اُحد کے اجساد مبارک امیر معاویہ کے حکم سے چالیس سال بعد نکلوائے گئے جب کدال حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے پائے مبارک پر لگا تو خون بہنے لگا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کی نعش کو چھ ماہ بعد نکالا تو جسم بعینہ تروتازہ پایا گیا جیسا کہ مشکوٰۃ میں ہے۔ اب گذارش یہ ہے حضور انور علیہ التحیہ والتسلیم کے جسم مبارک میں کیوں تغیر پیدا ہوا۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جو ایسے الفاظ فرمائے کہ ہر دو امر شانِ نبوت۔ حیات نبی حدیثِ صحیحہ کے مخالف تو نہیں۔

واو نہیں ہے

فقط والسلام

احقر حکیم سید احمد حسن میونسپل کمشنر

۱۱ نومبر ۱۳۴۷ھ

جواب

اس مصنف کا سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے متعلق ایسی روایت جو حدیثِ صحیحہ کے خلاف ہے لکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت نہیں ہے۔ اور اگر سلف میں سے کسی نے اگر ایسا کیا ہے تو ان کا مقصود محض روایات کا بتمامہا جمع کرنا تھا۔ کیونکہ محدث کا منصب ہے کہ ہر بات میں تمام روایات صحاح وحسن وصفات بلکہ بعض دفعہ موضوعات تک بیان کر دیتا ہے پھر اس کا ضعف وغیرہ ظاہر کرتا ہے یا طالب علم کے فہم پر اعتماد کر کے سکوت کرتا ہے۔ لیکن اس مصنف کا مقصود تو فن حدیث کی کتاب مدوّن کرنا نہ تھا بلکہ واقعہ رحلت لکھنا تھا تو اس کو لازم تھا کہ حدیث کی تحقیق کر کے لکھتا ورنہ صحاح کی روایت پر اکتفا کرتا۔ کیونکہ اس کی یہ کتاب عوام کے ہاتھ میں پہنچے گی۔ اور ایسی روایت سے ان کے عقائد میں تزلزل کا اندیشہ ہے۔ اس تمہید کے بعد جواب عرض ہے۔

۱: حدیثِ اول میں تو حدیثِ صحیحہ کی مخالفت کچھ بھی نہیں ہے ہاں اس مصنف کے ترجمہ سے مخالفت کا وہم ہو سکتا ہے۔ کنز العمال میں یہ روایت بتخریج ابن سعد مذکور ہے حدیث طویل ہے جس میں سے صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا جاتا ہے۔

عن عکرمۃ توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا انما عرج بروحہ کما عرج بروح موسی وکان عمر خطیبا یوعد المنافقین وقال ان رسول اللہ صلی اللہ

عليه وسلم لم يمت وانما عرج بروحه كما عرج بروح موسىٰ ولم يزل عمر يتكلم
حتى ازبد شدقاه فقال العباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأسن كما يأسن
البشر وان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد مات فادفنوا صاحبكم أيميت احد
كما اماتة ويميته اماتتين هو اكرم على الله من ذلك ـ فان كان كما تقولون فليس
على الله بعزيز ان يحث عنه التراب فيخرجه ان شاء الله الحديث ابن سعد

(ج ۲ ، ص ۵۳)

اس کا مطلب بیان کر دینے سے پہلے یہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ کہ اس روایت میں علت انقطاع تو ظاہر ہے کیونکہ عکرمہ نے حضرت عمر و حضرت عباس رضی اللہ عنہما و عنہم کو نہیں پایا۔ اور بقیہ سند کا حال بھی معلوم نہیں کہ اس کے بقیہ رواۃ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ اور آیا ابن سعد نے یہ روایت اپنے استاد واقدی کے ذریعہ سے روایت کی ہے۔ جو مجہول ہیں ضعفاء کے ساتھ روایت کرنے میں متہم ہیں اور خود بھی مجروح و متکلم فیہ ہیں۔ یا کسی اور سے روایت کی ہے۔ جب تک سند معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک یہ روایت قابل اعتماد نہیں۔ اور علامہ سیوطی کا اس کو جمع الجوامع میں نقل کرنا اسی امر پر مبنی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ وظیفۂ محدث یہ ہے کہ وہ تمام روایات کو جمع کر دے إلا ان يكون التزم الصحة فلا يخرج غير الصحيح۔ اس کے بعد الفاظ پر گفتگو کرتا ہوں اس حدیث میں حضرت عباسؓ کا یہ قول ہے۔ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأسن كما يأسن البشر وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قد مات۔ جس کا ترجمہ مصنف مذکور نے یہ کیا ہے کہ لوگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بھی بگڑ جائے گا جس طرح تمام آدمیوں کا بگڑ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں اھ لیکن ہمیں اس ترجمہ میں کلام ہے۔ کیونکہ اسن کے معنی لغت میں دو ہیں۔ ایک دوران وغشی کے اور دوسرے تغیّر کے ملاحظہ ہو مجمع البحار ج ۱، ص ۳۲۔ جس میں اول یہ معنی لکھے ہیں رميت طبيباً فأسن فمات اى اصابه دوار وهى الغشى اس کے بعد تغیّر کے معنی بیان کئے ہیں پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں یأسن کا معنی اول ہے۔ اور اس وقت یہ جملہ حضرت عمر کے اس قول کو تسلیم کر کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غشی ہو گئی ہے جملہ آئندہ کے لئے بمنزلہ تمہید کے ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش بھی ہو سکتے ہیں۔ جبکہ آدمی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے۔ اور تغیّر کے معنی لئے جائیں

تو اس سے کہاں یہ لازم آتا ہے کہ آپؐ کا جسم بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اس کے لئے بلاوجہ حذفِ لفظِ جسم کا قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ مراد مطلق تغیر ہے مطلب یہ ہے جس طرح اور آدمیوں میں تغیرات ہوتے ہیں کہ آج حیات ہے کل ممات اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی متغیر ہو سکتے ہیں۔ اور چونکہ انسان کی جو حالت بزمانۂ حیات ہوتی ہے وہ ظاہر میں ارفع و اعلیٰ ہے۔ اور حالت ممات اس کے اعتبار سے ایک تغیر عظیم ہے۔ اس لئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس کو یاس سے تعبیر فرمایا ہے اور اگر یاسن کا معنی تغیر جسم کے لئے جائیں جیسا کہ مصنف نے لیا ہے۔ تو یہ روایت اس پر محمول کی جائے گی کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حدیث حرم اللہ اجساد الانبیاء علی الارض۔ اس وقت تک نہ پہنچی ہوگی۔ اس واسطے یہ بات ان کی زبان سے نکل گئی۔ اور چونکہ صحابہ اس وقت پریشان و صدمہ میں تھے۔ اس لئے کسی نے اس پر التفات نہ کیا کہ انکار کیا جاتا مگر تغیر جسم پر اس کو محمول کرنا بعید ہے۔ کیونکہ حضرت عباس پر اس حدیث کا مخفی رہنا زیادہ بعید نہیں۔ کیونکہ ان کا اسلام متاخر ہے۔ مگر قدرِ بُعد سے خالی نہیں۔ دوسرے کنز العمال میں حضرت عباسؓ کا یہ قول بھی مذکور ہے عن جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ ان علیا غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم والعباس یصیب الماء واُسامۃ وشقران یحفظان الباب فلما فرغ وقال العباس مخزنۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ادفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی التراب ولکن اعدلہ صندوقا واجعلہ فی بیتی فاذا الکربنی امر نظرت الیہ فقال علی عباس اما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدفن اولادہ ثم تلا ھٰذہ الآیۃ منہا خلقناکم وفیہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃ اخریٰ۔ الحدیث وعزاہ الی ابن معزونی۔ ج ۴، ص ۵۶

اگر حضرت عباس کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم دوسرے آدمیوں کی طرح بگڑنے والا ہوتا تو وہ صندوق میں رکھنے اور بوقت پریشانی دیدار و زیارت کرنے کا خیال ظاہر نہ فرماتے۔ مجھے اس دوسری حدیث کی سند بھی معلوم نہیں جس طرح ابن سعد کی روایت مذکور کی سند معلوم نہیں، اس لئے اس کا معارضہ اس سے کرنا درست ہے پس احتمالین اولین

اولیٰ ہیں۔

۲: دوسری روایت کے متعلق عرض ہے کہ یہ حدیث صحیحہ کے خلاف ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

غسلت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ فجعلت انظر ما یکون من المیت فلم از شیئاً وکان طیباً حیاً ومیتاً صلی اللّٰہ علیہ وسلم اخرجہ الحاکم فی المستدرک وقال صحیح علی شرط شیخین واقرہ علی ذلک الذہبی فی تلخیصہ وقال علی شرط م (ج ۳، ص ۵۹)

وقال الملا علی القاری فی شرح ھٰذا الحدیث وقدوری عن علی کرم اللّٰہ وجہہ انہ حین غسل النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم مسح بطنہ فلم یجد شیئاً فقال طبت حیا ومیتاً۔

وفی روایۃ ماح ریح المسک فی البیت کما فی بطنہ وقیل وانتشر فی المدینۃ قال وسطعت منہ ریح طیبۃ لم یجد مثلھا قط انتہی کذا فی شرح الشفاء واخرجہ فی کنز العمال نحوہ بمعناہ وعزاہ الی ابن سعد اھ (ج ۴، ص ۵۶)

پس ابن سعد کی یہ روایت تو صحیح روایت کے موافق ہے اور جو روایت مصنفِ رحلت نے نقل کی ہے وہ ان روایات کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر میں تغیر آگیا تھا جو میت کے جسم میں عادۃً آجاتا ہے۔ نیز انتفاح بطن کے بعد عادۃً خوشبودار ہوا کا نکلنا بعید ہے کیونکہ جسم کا تغیر ہوا کے تغیر کو بھی عادۃً مقتضی ہے حالانکہ علیؓ نے صحیح روایات میں اس کی بالکل نفی فرمائی ہے۔ لیکن ابن سعد کی یہ روایت جو مصنف رحلت نے نقل کی ہے۔ حدیث ان اللّٰہ حرم اجساد الانبیاء علی الارض أن تاکلھا، کے منافی نہیں کیونکہ یہ تغیر بوجہ انتفاح ریح وغیرہ کے ہوا کرتا ہے ارض کے فعل کو اس میں دخل نہیں۔ حدیث۔ ان اللّٰہ حرم الخ کا مقتضیٰ تو صرف اتنا ہے کہ زمین انبیاء کے اجسام کو نہیں کھا سکتی۔

رہا یہ کہ ہوا وغیرہ سے بھی تغیر نہیں ہوتا اس سے وہ حدیث ساکت ہے لیکن سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حاکم کی روایت اور ابن سعد کی وہ روایت جو کنز العمال سے ہم نے نقل کی ہے خاص طور پر یہ بتلاتی ہے کہ آپؐ کے جسم میں ہوا وغیرہ سے بھی کوئی تغیر نہیں

ہوا۔ اور آپؐ کے جسم میں معمولی مردوں کی طرح کوئی بات نہیں پائی گئی بلکہ اس کے خلاف ریح طیبہ کا مہکنا اور مشک کی خوشبو غسل کے وقت پھیلنا متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ پس ابن سعد کی یہ روایت انتفاخ بطن وغیرہ کا ذکر بزعم مصنف مذکور ہے ہرگز قابل التفات نہیں۔ اور ممکن ہے کہ اس میں بھی مصنف مذکور نے ترجمہ الفاظِ حدیث میں غلطی کی ہو۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں وہ کرچکا ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون

۱۸ر جمادی الاول ۴۶ھ

حرام وحلال مخلوط مال کا حکم

السوال:۔ تین مہینے ہوئے کہ ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم آیا ہے۔ ہے تو غریب مگر اس کے پاس کچھ مال ہے بعض اس میں سے ایسا ہے کہ اس کا باپ جب زندہ تھا تو کہیں روپیہ رکھا تھا اور اس نے دو چار چرالئے۔ اور بعض قبر زیارت وغیرہ کرکے جمع کرلیا۔ مالک نصاب ہونے کے بعد بھی زکوٰۃ وصدقات واجبہ لیتا رہا اور روپیہ پاس ہوتے ہوتے سوال کرکے بھی روپیہ جمع کیا۔ یہ جانتا تھا کہ یہ سب ذرائع ناجائز ہیں۔ اور کچھ روپیہ حلال مال میں سے بھی ہے۔ مگر حرام وحلال مخلوط ہوگیا ہے۔ ایسے روپیہ سے کتابیں بہت خریدی۔ اور کپڑا وغیرہ بھی اس وقت نقد سو روپیہ ہے اب اس پر خوف خدا غالب ہوا ہے کہ اس سے رہائی اور نجات کی فکر ہوئی۔ اب پریشان ہے کہ ان اشیاء اور روپیہ کو کیا کروں وہ چاہتا ہے کہ سب کو صدقہ کردیں مگر ایک تردد یہ ہوا کہ پانچ بھائی ہیں اب وہ لوگ بھی اس کی کمائی میں شریک ہوں گے۔ یعنی باپ کی کمائی میں صدقہ کرتے وقت اگر ان سے اجازت لے لے تو وہ اس پر راضی نہ ہوں گے۔ اور بے پوچھے کیسے تصرف کرے۔ البتہ زیادہ زور دینے پر مجبوراً راضی ہوں گے۔ نیز یہ کہ باپ سے کتنا روپیہ چرایا تھا وہ معلوم نہیں وہ تو ورثہ کو حصہ رسد تقسیم کرنا ہوگی مگر مقدار یاد پڑنے سے مشکل پڑا اور ایک قرآن مجید ۱۱ر روپے کا ہے آٹھ ۸ روپیہ ایک شخص نے دیا تھا اور تین روپیہ اپنی جیب سے دیا تھا۔ مگر وہ تین روپیہ بھی مال مشتبہ میں سے ہے اور روپے والے نے کہا کہ تم ہی پڑھنا کسی دوسرے کو نہ بیچنا۔ اب اس قرآن شریف کو کیا کروں۔ اب حضرت والا ارشاد فرماویں

کہ اس کی نجات کیسے ہوگی۔ جو اپنے کسب کا ہے اور مشترکہ ہے اس کا کیا کریں۔ اور جو باپ سے لیا تھا اس کو کیا کریں۔

السائل

اطہر علی مدرسہ جامعہ ملیہ صدر کملا

الجواب

حرام وحلال مخلوط ہونے سے یہ سب مال اُس شخص کی ملک ہو گیا۔ مگر ملکِ خبیث ہے اس لئے اگر اہل حقوق کے حقوق کا بدل ادا کردیا جائے تو یہ سب حلال ہو جائے گا جس کی صورت یہ ہے کہ باپ سے جتنا روپیہ چرایا تھا۔ اس کا تخمینہ سے اندازہ کریں۔ اور تخمینہ سے جو اندازہ ہوا اس کو سب ورثاء کا حق سمجھیں اور اس میں سہام شرعیہ معلوم کرکے سب ورثاء کو اطلاع کردیں کہ آپ کا میرے ذمہ اتنا اتنا روپیہ ہے یا معاف کردو یا وصول کرلو۔ اگر معاف کردیں بشرطیکہ وہ سب بالغ ہوں تو اُن کے حقوق سے بری ہو جائے گا اور نابالغ کی معافی لغو ہے۔ اس کا حق ادا کرنا لازم ہے۔ اگر وہ معاف نہ کریں تو ان کے حق کو ادا کردے خواہ دفعتًا واحدۃً یا تدریجًا۔ اسی طرح اندازہ کرکے کہ زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کا کتنا مال لیا ہے۔ اور یاد کرلے کہ کن کن لوگوں سے لیا ہے اگر وہ آدمی معلوم ہوں تو ان کو یہ مقدار ادا کردے اگر معلوم نہ ہوں تو ان کی طرف سے بنیت زکوٰۃ یہ رقم فقراء پر تقسیم کردے۔ خواہ دفعتًا اس کی استطاعت ہو یا تدریجًا ادا کرنے میں مشغول ہو جائے۔ اور جو مال سوال کرکے حاصل ہوا ہے اور زیارت قبر سے حاصل کیا ہے وہ اس کی ملک ہو گیا ہے۔ مگر ملک خبیث ہے اس کا بھی اندازہ کرکے فقراء کو دیدے خواہ دفعتًا ہو یا تدریجًا۔ اگر اس وقت سے ادائے حقوق میں لگ جائے گا۔ اور جتنا ادا کرسکتا ہے ادا کرتا رہے گا تو اس مال مخلوط من الحلال والحرام سے انتفاع اس کو جائز ہوگا۔ اور اس قرآن میں تلاوت بھی جائز ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ

۱۸ / رجب سنہ ۴۶ھ

دو بالغ مرد ایک چارپائی پر ایک ہی لحاف میں سو سکتے ہیں یا نہیں؟

السوال:- دو بالغ مردوں کو ایک چارپائی پر ایک ہی لحاف اوڑھ کر بضرورت یا بلاضرورت سونا کیا ہے۔ بحوالہ کتاب ارشاد فرماویں۔

السائل۔

بندہ احمد حسن غفرلہ

متعلم مدرسہ کنز العلوم قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد

جمعہ، ۳؍ شعبان ۱۳۴۶ھ

الجواب

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مروا ابناءکم بالصلوٰۃ اذا بلغوا سبعًا واضربوا علیہا اذا بلغوا عشراً وفرقوا بینہم فی المضاجع رواہ ابوداؤد ودارقطنی وغیرہما والسند حسن کما فی الاعلاء۔

اس سے معلوم ہوا کہ دس برس کے بعد ایک خوابگاہ میں دو لڑکے نہ سوئیں۔ جب مراہق کے واسطے یہ امر ہے تو بالغ لڑکوں کے واسطے یا مردوں کے واسطے کس طرح اس کی گنجائش ہوگی ولان فی ذلک فتنۃ ہیجان الشہوۃ والاحتراز منہ لازم ومقدمۃ الواجب واجب۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

۷؍ شعبان ۴۶ھ

عبد الصبّار نام رکھنے کا حکم

السوال:- حضرت میرا نام عبد الصبّار ہے اور لفظ صبار میں مجھے کچھ شک ہے یعنی دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا لفظ صبّار عبد کے ساتھ درست ہے یا نہیں؟ بظاہر معنی تو یہ ہے کہ عبد الصبار یعنی صابر کا بندہ لہٰذا مجھے مطلع فرمایا جاوے کہ آیا یہ نام شرعی دائرہ میں ہے یا نہیں۔

نیز یہ کہ اگر اس نام میں نقص ہو تو دوسرا نام بدل کر رکھنا چاہئے یا نہیں۔ فقط

فقط محمد عبد الصبّار۔ گورنمنٹ ٹیکنیکل اسکول گورکھپور۔

الجواب

قال القاری: فی شرح حدیث اسماء اللہ الحسنی قیل: مامن اسم من الاسماء التی فی ھٰذا الباب إلا وقد ورد بہ الکتاب والسنۃ الصحیحۃ غیر لفظ الصبّور، فانہ ما وجد الا فی ھٰذا الحدیث وفی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ما احد أصبر علی اذی یسمعہ من اللہ اھ والحدیث قال الترمذی غریب اھ ج ۳ ص ۴۳ مرقاۃ

علماء نے فرمایا ہے کہ اسماء الٰہیہ توقیفی ہیں اور صبّار کا اطلاق حق تعالیٰ پر کہیں کتاب و سنت میں وارد نہیں صرف ایک حدیث میں صبّور کا اطلاق وارد ہے اس لئے عبد الصبّار نام اچھا نہیں ہے۔ عبد الصبّور کر دیا جاوے یا جو جی چاہے اسماء حسنیٰ میں سے اختیار کر لیا جائے۔ واحبھا الی اللہ عبد اللہ وعبد الرحمٰن۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۰ رشعبان ۱۳۴۶ھ

مکڑی مارنا جائز ہے یا نہیں

السوال: کیا مکڑی کا مارنا اس لئے ناجائز ہے کہ اس نے ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت غار کے منہ پر جالا تان کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی جیسا کہ مولانا ذوالفقار علی صاحب کی کتاب عطر الوردہ سے مفہوم ہوتا ہے۔

السائل۔
احمد عبد الحکیم۔ اشرف منزل کرنل گنج
کانپور۔ ۱۳ر فروری ۱۹۲۰ء

الجواب

ہاں عنکبوت کے لئے یہ فخر تو بے شک ہے کہ اس نے افضل الخلق پر نسج کیا مگر اس سے نوع عنکبوت کا قتل حرام نہیں ہوتا۔ خاص وہی فرد مکرّم ہوا اور اس کی نوع کو فی الجملہ فخر ہوا۔

وفی مراسیل ابوداؤد: أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان العنکبوت شیطان فاقتلوہ۔ وفی کامل ابن عدی: عن ابن عمر مرفوعًا وھو حدیث ضعیف

کذا فی حیوٰۃ الحیوان ج ۲ / ص ۱۴۳ ۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۲ / شعبان ۱۳۴۶ھ

استفتاء مکرر برائے تصحیح حوالہ استفتاء مذکورہ

السوال: میں نے حرمتِ عنکبوت کا حوالہ اشاعتِ اسلام مؤلف حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عم فیضہم سے دیا ہے جو کہ میری غلطی ہے براہ کرم اس عریضہ کی نقل کی گئی ہو تو اس میں تصحیح فرما دیجئے۔ اصل یہ ہے کہ مولانا ذوالفقار علی صاحب رح نے شرح قصیدہ بردہ (عطر الوردہ) کے صفحہ ۲۵ مطبوعہ مجتبائی پر تحریر فرمایا ہے کہتے ہیں کہ کبوتران حرم محترم اس جوڑے کی نسل سے ہیں ببرکت دعائے نبوی تا قیام قیامت صدمہ شکاریاں سے محفوظ ہیں اور مکڑی کے مارنے کی بھی ممانعت ہوگئی ہے۔ انتھی بلفظہ۔ مولانا مغفور نے یہ مضمون بذیل شرح ظنوا الحمام وظنوا العنکبوت علی، خیر البریۃ لم تنسج و لم تحم۔

وقایۃ اللہ اغنت عن مضاعفۃ من الدروع وعن کال من الاطم

خلاصہ قصہ ہجرت میں تحریر فرمایا ہے۔

السائل

احمد عبد الحلیم ۔ مذکورہ۔

اس کا جواب مذکور نہیں بلکہ وہ پہلے والا ہی ہے۔

کونسل مونسپل بورڈ کمیٹی وغیرہ کے ممبروں کے فرائض اور اس میں کوتاہی کرنے کے متعلق چند سوالات

السوال: زید کتابوں کے انتخاب کی کمیٹی کا یا مونسپل بورڈ کا یا کونسل کا یا کسی اور کمیٹی کا ممبر ہے۔ اس کو گورنمنٹ نے یا قوم نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ نیک نیتی سے سچی رائے دے گا۔ اگر اس نے اپنے نفع کے خیال سے یا اپنے کسی عزیز یا دوست کے خیال سے یا کسی کی خاطر یا دباؤ سے سچی رائے نہ دی تو وہ گنہگار ہوگا یا نہیں۔

۲: زید کسی کمیٹی کا صدر ہے وہ اپنے اثر سے اور ممبروں کو کسی معاملہ میں ناجائز طور پر اپنی رائے کے موافق بنانے کی کوشش کرے تو یہ اس کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ اگر اس اثر سے کوئی کام ہو جائے جس سے اس کے کسی عزیز یا دوست کو یہ جائز نفع پہنچے تو ایسا نفع اس عزیز کو جائز ہوگا یا نہیں۔

۳: جو لوگ کسی کمیٹی کے ممبر یا صدر ہوتے ہیں انھیں گورنمنٹ یا قوم امین سمجھ کر مقرر کرتی ہے۔ ان کی حیثیت شرعاً امین کی ہوتی ہے یا نہیں۔ ان کو نیک نیتی سے شرعاً اس کمیٹی کے قواعد کی پابندی لازم ہے یا نہیں اگر وہ اس کی پابندی نہ کریں تو شرعاً وہ گنہگار ہوں گے یا نہیں۔

۴: خالد اپنے عزیز دوست زید سے جو کمیٹی کا ممبر یا صدر ہے اس بات کی خواہش کرتا ہے کہ وہ خلاف دیانت کسی معاملہ میں اس کے موافق رائے دیکر اس کو نفع پہنچائے خالد کو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر اس طریقہ سے خالد کو نفع پہنچا تو وہ نفع شرعاً اس کے لئے حلال ہوگا یا حرام۔

۵: عمر ایک کمیٹی کا ممبر ہے اس نے زید کی خاطر سے جو رائے کمیٹی کا صدر ہے اپنی اصلی رائے کو چھپا کر غلط رائے دیکر زید کا ساتھ دیا تو عمر بھی گنہگار ہوگا یا نہیں۔

۶: زید ایک کمیٹی کا ممبر ہے۔ اور اس کمیٹی کو کسی ایسے کام کے تجویز کرنے کا اختیار ہے۔ عام لوگ نفع حاصل کر سکیں اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر کسی شخص خاص کی کوئی عمدہ چیز ہو تو وہ سفارش کرے کہ یہی چیز استعمال کی جاوے۔ زید نے بغیر اس کے دوسری چیز اس کے مقابل کی اس کے سامنے کرے اور بغیر اس کے کہ وہ چیز اس تجویز کے مطابق ہو خالد کو اس کے ذاتی تعلق کی وجہ سے نفع پہنچانے کی غرض اس کی چیز کے لینے یا استعمال کرنے کی سفارش کرے دوسرے لوگوں کو اس کے جائز نفع سے محروم رکھے۔ ایسی صورت میں زید گنہگار ہوگا یا نہیں۔ اور خالد نے جو اس سے نفع حاصل کیا وہ اس کے لئے حلال ہوگا یا حرام۔

۷: زید کمیٹی کا ممبر ہے اور اس کے اختیار میں ہے کہ چند چیزیں جو اس کے پاس آئیں۔ ان میں سے جو بہتر ہو اس کو منتخب کر کے اور ممبروں کے سامنے پیش کرے۔ زید اچھی چیز کو ممبروں کے سامنے پیش نہ کرے اور اپنے کسی دوست یا عزیز کی کسی خراب چیز کو اچھی ظاہر کر کے محض اس کو نفع پہنچانے کے لئے پیش کرے اور کمیٹی نے اس کو منظور کرے۔ اس صورت میں زید گنہگار ہوگا یا نہیں اور اس کا دوست یا عزیز خالد جس نے اس سے جو نفع حاصل کیا تو یہ نفع اس کے لئے جائز ہوگا یا نہیں۔

۸: زید کمیٹی کا صدر ہے۔ کمیٹی نے ایک تجویز کی جس سے عام لوگ نفع اٹھا سکتے تھے زید نے اپنے اثر سے خالد کو نفع پہنچانے کے لئے اور لوگوں کو نفع حاصل کرنے سے روکا اور لوگ اس خیال سے رُک گئے کہ اگر ہم نے زید کے خلاف کیا تو وہ ہمارے اور کاموں میں رخنہ انداز ہو جاتے گا اور ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اس حالت میں زید گنہگار ہو گا یا نہیں؟ اور خالد جو اس کے اس اختیار سے نفع حاصل کرتا ہے یہ نفع اس کیلئے جائز ہو گا یا نہیں۔

۹: زید جو کمیٹی کا ممبر ہے یا صدر ہے اس نے بکر سے کچھ روپے اس غرض سے لئے کہ بکر اس کی فرمائش کے مطابق ایک کتاب تیار کرے اور وہ کمیٹی میں منظور کر دے گا۔ تو بکر نے اس کے کہنے کے مطابق تیار کیا۔ زید نے اس وجہ سے کہ ممبرانِ کمیٹی کی خواہش کے مطابق تھی کمیٹی میں منظور کرا دی۔ اس صورت میں زید نے جو وہ روپیہ لیا اس کے حق میں رشوت ہو گا یا اپنی رائے دینے کا حق ہو گا۔ اگر وہ روپیہ رشوت ہے تو بکر بھی گنہگار ہو گا یا نہیں ایسی صورت میں بکر کو اس کتاب سے منتفع ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔

۱۰: زید نے بکر سے اس روپیہ کی بابت یہ کہا تھا کہ اس وقت ہمیں ضرورت ہے تم دیدو۔ تمھاری کتاب جو تم تیار کرو اگر وہ نہ منظور ہو تو اس روپیہ کو بطور قرض سمجھنا میں اس کو ادا کر دوں گا ورنہ میری اس رائے کا معاوضہ ہو گا۔ بکر نے اس خیال سے یہ روپیہ دیدیا کہ اگر میں نہ دونگا تو زید دوسروں سے معاملہ کرے گا۔ اور مجھ سے ناخوش ہو کر مجھے اور بھی نقصان پہنچائے گا۔

۱۱: اگر ۹، ۱۰ کے معاملہ میں زید اور بکر گنہگار ہیں تو اب ان کو کیا چارۂ کار اختیار کرنا چاہئے۔ کہ مواخذۂ عقبیٰ سے بچیں۔ اگر زید خالد کے اصرار سے فسخ نہ کرے تو خالد کو اپنے مواخذۂ عقبیٰ سے بچنے کیلئے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہئے۔ اور اگر زید روپیہ واپس کر سکے اور مواخذۂ عقبیٰ سے بچنا چاہے تو اس کو کیا چارۂ کار اختیار کرنا چاہئے۔ یہ سب معاملات جس اصل شرعی پر مبنی ہوں اُن کو ظاہر فرمایا جائے۔ اور کتاب وسنت اور فقہ سے پورے ثبوت کے ساتھ اس کا جواب تحریر فرمادیں۔ تاکہ تعلیم یافتہ حضرات کو چون وچرا کا موقع نہ ملے۔

السائل

جلال الدین جعفری از مطبع انوار احمدی الٰہ آباد

الجواب

اول قاعدہ ملاحظہ ہو ۔

۱ : جس کو کوئی منصب یا عہدہ دیا جاتا ہے اس کو اس کا اہل سمجھ کر دیا جاتا ہے پس اس عہدہ اور منصب کے حقوق کی رعایت شرعی حدود میں رہ کر اس کے ذمہ شرعاً واجب ہے۔ البتہ اگر عہدہ یا منصب کا کوئی حق خلاف شرع ہو تو اس کی رعایت لازم نہیں۔ بلکہ اپنی قدرت کے موافق اس کی موافقت لازم ہے۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ ولا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ ومن رأی منکراً فلیغیرہ بیدہ او بلسانہ او بقلبہ الحدیث۔

۲ : امین کو خیانت جائز نہیں وفی الحدیث فی علامات النفاق۔ إذا ائتمن خان۔

۳ : جس شخص کو صحیح رائے دینے کیلئے نمائندہ بنایا گیا ہو وہ شرعاً بھی امین ہے۔ لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام المستشار مؤتمن۔ اور اس پر لازم ہے کہ رائے دیتے ہوئے شرعی حدود کی رعایت کرے رائے دینے سے پہلے یہ سوچ لے کہ رائے خلافِ شرع تو نہیں۔

۴ : جس شخص کو غلط رائے دینے سے اس سے کسی دوست کو نفعِ مالی پہنچے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دوست کو بلا معاوضہ نفع پہنچے دوسرا یہ کہ بمعاوضہ نفع پہنچے مثلاً اس شخص نے رائے دی کہ فلاں شخص کا مال اچھا ہے اور اس کی رائے کی وجہ سے دوست کا مال فروخت ہو گیا۔ اس صورت میں جو نفع دوست کو ہوا وہ مباح ہے مگر رائے دینے والا غلط رائے دینے کی وجہ سے گنہگار ہوا مگر اس کو عقدِ بیع میں داخل نہیں اس لئے عقدِ بیع موافق اصولِ شرعیہ ہوا اس لئے اس سے توبہ کرنا دونوں کو لازم ہے۔

اب جواباتِ سوالات معروض ہیں

جواب اوّل :۔ اس صورت میں سچی رائے دینا واجب ہے۔ غلط رائے دینا حرام ہے۔ بشرطیکہ رائے شریعت کے موافق ہو۔ اور غلط رائے دینے سے

کسی عزیز یا دوست کو مالی نفع پہنچ جائے تو اس کے جواز و حرمت کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

ج۲ : دوسرے ممبروں کو ناجائز طور پر غلط رائے کے موافق بنانا جائز نہیں ہے۔ اور عزیز یا دوست کو نفع پہنچنے کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

ج۳ : ہاں یہ لوگ شرعاً امین ہیں ان کو نیک نیتی سے سچی رائے دینا اور کمیٹی کے قواعد کی پابندی کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہ قواعد شریعت کے خلاف نہ ہوں واللہ اعلم۔

ج۴ : خالد کو ایسا کرنا جائز نہیں اور خالد کو جو نفع پہنچا اس کی تفصیل اوپر گذر چکی۔

ج۵ : ہاں عمر بھی گنہگار ہوگا۔

ج۶ : زید کا یہ فعل ناجائز ہے۔ جس سے اس کو گناہ ہوگا۔ اور خالد کو بھی ایسا کرنا جائز نہیں کہ اپنے خراب مال کو اچھا ظاہر کرے اور نفع کی بابت اوپر تفصیل گذر چکی ہے۔

ج۷ : مکرر مثل جواب۔ ج۸ یہاں بھی وہی حکم ہے۔

ج۸ : زید کا یہ فعل ناجائز ہے۔ جس سے اس کو گناہ ہوگا۔ اور خالد کو بھی اس تحریک سے گناہ ہوگا۔ اور نفع کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

ج۹، ج۱۰ : رائے کا معاوضہ لینا حرام ہے۔ رائے کوئی مال متقوم نہیں جس کا معاوضہ لیا جاوے اس لیئے زید کا بکر سے روپیہ لینا رشوت میں داخل ہے۔ جس کا بکر کو واپس کرنا واجب ہے۔ اور بکر کو بھی رشوت دینے کا گناہ ہوگا اگر تحصیل منفعت کیلئے رشوت دی ہو۔ اگر ضرر سے بچنے کی خاطر دی ہو اور ضرر شدید کا اندیشہ ہو جس کا تحمل نہ ہو سکے تو بکر کو گناہ نہ ہوگا۔

ج۱۱ : بکر کے ذمہ صرف توبہ واجب ہے اگر اس نے تحصیل نفع کیلئے رشوت دی ہو اور زید کے ذمہ بکر کی رقم واپس کرنا واجب ہے اور توبہ کرنا بھی لازم ہے

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ۱۰ شوال ۱۳۴۶ھ

السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسا ہی حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد تک حضرت بی عائشہؓ اپنی اخیر عمر تک اسی حجرہ میں رہتی تھیں جس میں حضرات ثلاثہ مذکورین مدفون ہیں یا وہ حجرہ چھوڑ کر کہیں اور قیام فرمالیا تھا۔ اور حضرت عمر رضؓ نے جو اس حجرہ کی سقف مرمت فرمائی تھی اس وقت بھی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا اس حجرہ میں قیام فرماتی تھیں یا نہ۔

کیا حضرت عائشہؓ اپنی اخیر عمر تک اسی کمرہ میں رہتی تھیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر مدفون ہیں یا اس کو چھوڑ دیا تھا اور کب چھوڑا

السائل

شیر محمد از گھوٹکی۔ ضلع سکھر سندھ

الجواب

قال العلامة السمهودی والابن زبالة عن عائشة رضی اللہ عنها قالت : ما زالت اضع خماری وانفصل فی ثیابی حتی دفن عمر رضی اللہ عنه فلوازل متحفظة علی ثیابی حتی بنیت بینی وبین القبر جداراً و عن المطلب کانوا یأخذون من تراب القبر فأمرت عائشة رضی اللہ عنها بجدار فضرب علیهم و کانت فی الجدار کوة فکانوا یأخذون منها فامرت بالکوة فسدت۔

وفی طبقات ابن سعد : اخبرنی موسیٰ بن داؤد : قال : سمعت مالك بن انس یقول : قسم بیت عائشة باثنین قسم کان فیه القبر وقسم کان تکون فیه عائشة۔ وبینهما حائط وکانت عائشة ربما دخلت حیث القبر فضلا (ای فی ثیاب الفضل) فلما دفن عمر رضی اللہ عنه لم تدخله الا وهی جامعة علیها ثیابها اھ

(ص - ۱۳۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عمرؓ کے دفن تک اور اس کے بعد بھی اسی حجرہ میں رہتی تھیں اور ان کے گھر کے دو حصے کر دیئے

گئے تھے۔ ایک حصہ میں قبریں تھیں اور ایک حصہ میں خود رہتی تھیں اور دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۵ شوال ۱۳۴۶ھ

بورڈ کے منظور کردہ تخمینہ میں اگر مدرس بجائے ٹھیکیدار کے خود با کفایت کام کروا کر کچھ رقم منظور شدہ تخمینہ سے پس انداز کرلے تو یہ رقم اس کیلئے حلال ہے یا نہیں۔

السوال: زید مدرسہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا صدر مدرس ہے اور مکانِ مدرسہ بھی بورڈ کا ہے بورڈ مکانِ مدرسہ کی مرمت مدرس کی معرفت کرانا چاہتا ہے اور زید بھی مرمت کا کام ٹھیکیدار کے مقابلہ میں اچھا اور کفایت سے کراتا ہے۔ تخمیناً منظور شدہ سے بعد کرانے کام کے جو رقم بچ جاتی ہے اس کو حق المحنت خیال کرکے اپنے صرف میں لاتا ہے تو کیا زید کے واسطے یہ جائز ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو یہ رقم بورڈ کی مدمیں داخل کرنے سے ادائیگی ہو جائے گی یا نہیں۔

قاعدہ: مرمت کا یہ ہے کہ بورڈ اپنے قواعد کے موافق کام کا تخمینہ کرکے مدرس کو رقم اور تخمینہ پہنچا دیا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ مدرس اس رقم سے اس کام کو کرادے۔ اگر تخمینہ سے زیادہ خرچ ہوتا ہے تو بورڈ یقین ہونے پر زیادہ رقم دیتا ہے۔ اور اگر بقیہ رقم مدرس بورڈ کو واپس کرنا چاہے تو بورڈ قبول کرلیتا ہے۔ اس طرح کام کرنے والے کو امانی کا کام کہا جاتا ہے۔

۲: زید بورڈ کے مدرسہ کا مدرس ہے اور پونڈ بھی بورڈ کا ہے زید نے مدرسی کی حالت میں موافق حکم ڈسٹرکٹ بورڈ پونڈ کی انچارجی کرتے ہوئے راسان پونڈ کو خوراک نہیں دی یا کم خوراک دی اور خوراک پوری وصول کرکے اپنے صرف میں لایا کیا یہ بھی حق العباد ہے تو اس کی ادائیگی کی کیا سبیل ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ کون کون راسان کس کی تھی اور نہ یہ معلوم ہے کہ کس قدر کمی خوراک میں ہوئی ہے اس کی ادائیگی یا معافی کی جو صورت توبہ واستغفار وغیرہ ہو تو ارقام فرمادیں۔ فقط والسلام۔

مرتضیٰ علی۔ مدرس اسلامیہ ڈسٹرکٹ بورڈ سہارنپور

الجواب

قاعدہ کے بیان کرنے سے معلوم ہوا کہ بورڈ اس رقم کو مدرسہ کی ملک نہیں کرتا بلکہ اپنی ہی ملک سمجھتا ہے۔ اور مدرس کو محض امین کے طور پر رقم کے صرف کرنے کا حق ہے۔ لہذا اس صورت میں باقی ماندہ رقم کا واپس کرنا لازم ہے۔ اور اس کو اپنے تصرف میں لانا جائز نہیں۔ اور جو صرف ہوئی ہے اس کو واپس بورڈ میں داخل کرنا لازم ہے۔

ع۲: ہاں یہ ہے حقوق العباد، راسان کی خوراک میں کمی کرنے کا گناہ توبہ و استغفار سے معاف ہو جاوے گا۔ اور بچی ہوئی رقم اندازہ کر کے اپنے ظن غالب سے بورڈ کو واپس کردی جاوے۔ اور اندازہ ایسا لگایا جاوے جس سے دل گواہی دے دے۔ کہ بچی ہوئی رقم ادا ہوگئی۔ اور اس کے ساتھ تمام گناہوں سے توبہ و استغفار بھی کیا جائے۔ کیونکہ حقوق کے تلف کرنے میں حق کے تلف کرنے میں حق اللہ بھی تلف ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۸ رشوال ۱۳۴۶ھ

حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت متعلق نحوست پر شبہ کا جواب

السوال:۔ حجۃ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ عورت، گھوڑا اور مکان میں نحوست ہے۔ حالانکہ اسلام میں کسی چیز میں نحوست کہنا شرک ہے۔ اگر نحوست کے معنی بدعادات ہیں تو یوں تو بدعادات، بدخصلت اور برائی ہر چیز میں ہوسکتی ہے۔ ہر سہ اشیاء مندرجہ بالا میں نحوست کی خصوصیت کے کیا معنٰی ہو سکتے ہیں۔

الجواب

آپ نے حجۃ اللہ البالغہ کو سمجھا ہی نہیں۔ مہربانی کر کے اس کی عبارت مع حوالہ و جلد لکھ بھیجیئے۔ پھر جواب دیا جاوے گا۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ

خالہ کے حقوق اور بلاقصور بیوی کو طلاق دینے کے متعلق ایک استفتاء کا جواب

السوال:۔ ایک حقیقی خالہ اپنے بھانجے کو اس کے والدین سے بھی زیادہ اور بہتر

طریقہ سے پرورش کرتی رہی اس کی ناز برداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جوان ہونے پر اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بھی اس سے کردی یہ لڑکی بھی شوہر کی نہایت مطیع ہے۔ اور خالہ بھی دونوں کے اخراجات کی کفیل ہے۔ اور اس کی مادرانہ شفقتیں روز افزوں ہیں لیکن بھانجہ بجائے اس کے کہ پسرانہ خدمات سے حقوق مادری ادا کرتا انتہائی ایذا رسانی پر کمربستہ ہے بلکہ وہ صورت اختیار کرنا چاہتا ہے کہ ہمچشموں میں اس کی خالہ کی سخت توہین اور بے آبروئی ہو (یعنی طلاق دینے پر آمادہ ہے) حالانکہ بیوی اور خالہ کی طرف سے کوئی امر خلاف شرع وعقل و شرافت سرزد نہیں ہوا۔ ایسے احسان فراموش مربی کش کیلئے شریعت کیا حکم دیتی ہے۔ اور واقفینِ حال کو اس کیساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

صحیح احادیث میں خالہ کو بمنزلہ ماں کے فرمایا گیا ہے۔ جو حقوق ماں کے ہیں وہ حقوق خالہ کے بھی ہیں خصوصاً جبکہ اس نے پرورش بھی کی ہو تو حق تربیت سے اس کے حقوق میں اور بھی اضافہ ہو جاوے گا۔ اور بلاوجہ بدون کسی خطا و قصور کے بیوی کو طلاق دینا۔ حق تعالیٰ کو سخت ناگوار اور بہت ہی مبغوض ہے پس جو شخص اپنی حقیقی خالہ کو ایذا دے اور اس کو ذلیل کرے وہ اس وعید کا مصداق ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ ومن لم یوقر کبیرنا فلیس منا۔ جس نے اپنے محسن کا احسان نہ مانا اس نے اللہ کا احسان نہ مانا یعنی وہ خدا کا ناشکرا ہے۔ اور جو اپنے بڑے اور بزرگ کی تعظیم نہ کرے وہ مسلمانوں میں شمار نہیں۔ یعنی اس کا یہ فعل مسلمانوں کے افعال میں سے نہیں یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور جو لوگ اس کے حال سے واقف ہیں وہ اس سے قطع تعلق کردیں جب تک وہ توبہ نہ کرے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۹ / رمضان ۱۳۴۷ھ

دوسرے آدمی کو بلا محصول ادا کئے مال لانے کو کہا وہ شخص پکڑا جائے تو مقدمہ کے اخراجات کس کے ذمہ ہوں گے یعنی ملزم یا آمر کے ذمہ

السوال :- عرضِ حال خدمت میں یہ ہے کہ ہماری دوکان پر ۲ عدد بوری مصری بلا محصول پکڑی گئی۔ ایک بوری مصری پر محصول کمیٹی مبلغ ہیے ہوتا تھا میں نے اپنے بھائی سے بوری بلا محصول لانے کو کہا اس نے یون میل سے کرایہ ایک روپیہ فی بوری کہا میں نے منظور کیا۔ اب کمیٹی کرنال نے میرے بھائی پر دعویٰ عدالت میں دائر کیا ہے اب خرچہ موافق قانونِ شرع کے کس کے ذمہ ہوگا۔ نہایت مہربانی۔

جان محمد تیلی

۱۳ ر رمضان ۴۷ھ

الجواب

قاعدہ سے مقدمہ کا خرچہ اسی شخص پر ہے جس پر کمیٹی نے دعویٰ کیا ہے۔ صاحبِ مال پر خرچہ نہیں ہے۔ مگر مروّت کا مقتضی یہ ہے کہ صاحبِ مال اس صورت میں اپنے بھائی کی امداد کرے اور کچھ خرچہ خود بھی برداشت کرے۔ کیونکہ یہ بلا اسی کے کہنے سے اُس پر واقع ہوئی ہے۔ یہ اس کے ذمہ واجب تو نہیں مگر ایسا کرنا بہتر ہوگا کہ بھائی کی دلجوئی ہو۔

قلت و لیس هذا مما یضمن فیه المتسبب ایضاً کالمباشر لکون الضمان بغیر حق من اصله و لکون المباشر قد رضی بالقاء نفسه فی الخطرة باغلاء الاجر۔ و الله تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۱۷ ر رمضان ۱۳۴۷ھ

دس مختلف سوالات پر مشتمل ایک استفتاء

السوال ۱:- نقرئی زیور کی زکوٰۃ دس تولہ چاندی ہوتی ہے۔ جس کی قیمت آجکل ۱ہ۱ہ ہے اگر روپیہ سے زکوٰۃ ادا کی جاوے تو عنہ دینا چاہیں تو وہ دسؔ تولہ ہیں یا ۱ہ۱ہ ۔

۲: مسجد کا فرش خشب اور پتھر کا تھا۔ اس کو اگر اکھڑوا کر ٹائل لگوا دیا گیا مسجد

ہیں ضرورت نہیں کہ کہیں اس عین کو لگایا جائے۔ خریدار خریدنے میں تأمل کرتے ہیں کہ گھر میں لگوانے میں بے ادبی ہے اور جو ایسا کرے گا فلاح نہ پاوے گا۔ اب اس کو کیا کیا جاوے کہ نقصان بھی ہے۔ اور جگہ بھی گھری ہوئی ہے۔

س ۳: ایک شخص سرکاری مطبع میں ملازم ہے جہاں اسٹامپ کے کاغذ طبع ہوتے ہیں اور اس میں چھوٹی چھوٹی تصویریں ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کو ان کا چھاپنا اور ایسی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

س ۴: عورت کو ایام حیض ختم ہونے پر کرسف بے داغ معلوم ہوتا ہے۔ مگر فرج میں انگل ڈالنے سے سرخی معلوم ہوتی ہے۔ گویا دم حیض اندر رُک جاتا ہے جو دوسرے دن خارج ہوتا ہے۔ اس حالت کو حیض سمجھا جائے یا طُہر۔

س ۵: زید نے اپنے حج بدل کی وصیت کرکے انتقال کیا مگر ثلث میں صرف پچاس روپیہ نکلتے ہیں۔ باپ اس کا اپنے پاس سے پیسے دیکر حج بدل کراتا ہے تو کیا یہ حج فرض ہوگا اور تمام شرائط حج بدل کی پورا کرتی ہوں گی یا یہ حج نفل ہے ایصالِ ثواب کے درجہ میں۔ اور باپ حج بدل کرانے کیلئے قران یا تمتع کی اجازت دیدے تو صحیح ہے یا نہیں۔ نیز حج بدل کرنے والا روپیہ لینے کیلئے میت کے وطن گیا اور نیت سفر کرلی مگر اس کو اپنے گھر واپس آنا ضروری ہے تو گھر آنے سے سفر کی نیت باطل ہو جائے گی یا نہیں۔ اور کیا ضروری ہے وہیں سے سیدھا بمبئی کو روانہ ہو جائے۔

س ۶: حاجی صاحب مال ہے کہ فرض ادا کر چکا ہے نفل کیلئے اپنے روپیہ سے جا سکتا ہے۔ اس کیلئے اپنے روپیہ سے حج کرنا افضل یا دوسرے کے پیسے سے حجِ بدل کرنا۔

س ۷: اب تو حجاز میں بھی بغیر تصویر کے پاسپورٹ کہیں نہیں ملتا۔ بس کوئی شخص محض سیاحت کیلئے مصر جائے یا زیارت کیلئے مسجدِ اقصیٰ تو اس کو تصویر کھینچوانا جائز ہے یا نہیں۔

س ۸: اشتہار میں ایک کتاب کی قیمت شائع کردینے کے باوجود کیا مالک کو اختیار ہے کہ اس کتاب کی قیمت کسی سے زائد لے لے۔

ع۹ : غیر کیلئے غائبانہ سلام پہنچانا مثلاً کسی کا کہنا کہ مدینہ منورہ جاؤ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہو کر میرا اسلام عرض کرنا۔ جائز ہے یا نہیں۔
ع۱۰ : سفر میں شیخ کے مزار پر حاضری کی نیت شامل کرنا صحیح ہے یا نہیں فقط۔

جوابات

ع۱ : نقدی زیور کی زکوٰۃ روپوں سے دی جائے تو دوسری جنس بھی ملادی جائے تو صحیح ہے۔
ع۲ : نہیں بے ادبی کچھ نہیں بلکہ گھر میں برکت ہوگی۔ البتہ پاخانہ کے مقام پر نہ لگائیں۔
ع۳ : چھاپنے میں تو گنجائش ہے جب تصویر صغیر ہو۔ البتہ کتابت یا فوٹو لینا جائز نہیں کہ تصویر میں داخل ہے۔
ع۴ : اگر ادخال اصبع سے خون جاری ہو جائے تو حیض ہوگا۔ اگر دس دن کے اندر ہو اگر دس دن سے زیادہ ہو جائے تو استحاضہ ہے۔
ع۵ : جس قدر ثلث میں نکلا ہے اس کو الگ حج بدل کرنے والا محفوظ رکھے اور مکہ سے عرفات تک آمد و رفت اسی میں سے کرے۔ اس کا حکم تو حج فرض کا حکم ہے۔ باقی کا حکم تبرع کا حکم ہے۔ اس لئے مامور کو تمتع یا قران کی اجازت وارث نہیں دے سکتا۔ اگر باپ یہاں سے کسی کو نہ بھیجتا تو یہ واجب ہوتا کہ پچاس میں جہاں سے حج ہو سکے وہاں سے کرایا جائے۔ اور اس کا حکم بھی حج فرض کا ہوگا۔ اگر باپ یہاں سے بھیج دے یہ اور اچھا ہے کہ اس میں میت کا حج بلا اختلاف ادا ہو جائے گا۔ رہا روپیہ لینے کیلئے میت کے وطن جانا تو اس میں احوط یہی ہے کہ مامور جب گھر سے بالکل جدا ہونا چاہے اس وقت آمر کے وطن جائے اور وہیں سے انشائے سفر کرے اور گنجائش صورت مسئولہ میں اس کی بھی ہے۔ کہ میت کے وطن سے انشاء سفر اس طرح کرے کہ اثناء سفر میں اپنے وطن سے دور کی بھی اجازت ہے۔
ع۶ : حج بدل کا ثواب اپنے حج سے سات گنا زیادہ ہے۔

سو مگر ادخال اصبع اس غرض کیلئے مکروہ ہے ۱۲ منہ

کما روی عن ابن عباسؓ وعللوہ بکون نفعہ متعدیا اھ غنیہ ص ۱۸۱

مگر شرط یہ ہے کہ حقوق العباد میں گرفتار ہونے کا اندیشہ نہ ہو جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ وارث میت سے اس مال کی اباحت حاصل کرے اذا لم یکن فیہم صغیراً او کان ولم یحجوہ بحصتہ کہ یہ مال سفرِ حج بدل کیلئے بطور اباحت کے تمھاری ملک کر دیا گیا ہے کہ جس قدر تم سفر میں خرچ کرتے جاؤ گے وہ تمھاری ملک ہو جائے گا۔ اور تملیک بطور اباحت مبطل حج بدل نہیں ہے۔ کیونکہ انفاق سے پہلے وہ رقم مِلک آمر ہے۔ اور بعد انفاق کے وہ مِلک مأمور ہوگی ولا باس بہ اس صورت میں مأمور سے بھی حق العبد کا مطالبہ بالکل نہ ہوگا۔ اور نہ اندیشہ حق العباد کی حالت میں اپنی ہی رقم سے حج کرنا اولیٰ ہے۔

ے ۷: معمولی ضرورت مجوّز تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔

ے ۸: ہاں جائز تو ہے مگر خریدار سے اس امر کو ظاہر کر دیا جائے کہ قیمت مشتہرہ سے زائد لے رہا ہوں۔ تاکہ وہ بائع سے بدظنی نہ کرے۔ کہ مجھکو ناواقف جان کر زیادہ دام لے لیئے۔ وفی الحدیث اتقوا مواضع التہم۔

ے ۹: غیر نبی کو خطاب کر کے سلام نہ پہنچایا جائے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے عرض کرے کہ اللّٰھم بلّغ روح شیخنا ھٰذا سلاماً من خادمہ فلان۔

ے ۱۰: ہاں کچھ حرج نہیں۔ لَاجُنَاحَ عَلَیْکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔ والسلام مسک الختام۔ واللہ اعلم۔

۲۲ رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ

سامان تعزیہ میراث میں مل جائے تو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے

السوال: زید تعزیہ بناتا تھا مگر اس کے ورثاء نے ترک کر دیا لیکن پہلے کے بعض سامانوں کو کسی حیلہ سے کیا بلکہ ورثاء کے ایماء سے اس جگہ کے دوسرے تعزیہ داروں نے لے لیا اور ہمیشہ اس کو کام میں لایا کرتے ہیں ایسی صورت زید کے مورث پر اس کا گناہ بھی ہوگا یا نہیں۔ ان چیزوں کے لینے میں مقدمہ فوجداری

کا بھی احتمال ہے اس حالت میں ورثاء کو کیا کرنا چاہئے۔

الجواب

یہ سامان تعزیہ بھی زید کی ملک تھا اس لئے اس کے سب ورثاء میں اس کی تقسیم کے بعد نقد قیمت کی تقسیم لازم تھی اگر بالغ وارثوں نے یہ سامان دوسرے کو دیدیا ہے اور اس میں نابالغوں کا بھی حق تھا تو نابالغوں کے حق کا ادا کرنا بالغوں کے ذمہ ہے اور سب ورثاء پر لازم تھا کہ اس سامان کو تعزیہ داری کے کام میں نہ خود لاتے اور نہ دوسروں کو اس کام کے واسطے دیتے۔ دوسروں کو تعزیہ بنانے کیلئے دینے کا گناہ تو زید کو نہیں ہوا۔ اگر اس نے وصیت نہ کی تھی۔ ہاں بالغ ورثاء کو ہوا پس اگر وہ واپس لے سکیں لے لیں۔ ورنہ اس گناہ سے توبہ واستغفار کریں۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون۔ ۲۴ ذی قعدہ ۴۸ھ

باب بیٹے کو کس طرح پکارے | **السوال:** فقیر کے تین لڑکے ہیں مثلاً پس بلاتے وقت بڑا میاں، منجھا میاں، چھوٹا میاں کرکے بلاؤں یا اس کا نام لیکر۔ عبد اللہ وجیہ اللہ، محفوظ اللہ مثلاً خاص نام سے پکاروں۔ غرض صحیح بلانے کے دستور مطلوب ہیں۔ نہ کہ بڑا مولوی، منجھا مولوی، چھوٹا مولوی۔

۲: میاں کا لفظ ہمارے دیار میں اکثر نام کے پیچھے ہمارے لوگ استعمال کرتے ہیں یہ خلاف سنت ہے یا نہیں۔ عرضگذار

محمد ابراہیم۔ مدرس مدرسہ محمدیہ

الجواب

باپ کو جائز ہے کہ لڑکے کو نام لیکر پکارے۔ یا بڑا میاں، چھوٹا میاں کرکے پکارے۔ اور میاں کا لفظ لگا دینا سنت کے خلاف بایں معنی نہیں کہ ممنوع نہیں۔ باقی سنت سے اس کا ثبوت بھی نہیں۔ غرض باپ بیٹے کو اس طرح پکارے کہ جس میں نہ اس کی تعظیم ہو اور نہ تذلیل ہو۔ نام لیکر پکارنے میں کچھ تذلیل نہیں ہاں تعظیم بھی نہیں۔ مگر باپ کے ذمہ اولاد کی تعظیم نہیں بلکہ اولاد کے ذمہ اس کی تعظیم ہے۔

البتہ اگر اولاد عالم ہو اور باپ جاہل ہو تو اس صورت میں بھی باپ کے ذمہ اولاد کی تعظیم واجب نہیں مگر علم کا ادب بہتر ہے۔ واللہ اعلم

احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون۔ ۳۰ ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ

پلیٹ فارم لیئے بغیر اسٹیشن کے اندر جانا

السوال: ریل گاڑی آنے کے وقت پلیٹ فارم پر جانے کیلئے ایک آنہ کا ٹکٹ لیکر جانے کا قانون ہے۔ اگر کوئی شخص بلا ٹکٹ پلیٹ فارم پر جائے یہ درست ہے یا نہیں۔

الجواب

اسٹیشن بابو سے دریافت کرکے جائے تو جائز ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۰ محرم ۴۹ھ

السوال: ایک موضع ضلع میرٹھ میں ایک چبوترہ خام تھا۔ جس پر مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے مسلمانوں نے اس چبوترہ کو پختہ مسجد بنانا چاہا۔ مگر زمینداروں نے جو غیر مسلم تھے مسلمانوں کے ساتھ مقدمہ لڑایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو تعمیر مسجد کی اس چبوترہ پر نماز پڑھنے کی ممانعت کردی گئی۔ اور وہ چبوترہ غیر مسلموں نے توڑ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اسی موضع میں ایک قطع زمین ایک غیر مسلم سے چار روپیہ میں خرید کیا۔ مسلمانوں نے اس اراضی پر تعمیر مسجد شروع کردی۔ اس اراضی کے بائع کا ایک لڑکا تھا۔ دوسرے غیر مسلم باشندگانِ موضع نے اس لڑکے کے بہکا کر اس مضمون کا عدالت میں دعویٰ دائر کرادیا کہ یہ اراضی ہماری جدی ہے میرے باپ کو اس کی بیع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ (اہل ہنود میں اگر ایک شخص مرجائے تو اس کی اولاد ذکور اور اولادِ ذکور کی اولاد ذکور کو وراثت

ہندوؤں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اگر ہمارے بری ہونے کی کوشش کرو تو ہم تمہیں مسجد کیلئے زمین دیدیں گے اور بطور اطمینان چار سو روپیہ کی تحریر دیدی کہ بوقت انکار ہم سے وصول کرلو۔ مقدمہ میں مسلمانوں کی سعی سے برے ہونے کے بعد ہندو لوگ زمین دینے سے انکار کردیں تو یہ روپیہ مسلمانوں کیلئے لینا جائز ہے یا نہیں؟

ایک دم ملتی ہے) نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مقدمہ ہار گئے اور بیعنامہ منسوخ ہو گیا اور مسلمانوں پر مرجہ اور خرچہ کی ڈگری ہو گئی اس لڑکے نے یہ روپیہ مسلمانوں سے وصول کرلیا اس کے بعد مسلمان بالکل مجبور ہو گئے ۔ اتفاقاً باشندگانِ غیر مسلم اس موضع میں دو فریق ہو گئے اور آپس میں مقدماتِ فوجداری چل گئے ۔ ایک فریق کے آٹھ آدمیوں کو سزا ہونے کو تھی انہوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ تم کوشش ہمارے بری ہو جانے کی کرو تو ہم تمہیں زمین مسجد کے واسطے دیں گے ۔ اور تم اگر ہم سے مطمئن نہ ہو تو ایک رقعہ چار سو روپیہ کا ہم تم مسلمانوں کو تحریر کر کے حوالہ کرتے ہیں ۔ اگر ہم اس وعدہ سے پھر جائیں تو تم چار سو روپیہ ہم سے وصول کر لو ۔ چنانچہ مسلمانوں نے کوشش کی وہ لوگ بری ہو گئے ۔ اور اس کوشش میں مسلمانوں کے بہتّر روپے خرچ میں آئے ۔ اس کے بعد جب مسلمانوں نے ان لوگوں کو ایفاء عہد کا کہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور سب باشندگان جن میں یہ تنازع ہوا تھا سب متفق ہو گئے ۔ اور جس فریق نے یہ رقعہ تحریر کیا تھا یہ فریق ان میں سے نہیں ہے جس نے پہلے زمین مسلمانوں کو چار سو روپے میں فروخت کی تھی ۔ اور یہ روپیہ بھی مسلمانوں کا وصول نہیں ہوا ۔ خلاصہ یہ کہ رقعہ کا روپیہ مسلمان وصول کر سکتے ہیں یا نہیں ۔ اور اس لڑکے نے جس نے مسلمانوں سے مقدمہ لڑایا تھا اس میں تمام باشندگانِ غیر مسلم نے چندہ دیا تھا ۔

الجواب صحیح

قال فی الخلاصة عن النوازل : رجل قال لدلال بع ضیعتی علی ان لك من الاجر كذا فلم یقدر هو علی الا تمام فباعها دلال آخر لیس للأول شیئ وبه اخذ الفقیه ابو اللیث قال فی المحیط : والاستحسان وعلیه الفتوی . وفی النوادر ابن سماعه : رجل شیئاً فقال للانسان بعینه ان دللتنی علیه فلك درهم فان دله من غیر مشی معه لا یستحق للاجر وان مشی معه فله اجر مثله .

رجل بیع شیئاً فی السوق فاستحان من ا ل السوق فاعانه

علیہ ثم طلب منہ الاجر المعتبر فی ذلک عادۃ اہل السوق فان کانوا
لا یعینون الا باجر یجب اجر المثل۔ و ان کانوا یعینون فی مثل
ذلک بغیر الاجر لا شئ علیہ قلت : انما ورد فی الجواب لغرض
المسئلۃ فیما اذا استحان و لم یبین الاجر ج ۳، ص ۱۲۶
رجل رفع جاریتہ مریضۃ الی طبیب و قال لہ عالجہا لما لک
و ما یزداد قیمتہا بالصحۃ فالزیادۃ لک فبرأت یجب اجر المثل
و ثمن الادویۃ و النفقۃ و الکسوۃ ان اعطاہا اھ ج ۳، ص ۱۲۹۔
قلت ھذا کلہ من باب الاستیجار علی العمل و الاستصناع
و یقال لہ الجعالہ و للاجر الجعل فی عرف اہل الحجاز قال
الموافق المغنی ان الجعالۃ فی رد الضالۃ و الابق و غیرھما
(کخیاطۃ الثوب و بناء الحائط و مداواۃ المریض و بیع الضیعۃ
و الوکالۃ بالخصومۃ و نحوھا) جائزۃ و ھذا قول ابی حنیفۃ
و مالک و الشافعی و لا نعلم فیہ مخالفاً۔ و الاصل فی ذلک قول
اللہ عز وجل لمن جاء بہ حمل بعیر و انا بہ زعیم۔ و روی
ابو سعید: ان رجل من الصحابۃ : رقی لابقا من احیاء العرب علی
قطع شیاہ اخرجہ البخاری و لان الحاجۃ تدعوا الی ذلک فان
العمل قد یکون مجہولاً۔ کرد الآبق و الضالہ و نحو ذلک۔ و لا
تنعقد الاجارۃ فیہ و الحاجۃ داعیۃ الی ردھما و قد لا یجد
من تبرع بہ فدعت الحاجۃ الی اباحۃ بذل الجعل فیہ مع
جہالۃ العمل لانہا ای الجعالہ غیر لازمۃ لکل واحد منہما
الرجوع فیہ قبل حصول العمل لکن ان رجع الجاعل قبل التلبس
بالعمل فلا شئ علیہ و ان رجع بعد التلبس بہ فیہ للعامل اجرۃ
مثلہ لانہ انما عمل بعوض و ان فسخ العامل قبل اتمام العامل
فلا شئ لہ لانہ اسقط حق نفسہ و یصیر کعامل المضاربۃ اذا
فسخ قبل ظہور الربح "

بخلاف الاجارة الا ترى ان الاجارة لما كانت لازمة
افتقرت الى تقدير مدة والعقود الجائزة كالشركة والوكالة
لا يجب تقدير مدتها ولان الجائزة من العقود لكل واحد
منهما تركها فلا يؤدى الى ان يلزمه مجهول عنده بخلاف
اللازمة قال ولا بد ان يكون العوض معلوما لان الحاجة تدعو
الى كون العمل مجهولاً ولا حاجة الىٰ جهالة العوض ولان العمل
لا يصير لازماً فلو يجب كونه معلوماً والعوض يصير لازماً باتمام
العمل فوجب كونه معلوماً قالوا اذا جعل الامير جعلا لمن
يدله على اوطريق سهل وكان الجعل من مال الكفارة جاز
ان يكون مجهولاً كجارية بعينها للحامل اھ ملخصاً ج ۶، ص ۱۵۰ - ۱۵۱

وبالجملة فقد اتفقوا على جواز الاستيجار على العمل مع
جهالته وفرقوا بين الجعالة والاجارة وفى الصورة المسئولة
لم يرض المسلمون بالعمل مجاناً وانما بذلوا جهدهم واموالهم
استخلاص القوم على جعل معلوم فالعقد صحيح ويجب على
القوم الاجر المسمّٰى ويجوز للمسلمين اخذه منهم - واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۳ر جمادی الاول ۱۳۵۵ھ

صح الجواب
اشرف علی ۲۵ ج ۲ ۵۵ھ

النفع البرزة
فی تحقیق قطع الشجرة

شجرة الرضوان کے بارے میں اخبار منادی دہلی میں شائع شدہ ایک مضمون کے جواب میں۔

الجواب المجمل

شجرة الرضوان کے متعلق طبقات ابن سعد میں جو نافع کا ایک اثر وارد ہے
قال کان الناس یأتون الشجرة التی یقال لها شجرة الرضوان فیصلون عندها قال فبلغ ذلك عمر بن الخطاب فاوعدهم فیها وامر بها فقطعت اھ

اس سے بعض علماء نے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ جب حضرت عمر نے اسے تبرک درخت کو خوف فتنہ کی وجہ سے کہ عوام اس درخت کی تعظیم میں حد سے بڑھنے لگیں گے کٹوا دیا تو ان مأثر و مزارات اور قبوں کو کیوں نہ ڈھایا اور مٹایا جائے جو اصل سے ہی خلافِ شرع بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے اور اُن پر عمارت بنانے سے منع فرمایا۔ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تجصیص القبور وان یکتب علیھا و ان یبنی علیھا۔ رواہ مسلم وابو داؤد وترمذی وزاد ان توطا مراقی الفلاح والطحاوی ص۳۵۶۔ ولعن اللہ الیھود والنصاری اتخذوا قبور انبیائھم مساجداً متفق علیہ۔

اور بعض مأثر تو بالکل ہی مخترع ہیں۔ تاریخ صحیح اور حدیث معتبر سے اُن کی کچھ اصل نہیں ملتی۔ گو فی نفسہٖ کچھ اصل ہو۔ مگر اُن کی وجہ سے عوام میں فتنے برپا ہو رہے ہیں۔ کہ اُن پر مجاور رہنے لگے اور اس پر غلاف اور نذریں

سه سئل ابو عبد اللہ (احمد بن حنبل) عن الرجل یأتی ھذہ (باقی صفحہ ــــ پر

چڑھاتے حالانکہ ابوداؤد کی حدیث میں جس کی اسناد حسن ہیں لا تتخذوا قبری عیداً۔ اور بعض طرق میں لا تتخذوا قبری و بیتی عیداً بھی ہے۔ جو کثرت مخارج کی وجہ درجہ حسن میں ہے ملاحظہ ہو اقتضاء صراط المستقیم ص۱۵۴، ص۱۵۵۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان و قبر کو عید بنانا ممنوع ہے تو دوسرے مأثر کا حکم اس سے ظاہر ہے۔ پس ان علماء کا مقصود کچھ اثر نافع پر مفقود نہیں تھا کیونکہ انہوں نے ان شرکیات و بدعات کی تردید میں آیاتِ الٰہیہ اور صدہا احادیث صحیحہ و اقوال ائمہ اربعہ سے استدلال کیا ہے اور محض تائید کے درجہ میں اثرِ نافع کو بھی بیان کر دیا ہے۔ مگر بعض مضمون نگاروں نے ایک رئیس المبتدعین کے اخبار میں تمام دلائل کو چھوڑ کر اور آیاتِ الٰہیہ و احادیثِ صحیحہ و اقوالِ ائمہ اربعہ سے منہ موڑ کر صرف اثرِ نافع کی تردید پر سارا زور ختم کر دیا۔ اور ان لوگوں کو جو اس اثر کو محض تائید کے درجہ میں پیش کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناپاک اتہام لگانے والا اور ملاحدہ و جہال کا لقب دیا اور یہ کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے وسیع الخیال و حکیم امت کو پست خیال ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور اُن کے دامنِ عدل پر دھبہ لگاتے ہیں۔

گو مضمون نگار نے ظاہر میں اپنا مخاطب فرقہ نجدیہ یا سردارانِ نجدیہ جماعت غیر مقلدین کو بنایا ہے مگر درحقیقت اس میں علماء حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ اور حضرات محدثین بالخصوص اثر کے راوی حضرت نافع اور ان کے بعد والے رواۃ سب کو ملحدہ جہاں کا لقب دیا ہے۔ اور سب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناپاک اتہام لگانے کا مجرم بنایا ہے۔ کیونکہ نافع کے اس اثر کو محض نجدیہ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) المشاهد التی بالمدینة وغیرها یذهب الیها تری ذلك قال علی حدیث ابن ام مکتوم انه سأل النبی صلی الله علیه ان یصلی فی بیته حتی یتخذ ذلك مصلی وعلی ما کان یفعله ابن عمر یتتبع مواضع النبی صلی الله علیه وسلم و اثره فلیس بذلك بأس أن یأتی لاجل المشاهد إلا ان الناس قد افرطوا فی هذا جدا واکثروا فیه اھ (من الاقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیه ص۱۸۴)

دل قوله إلا ان الناس قد شرطوا الخ علی المنع منه اذا ترتب علیه فتنة ۱۲۔

سرداران نجدیہ ہی پیش نہیں کرتے بلکہ جملہ مذاہب اربعہ کے علماء اور محدثین نے اس کو پیش کیا اور نقل کیا ہے اور صحیح مانا ہے۔

علماء شافعیہ میں سے خاتمۃ الحفاظ المحدثین حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس اثر کو نقل کرتے ہوئے اس کی تصحیح کی ہے۔ قال ثم وجدت ابن سعد باسناد صحیح عن نافع ان عمر بلغہ ان قوما یأتون الشجرۃ الخ اھ (ج ۷ ص ۳۴۵)

اور علماء حنفیہ میں سے خاتمۃ المحققین علامہ عینی نے شرح بخاری میں اس اثر کو نقل کرتے ہوئے صحیح مانا ہے۔ قال وفی روایۃ ابن سعد باسناد صحیح عن نافع ان عمر بلغہ الخ (ج ۸، ص ۲۸۴)

اور علماء مالکیہ میں سے امام محمد بن وضاح نے جو حافظ حدیث ہونے کے علاوہ محدث الاندلس کے لقب سے ممتاز ہیں۔ اپنی کتاب میں سند صحیح سے اس اثر کو بیان فرمایا ہے ملاحظہ ہو (انما تتہ العنان لا بن المقیم صلا)

اور علماء حنابلہ میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ حرانی اور حافظ ابن القیم نے اس اثر کو بیان کرکے اس سے احتجاج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۸۵ لابن تیمیہ۔

اور انما تتہ العنان لابن القیم ص مذکور۔

پس اگر اس اثر کو بیان کرنا اور اس کو صحیح ماننا اور اس کو استدلال میں پیش کرنا الحاد اور جہل ہے۔ اور حضرت عمرؓ پر ناپاک اتہام لگانا اور ان کے دامنِ عدل پر دھبہ لگانا ہے۔ تو اس کے مجرم صرف جماعتِ نجدیہ یا سردارانِ نجدیہ ہی نہیں بلکہ ایک طرف سے تمام اہل سنت والجماعت اور جملہ مذاہبِ اربعہ اس جرم کے مرتکب ہوں گے نعوذ باللہ منہ۔

کیونکہ اس مبتدع مضمون نگار کے اس مضمون سے تمام اہل سنت کے دامن عصمت پر ایک غلیظ الزام اور بدنما داغ لگتا تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ مختصراً اس کا جواب دیدیا جائے۔ تاکہ عوام غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

مضمون نگار نے اولاً بخاری کی روایات سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ درخت بیعتِ رضوان کے اگلے ہی سال تمام صحابہ کی نظروں سے غائب ہوگیا تھا

اور اس کیلئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا قول رجعنا من العام المقبل فی اجتمع من اثنان علی الشجرۃ التی بایعنا تحتھا کانت رحمۃ الخ

اور حضرت مسیبؓ بن حزن کے قول فلما خرجنا من العام المقبل نسیناھا فلم نقدر علیھا سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ صیغہ جمع متکلم کا استعمال عموم کو بتلاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عدم عرفانِ شجرہ اور اس کو بھول جانا فقط عبد اللہ بن عمرؓ و مسیب بن الحزن کیلئے خاص نہ تھا۔

مگر اس سے کوئی پوچھے کہ صیغہ جمع متکلم کا عموم پر دلالت کرنا یہ کون سا قاعدہ معانی و اصول سے ثابت ہے۔ صیغہ جمع متکلم حقیقت کے اعتبار سے ایک سے زائد پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عربی زبان میں دو کے واسطے بھی جمع متکلم کا صیغہ ہی وضع کیا گیا ہے۔ جو میزان پڑھنے والے بھی جانتے ہیں۔

پس مسیب بن الحزن کے قول میں دو سے زیادہ پر دلالت کی کوئی دلیل بیان کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے کلام میں کوئی قرینہ ارادۂ تثنیہ یا جمع پر قائم نہیں بلکہ قتادہ کی روایت میں مسیبؓ کا قول نسیناھا فلم اعرفھا۔ یہ بتلاتا ہے کہ وہاں جمع سے واحد ہی مراد ہے۔ کیونکہ مجازاً کبھی واحد کو بھی جمع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے قرآن میں جابجا حق تعالیٰ نے اپنے لئے صیغہ جمع ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ محاورہ ہر زبان میں شائع ہے۔

پس مضمون نگار کو اس مجاز کے مراد نہ ہونے پر بھی دلیل قائم کرنا چاہیئے جس کا قرینہ دوسری روایت میں موجود ہے اور ابن عمرؓ کے قول میں ارادہ معنی جمع پر گو قرینہ ہے۔ مگر اس میں بھی عموم و استغراق پر کوئی دلیل نہیں، اس سے یہ کیونکہ ثابت ہوا کہ تمام صحابہ اس درخت کو بھول گئے اور اس کی تعیین سے عاجز تھے۔ پھر ابن عمرؓ اور مسیبؓ کے قول سے اُن کا عدم عرفان و نسیان ہی مفہوم ہوتا ہے۔ نظروں سے گم ہو جانا جس سے غیبی طور پر اس کا اخفاء و ارتفاع مفہوم ہو رہا ہے۔ کس لفظ سے سمجھا گیا۔ گیا کسی چیز کو نہ پہچاننا اور بھول جانا اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ نظروں سے گم ہو جائے۔ ہرگز نہیں۔

اگر مضمون نگار اس بات کا مدعی ہے تو دلیل قائم کرے اور اگر اس نے

اس روایت کے تمام طرق کو جمع کیا ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت مسیبؓ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ درخت ہی اصل سے مخفی و غائب ہوگیا۔ بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ وہ درخت موجود تھا مگر ہم کو اس کی تعیین میں اشتباہ ہوگیا۔ چنانچہ عفان کی روایت میں حضرت مسیبؓ کے یہ الفاظ ہیں فعمی علینا مکانہا۔

(فتح الباری فی شرح البخاری۔ ج ۷، ص ۳۴۴)

اور حضرت عبد اللہ بن عمر کے الفاظ تو بہت صاف ہیں کہ وہ تو اتنا ہی فرماتے ہیں کہ ہم میں سے دو آدمی بھی اس درخت پر اتفاق نہ کر سکے۔ جس سے صراحۃً ہی معلوم ہو رہا ہے کہ وہ صرف اپنا تعیین نہ کر سکنا بتلا رہے ہیں۔ نہ کہ درخت نظروں سے غائب اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مضمون نگار نے حضرت مسیبؓ کے قول إن اصحاب محمد لم یعلموا ها و علمتموها انتم فانتم اعلم سے استدلال کیا ہے۔ کہ جمع مضاف بقاعدۂ معانی و اصول مفیدِ استغراق ہے پس حاصل یہ ہوا کہ عموماً اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے یہ درخت علی سبیل التعین غائب ہوگیا تھا۔ اس مضمون نگار نے جمع مضاف کے مفید استغراق ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اور اس کو قاعدۂ معانی و اصول بتلایا ہے۔ مگر اس سے کوئی پوچھے کہ یہ قاعدہ کہاں لکھا ہے ذرا وہ عبارتِ کتاب مع حوالۂ صفحہ و باب نقل کرے پھر یہ بھی ثابت کرے کہ جمع معرف باللام یا جمع مضاف کا استغراق کیلئے ہونا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ یا مختلف فیہ اگر اس نے نور الانوار ہی پڑھی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ عموم کیلئے استغراق کا لازم ہونا مختلف فیہ ہے۔ چنانچہ فخر اسلام عموم استغراق کو شرط نہیں کرتے اور اہلِ معانی نے جمع معرف باللام کا مفید استغراق ہونا ضرور بیان کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کی دو قسمیں بھی کی ہیں۔ استغراقِ حقیقی اور استغراقِ عرفی اور استغراقِ

پس اس لفظ سے بھی کسی طرح مضمون نگار یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ صحابہ اس درخت کو بھول گئے اور اس کے پہچاننے سے عاجز تھے اور اس کا غائب ہو جانا تو کسی لفظ سے بھی مفہوم نہیں ہوتا اور یہ ایسی بات ہے جس کا غلط ہونا خود مضمون نگار کے ضمیر کو معلوم ہے مگر وہ دیدہ و دانستہ سعید بن المسیب رضی کے قول میں اصحاب محمدؐ کو استغراق حقیقی پر محمول کرنے کی غلط کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بخاری میں حضرت جابرؓ کا یہ قول بھی موجود ہے۔ لوکنت ابصر الیوم لاریتکو مکان الشجرۃ۔ اگر میں آج بینا ہوتا تو تمہیں درخت کی جگہ بتلا دیتا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ کو مکانِ شجرہ کا علی سبیل التعین علم تھا۔ اور جب وہ درخت غیبی طور پر دنیا سے اٹھایا نہیں گیا تو یقیناً جب تک وہ اپنی جگہ پر قائم رہا اس وقت تک وہ درخت کو پہچانتے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہ اس درخت کو اور اس کی جگہ کو نہ بھولے تھے۔

مگر مضمون نگار دیدہ و دانستہ اس حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور نہایت جرأت سے کہتا ہے کہ حضرت جابرؓ نے مکان الشجرہ فرمایا ہے بعینہ الشجرہ نہ فرمایا۔ جبکہ ظاہر ہے کہ اصل درخت کی شناخت اور ہے اور اس جگہ کی پہچان اور ہے الخ۔

جس شخص کے سر میں دماغ اور دماغ میں شعور ہے وہ جانتا ہے کہ جو شخص کسی درخت کو یا کسی مکان کی جگہ کو پہچانتا ہوگا وہ یقیناً اس درخت اور مکان کے بقاء تک کو پہچانے گا اور مکان بھی ضرور پہچان لے گا۔

اور یہی وہ بات ہے جس کو حافظ ابن حجر نے حضرت جابرؓ کے قول سے سمجھا ہے۔
مگر مضمون نگار حافظؒ کی سیدھی اور صحیح بات کو ایک احتمالِ رقیق کہہ کر اڑا
دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور محض مکان شجرہ

اس کا جواب اوپر کی تقریر سے ناظرین نے سمجھ لیا ہوگا کہ ان حضرات کے اقوال
سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ درخت نگاہوں سے غائب اور آنکھوں سے
اوجھل ہوگیا تھا۔ بلکہ وہ صرف اپنا نہ پہچاننا اور جگہ کا یاد نہ رہنا اور اس
درخت کا دوسرے درختوں سے مشتبہ ہونا بتلاتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا کہ
کرامت کے طور پر درخت دنیا سے اٹھا لیا گیا یا آنکھوں سے غائب اور اوجھل
کر دیا گیا محض مضمون نگار کا خیال آفرینی ہے۔ اور اپنی طرف سے ایک نئی
بات کا اختراع ہے۔

حضراتِ صحابہ نے ہرگز ان باتوں کا دعویٰ نہیں کیا تھا اگر کسی کو دعویٰ
ہے تو اس پر صریح دلیل قائم کرے۔ جب تک اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو اس
وقت تک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی بات کا رد کرنا آفتاب پر تھوکا اپنے منہ پر
لینا ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ بعض صحابہ اس درخت کو اور اس کے تباہ ہونے کے
بعد اس کی جگہ کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

اب تو بخاری کی روایت سے یہ ثابت ہوگیا کہ سعید بن المسیبؓ کے قول
میں اصحاب محمد میں جمع مضاف عموم اور استغراق کیلئے نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو
اصحاب عرفی مراد ہے نہ کہ حقیقی۔ اس کے بعد مضمون نگار کہتا ہے کہ اگر حضرت
جابر کی روایت کو عبداللہ بن عمر اور مسیبؓ کی روایت سے تعارض ہوتا بھی تو حضرت

عبد اللہ بن عمر کی روایت کو بہر صورت ترجیح و تقدیم ہوتی۔ اس لیئے کہ وہ آثارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت جویان تھے اور اُن مقامات کی حضوری سے برکت حاصل کرتے تھے۔ الخ

مگر یہ ایسی بات ہے جو اسی شخص کی زبان سے نکل سکتی ہے جس کو علم سے ذرا مس نہ ہو کیونکہ سب حدیث پڑھنے والے اس قاعدہ کو جانتے ہیں کہ جاننے والا نہ جاننے والے پر مقدم ہے اور مثبت نافی پر مقدم ہے۔ پس اس قاعدہ سے حضرت جابرؓ کے قول کو ترجیح ہے۔ اور جو وجۂ ترجیح مضمون نگار نے بیان کی ہے اس کو علماء حدیث وفقہ سے اسباب ترجیح میں شمار نہیں کیا۔ دوسرے یہ ماننا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر آثارِ رسول اللہ کے بہت جویان تھے مگر حدیث پڑھنے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صغارِ صحابہ میں یعنی کمسن اور تھوڑی عمر والے تھے۔ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کا علم بلا واسطہ کم ہوتا تھا۔ وہ بہت سے آثار کو اجل صحابہ کرام سے دریافت کر کے معلوم کرتے تھے۔

چنانچہ دخولِ بیت اللہ اور اس میں نماز پڑھنے کی کیفیت ابن عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے معلوم کی۔ (بخاری ج ۱، ص ۲۱۶)

اسی طرح قباء میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور وہاں کی مسجد میں آپ نے نماز پڑھی اور انصار حالتِ نماز میں آپ کو سلام کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ سے اُن کو جواب دیتے تھے۔ یہ کیفیت بھی اُن کو حضرت بلال سے معلوم ہوئی تھی۔ (ابوداؤد ج ۲، ص ۹۷)

پھر باوجود اس قدر تتبع آثار کے عبد اللہ بن عمر بعض دفعہ کسی بات کو بھول بھی جاتے تھے چنانچہ بخاری میں موجود ہے کہ ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمرہ ماہ رجب میں بیان کیا جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انکار فرمایا اور کہا کہ عبد اللہ بن عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر عمرہ میں تھے لیکن رجب میں آپؐ نے کوئی عمرہ نہیں فرمایا۔ (بخاری ج ۱، ص ۲۳۹)

کیا بعید ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر شجرۂ رضوان کو بھی بھول گئے ہوں

پھر کیا وجہ ہے کہ اُن کی نسیان و عدم معرفت کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علم و معرفت پر ترجیح دی جائے۔ یہ نیا طریقۂ ترجیح مضمون نگار کے دماغ نے ایجاد کیا ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے عمدۃ القاری کی عبارت کا حوالہ دیکر کہا ہے کہ علامہ عینی محدث نے بھی اس درخت کا بعینہٖ استتار و اخفاء کا ذکر کیا ہے جیسا کہ میں نے عبارت نص سے سمجھا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ عینی محدث نے اس کے باوجود اثر نافع کو بھی صحیح کہا ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور اس اثر کو قولِ ابنِ عمر و مسیب و سعید کے خلاف سمجھ کر رد نہیں کیا جیسا مضمون نگار نے کیا ہے۔ اور نہ اس کو حضرت عمر پر ناپاک اتہام کہا نہ اس کے راویوں اور ماننے والوں کو ملاحدہ وجہال کہا۔ لیکن مضمون نگار کے نزدیک اس اثر کو ماننے والے اور پیش کرنے والے سب ملاحدہ وجہال ہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناپاک اتہام لگانے والے جن میں خود علامہ عینی محدث بھی داخل ہو گئے۔ اول تو مضمون نگار اس الزام سے علامہ عینی محدث کو بری کرے اور اپنے خود ساختہ جرم کو اُن پر سے دفع کرے پھر ہم بھی اُن کے قول کا مطلب حل کر دیں گے۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتاویٰ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کیا انہوں نے اس میں بھی فرمایا ہے اور حافظ ابن حجر کی اس رقیق توجیہ پر نہایت تعجب فرمایا اس کے متعلق اولاً صحیح سند کا مطالبہ ہے کہ مضمون نگار سند صحیح متصل اس فتاویٰ مطبوعہ کا شاہ صاحب کا فتاویٰ ہونا ثابت کرے اور بتلائے کہ اس کو شاہ صاحب نے جمع کیا ہے یا کسی اور نے اور جامع ثقہ ہیں یا نہیں اور آجکل کے مطابع کا کسی کتاب کو طبع کر کے کسی کے طرف منسوب کر دینا حجت نہیں۔ اس فتاویٰ کو جس کسی عالم نے بھی دیکھا ہوگا وہ جانتا ہوگا کہ اس میں کس قدر رطب و یابس کو بھرا گیا ہے۔ اور اگر بالفرض یہ فتاویٰ شاہ صاحب کا ہی ہے تو اب حافظ ابن حجر اور شاہ صاحب کی جلالتِ شان کا موازنہ کر کے اہلِ علم سے فیصلہ کروا لیا جائے کہ حدیث کے علم میں حافظ کا مرتبہ عالی ہے یا شاہ صاحب کا۔ پس یہ دلیل بھی لغو ہوئی۔

اس کے بعد مضمون نگار بہت جرأت سے دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا شجرۂ رضوان کو کٹوا دینا بالکل بے سر و پا افسانہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ بخاری کی روایتِ صحیح کے خلاف ہے اس سے تو اس کا اخفاء و استتار ثابت ہوتا ہے۔ پھر قطع و برید کے کیا معنیٰ ہونگے۔ الخ

اس کا جواب ہماری تقریرِ بالا سے بالکل ظاہر ہو چکا ہے کہ یہ روایتِ صحیح بخاری سے درخت کا نظروں سے اوجھل ہو جانا اور غائب ہو جانا اور نہ پہچان سکنا اور جگہ میں اشتباہ ہو جانا ثابت ہے۔ اور قولِ سعید بن المسیب کو استغراقِ عرفی پر محمول کیا جائے تو بہت سے بہت مدینہ کے اکثر صحابہ کا بھول جانا اور نہ پہچاننا ثابت ہو جائے گا۔ اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ عام طور پر تمام صحابہ خصوصاً مکہ اور حدیبیہ اور حرم کے رہنے والے صحابہ بھی اس درخت کو بھول گئے۔ اور پہچان نہ سکتے تھے۔ یا وہ درخت ہی دنیا سے غائب ہو گیا تھا یہ محض مضمون نگار کی نرالی فہم ہے جو کہ سرتاپا غلط ہے۔ اس لئے یہ اثر بخاری کی روایت کے خلاف ہرگز نہیں اس کے بعد کہتا ہے کہ ثانیاً اگر جابرؓ کے قول کے وہ معنی بھی لیں جو حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اُن کی آخر عمر میں نابینائی تک وہ درخت بعینہٖ باقی تھا یعنی ۷۸ھ کے لگ بھگ تک تب بھی قطع و برید محال ہے اس لئے کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ۲۳ھ میں ہوا ہے الخ

اس کا جواب بجز اس کے کیا دوں کہ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"۔ یا یوں کہوں کہ دروغ گورا حافظہ نباشد۔ یا یوں کہوں کہ مضمون نگار کی عقل آئمۂ شافعیہ، حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی شان میں گستاخی کرنے کی وجہ سے مسخ ہو گئی ہے۔ کیونکہ حافظ نے ہرگز نہیں کہا کہ وہ درخت حضرت جابرؓ کی آخری عمرِ نابینائی تک باقی تھا۔ وہ تو اس کے خلاف تصریح فرما رہے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ وفیہ دلالۃ علی انہ کان یعرفہا بعینہا لان الظاہر انہا حسن مقالتہ کانت ہلکت اما بجفاف أو بغیرہ واستمر ہو یعرف موضعہا بعینہ ثم وجدت عند ابن سعد باسناد صحیح الخ (ج ۷، ص ۳۴۴، ۳۴۵)

اس میں صاف تصریح ہے کہ حافظ کے نزدیک حضرت جابر کی بینائی کے وقت وہ درخت ھلاک ہو گیا تھا۔ تب ہی تو حضرت جابر نے یہ فرمایا کہ اگر میں بینا ہوتا تو درخت کی جگہ تبلا دیتا۔ اگر اس وقت درخت بعینہٖ موجود ہوتا تو یوں نہ فرماتے کہ تم کو دکھلا دیتا پس اس اعتراض کی لغویت اور مضمون نگار کی فہم کا حال معلوم ہو گیا۔

اس کے بعد مضمون نگار کہتا ہے۔

ثالثاً جس نے اس حکایت کو پیش کیا ہے وہ طبقات ابن سعد سے پیش کیا ہے اس جمع سے اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن سعد کاتب واقدی کی روایت بخاری کی روایت کے سامنے قابلِ قبول نہیں چنانچہ اس لیئے اس نے آخیر میں کہا ہے کہ اب سمجھنا چاہیئے کہ کجا امام محمد بخاری و کجا کاتب واقدی شتان بینھما۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بات تو مضمون نگار کو اس وقت زبان سے نکالنی چاہیئے تھی جب کہ وہ اس اثر کو روایتِ کے معارض ثابت کر دیتا۔ حالانکہ ہم دکھلا چکے ہیں کہ اس نے کسی دلیل سے بھی اس کا معارض ہونا ثابت نہیں کیا، محض خیالی ڈھکوسلوں سے وہ اس کو معارض سمجھتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کاتب واقدی کی طرح مجروح و مطعون نہیں ہے۔ بلکہ اس کو تمام محدثین نے حافظ، ثقہ عدل و متحری مانا ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (ج ۹، صـ۱۸۲)

· محمد بن سعد بن منیع الھاشمی مولاھم ابو عبد اللہ البصری المتحری قال الخطیب ومحمد عندنا من اھل العدالۃ وحدیثہ یدل علی صدقہ فانہ یتحری فی کثیر من روایاتہ اھ

تیسرے ہم مضمون نگار کو اس کی قلت نظر پر تنبیہ کرتے ہیں کہ اس اثر کو سب نے طبقات ابن سعد ہی سے پیش نہیں کیا بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم نے اس کو کتاب محمد بن وضاح سے نقل کر کے پیش کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا۔ اور محمد بن وضاح کا حال طبقاتِ مالکیہ لابن فرحون جس کا نام الدیباج المذھب ہے۔ اس طرح مذکور ہے۔ وبہ یبقی بن مخلد صارت الاندلس دار حدیث وکان اماما ثبتاً عالماً بالحدیث بصیراً بہ متکلما علی

علله ۱ھ (ج - ص ۲۴۰، ۲۴۱)

اس کے بعد مضمون نگار نے نہایت دلیری سے اس اثر کے راویوں پر کلام شروع کیا ہے۔ کہ اس میں عبدالوہاب بن عطا، ضعیف ہے جس کو بخاری نے لیس بالقوۃ کہا ہے۔ اور تقریب میں صدوق ربما اخطاء کہا ہے۔ یہی وجوہات ہیں کہ امام بخاری نے ان سے کوئی روایت نہ کی اور نہ مسلم نے ادھر توجہ کی الخ

اس کا جواب یہ ہے کہ مضمون نگار کو ایسی سند پر کلام کرنے کا کوئی حق نہیں ہے حافظ ابن حجر و علامہ عینی جس اسناد کو صحیح فرما چکے ہیں کیونکہ تہذیب التقریب کے مصنف خود حافظ ابن حجر ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ کون سے جرح سے راوی ضعیف ہوتا ہے اور کس سے نہیں ہوتا۔ اور ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ حافظ ابن حجر و علامہ عینی دونوں نے اس اسناد کو اسنادِ صحیح فرمایا ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار کو یہ معلوم کر کے اپنی قلت بضاعۃ پر رونا چاہیئے کہ امام محمد بن وضاح نے اس روایت کو بواسطہ عیسیٰ بن یونس روایت کیا ہے جو صحیح بخاری و مسلم دونوں کے رواۃ ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں اُن کی سند میں عبدالوہاب بن عطاء کے متعلق کہتا ہے کہ نہ مسلم نے اس طرف توجہ دی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم نے عبدالوہاب کی روایت کو صحیح مسلم میں نہیں لیا۔ حالانکہ تہذیب و تقریب۔ دونوں میں امرِ مبہم سے اور کتاب الجمع میں الرجال الصحیحین للمقدسی میں صراحت کے ساتھ ان کا رجال مسلم سے ہونا مذکور ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے اس پر زور دیا ہے کہ یہ اثر بقاعدۂ محدثین منقطع ہیں۔ کیونکہ نافع نے حضرت عمر کو نہیں پایا اور منقطع قابلِ اعتماد و استناد نہیں ہوتا۔ اس کے بعد یا سردارانِ نجدیہ کی دیانت پر حملہ کیا ہے کہ یہ لوگ اپنے عقیدۂ مخترعہ کو ثابت کرنے کیلئے رطب و یابس کی تمیز بھی نہیں کرتے۔ لیکن مضمون نگار کو اس کی خبر نہیں کہ یا سردارانِ نجدیہ سے پہلے خود اس کے مسلّم علماء عینی اور حافظ جیسے محدثین جو نجدی یا وہابی نہیں۔ بلکہ حنفی اور شافعی مقلد ہیں اس اثر کو نقل کر کے اس کی اسناد کو صحیح کہہ چکے ہیں۔ تو کیا اُن کی بھی رطب و یابس کی

تمیز نہ تھی۔ پس اس کو پہلے اپنے گھر کی خبر لینا چاہیئے۔ پھر پاسدارانِ نجدیہ کو الزام دینا زیبا ہوگا۔

ہ حملہ بر خود می کنی۔ اے سادہ مرد ہمچوں آں شیر کہ بر خود حملہ کرد۔

نیز اُن کو اپنے مذہب کے اصول کو بھی پڑھنا چاہیئے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ حنفیہ کے یہاں قرون ثلاثہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا منقطع بھی حجت ہے وہ اس کو صرف ہم نہیں کہتے ملاحظہ ہو نور الانوار ص۱۸۴، ص۱۸۵ التقسیم الثانی فی الانقطاع وھو نوعان ظاھر و باطن اما الظاھر فمرسل من الاخبار ان کان من الصحابی فمقبول بالاجمال ومن القرن الثانی والثالث مقبول عند الحنفیۃ۔

اور اھلِ نجد اپنے کو حنبلی کہتے ہیں اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی حنفیہ کی طرح منقطع حجت ہے۔ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین لابن القیم ج ۱ ص۸ : اور پاسدارانِ نجدیہ کے نزدیک منقطع ضعیف ہے تو مطلقاً ضعیف نہیں بلکہ وہ منقطع ضعیف ہے جس کا ارسال کرنے والا ثقہ وغیر ثقہ ہر ایک سے ارسال کرتا ہو اور اگر ارسال کرنے والے صرف ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہو یا وہ امام متفق علیہ ہو تو اس کا ارسال وانقطاع محدثین کے یہاں مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلغات مالک ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ اور بخاری کی تعلیقات مجزومہ بھی بحکم موصول صحیح ہیں۔ اور اصول حدیث میں پاسدارانِ نجدیہ محدثین ہی کے متبع ہیں اب دیکھنا چاہیئے کہ نافع کا ارسال کس قسم میں داخل ہے تو ظاہر ہے کہ نافع متفق امام وثقہ ہیں جب کوئی وجہ نہیں کہ مالک کا بلاغ حجت خط ہو اور نافع کا بلاغ وارسال حجت نہ ہو۔ حالانکہ امام مالک نے جس سند کو اصح الاسانید کہا ہے وہ نافع کے واسطے سے ہے اور دوسرے نافع کا صحیح الروایۃ ہونا اور اُن کی روایت میں خطا نہ ہونا بھی ایک مسلّم امر ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (ج ر ۱۰، ص ر ۴۱۴)

وقال الخلیلی نافع من أئمۃ التابعین بالمدینۃ امام فی العلم متفق علیہ صحیح الروایۃ ولا یعرف لہ الخطاء فی جمیع ما رواہ اھ ملخصاً۔

اس تصریح کے بعد نافع کے ارسال و انقطاع کے مقبول ہونے میں کیا کلام ہے حیرت ہے کہ احمد بن حنبل اور بخاری اور مالک وغیرہ کسی بات کو جزم کے ساتھ بلا نما یا تعلیقات بلا سند بیان کریں تو ان کا نام جزم و حجت ہو اور نافع جیسے امام التابعین متفق علیہ ثقہ صحیح الروایۃ کا جزم حجت نہ ہو۔ اس کو کوئی محدث تسلیم نہ کریگا۔ علاوہ ازیں کہ جن پاسداران نجدیہ نے مقابر و قبب کے قابل انہدام ہونے کی تائید میں نافع کا یہ اثر پیش کیا ہے ان کا مدعیٰ صرف اسی پر موقوف نہیں بلکہ اس کو تو محض تائید کے درجہ میں وہ پیش کرتے ہیں اور منقطع سے تائید کرنا اتفاقاً سب کے نزدیک درست ہے۔ اور ان کا اصل مدعا احادیث مرفوعہ صحیح سے ثابت ہے۔ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف قبروں کے پختہ کرنے اور ان پر عمارت بنانے اور چراغان کرنے سے منع فرمایا ہے پس اگر مضمون نگار کو ہمت ہے تو ان احادیث کا جواب دے کر اپنی مبتدع جماعت کی دستگیری کرے محض اثر نافع کی تردید میں اتنا زور کیوں دکھلایا جاتا ہے۔ جس سے پاسداران نجدیہ اتنا کہہ سکتے ہیں اور پھر سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ اس کو تو ہم نے محض تائید میں بیان کیا تھا۔ اور ہمارا اصل اعتماد احادیث مرفوعہ صحیحہ پر ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار علم دین کے میدان سے نکل کر نئی (مغربی) روشنی کی پناہ لیتا ہے جو غالباً اس کا اصلی مذاق ہے اور پہلا رنگ محض پختہ کاران اسلام کو دھوکہ دینے کیلئے اختیار کیا گیا تھا وہ کہتا ہے۔

(خاکش بدہن) ملاحدہ و جہال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وسیع الخیالی کی پست خیالی ثابت کرنیکے لئے اس قسم کی باتیں اس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ وہ آثار قدیم و مہتم بالشان یادگاروں کو مٹاتے تھے کتب خانہ اسکندریہ جلادیا اور تبرک آثار رسول کو مٹا دیا پھر کہتا ہے کہ آثار قدیمہ کی حفاظت کا مسئلہ اس زمانہ میں مسلم الثبوت ہو گیا ہے۔ اور نامورانِ ملک و ملت کا اسٹیچو (مجسم) نصب کیا جاتا ہے اور اس کے نصب کرنے میں مسلمان لیڈران بھی فراخدلی سے شرکت کرتے ہیں۔ اور تصویر کے جواز پر رسالہ لکھا جاتا ہے۔

مگر ذریاتِ نجدیہ جب آثارِ انبیاء کو اور آثارِ سلف صالحین کو مسمار کرتے ہیں تو اس کو سنت فاروقی و مشرب شافعی و مسلکِ حنبلی بنا کر اس عمل کو مستحسن بناتے ہیں اس کے بعد پھر علم دین کی پناہ میں آکر کہتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو آثارِ انبیاء کی ایسی قدر کرتے تھے کہ مقام ابراھیم جہاں حضرت ابراھیم کے قدم مبارک کے نشان تھے اس کو مصلی بنانے کی تمنا کرتے تھے۔ حالانکہ بت پرستی کا خوف تو مقام میں تو بہت زیادہ تھا کیونکہ اس کے پوجھنے والے وہاں بہت باقی تھے۔ اس کے بعد واقع رمل کا ذکر کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کعبہ میں رمل کیا تھا تاکہ مشرکین قوت اسلامی کو دیکھ لیں پھر حضرت عمرؓ اپنے زمانہ میں فرماتے ہیں کہ اب تو اس کی ضرورت نہیں رہی یہاں نہ مشرکین ہیں نہ مخالفین لیکن یہ ہمارے حضور کا فعل ہے ہم تو اسے نہ چھوڑیں گے بے ضرورت شئ کو قائم رکھنا فقط آثارِ رسول کی قدر دانی تھی پس ایسے بزرگ کو شجرۃ الرضوان کا قاطع بتانا قطعی بہتان و افتراء ہے اور ایسے آثار پر مسجد بنانا اور وہاں نماز پڑھنا اگر حضرت فاروق کے نزدیک ایک ناجائز و موہم شرک تھا تو سب سے پہلے اپنے فرزند کو تنبیہ فرماتے جن سے بروایت صحیحہ یہ باتیں ثابت ہیں۔ الخ ملخصا۔

اس خبط عشواء اور کفر و اسلام سے مرکب کلام کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے شک وسیع الخیال تھے مگر اسی حد تک جہاں تک اسلام میں اور شریعت میں وسعت ہو اور جن باتوں سے اسلام و توحید میں رخنہ پڑنے کا خطرہ ہوتا اُن کے مٹانے میں وہ تمام صحابہ سے زیادہ شدید تھے۔ اسی لیئے شیطان اُن کے سایہ سے بلکہ نام سے بھی بھاگتا تھا۔ مضمون نگار کے نزدیک تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وسیع الخیال اس وقت ہوتے جبکہ وہ اپنے زمانہ کے بہادر اور دلیر صحابہ کا مجسمہ تیار کراتے جیسے حضرت خالد بن ولید و ضرار بن ازور و ذو الطلاع حمیری وغیرہم۔ بلکہ پورے وسیع الخیال تو جب ہوتے کہ دشمنان اسلام میں بھی جو نامور اور بہادر تھے جیسے ابو جہل وغیرہ ان کے مجسمے تیار کراتے یا کم از کم ان کی قبروں کو پختہ ہی بنا دیتے تاکہ آجکل کی محافظ آثارِ قدیمہ کمپنی

کی معلومات میں اضافہ ہوتا جو فرعون کی لاش کو بھی بڑی احتیاط سے عجائب خانہ میں رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے تو خزانہ فارس سے حضرت دانیال پیغمبر علیہ السلام کا جسم مبارک آیا تھا آپؓ نے اس کو بھی اسی طرح دفن کیا کہ آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ ان کی قبر کس جگہ ہے۔ کیونکہ آپؓ نے دن میں تیرہ قبریں کھدوا کر رات کو ایک قبر میں ان کا جسم مبارک دفن کرا کے سب پر مٹی برابر کر دی ذرا سا نشان بھی تو نہ بنایا جو مبتدع مضمون نگار کی جماعت کے لیئے سجدہ گاہ بنانے میں معین ہوتا اور شاید مقدمہ میں اضافہ کا سبب بن جاتا۔ دیکھو اغاثۃ اللہفان لابن القیم (ص۱۰۹)

جس میں سند صحیح کے ساتھ یہ واقعہ مذکور ہے۔ اور حضرت خالد جیسے بہادر و شیر دل کا مجسمہ تو کیا تیار کراتے یا ان کی قبر کو پختہ و عالی شان تو کیا تیار کرتے تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی اُن کو قیادتِ عساکر سے بھی معزول کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے نزدیک وسیع الخیال کس طرح ہو سکتے ہیں۔ بس ایسی وسیع الخیالی مضمون نگار اور اس کے فراخ دل بیباک لیڈروں کو ہی مبارک ہو۔ جو اسٹیچو نصب کرنے میں شرکت کرتے اور جوازِ تصویر کی کوشش کر کے توحیدِ اسلامی کو مٹانا چاہتے ہیں۔

اور رہا مضمون نگار کے نزدیک جب ایک مبارک درخت کا کاٹنا تنگ خیالی اور اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا تنگ خیالی ثابت کرتا ہے تو یقیناً ان مصاحف قرآنیہ کو نیست و نابود کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لکھے گئے تھے۔ یا اُن صحابہ کے مصاحف کو دھلوا کر چاک کر دینا جو ترتیب نزول وحی پر انہوں نے لکھے تھے۔ مضمون نگار کے نزدیک بہت بڑی تنگ خیالی ہوگی مگر تاریخ و احادیث شاھد ہیں کہ حضرت عثمان نے قرآن کو بترتیب موجودہ مرتب کر کے بقیہ مصاحف کو نیست و نابُود کر دیا تاکہ بعد میں اُمت کے اندر فتنہ رونما نہ ہو بس مضمون نگار کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرات صحابہ کی نظر میں آثار قدیمہ سے زیادہ احکام و اعتقادات کی حفاظت ضروری تھی وہ اس کی حفاظت کیلئے آثارِ قدیمہ کی زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے۔

رہا واقعہ رمل و قصہ مقام ابراہیم تو اس سے مضمون نگار کا مدعا کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ ضروری آثار کا باقی رکھنا بھی جائز نہیں یا ان کی زیارت ممنوع ہے۔ اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرقہ نجدیہ یا پاسدارانِ نجدیہ کا یہ گمان ہے کہ وہ تمام آثارِ نبویہ کو مٹایا کرتے تھے بلکہ ان کا دعویٰ (ملاحظہ ہو اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ ص ۱۸۵، ۱۸۶ جس میں بہت تفصیل کے ساتھ اس بحث کو بیان کیا گیا ہے) صرف اس قدر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضروری آثار کو باقی رکھتے تھے اور غیر ضروری کو مٹادیا کرتے تھے۔ جبکہ اُن کے ساتھ ضروری آثار جیسا معاملہ کیا جاتا۔ اور ضروری آثار وہ ہیں جن کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً توجہ فرمائی ہو یا ان کے متعلق امر فرمایا ہو۔ یا نص میں اسکی عظمت کی طرف اشارہ ہو۔ چنانچہ مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محراب اور ممبر کی جگہ محفوظ رکھی گئی۔ وہ ستون محفوظ رکھا گیا جس کی آڑ میں آپؐ بالقصد نماز پڑھتے تھے۔ اسی طرح مقام ابراہیم کو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلی بنانا چاہا۔ کیونکہ رسول اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کا احترام ظاہر فرمایا تھا۔ ادھر نص قرآنی میں ہے فیہ آیات بینات مقام ابراھیم۔ نازل ہو چکا تھا۔ اور اس کے پوجنے والے وہاں بہت باقی تھے۔ محض افتراء و بہتان ہے۔ وہ کسی معتبر تاریخی کتاب یا حدیث سے بھی اس کا ثبوت نہیں دے سکتا کہ مشرکین عرب مقام ابراہیم کی پرستش کرتے تھے۔ مشرکین جن بتوں کی پوجا کرتے تھے فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو خانہ کعبہ سے نکال کر پھینک دیا تھا مقام ابراہیم کسی قبیلہ کا بت نہیں تھا۔ اور اگر محض احترام کا نام عبادت ہے تو احترام تو مشرکین کعبۃ اللہ اور حجر اسود کا بھی کرتے تھے۔ جب خدا و رسول نے کعبہ و حجر اسود کے احترام کو بت پرستی کا سبب یا ذریعہ نہ سمجھا تو حضرت عمر مقام ابراہیم ہی میں ایسا خطرہ کیوں کرتے۔

اور واقعہ رمل میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی طرف عمداً توجہ فرمائی تھی۔ اور نہ صرف توجہ فرمائی بلکہ صحابہ کو اس کا امر فرمایا تھا پھر حکم کے

ہوتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو کیسے موقوف کر دیتے۔ البتہ ان کو بعد میں یہ شبہ ہوا تھا کہ شاید یہ حکم اس وقت کیلئے مخصوص ہو۔ کیونکہ اس وقت اس کی ضرورت تھی اور اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور قاعدہ ہے الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ۔ جو کام کسی ضرورت سے کیا جاتا ہے وہ ضرورت ہی کے ساتھ مقید ہوتا ہے تو اب شاید اس حکم کا باقی رکھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کے خلاف ہو۔ پھر آپ کے ذہن میں کوئی دوسری بات آگئی جس سے اس حکم کا اسی وقت کیلئے مخصوص ہونا واضح ہو گیا۔ اس لئے حکم ظاہری عموم پر رکھا۔ اور اجتہاد سے اس کو مخصوص نہیں کیا۔ بہر حال ضروری آثار کے ابقاء میں ان افعال واماکنہ کی حفاظت میں کسی کو کلام نہیں جنکی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالقصد توجہ فرمائی یا ان کی عظمت وحرمت کی طرف اشارہ فرمایا یا ان کے متعلق حکم فرمایا ہو۔

گفتگو ان غیر ضروری آثار میں ہے جنکی طرف حضور نے بالقصد توجہ نہیں فرمائی نہ ان کی عظمت وحرمت کی طرف اشارہ فرمایا نہ اُن کے بارے میں کوئی حکم فرمایا۔ مثلاً سفر میں اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ قیام فرمایا۔ یا نماز کا وقت ہو جانے کی وجہ سے نماز پڑھی ہو یا سایہ کی غرض سے کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوں۔ ایسے اتفاقی آثار کے متعلق حضرت عمر کی تاکید تھی کہ ان کو ان آثار کی طرح نہ بنایا جائے جنکی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص توجہ وارادہ ثابت ہے۔ اور ان مقامات کا نماز وغیرہ کیلئے خصوصیت سے قصد نہ کیا جائے۔ ملاحظہ ہو اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ ص۱۸۵۔

جس میں سنن سعید بن المنصور سے بسند صحیح یہ اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

حدثنا معاویۃ حدثنا الاعمش عن المعرور بن سعید عن عمر رضی اللہ عنہ قال خرجنا معہ فی حجۃ حجہا فقرأ بنا فی الفجر بالم ترکیف فعل ربك باصحاب الفیل و لایلاف قریش فی الثانیۃ فلما رجع من حجۃ

سہ: مثلاً یہ کہ رمل میں اظہار شوق ورغبت ہے جو طاعات میں دائماً مطلوب ہے ۱۲ ظفر احمد

ابن عمر رضی اللہ عنہ لم یوافقہ علیہ احد من الصحابۃ فلم ینقل عن الخلفاء الراشدین ولاغیرھم حتی المھاجرین والانصار انہ کان تجری قصدا الامکنۃ التی نزلھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم والصواب مع جمھور الصحابۃ لان متابعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تکون بطاعتہ امرہ وتکون فی فعلہ بان یفعل مثل ما فعل علی الوجہ الذی فعلہ۔ فاذا قصد العبادۃ فی مکان کان قصد العبادۃ فیہ متابعتہ لہ واما اذا نزل فی مکان بحکم الاتفاق فکونہ صارف وقت النزول او غیر ذلک مما یعلم انہ لم یتحر ذلک المکان فانا اذا تحرینا ذلک المکان لم یکن متبعین لہ فان الاعمال بالنیات اھ (ص ۱۸۵)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس فعل میں تمام جمہور صحابہ سے منفرد تھے۔ حضرات صحابہ کا عموماً ہرگز یہ طریقہ نہ تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کا اہتمام کے ساتھ تتبع و قصد کریں۔ پھر علامہ ابن تیمیہ فیصلہ فرماتے ہیں کہ صواب جمہور صحابہ ہی کے ساتھ ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع دو طرح ہے۔ ایک یہ کہ آپؐ کے امر کا اتباع کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کے فعل کا اتباع اسی طرح کیا جائے جس طرح حضور نے وہ فعل کیا ہے اگر حضور نے کسی خاص جگہ کی عبادت کیلئے قصد کیا ہو وہاں کا قصد کرنا ہمارے لئے بھی عبادت ہے۔ اور جس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کیلئے قصد نہ کیا ہو بلکہ اتفاقاً وہاں نماز پڑھی ہو یا قیام فرمایا ہو تو اس کا اہتمام کرنا اس میں قصد کر کے جانا یا نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اہتمام یا قصد نہ کیا تھا باقی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے غلبۂ محبت میں جو کچھ کیا ہے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اگر غلبۂ محبت میں کوئی ایسا کرے اور حدود سے تجاوز نہ کرے تو اس کا یہ فعل جائز ہے۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک معلوم ہوگیا۔ اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ آثار نبویہ کے بارے میں حضرت عمر کا مسلک اپنے صاحبزادے سے الگ تھلگ تھا۔ تو اب مضمون نگار یہ بتلائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شجرۂ رضوان کا قاطع بتانا بہتان کدھر سے ہے۔ بلکہ یہ منصف اس کہنے پر مجبور ہوگا کہ اس واقعہ کی نسبت حضرت عمر کے مسلک کے موافق اور اُن کے طریقۂ اجتہاد کے عین مطابق ہے۔ اور واقعۂ رمل اور واقعہ مقام ابراہیم سے مضمون نگار نے جو استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آثار انبیاء ایسی قدر و منزلت کرتے تھے کہ مقام ابراہیمؑ کے قدم مبارک کا نشان تھا اس کو مصلیٰ بنانے کی تمنا کرتے تھے۔ خیال کرنے کی جا ہے کہ جو حضرت ابراہیمؑ کے مقام کی یوں عزت کرے وہ مقام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر برباد کرسکتا ہے۔ بت پرستی کا خوف تو مقام ابراہیمؑ میں بہت زیادہ تھا کیونکہ اس کے پوجنے والے وہاں بہت باقی تھے اور ابھی اسلام بالکل تازہ تھا۔ اسی طرح رمل کے بارے میں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طوافِ کعبہ میں رمل کیا تھا کہ تاکہ مشرکین قوتِ اسلامی کو دیکھ لیں اور مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور نہ سمجھیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں فرماتے ہیں کہ اب تو اس کی ضرورت نہ رہی ہمارے لئے حضورؐ کا فعل ہے ہم تو اسے نہ چھوڑیں گے الخ

اس کا جواب اوپر کی تقریر پر غور کرنے سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ گفتگو اُن آثار انبیاء میں ہے جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یا کسی نبی کا اتفاقاً وہاں گذر ہوگیا ہو۔ یا انہوں نے اتفاقاً وہاں قیام کیا ہو۔ یا اتفاقاً نماز پڑھی ہو کہ اُن کا اہتمام و قصد و تحری کرنا کیسا ہے۔ اور مقام ابراہیمؑ اس بحث سے خارج ہے۔ کیونکہ بناء کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ کا کھڑے ہوکر بیت اللہ کی تعمیر کرنا اتفاقاً نہ تھا بلکہ یہ پتھر خاص جنت سے اس کام کیلئے بھیجا گیا تھا۔ جس میں آیاتِ بینات تھیں۔ جیسا کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے درمنثور میں متعدد روایات اس کے متعلق نقل کی ہیں جن سے اس پتھر کا جنت سے آنا ثابت ہوتا ہے۔

(ج ۱، ص ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶)

پس مقامِ ابراہیمؑ کی قریب قریب وہی شان ہے جو اسود کی ہے۔ اور جو ایسے آثارِ انبیاء میں سے ہوں جن کا خود انبیاء نے اہتمام و قصد کیا ہو اُن کی عظمت و اہتمام کی حق تعالیٰ نے تاکید کی ہو جیسا کہ فیہ آیات بینات سے مقامِ ابراہیم اشارۃً معلوم ہو رہا ہے۔ اُن کے اہتمام و تعظیم اور قصد سے کوئی منع نہیں کرتا۔ نہ وہابی نہ نجدی نہ حنفیہ متبع سنت اور مضمون نگار کا یہ کہنا کہ مقامِ ابراہیمؑ میں بت پرستی کا خوف زیادہ تھا اور اس کے پوجنے والے وہاں بہت باقی تھے۔ الخ یہ بالکل غلط و لغو مضمون ہے۔ وہ کسی معتبر سند سے ہرگز اس کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ کہ مشرکین عرب نے حجر اسود و مقام ابراہیم میں سے کسی کو اپنا معبود بنایا ہو، یا ان کو بُت کی طرح پوجا ہو کعبہ میں مشرکین نے سینکڑوں بُت رکھے ہوئے تھے۔ جن کی وہ پرستش کرتے تھے مگر حجرِ اسود یا مقام ابراہیم کی پرستش کرنا کسی طرح ثابت نہیں ہے اور بالفرض اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو جو لوگ مقام ابراہیم کو پوجتے ہوں گے وہ حجرِ اسود کو بھی ضرور پوجتے ہوں گے اور کعبہ کو بھی پوجتے ہوں گے تو جب خدا و رسول نے حجرِ اسود و کعبہ کی پرستش کی پرواہ نہ کی اور دونوں کو بدستور قبلہ نماز بنا دیا تو حضرت عمرؓ کو مقامِ ابراہیم میں اس کی رعایت کی کیا ضرورت تھی۔ اور اس واقعہ رمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اتفاقی طور پر نہ تھا۔ بلکہ عمداً اور قصداً تھا۔ اور صرف فعل ہی نہ تھا بلکہ امر بھی تھا۔ حضور نے عمرۃ القضاء میں مسلمانوں کو صیغۂ امر سے رمل کا حکم فرمایا تھا۔ پس یہ بھی بحث سے خارج ہے خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں صحابہ کو رمل سے منع نہیں کیا بلکہ حضور نے خود اور صحابہ کرام نے آپؐ کے سامنے حج وداع میں بھی رمل کیا حالانکہ عمرۃ القضاء میں جو اس کی علت تھی وہ حجۃ الوداع میں باقی نہ رہی تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس کا باقی رکھنا منظور ہے اس لئے حضرت عمرؓ اس کو کیونکر موقوف کر سکتے تھے۔

بہرحال مقامِ ابراہیم اور رمل کے واقعہ کو ذکر کر کے مضمون نگار نے خلط بحث کیا ہے۔ دوسرے جو لوگ ایسے آثار و شاہد کی جن پر اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہو گیا ہو زیارت وغیرہ سے منع کرتے ہیں وہ کب کہتے ہیں کہ اُن کی عظمت دل سے بھی نکال دی جائے۔ یا معاذ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کی عظمت نہ تھی۔

وہ تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ان آثار سے محبت ضرور کی جائے مگر زیارت کا قصد واہتمام نہ کیا جائے کہ اس میں حد سے تجاوز اور دین میں غلو ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے تعدّی ہے۔ اور اگر محض زیارت ہی کی حد تک بات رہتی تو مضائقہ نہ تھا جیساکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ لیکن اب تو لوگ حد سے بڑھنے لگے۔ اور ان آثار کو عبادت گاہ بنانے لگے اور ایسی حالت میں حضرت عمر نے اپنی دوربینی نگاہ سے دیکھ کر اُن آثار کے قصد واہتمام سے منع فرمایا تھا۔ اس کے بعد شرطِ خامس کی تحقیق بھی اثر نافع میں دکھلانا چاہتا ہوں۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک مرسل ومنقطع کے مقبول ہونے کی پانچویں شرط یہ ہے کہ ارسال کرنے والا کسی مجہول یا ضعیف سے ارسال نہ کرتا ہو۔ بلکہ ثقہ سے ارسال کرتا ہو۔ جیسے کہ سعید بن المسیبؒ۔

میں کہتا ہوں کہ نافع بھی اسی درجہ کے ارسال کرنے والے ہیں۔ تہذیب التہذیب (ج ۱، ص ۴۱۴) میں حافظ خلیلی صاحب الارشاد کا قول ملاحظہ ہو۔

قال الخليلى نافع من ائمة التابعين بالمدينة امام فى العلو متفق عليه - صحيح الرواية منهم من يقدم على سالم ومنهم من يقارنه به ولا يعرف به خطاء فى جميع ماروا اھ

اس میں چند باتیں ہیں۔ نمبر ۱ نافع متفق علیہ امام ہیں۔ ۲: صحیح الروایت ہیں ۳: ان کی تمام مرویات میں کوئی خطاء نہیں پہچانی گئی۔ اس تصریح کے بعد نافع کے ارسال و انقطاع کے مقبول ہونے میں کیا کلام ہے۔ حیرت یہ ہے کہ امام مالک کی بلاغات تو حجت ہوں امام محمد بن حسن الشیبانی کی بلاغات حکم میں سند ہوں اور امام بخاری کی تعلیقات صحیح ہوں اور نافع مولاء ابن عمر کا بلاغ حجت نہ ہو۔ جو امام مالک کے شیخ اور اعلیٰ درجہ کے استاذ ہیں۔

حتی کہ محدثین نے مالک عن نافع عن ابن عمر کو اصح الاسانید میں شمار کیا ہے۔ نافع کے سوا امام مالک کا اور کوئی شیخ ایسا نہیں جس کی سند کو اصح الاسانید کہا گیا ہو۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایسے متفق علیہ صحیح الروایت کا بلاغ حجت اور صحیح نہ ہو۔ بلکہ خلیلی کے قول پر جس روایت کی سند نافع تک صحیح ہو جائے پھر اس کی صحت میں کوئی کلام باقی نہیں رہتا کیونکہ وہ تصریح کرتے ہیں کہ نافع کی تمام مرویات

میں کوئی خطاء نہیں پہچانی گئی۔

اور شجرۃ الرضوان کے قاطع کی اسناد نافع تک بلاشبہ صحیح ہے جیسا کہ اوپر بتلایا گیا ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ اب اس کی صحت میں کچھ بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہم اس اشکال کا جواب بھی دینا چاہتے ہیں جو ظاہر ہیں بہت سخت اشکال ہے وہ یہ کہ نافع کا اثر جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قاطع شجرۂ رضوان بتلا رہا ہے صحیح بخاری کی روایت سے متعارض ہے۔ کیونکہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شجرۂ رضوان بیعتِ حدیبیہ کے اگلے ہی سال لوگوں کی نظروں سے مخفی اور گم ہو گیا تھا۔ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کیونکر کٹوا دیا۔ یہ اشکال کی تقریر ہے جو مضمون نگار کی بھی تقریر کا خلاصہ ہے۔

اب جواب ملاحظہ ہو۔ تعارض کے معنی یہ ہیں کہ دو مفہوم باہم ایک دوسرے کی نقیض ہوں یا ایک سے دوسرے کی نقیض لازم آتی ہو اور دونوں میں تطبیق اور جمع ممکن نہ ہو۔ اب ہم مضمون نگار سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ کو بروایتِ بخاری حضرت عمر کا قاطع شجرہ نہ ہونا معلوم ہوتا ہے وہ یقیناً اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ بخاری کی کسی روایت میں لم یقطع عمر الشجرۃ البیعۃ وارد نہیں ہے۔ پھر کیا آپ کو ان روایات سے کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے۔ جس سے حضرت عمر کا قاطع شجرہ نہ ہونا لازم آئے۔ بظاہر مضمون نگار اس کا مدعی ہے۔ اور اس نے بخاری کی روایت سے یہ سمجھا ہے کہ شجرۂ رضوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی مخفی اور گم ہو گیا تھا۔ پھر مخفی اور مفقود کا قطع کیونکہ ممکن ہے۔ مگر میں اس سے پوچھتا ہوں کہ اس نے شجرہ کا مخفی اور مفقود ہونا کس روایت سے اور کس لفظ سے سمجھا ہے۔ اس کے متعلق اس نے عبد اللہ بن عمرؓ اور مسیبؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے مگر دونوں میں اس کے دعویٰ کی کچھ دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عبد اللہ بن عمر کے الفاظ یہ ہیں۔ رجعنا من العام المقبل فی اجتمعی من اثنان علی الشجرۃ التی بایعنا تحتھا الی قولہ من اللہ اھ بخاری مع فتح الباری ج ۶، ص ۸۳

ترجمہ: اگر ہم اگلے سال لوٹے تو ہم سے دو آدمی بھی اس درخت کی شناخت پر متفق نہ ہو سکے۔ جس کے نیچے ہم نے بیعت کی تھی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت تھا۔

(یعنی اس کا یقینی طور پر معلوم نہ ہونا یا خود وہ درخت رحمت تھا۔ دونوں احتمال ہیں جیساکہ حافظ نے بیان کیا ہے)

اس سے صراحۃً یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس درخت کے غیبی طور پر مخفی یا مفقود ہوجانے کے مدعی تھے بلکہ اس کا حاصل صرف اتنا ہے کہ اس کی پہچان میں اختلاف ہوگیا۔ اور ابن عمر کے ساتھی جس قدر تھے اُن میں سے دو آدمی بھی اس کی شناخت پر اتفاق نہ کرسکے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ فی نفسہ غیبی طور پر وہ درخت مخفی یا مفقود ہوگیا یا اٹھا لیا گیا تھا۔ اور سعید بن المسیب کے والد مسیبؓ کے الفاظ یہ ہیں۔

عن قتادۃ عن سعید ابن المسیب عن ابیہ قال رأیت الشجرۃ ثم اتیتہا بعد فلم اعرفہا قال محمود ثم انسیتہا بعد (بخاری مع فتح الباری ج ۷، ص ۳۴۴)

ترجمہ: میں نے اس درخت کو دیکھا پھر بعد میں اس کے پاس گیا تو میں نے اس کو نہیں پہچانا اور ایک راوی کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر بعد میں اس کو بھلا دیا گیا۔

اس سے صرف حضرت مسیب کا نہ پہچاننا اور بھول جانا ثابت ہوا۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ فی الواقع غیبی طور پر سب کی نگاہوں سے مخفی ہوگیا تھا۔ یا زمین سے اٹھا لیا گیا۔ یا مفقود ہوگیا تھا۔ اور طارق بن عبدالرحمٰن کی روایت میں حضرت مسیب کے الفاظ ہیں۔

عن سعید بن المسیب عن ابیہ انہ کان فی من بایع تحت الشجرۃ فرجعنا علیہا العام المقبل فعمیت علینا اھ۔ صفحہ مذکورہ۔ کہ انہوں نے شجرہ کے نیچے بیعت کی تھی۔ پھر ہم اگلے سال اس کی طرف لوٹے تو وہ ہم پر مشتبہ ہوگیا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ حضرت مسیب نے اس کو نہ پہچانا۔ اور ان کو اشتباہ ہوگیا اور یقین کے ساتھ اس کی تعیین نہ کرسکے۔ اور لفظ رجعنا و علینا صیغہ جمع متکلم میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ واحد متکلم کی جگہ جمع کا صیغہ لایا گیا ہو۔ کیونکہ محاورات میں کبھی ایک آدمی بھی اپنے کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی ظاہر ہے۔ کیونکہ اوپر قتادہ کی روایت میں ثم لم اعرفہا یا ثم انسیتہا،

مذکور ہے۔ اس سے احتمال کی تقویت ہوتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت مسیب کے ساتھ چند رفقاء اور بھی ہوں اور اُن کو بھی اشتباہ ہو گیا ہو۔

باقی اس پر کوئی دلیل نہیں کہ صیغہ جمع سے تمام صحابہ مراد ہیں جو اس کا مدعی ہو وہ اس کی دلیل بیان کرے۔ کیونکہ صیغہ جمع متکلم کا استغراق وعموم پر دلالت کرنا لغت واصول سے ثابت نہیں۔ پھر یہ بات مقرر قابل تنبیہ ہے کہ حضرت مسیب کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ درخت اصل سے غیبی طور پر اٹھا لیا گیا تھا۔ یا چھپا لیا تھا۔ بلکہ اُن کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہم کو اس میں اشتباہ ہو گیا۔ چنانچہ روایت عفان میں حضرت مسیب کے الفاظ یہ ہیں: فعمی علینا مکانہا۔ (فتح الباری ج صـ ۳۲۴) کہ ہم پر اس کی جگہ مشتبہ ہو گئی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا تعین نہ کر سکنا بتلا رہے ہیں۔ طارق بن عبدالرحمٰن کی دوسری روایت میں اس سے زیادہ تفصیل ہے۔

قال انطلقت حاجاً فمررت بقوم یصلون قلت ما ھذا المسجد قالوا ھذہ الشجرۃ حیث بایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیعۃ الرضوان فاتیت سعید بن المسیب فاخبرتہ فقال سعید بن المسیب حدثنی ابی انہ کان فیمن بایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تحت الشجرۃ قال فلما خرجنا من العام المقبل نسیتھا فلم نقدر علیھا فقال سعید ان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لم یعلموھا وعلمتموھا انتم فانتم اعلم۔

(بخاری مع فتح الباری۔ صفحہ مذکور)

وہ فرماتے ہیں کہ میں حج کیلئے چلا تو ایک قوم پر گذر ہوا جو نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ مسجد کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ درخت (کی جگہ) ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی تھی۔ تو میں سعید بن مسیبؒ کے پاس گیا اور اُن کو اس کی خبر کی انہوں نے کہا کہ مجھ کو میرے باپ نے خبر دی ہے وہ بھی ان لوگوں میں سے جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی وہ فرماتے ہیں کہ پھر جب ہم سال آئندہ مکہ کی طرف نکلے تو اس درخت کو بھلا دیئے

گئے۔ اور اس کی تعیین پر قادر نہ ہوئے۔ سعید نے کہا کہ حضور کے صحابہ نے تو اس درخت کو نہ پہچانا اور تم نے جان لیا پس تم اُن سے زیادہ جاننے والے ہوئے۔

اس روایت میں اول تو حضرت مسیب کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں کہ اس میں بھی صرف اپنا بھول جانا بیان فرماتے ہیں۔ اس کے بعد سعید بن المسیب کے الفاظ قابلِ غور ہیں کہ صحابہ نے تو اس درخت کو نہ جانا اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ صحابہ سے مراد صرف سعید بن المسیب ہوں یا ابن المسیب اور اُن کے چند رفقاء یا تمام صحابہ۔ تیسرے احتمال پر کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ جمع معرف باللام عموم کیلئے ہوتی ہے اور جمع مضاف کو بھی عموم و استغراق کے لئے اصول میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کلام اس میں ہے کہ سعید بن المسیب کے قول میں عموم و استغراق حقیقی ہے یا عرفی۔ یقیناً استغراق حقیقی مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ سعید بن المسیب نے تمام صحابہ کو نہیں پایا۔ وہ اُنہیں صحابہ کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں جن سے ان کا لقاء ثابت ہے۔ اور جن سے لقاء نہیں وہ کچھ ان کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ پس اصحاب محمد سے مراد اُن کے قول میں وہی صحابہ ہو سکتے ہیں جنہوں نے اُن سے درخت کا بھول جانا بیان کیا نہ کہ سب اور یہ کوئی خدا اور رسول کی خبر نہیں جس میں استغراقِ حقیقی مراد لیا جائے۔ بلکہ یہ ایک تابعی کا قول ہے جو اپنے علم ہی کے موافق استغراق کر سکتے ہیں۔ پس احتمال اول و ثانی ہی ممکن ہے اور تیسرا احتمال باوجود اس کے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں خلافِ دلیل بھی ہے۔ کیونکہ سعید بن المسیب کبار تابعین اور خیر القرون میں سے ہیں اُن کے زمانہ میں جو تابعین تھے بدون صحابہ سے تحقیق کئے محض خیال و گمان سے مقام شجرہ پر مسجد بنا دیتے یقیناً جو لوگ اس مسجد کے بانی تھے اور جو اس کو مسجدِ شجرہ کہتے تھے انہوں نے صحابہ سے تحقیق کر کے اس کی جگہ کو معلوم کیا ہوگا۔ پس سعید بن المسیب کے قول کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ صحابہ میں سے کسی کو بھی شجرہ یا مکان کا علم نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے والد یا اُن کے چند رفقاء کا نہ جاننا بیان فرماتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اُن کے نہ جاننے پر دوسرے صحابہ کو قیاس کرتے ہوں۔ کہ اُن کی طرح دوسروں کو بھی معلوم نہ تھا۔ پھر تابعین کو

اس کا علم کیسے ہو گیا مگر اس قیاس پر بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ اُن کا سب صحابہ کو
اپنے والد ماجد یا اُن کے چند رفقاء پر قیاس کرنا صحیح نہیں اُن کی عدم معرفت
دوسروں کی عدم معرفت کو مستلزم نہیں خصوصاً جبکہ اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا جائے۔
یہ اھلِ مدینہ مدینہ کے آثار سے زیادہ واقف تھے۔ اور اھلِ مکہ مکہ کے آثار سے
زیادہ واقف تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر اور مسیب اھل مدینہ تھے۔ اور حدیبیہ
مکہ کے قریب تھا۔ پس اھل مدینہ کا اس کو نہ پہچاننا اور بھول جانا اس کو مستلزم
نہیں کہ اھل حرم بھی اس کو بھول گئے ہوں۔ جبکہ بخاری کی روایت سے یہ ثابت ہے کہ
زمانہ تابعین میں اس درخت کی جگہ مسجد بن گئی تھی۔ اور لوگ وہاں نماز پڑھتے
تھے۔ تو دوسرا احتمال قوی ہو جاتا ہے۔ غالباً اھل مکہ و اھل حرم کو وہ درخت اور
اس کی جگہ محفوظ تھی۔ اور سعید بن مسیب کا محض اپنے والد کے نہ پہچاننے سے اُن
لوگوں پر انکار کرنا درست نہ تھا۔ بالخصوص جبکہ اھل مدینہ بھی سب کے سب
اس درخت کو نہ بھولے تھے۔ کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے خود بخاری میں روایت
ہے کہ لو کنت ابصر الیوم لرأیتکم مکان الشجرۃ الخ۔ اگر میں اس وقت
بینا ہوتا تو میں تمہیں اس درخت کی جگہ بتلا دیتا۔ اور جب اُن کو اپنی نابینائی کے
وقت جو اخیر عمر میں پیدا ہو گئی تھی اس درخت کی جگہ محفوظ تھی تو یقیناً بینائی کے
زمانہ میں اس درخت کو پہچانتے تھے۔ کیونکہ ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ حضرت مسیب
ابن عمر کے قول سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ وہ درخت غیبی طور پر اٹھا لیا
گیا یا مخفی کر دیا گیا تھا۔ بلکہ اُن کے اقوال سے اُن کا بھول جانا اور جگہ کا مشتبہ
ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔ پس جو شخص اس کی جگہ کا یاد رکھنا بتلاتا ہے یقیناً وہ
درخت کو بھی پہچانتا تھا۔ البتہ اگر روایت سے غیبی طور پر اس کا دنیا سے اُٹھا
لیا جانا یا مخفی کر دیا جانا ثابت ہو جاتا تو پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا جگہ کو
یاد رکھنا خود اس درخت کی معرفت کو مستلزم نہ ہوتا۔ مگر غیبی اخفاء یا غیبی رفع
کا ثبوت کسی روایت میں نہیں۔ بلکہ صرف ایک دو صحابی اپنا نسیان یا ذہنی اشتباہ
ظاہر کرتے ہیں اس سے یہ کیونکر مان لیا جائے کہ تمام صحابہ اس سے ناواقف تھے۔
اور ان کی طرح سب ہی بھول گئے تھے۔ اس تقریر سے حافظ ابن حجر کے اس قول

کی صحت واضح ہو گئی۔

لکن إنکار سعید ابن المسیب علی من زعم انہ اعرفہا مؤنساً علی قول ابیہ انہم لم یعرفوہا فی العام المقبل لا یدل علی رفع معرفتہا اصلاً فقد وقع عند المصنف من حدیث جابر الذی قبل ھذا، لو کنت ابصر الیوم لاریتکم مکان شجرۃ فھذا یدل علی انہ کان یضبط مکانہا بعینہ واذا کان فی آخر عمرہ بعد الزمان الطویل یضبط موضعہا ففیہ دلالۃ علی انہ کان یعرفہا بعینہا لان الظاہر انہا حین مقالتہ تلک کانت ھلکت اما بجفاف أو غیرہ والعلۃ ھو یعرف موضعہا بعینہ ثم وجدت عند ابن سعد باسناد صحیح عن نافع ان عمر بلغہ الخ

حافظ ابن حجر کے اس قول پر مضمون نگار نے ایک دقیق اعتراض کیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکان الشجرہ فرمایا ہے بعین الشجرہ نہیں فرمایا۔ دراصل درخت کی شناخت اور ہے اور جگہ کی شناخت اور پہچان اور ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس درخت کو پہچانتے تھے الخ

مگر یہ بے سروپا تقریر محض اس خیال کا نتیجہ ہے کہ مضمون نگار نے عبداللہ بن عمر و مسیب کی روایات سے یہ مطلب نکالا ہے کہ وہ درخت غیبی طور پر زمین سے اٹھا لیا گیا۔ یا تمام مخلوق کی نظروں سے غائب کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ محض دعویٰ بلا دلیل اور خیالی ڈھکوسلا ہے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ ان حضرات کے قول سے صرف اُن کا بھول جانا اور جگہ کا مشتبہ ہو جانا معلوم ہوتا ہے۔ نہ وہ تمام صحابہ کے متعلق استغراق اور عموم کے ساتھ نسیان کے مدعی ہیں اور نہ غیبی اخفاء اور رفع کے قائل ہیں۔ اور جب سب کا نسیان اور غیبی اخفاء ثابت نہیں تو یقیناً کسی صحابی کا اس کو اس کی جگہ کو پہچاننا خود اس درخت کو پہچاننے کو بھی مستلزم ہے۔

دوسرا اشکال مضمون نگار نے حافظ صاحب کے قول پر یہ کیا ہے کہ اگر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے وہ معانی ہیں جو حافظ ابن حجر نے بیان فرمائے کہ اُن کی آخر عہد نابینائی تک وہ درخت بعینہ باقی تھا۔ یعنی ۷۸ھ؁ اٹھتر کے

آگ بھاگ تک جب بھی قطع و برید محال ہے الخ

مگر اس اعتراض کو دیکھ کر مدارس عربیہ کا ہر طالب علم مضمون نگار کے فہم پر بے ساختہ قہقہہ لگائے گا کیونکہ حافظ نے اس کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ حضرت جابرؓ کی آخر عمر نابینائی تک وہی درخت بعینہ باقی تھا بلکہ وہ تو اس کے خلاف یہ فرماتے ہیں لان الظاهر انها حين تلك كانت هلكت۔ کہ حضرت جابرؓ کے قول سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اس ارشاد کے وقت وہ درخت ہلاک ہو چکا تھا۔ (جبھی تو یہ فرمایا اگر میں بینا ہوتا تو درخت کی جگہ بتلا دیتا اگر اس وقت درخت موجود ہوتا تو جگہ کا ذکر کیوں فرماتے۔ صاف یوں ہی نہ کہتے کہ میں تم کو وہ درخت بتلا دیتا) پس اس غلط فہم پر جو مضمون نگار نے مرتب کیا ہے وہ بھی غلط در غلط ہو گیا۔ اور معلوم ہو گیا کہ یہ تمام تقریر بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔

اب ہم کہتے ہیں کہ جب بخاری کی روایات سے اس درخت کا عام طور پر اختفاء و استتار یا غیبی طور پر اس کا غائب کر دیا جانا ہرگز ثابت نہیں بلکہ بعض صحابہ و تابعین ہی کے زمانہ میں مسجد کا اس جگہ بنجانا اور تابعین کا وہاں نماز پڑھنا بخاری سے ثابت ہے تو اب ان روایات کو اثر نافع سے جس میں حضرت عمر کا اس درخت کو کٹوا دینا مذکور ہے کچھ بھی تعارض نہیں بلکہ اس اثر میں اور بخاری کی روایات میں تطبیق اس طرح ظاہر ہے کہ اس درخت کو بعض صحابہ بھول گئے تھے اور اُن پر اس کی جگہ مشتبہ ہو گئی تھی اور بعض جانتے اور پہچانتے تھے۔ اور جو صحابہ جانتے تھے وہ یا ان کے متبعین اس درخت کے نیچے نماز پڑھتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خبر سن کر بخوف فتنہ اس درخت کو کٹوا دیا تاکہ عوام کے اعتقادات متزلزل نہ ہو جائیں بتلائیے اب اس اثر میں اور بخاری کی روایات میں کیا تعارض ہے۔ پس یہ اشکال بھی ھباءً منثوراً ہوا۔ اور نافع کا یہ اثر روایۃً و درایۃً ہر طرح بے غبار ہو گیا وللہ الحمد۔

اور اگر ہم تنزل کر کے تھوڑی دیر کو یہ مان بھی لیں کہ حضرت ابن عمر و مسیب کی روایات سے عام طور پر اس درخت کا مخفی اور غائب کر دیا جاتا یا غیبی طور پر اٹھا لیا جانا مفہوم ہوتا ہے۔ تب بھی اثر نافع کو ان روایات سے تعارض نہیں کیونکہ اثر نافع

کے الفاظ یہ ہیں جو خود مضمون نگار نے طبقات ابن سعد سے نقل کیے ہیں۔

فان الناس یأتون الشجرة التی یقال لها شجرة الرضوان فیصلون عندها فبلغ ذلك عمر بن الخطاب فاوعدهم فیها وامر بها فقطعت۔

اس میں نافع نے یہ کہاں دعویٰ کیا ہے کہ لوگ حقیقی شجرۃ الرضوان کے نیچے نماز پڑھنے جایا کرتے تھے بلکہ وہ تو صرف یہ فرماتے ہیں کہ ایک درخت جس کو شجرۃ الرضوان کہا جاتا تھا کے نیچے لوگ نماز پڑھتے تھے اس میں ۲ احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ وہ واقعی وہی حقیقی شجرہ ہو جس کے نیچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی تھی یا اور کوئی درخت ہو جس کو لوگوں نے شجرۃ الرضوان سمجھ کر اس لقب سے مشہور کر دیا۔ پس مضمون نگار کے نزدیک اگر حقیقی شجرہ مخفی یا مفقود یا مرفوع من الدنیا ہو چکا ہے، اس کو اثر نافع کو رد کرنے اور صحیح سند کو ضعیف کرکے اپنی لیاقت ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی وہ بخاری کی روایات اور اس اثر میں یوں مطابقت دے سکتا تھا کہ بعد میں لوگوں نے اپنے قیاس وظن غالب سے کسی اور درخت کو شجرۃ رضوان سمجھ کر متبرک قرار دے لیا ہوگا۔ حضرت عمر نے اس کو کٹوا دیا۔ اگر مضمون نگار یوں تقریر کرتا اور اثر نافع کے ماننے والوں کو ملاحدہ وجہال نہ بناتا تو ہم کو اس سے الجھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس کو بھی اس فضول بحث میں پھنسنے کی نوبت نہ آتی جس میں وہ کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ھذا واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۵ رجب المرجب ۱۳۴۶ھ

رومال کا گرہ دیکر بازوؤں پر چھوڑنا سدل میں داخل ہے۔

السوال : چند مسئلے درج ذیل ہیں

۱: اول یہ کہ کسی نے سر یا کندھوں کے دونوں جانب رومال یا اس قسم سے کوئی اور کپڑا ایک دو گرہ دیکر یا یوں ہی گلے میں لپیٹ کر پھر کپڑے کے دونوں گوشوں کو چھوڑ دے تو آیا یہ سدلِ ثوب میں داخل ہے یا نہیں ؟

۲: دوسرے یہ کہ من تشبہ بقوم فھو منھم کا خلاصہ مضمون بیان فرمایئے کہ مشابہت کسے کہتے ہیں اور کسی عارض کی وجہ سے کبھی مرتفع بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔

الجواب

رومال وغیرہ کا اس طرح گلے میں دیکر گوشوں کو چھوڑ دینا سدل میں داخل ہے

قال فی الطحطاوی فی حاشیته علی مراقی الفلاح : وفی البحر عن فتح القدیر ان السدل یصدق علی ان کون المندیل مرسلاً عن کتفیه کما یعتاده کثیر فینبغی لمن علی عنقه مندیل ان یضعه عند الصلاۃ ولا فرق بین ان یکون محفوظاً عن الوقوع اولا اھ

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ رومال خواہ گرنے سے محفوظ ہو (جیسے گرہ لگی ہوئی ہو) یا محفوظ نہ ہو بہر حال سدل میں داخل ہے۔

۲: تشبہ بالکفار کی چند صورتیں ہیں :

۱: فطری امور میں مشابہت مثلاً کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، لیٹنا، صفائی رکھنا وغیرہ یہ مشابہت حرام نہیں۔

قال فی الدر : فان التشبیه بهم لا یکرہ فی کل شیٔ بل فی المذموم وفیما یقصد به التشبه کما فی البحر اھ وقال الشامی تحت قوله لا یکرہ فی کل شیٔ - فانا ناکل ونشرب کما یفعلون اھ ج ۱ - ص ٦۵۲

۲: عادات میں مشابہت۔ مثلاً جس ہیئت سے وہ کھانا کھاتے ہیں اسی ہیئت سے کھانا یا لباس ان کی وضع پر پہننا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہماری کوئی وضع پہلے سے ہو اور کفار نے ابھی اس کو اختیار کر لیا ہو خواہ ہمارا اتباع کر کے یا ویسے ہی تو اس صورت میں یہ مشابہت اتفاقیہ ہے۔ اور اگر ہمارے وضع پہلے سے جدا ہو اور

اس کو چھوڑ کر ہم کفار کی وضع اختیار کریں یہ ناجائز ہے۔ اگر ان کی مشابہت کا قصد بھی ہے تب تو کراہت تحریمی ہے اور اگر مشابہت کا قصد نہیں ہے بلکہ اس لباس و وضع کو کسی اور مصلحت سے اختیار کیا گیا ہے تو اس صورت میں تشبہ کا گناہ نہ ہوگا مگر چونکہ تشبہ کی صورت ہے اس لئے کراہت تنزیہی سے خالی نہیں۔

قال هشام رأیت علی ابی یوسف نعلین محفوفین بمامیر فقلت اتری بهذا الحدید بأسًا قال لا قلت فضیان وثون بن یزید کرها ذلك لان فیه تشبهًا بالرهبان فقال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم كان یلبس النعال التی لها شعر وانها من لباس الرهبان فقد اشار الی ان صورة المشابهة فیما تعلق به صلاح العباد لا یضر فان الارض مما لا یمكن قطع المسافة البعیدة فیها الا بهذا النوع اه قلت وفعله علیه السلام محمول علی بیان الجواز اذا كان بدون القصد اه

مگر چونکہ آجکل عوام جواز کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں ان کا قصد تشبہ ہی کا ہوتا ہے اس لئے اکثر احتیاط کے لئے عادات میں بھی مطلقاً تشبہ سے منع کیا جاتا ہے خواہ تشبہ کا قصد ہو یا نہ ہو۔

۳۔ ان امور میں تشبہ جو کفار کا مذہبی شعار ہے یا دینی رسم اور قومی رواج ہے جیسے زنار وغیرہ پہننا یا مجوس کی خاص ٹوپی جو ان کی مذہب کا شعار ہے اس میں تشبہ حرام بلکہ بعض صورتوں میں کفر ہے۔ عالمگیریہ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۴ر جمادی الاولی

کتاب الوصیّۃ

فقراء کو کھانا کھلانے کی وصیت کرنے کی ایک صورت کا حکم

السؤال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس معاملہ میں کہ اہل اسلام میں سے ایک شخص فوت ہوگیا اور وہ مرحوم قرضدار تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری وصیت پر روز اول یکصد روپیہ خرچ اٹھا کر لوگوں کو روٹی کھلانا تاکہ مجھ کو ثواب ملے۔ اور مرحوم کی جائیداد معمولی ہے۔ آیا میتِ مذکور پر قرضہ اٹھا کر روزِ اول صدقہ کر کے عام لوگوں کو کھلانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر وہ وصیت کر کے مر گیا جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو اگر سو روپیہ اس کے کل ترکہ کی تہائی میں سے نکل سکے تو ۱۰۰ روپیہ کی مقدار میں اس کے ترکہ کی کچھ چیزیں فروخت کر کے سو روپیہ سے فقراء کو کھانا کھلانا ورثہ کے ذمہ ضروری ہے۔ اگر کھانا نہ کھلاویں تو فقراء کو اتنی رقم صدقہ کردی جاوے اور اگر ثلث ترکہ میں پورے سو روپیہ کی گنجائش نہ ہو تو جتنی گنجائش ہو اتنا ہی خرچ کردیں اور قرض کر کے کھلانا ورثہ کے ذمہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امداد تھانہ بھون
۲۲ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ

زانیہ کی امور خیر میں صرف کرنے کی وصیت اور اس مال کا حکم

السؤال: ایک لونڈی طوائف مرتے وقت وصیت رنڈیوں کو کر گئی کہ میرے مال میں سے ایک ہزار روپیہ فی سبیل اللہ دینا اور کچھ میرے ختم درود پر صرف کر کے بقیہ مال میرے وارثوں کو

دیدینا۔ چنانچہ بعد وفات مذکورہ کے تمام مال انجمن کے ممبروں نے اپنے قبضہ تحویل میں لے لیا ہے سب کا ارادہ یہ ہے کہ اس روپیہ سے متوفاۃ نے اللہ کے واسطے دینے کی وصیت کی ہے اس لیے پانی کا ایک نل قبرستان میں پہنچایا جائے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے روپیہ سے جو نل پہنچایا جاوے گا اس کا پانی جائز ہے یا ناجائز۔ صاف طور پہ آیت و حدیثِ نبوی کا حوالہ دیکر جواب عنایت فرماویں مکرر عرض ہے کہ یہ عورت مذکورہ پیشۂ زنا کرتی تھی اور اخیر تک زنا کرتی رہی۔ جس قدر روپیہ اس کے پاس ہے وہ زنا کی کمائی کا ہے۔ کیا ایسا روپیہ مسجد میں لگ سکتا ہے یا انجمن جو لڑکے تعلیم قرآن اور تعلیم دینیات پاتے ہیں وہ روپیہ تعلیم دینے والوں کو کھانا جائز ہے یا نہیں۔ قبرستان میں نماز جنازہ اس پانی کے ساتھ جائز ہے یا نہیں۔ بعض قبرستان میں حدود سے باہر عصر و مغرب کی نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس پانی سے وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بیّنوا توجروا۔

عاجز کریم بخش لوہار

درسرائیں بہادر ملکہ دار۔ از کالکا

الجواب

صورتِ مذکورہ میں جب اہلِ انجمن کو معلوم تھا کہ یہ مال کسب خبیث کا ہے تو اس کا لینا ناجائز تھا۔ اور لینے کے بعد اس کو مصارفِ خیر میں لگانا بھی جائز نہیں۔ اور اگر اس پر بھی وہ اس مال سے پانی کا نل لگا دیں گے تو اس نل سے بلا واسطہ یعنی استعمال بالمس کے ساتھ وضو وغیرہ کرنا بہتر نہیں ہوگا۔ ثواب میں کمی رہے گی۔ لیکن وضو صحیح ہو جائے گا۔

لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم مہر البغی حرام قلت ونظیرہ الحوض فی الارض المغصوبۃ یکرہ التوضی بمائہ مع الحکم بصحۃ الوضوء والصلوٰۃ البتہ ایک حیلہ سے یہ کراہت وغیرہ مرتفع ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اس متوفاۃ کے ورثہ کو یہ رقم خبیث واپس کرکے ان سے یہ کہا جائے کہ تم کسی ہندو سے ہمارے سامنے اتنی ہی رقم قرض لے کر ہمیں دیدو پھر تم اس کا قرضہ ادا کر دینا۔ اس صورت میں وہ

رقم حلال ہوگی۔ اس سے نل وغیرہ جو کچھ چاہیں بنا دیا جائے اور اس طرح ہندو سے قرض لی ہوئی رقم کو مسجد میں بھی لگا سکتے ہیں۔ انجمن کے بچوں کو بھی دے سکتے ہیں، مدرسین کی تنخواہوں میں بھی صرف کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ کیا گیا تو خاص کسب زنا کو کسی کام میں صرف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ حرام ہے اور حرام مال میں تصرف بھی حرام ہے۔

فلیس سبیله الا ان یتصدق الورثة او الوصی او وکیلهم علی من لم یکن عنده قوت یومه وکان مضطرًا الی اکله۔ واللہ اعلم۔

اور اگر وصیت ثلث سے زائد کی ہے تو زائد میں ورثہ کی رضامندی بھی شرط ہے اور نابالغ ورثاء کی رضامندی معتبر نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ

وصیت کی ایک خاص صورت | السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس بارے میں کہ ہندہ نے کچھ اپنا زیور اپنی حیات میں زید کے پاس بطور امانت رکھا اور کچھ پہنے رہی اور امانت کے وقت یہ کہدیا کہ میں اپنا سارا زیور جو امانت ہے اور جو میں پہن رہی ہوں خیرات کروں گی اور کچھ دنوں کے بعد ھندہ کا انتقال ہوگیا اور وہ زیور جو پہن رہی تھی وہ بھی امانتِ زید میں آگیا اور ھندہ نے مرض الوفات یعنی مرنے سے ایک روز پہلے زید سے یہ کہا کہ میرا سارا زیور خیرات کردینا لہٰذا صورتِ مذکورہ بالا میں زید کو کیا کرنا چاہیئے۔ کیا وہ کل زیور خیرات کردے یا بحیثیت وصیت ثلث خیرات کرے اور دو حصّہ ورثاء کو موافق فرائض تقسیم کردے۔

نوٹ: اس ھندہ کا کچھ مہر اور آٹھواں حصّہ اس کے زوج کے مال میں نکلتا ہے جس کے آجانے کے بعد یہ کل زیور ثلث مال میں آسکتا ہے۔ تو یہ کل زیور خیرات ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اور جو نا قابلِ وصول ہے اس کو ورثاء دعویٰ کرکے وصول کریں۔ لیکن کچھ وارث یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے واسطے سب مال ایسا کیوں چھوڑا جاتا ہے جو ہم وصول نہ کرسکیں جو مال زید کے قبضہ میں ہے۔ اس میں سے بھی تو کچھ دینا

چاہئے۔ بیّنوا توجروا۔

السّائل :
عبدالرحیم ولد لال محمد۔ مرادآباد
۵ / محرم الحرام ۱۳۴۴ھ

الجواب

حامداً و مصلیاً

صورتِ مذکورہ میں یہ زیور کل وصیت ہے کیونکہ میت کے کل مال میں سے ثلث کے اندر نکل سکتا ہے۔ لہٰذا اس میں وصیت کو نافذ کرنا ضروری ہے ورثہ میں سے کسی کا اس میں حق نہیں۔ بشرطیکہ یہ خوب محقق ہو کہ یہ کُل زیور ثلث میں سے نکل سکتا ہے۔

قال فی الدر : و بثلث دراھمہ او غنمہ او ثیابہ متفاوتۃ ای الدراھم والغنم ان خرج من ثلث جمیع باقی اصناف مالہ و ثلث الباقی فی الاخیرین ای الثیاب والعبید وان خرج الباقی من ثلث الکل اھ دل کلامہ علی انہ اذا اوصی بشیٔ ولہ من المال اصناف متعددۃ وخرج الموصی بہ من ثلث الکل فالوصیۃ جائزۃ ۔ واللہ اعلم ۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۴ / جمادی الاول ۱۳۴۴ھ

مرض الموت میں اس کہنے کا حکم کہ میرا روپیہ جو میرے پاس ہے میرے بھائی کے لڑکے کو دینا

السؤال : زید کا کچھ روپیہ بطور امانت بکر کے پاس جمع ہے۔ زید جو بہت بیمار ہوا تو اس نے بکر سے کہا کہ اگر میں مرجاؤں تو جو روپیہ آپ کے پاس ہے ہمارے بھائیوں کو دیدینا۔ جو کہ ملک میں ہیں یکایک اس کے ایک بھائی کا لڑکا ملک سے بتلاشِ روزگار یہاں پہنچ گیا عین سکرات میں زید نے بکر سے یہ کہا کہ جو روپیہ ہمارا تمہارے پاس ہے ہمارے بھائی کے اس لڑکے کو دینا۔ اب وہ شخص مرگیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میت کے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ اور میت کے بھائیوں نے ایک تار بھی بھیجا کہ روپیہ اور سامان کسی کو نہ دینا۔ پس آنجناب ارشاد فرماویں کہ اس روپیہ اور سامان وغیرہ

کا حقدار کون ہوگا۔ بیّنوا توجروا

الجواب

حامدًا و مُصلّیًا

صورتِ مسئولہ میں اگر بحالتِ ہوش و حواس بیمار نے امانت کا روپیہ بھائی کے لڑکے (بھتیجے) کو دلایا ہے تو ظاہر ہے کہ بیمار کے دونوں قول وصیت کے حکم میں ہیں۔ اور وصیت میں بلا اجازتِ ورثاء تہائی پر زیادتی جائز نہیں۔ نیز وصیت بحقِ ورثاء باطل ہوتی ہے۔ پس امانت میں سے نصف رقم بھتیجے کو بحکم وصیت دینا چاہئے بشرطیکہ یہ نصف رقم میّت کے کل ترکہ کی تہائی[ع] پر زائد نہ ہو اور اگر تہائی پر زائد ہوتی ہے تو اس زیادتی کی مقدار کو کم کرکے دین بقیہ ترکہ جس میں امانت کا روپیہ بھی شامل ہے میت کے دو بھائیوں اور ایک بہن میں اس طرح تقسیم کردیا جائے کہ پانچ حصے کرکے دو، دو حصے ہر ایک بھائی کو اور ایک حصہ بہن کو دیا جائے۔

والدلیل ھٰذا اوالاجنبی ووارثہ اوقاتلہ لہ نصف الوصیۃ وبطل وصیتہ للوارث والقاتل لانھما من اھل الوصیۃ علی مامرّ و لذا تصح بالاجازۃ۔ (درمختار)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موصی نے کسی اجنبی اور وارث کے لئے وصیت کی تو نصف حق اجنبی کا حق ہوا اور وارث کے حق میں بقیہ نصف وصیت باطل قرار پاویگی رہا یہ امر کہ بھتیجے کے حق میں پچھلا قول پہلے قول سے رجوع قرار دیا جاوے لیہ اس لیے قابلِ التفات نہیں ہے کہ رجوع کے لیے قول صریح ہونا چاہئے، محض دلالت معتبر نہیں ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ اس صورت میں جبکہ کسی نے کُل مال کی وصیت ایک شخص کے لیے کی ہو اور تہائی مال کی وصیت دوسرے شخص کے لیے کی ہو تو پچھلی صورت میں پہلی وصیت کے لیے رجوع قرار دی جائے حالانکہ فقہاء کرام اس کے برخلاف یہ حکم دیتے ہیں۔ فثلثہ بینھما نصفان، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

ع جب وصیت نصف میں صحیح مانی ہے تو یہ نصف رقم کل ترکہ کا سدس ہونا چاہئے کما لایخفی ۱۲
عبدالکریم عفی عنہ

سہ وھو مصرح فی الشامی - ج ۵ - ص ۶۴۷ - عبدالکریم عفی عنہ

الکلام علی الجواب

ہمارے نزدیک متوفی کا سکرات میں یہ کہنا : "جو ہمارا روپیہ ہے تمہارے پاس، وہ ہمارے بھائی کے اس لڑکے کو دیدینا "۔ بھتیجے کے لیے وصیت میں صریح نہیں ہے۔ بلکہ احتمال ہے کہ اس کو اس نیت سے دلانا چاہتا ہو کہ اس کے ذریعہ سے حقداروں کے پاس بسہولت پہنچ جائے گا۔ اور احتمال کی صورت میں وصیت کا ثبوت نہیں ہوسکتا پس اس روپیہ اور سامان کے حقدار میت کے دونوں بھائی اور بہن ہیں، بھتیجے کا اس میں کچھ حق نہیں۔

قال فی العالمگیریۃ فی ھذا المسائل انہ اذا اتی بلفظ ینبئ عن تملیك الرقبۃ یکون ھبۃ و اذا کان منبئًا عن تملیك المنفعۃ یکون عاریۃ و اذا احتمل ھٰذا و ذاك یُنْوٰی کذا فی المستصفٰی۔ اھ۔

(ج ۵ - ص ۲۲۹)

قلت والوصیۃ اخت الھبۃ فی الالفاظ لکونھا تملیکًا بعد الموت فلا تصح مالم تکن بلفظ صریح فیھا۔ و اللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون - ۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۴ھ

حکم الوصیۃ بوقف حصۃ من مالہ

السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ قبلہ والد صاحب حج کو تشریف لے گئے اور اشیاء ذیل احقر کے سپرد فرماگئے۔ نقد و مال تجارت -/۳۰۰۰ مکانات سکنائی -/۲۰۰۰ جائیداد صحرائی -/۲۰۰۰ - کل تخمینات -/۷۰۰۰

ایک پاکٹ بُک میں بطور وصیت فرماگئے جس کا خلاصہ یہ ہے : ایک حصہ وقف کر دیا جائے مال وغیرہ کا۔ ۱۹۱۲ء کو واپس تشریف لے آئے۔ اور جزوی طور پر دوکان پر تشریف لاتے رہے۔ کچھ دنوں بعد بیمار ہو گئے جس سے دوکان کا آنا ترک ہوگیا احقر نے اپنی مدد کے واسطے ایک دیانت دار، تجربہ کار کو دوکان میں شریک کر لیا اور منافع کے تین حصے کیے۔ ایک حصہ قبلہ والد صاحب کا، ایک احقر کا اور ایک حصہ شریک کا۔ اور قبلہ والد صاحب کو اطلاع بھی کر دی جس پہ خاموشی فرمائی۔

دسمبر ۱۹۱۳ء کو قبلہ والد صاحب شب کو بحالتِ بیماری جو کہ مجنونانہ تھی لاپتہ ہو گئے۔ احقر ان کی اصل رقم اور منافع درج کرتا رہا۔ ۱۹۲۱ء کو ان کے منافع کی رقم سے ایک جائیداد -/۳۰۰۰ تین ہزار روپے سے کچھ زائد کی خرید لی۔ جب وہ لاپتہ ہوئے تھے ان کی عمر تخمیناً ساٹھ برس کی تھی، بعد دس برس کے علماء کرام سے دریافت کیا گیا تو فرمایا گیا کہ عمر طبعی پوری ہو چکی ہے۔ نیز تلاش بھی بہت کی گئی مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ دیگر کوئی وارث بھی سوائے احقر کے نہیں چھوڑا اس پر یہ خیال ہوا کہ اب بظاہر ناامیدی ہے۔

۱۹۲۴ء کو احقر نے ملکیت اپنی تصور کی اور اس وقت موجود مالیت حسبِ ذیل بھی تھی:

مال ونقد -/۳۰۰۰۔ سابقہ جائیداد صحرائی -/۳۰۰۰ + جائید خرید کردہ -/۶۰۰۰ کل تخمیناً -/۱۵۰۰۰ پندرہ ہزار ہے

لہٰذا یہ ارادہ بھی کر لیا ہے کہ پانچ ہزار روپیہ تدریجاً خرچ کر دیئے جاویں لہٰذا ۱۹۲۵ء سے اُس کا نفاذ جاری کر دیا گیا۔ اور اب تک اللہ واسطے تقریباً -/۱۰۰۰ ہزار کے قریب خرچ بھی ہو گئے۔ اب ۱۹۲۷ء میں ہر جائیداد کی حالت گر گئی ہے اور مالیت میں کمی بھی ہو گئی ہے۔ اس لیے اب تین امور دریافت طلب ہیں۔ براہ کرام ان کا جواب جلد مرحمت فرماویں

(۱) یہ وصیت صحیح ہوگی یا نہیں؟

(۲) ایک حصہ سے احقر نے ⅓ حصہ مراد لیا ہے آیا یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

(۳) اگر یہ وصیت صحیح ہے تو کس رقم کو اصل مالیت لگایا جاوے، سابقہ یا درمیانی یا موجودہ۔

السائل:

احقر نہال الدین غفرلہ مراد آبادی

چمک بازار ۲۵ر شوال ۱۳۲۵ھ

الجواب

قال فی الدر عن واقعات المفتین معزیًا للقنیة انه انما یحکم بموته بقضاء لانه امر محتمل فمالم ینضم الیہ القضاء لایکون حجة اھ قال الشامی قوله بقضاء هواحد قولین - قال القهستانی وفی القاء من قوله فتعتد عرسه دلالة علی انه یحکم بموته بمجرد انقضاء المدة فلایتوقف علی قضاء القاضی کما قال شرف الائمة وقال نجم الائمة القاضی عبد الرحیم نص علی انه یتوقف علیہ کما فی المنیة اھ وقال شرف الائمة موافق للمتون سائحانی قلت لکن المتبادر من العبارة ان المنصوص علیہ فی المذهب الثانی اھ (ج ۳ - ص ۵۱۲ - کتاب المفقود)

وفی البدائع من باب الوصایا وسواء کان الموصی به معلومًا اومجهولًا فالوصیة جائزة لان هٰذه جهالة تمکن ازالتها من جهة الموصی مادام حیًّا ومن جهة ورثته بعد موته فاشبهت جهالة المقر به فی حال الاقرار وانها لاتمنع صحة الاقرار کذا جهالة الموصی له تمنع صحة الوصیة ایضًا وعلی هٰذا مسائل منها ما اذا اوصی الرجل بجزء من ماله اوبنصیب من ماله فان بیّن فی حیاته شیئا والا اعطاه الورثة ماشاءوا بعد موته لان هذا الالفاظ تحتمل القلیل والکثیر فیصح البیان فیه مادام حیًا ومن ورثته اذا مات لانهم قائمون مقامه ولواوصی له بسهم من ماله فله مثل اخس الانصباء ویزاد علی الفریضة ما لم یزد علی السدس عند ابی حنیفة رحمہ اللہ وعندهما مالم یزد علی الثلث فعلی روایة الاصل یجوز النقصان عن السدس عنده وعلی روایة الجامع الصغیر لا یجوز وبیانه اذا مات الموصی وترک زوجة وابنا فللموصی له علی روایة الاصل اخس سهام الورثة وهوالثمن ویزاد علی ثمانیة اسهم سهم آخر فیصیر تسعة فیعطی تسع المال وعلی روایة الجامع الصغیر یعطی السدس لانه اخس سهام الورثة - الی ان قال وجه قولهما ان السهام اسم لنصیب مطلق لیس له حد مقدر بل یقع علی القلیل والکثیر کاسم الجز الا انه یسمی سهمًا الا بعد القسمة فیقدر

بواحد من انصباء الورثۃ والاقل متیقن بہ فیقدر بہ۔ الا اذا کان یزید علی الثلث فیزاد الی الثلث (لا الی ازید منہ) لان الوصیۃ لا جواز لہا باکثر من الثلث من غیر اجازۃ الورثۃ۔

ووجہ قول ابی حنیفۃ ماروی عن ابن مسعود انہ سئل عن رجل اوصی بسہم من مالہ فقال لہ السدس۔ وروی عن ایاس بن ابن معاویۃ انہ قال السہام فی کلام العرب السدس اھ (ج ۳ - ص ۳۵۶)

قلت ولفظ الحصۃ فی لسان الھند کلفظ الطائفۃ۔ والجزء والبعض والشقص فی العربیۃ ولیس مثل السہم کما لا یخفی۔

حاصل یہ ہوا ۱ صورت مسئولہ میں بعد موتِ اقران کے بدون قضاء قاضی کے ورثہ کا مال مفقود پر قبضۂ مالکانہ کرلینا جائز ہے علی قول شرف الائمۃ۔ واخترناہ فی حق الاموال تیسیرًا۔ واما فی حق الزوجۃ فنختار قول نجم الائمۃ احتیاطًا فی باب الفروج۔

۲ اور ایک حصہ کی وصیت شرعًا صحیح ہوگی اور وارث کو اختیار ہے کہ جتنا چاہے اور جس مال میں سے چاہے جونسا حصہ چاہے وقف کردے۔ اور سائل نے جو ایک حصہ سے ایک ثلث مراد لے کر وقف ثلث کا ارادہ کیا ہے اس میں غایت احتیاط ہے۔

واللہ اعلم

تنبیہ: نقد روپیہ صدقہ کرنے سے وصیت ادا نہ ہوگی بلکہ وقف کرنے سے وصیت ادا ہوگی۔ اور وقف کا محل اعیان ہیں دراہم و نقود نہیں، فقط۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴ شوال ۱۳۴۵ھ

وصیت کے متعلق چند سوالات پر مشتمل ایک استفتاء

السؤال: مرحومہ نے مرتے وقت وصیت کی کہ میرا مکان نصف، نصف میری دونوں بیٹیوں کو دیا جائے اور زیور کے متعلق یہ وصیت کی کہ ۱/۳ حصہ خیرات کیا جائے باقی ۲/۳ حصہ نصف دونوں بیٹیوں کو دیا جائے

الجواب

لڑکیوں کے بارے میں وصیت باطل ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور خیرات کی وصیت درست ہے۔ اگر مرحومہ کی مملوک زیور وغیرہ میں سے اس کا ذاتی قرضہ ادا کر کے زیور بچے تو اس بقیہ میں سے ۱/۳ حصہ خیرات کرنا ضروری ہے۔ باقی ۲/۳ سب وارثوں کا حق ہے۔

سوال ۲: مکان اور زیور کی حقیقت یہ ہے کہ شوہر مرحومہ نے دو مکان اپنی کمائی سے خریدے مگر بیع نامہ بجائے اپنے نام کے اپنی زوجہ مرحومہ کے نام کر دیا۔ بعدہٗ ان مکانات کو مسمار کرا کر ان کے ملبہ سے اور نیز اپنی کمائی ہوئی زرِ کثیر سے ایک بڑا مکان تعمیر کرا دیا۔ مرحومہ نے اپنا مہر معاف[ع] کر دیا تھا۔ مرحومہ کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا نہ اس کو کوئی ترکہ اپنے باپ یا کسی اور رشتہ دار سے پہنچا تھا۔ وقتاً فوقتاً حسب خواہش مرحومہ شوہرِ مرحومہ نے زیور بنوایا جو مرحومہ کے پاس رہتا تھا۔ اور مرحومہ اس کو پہنا کرتی تھیں لیکن اس زیور کی زکوٰۃ ہمیشہ شوہرِ مرحومہ نے اپنی کمائی کے پیسے سے سالانہ خود حساب کر کے ادا کی ہے کوئی گفتگو مرحومہ اور اس کے شوہر کے درمیان اس زیور کے متعلق ایسی نہیں آئی کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ اس زیور کے خورد برد کرنے کا یا علیحدہ کرنے کا کوئی حق مرحومہ کو حاصل تھا۔

الجواب

فقط بیع نامہ کسی کے نام لکھوانے سے اس کی ملک ثابت نہیں ہوتی بلکہ جس کے نام سے زبانی بیع ہوئی ہو اسی کی ملک ہے۔ البتہ اس کے سوا اور کسی طرح ھبہ وغیرہ سے مع اس کے شرائط کے اگر ملک کر دیا ہو تو دوسری بات ہے۔ اور اگر زیور وغیرہ میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے۔ اگر آپ کے یہاں عام دستور ہے کہ فقط پہننے کے لیے دیا کرتے ہیں تب تو مرحومہ کی ملک نہیں ہوئی۔ اور اگر یہ دستور ہے کہ عورت کو مالک بنا دیتے ہیں تو وہ زیور اور کپڑے وغیرہ ملک مرحومہ کے ہو گئے۔ اور نیز جو اثاثۂ بیت اور زیور وغیرہ مرحومہ کے والدین نے اس کو دیا ہے وہ اس کی ملک ہے۔

ع اگر یہ معافی مرض الموت میں ہوئی ہو تو معتبر نہیں۔ مہر کی رقم مرحومہ کے ترکہ میں داخل کی جائے۔ منہ

سوال ۳: اب سوال یہ ہے کہ متذکرہ بالا حالات میں مرحومہ کو مکان اور زیور پر ایسی ملکیت شرعاً حاصل تھی یا نہیں کہ مرحومہ اُن کے متعلق مذکورہ بالا وصیت باختیارِ خود بلا مشورہ یا رضامندیٔ اپنے شوہر کر سکتی تھی

الجواب

اپنی ملک میں خیرات کی وصیت صحیح ہے، دختروں کے متعلق کسی حالت میں صحیح نہیں جیسا کہ جواب نمبر۲ میں تفصیل گزر چکی۔ واللہ اعلم۔

سوال ۴: اگر یہ وصیت کر سکتی تھی تو کہاں تک شرعاً اس کا شوہر اس وصیت پر عمل کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اور درصورت عمل نہ کرنے کے وہ کس گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور قیامت میں اس سے کیا مؤاخذہ ہوگا۔ وصیت کے وقت شوہر مرحومہ کا موجود تھا۔ اس نے وصیت کو سُنا مگر کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموش رہا۔

الجواب

جس صورت میں موافق نمبر۳ وصیت صحیح ہوگئی ہے اس میں اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ پورا نہ کیا جاوے تو سخت گناہ ہے اور اس مال کا رکھنا حرام ہے اور جس وصیت کا اس کو حق نہ تھا یعنی دختران کے بارے میں۔ اس میں آپ کی خاموشی سے وہ وصیت لازم نہیں۔ البتہ اگر انتقال کے بعد آپ نے کہہ دیا ہو کہ ہم کو وصیت منظور ہے تو اس کی مملوک چیز میں وہ وصیت پورا کرنا آپ کے ذمہ اپنے حصہ کے مطابق واجب ہوگی۔ باقی ورثاء نواب احمد وغیرہ کا حصہ برقرار رہے گا۔ آپ کی منظوری سے اس میں تغیر نہ ہوگا یعنی اس کی مملوک زیور وغیرہ موافق نمبر۲ میں سے اس کا ذاتی قرضہ ادا کرکے اور قرضہ کے بعد جو باقی رہے اس میں سے ۱/۳ خیرات کرے۔ باقی میں سے آپ کو ۱/۴ جو میراث میں سے پہنچتا ہے وہ ان دونوں لڑکیوں کو دیدیا جائے۔ اور ۲۸/۸۴ ہر دختر کو میراث میں سے جو ملے گا وہ اس سے الگ ہے۔ اور جو چیزیں حسب تفصیل نمبر۳ مرحومہ کی ملک ہی نہ تھیں بلکہ آپ کی مِلک تھیں ان کی بابت جب کہ وصیت کرنے کے وقت آپ کے سکوت سے اُس وصیت کا نفاذ ضروری نہ ہوا تھا۔ اسی طرح اگر بعد انتقالِ مرحومہ منظوری ظاہر کر دی ہو تب بھی ان

اشیاء کی بابت اس وصیت کا پورا کرنا ضروری نہیں ہوا۔

ہاں اگر اس وصیت کے مطابق کوئی چیز دختران کو دیدی ہو تو اب اس کا واپس لے لینا جائز نہیں ہے۔

فی الدر (الا ان بتجیز ورثته بعد موته) ولا تعتبر اجازتهم حال حیاته اصلاً بل بعد وفاته اھ (ج ۵۔ ص ۶۳۶)

وفیه ایضاً: (ج ۵۔ ص ۶۶۵) (وبالف عین) ای معینة بان کانت ودیعة عند الموصی (من مال آخر فاجاز رب المال الوصیة بعد موت الموصی و دفعه) الیه (صح وله المنع بعد الاجازة) لان اجازته تبرع فله ان یمتنع من التسلیم واما بعد الدفع فلا رجوع له۔ شرح تکملہ (بخلاف ما اذا اوصی بالزیادة علی الثلث او لقاتله او لوارثه فاجازتها الورثة) حیث لا یکون لھم المنع بعد الاجازة بل تجبروا علی التسلیم الخ

کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

۱۷ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ

فوت شدہ نمازوں کے فدیہ کے متعلق ایک وصیت اور اس کا حکم

السؤال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے متعلق از روئے شرع شریف کہ۔ ۱ : زید حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر مرض اسہال میں چار ماہ کے قریب مبتلا رہ کر دنیا فانی سے کوچ کر گیا مگر دوران مرض میں انتقال ہونے کے قریب تک اس کے ہوش و حواس نہایت درست رہے۔ چنانچہ انتقال کے قریب اپنے والد بزرگوار سے اپنے قصور معاف کرا کر انہیں راضی کیا اور کاغذ قلم دوات منگوا کر اپنی مخفی نقدی وغیرہ مفصل لکھوادی اور اپنی عمر بھر کی فائتہ نمازوں کے فدیہ کے ادا کرنے کی وصیت کی کہ بارہ سالہ نابالغی کے منہا کر کے فلاں سال سے فلاں سال تک کی فائتہ نمازوں کو حساب کر کے ادا کر دینا اور دوران مرض میں بھی کئی بار اس کی ادائیگی کی نسبت تاکید کی تھی اس پر زید مرحوم کے والد نے آخری وصیت نزع کے قریب یہ بھی کہا کہ پچیس سال ہوتے ہیں اور پچیس سال کی نمازوں کے فدیہ کے غلہ کی قیمت اس وقت کے نرخ سے تخمینۃً ½ ۱۲ ہزار

روپے ہوتے ہیں۔ اس پر زید نے جواب دیا کہ کچھ پرواہ نہیں کہ میری نقد متروکہ میں سے کُل نمازوں کا ادا کر دینا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد زید کا انتقال ہوگیا۔ زید مذکور نے باپ، زوجہ ایک دختر، ایک پسر ۱۴ سال سے مفقود الخبر وارث چھوڑے ہیں ان میں سے تین موجودہ وارث زید کی نمازہائے فائتہ کی فدیہ دینے پہ بخوشی خاطر راضی ہیں۔ لیکن قبل ادائیگی چند سوال شرعی علماء دین سے دریافت طلب ہیں۔

عـ۱ : زید کے عمرِ نابالغی کے بارہ سال منہا ہوں گے یا ۱۶، ۱۷، ۱۸ حسبِ فقہ و قانونِ بلوغ۔

عـ۲ : زید کی وصیت کے موافق اس کے ترکہ نقد میں سے کل نمازوں کا فدیہ ادا کیا جاوے گا یا کچھ کم۔

عـ۳ : غلہ کا نرخ نمازوں کے فوت ہونے کے زمانہ کا لگایا جاوے یا اس زمانہ ادائیگی کے وقت کا

عـ۴ : اس فدیہ کے مصارف کیا ہوں گے بیّنوا توجروا۔

نیاز مند : کمترین محمد یٰسین خان
از اسلام نگر ڈاکخانہ رامپور سہارن پور
۳ر اکتوبر ۱۹۲۶ء

الجواب

حامداً و مُصلّیاً۔

صورت مسئولہ میں پورے پچیس سالوں کی نمازوں کا فدیہ دیا جاوے۔ اور جب ثلثِ ترکہ سے وصیت پوری ہوسکے تو ورثاء کی رضامندی شرط نہیں اور اگر وصیت میں حساب غلط ہو جائے یعنی کوئی شخص اپنے ذمہ زائد نمازیں سمجھ کر وصیت کر دے باوجود کہ اس کے ذمہ اتنی نمازیں نہ ہوں تب بھی تمام وصیت کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور صورتِ مسئولہ میں تو حساب کی غلطی بھی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ بارہ سال کی عمر میں بالغ ہونا ممکن ہے۔ پس جب میت نے اس عمر سے اپنا بلوغ ظاہر کیا (کیونکہ نابالغی کے بارہ سال منہا کرنے کا یہی مطلب ہے کہ میں بارہ سال کی عمر میں بالغ ہوگیا تھا اس کے خلاف کوئی وجہ نہیں) تو اس کی تکذیب کیسے کر سکتے ہیں۔ نیز صحتِ وصیت کے واسطے

وجوب ضروری نہیں۔ اگر اُن نمازوں کے فدیہ کی وصیت کر دے جو واجب نہیں تب بھی وصیت صحیح ہے۔ اور مصارفِ فدیہ کے وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں۔

قال فی الدر: وفی اوصیت له بجمیع ما فی هذا الکیس وهو الف فاذا فیه الفان ودنانیر وجواهر فکله له ان خرج من الثلث مجتبی۔ انتهی

قال الشامی: وکذا اوصیت بثلث مالی وهو الف فله الثلث بالغًا ما بلغ لان قوله وهو الف غیر محتاج الیه والواجبیة وکذا اذا اوصیت بنصیبی من هذه الدار وهو الثلث فاذا النصیب النصف فهو له او بجمیع ما فی هذا الدار وهو کر طعام فاذا فیه اکثر وعلله فی المحیط بانه اضاف الایجاب والتملیک الی الثلث مطلقًا والی الجمیع ما فی الکیس فصحت الاضافة الا انه غلط فی الحساب فلا یقدح فی الایجاب اھ ج ۵۔ ص ۶۵۴

وفی البحر ج ۲۔ ص ۲۸۵ وقیدنا بکونهما ادرکا عدةً من ایام أخر اذ لو ماتا قبله لا یجب علیهما الایصاء لما قدمناه ولکن لو اوصیا به صحت وصیتهما لانها لا تتوقف علی الوجوب۔ کذا فی البدائع۔ وقال الشامی تحت قوله (مصرف الزکوٰة) وهو مصرف ایضًا لصدقة الفطر والکفارة والنذر وغیر ذلك من الصدقات الواجبة کما فی القهستانی ج ۲۔ ص ۹۳

کتبه عبد الکریم عفی عنه
۳۰ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

باقی رہا یہ سوال کہ اگر فدیہ میں گندم وغیرہ نہ دیا جائے بلکہ نقد وغیرہ دیا جاوے تو کس وقت کی قیمت کا اعتبار کیا جاویگا۔ انتقالِ موصی کے وقت جو نرخ تھا اس سے حساب لگایا جاوے یا فدیہ ادا کرنے کے وقت جو نرخ ہو اس سے حساب لگایا جاوے۔
اس میں دو قول ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ وقتِ وجوب کی قیمت معتبر ہوگی۔ اس لیے ان کے نزدیک انتقالِ موصی کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔ لانه وقت وجوب الفدیة۔ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ وقتِ ادا کی۔

قال فی الغنیة فی باب فدیة الجنایات بالصدقة: وتعتبر قیمة وقت الوجوب وقالا وقت الاداء۔ کذا قالوا فی زکات وفطرة فینبغی ان یکون

هذا الخ (ص ۱۴۱)

وفی الشامیة تحت قوله فدیٰ عنه ولیه کالفطرة قدرًا ای التشبیه بالفطرة من حیث القدر اذ لا یشترط التملیك هنا بل تکفی الاباحة وکذا هی مثل الفطرة من حیث الجنس وجواز اداء القیمة ۔ قال القهستانی: واطلاق کلامه یدل علی انه لو دفع الی فقیر جملة جاز ولم یشترط العدد ولا المقدار لکن لو دفع الیه اقل من نصف صاع لم یعتد به وبه یفتی اھ ص۱۸۹ ج ۲

اوران دونوں میں سے کسی کے قول کو کسی پر صراحۃً ترجیح نہیں دی گئی البتہ اشارۃً کلامِ شامی سے قولِ صاحبین کو ترجیح معلوم ہوتی ہے پس ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت کو چاہے اختیار کیا جاوے۔ اور نمازیں فوت ہونے کے وقت کی قیمت کا لگانا کسی کا بھی قول نہیں۔

رہا یہ کہ وقتِ ادا کس وقت کو شمار کیا جاویگا۔ آیا اس وقت کو جب کہ مسکین کے ہاتھ میں رقم پہنچ جائے یا اس وقت کو جس میں وصی اپنے قبضے سے فدیہ کی رقم نکال کر کسی ایسے شخص کے حوالہ کردے جو محل اقامتِ مساکین کا منتظم اورنگران ہو۔ تو ظاہر یہ ہے کہ وقتِ ادا اول ہی ہے یعنی جب کہ مسکین کے ہاتھ میں رقم پہنچے نہ کہ ثانی۔ پس لازم قیمت دینے میں اس وقت کی رعایت ہے جس میں مسکین کے ہاتھ میں رقم پہنچے۔

قال فی الدر: ولا یخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء اھ

قال الشامی: فلو ضاعت لا تسقط عنه الزکوٰة بخلاف ما اذا ضاعت فی ید الساعی لان یده کید الفقراء ۔ بحر عن المحیط اھ ج ۲ ۔ ص ۱۸

قلت: ولیس مهتم المدرسة کالساعی لان الاصل بطلان الوکالة عن المجهولین الا فی الولایة العامة والامام له ولایة عامة والساعی نائب عنه فید الساعی کید الامام وهو وکیل عن الفقراء بولایة العامة ولا کذلك هنا فافترقا۔

ولو کان وکیلًا عن الفقراء المعلومین یشترط ان لا یکون ما بیده زائدًا علی قدر النصاب ای لا یکون ما یبلغ کل واحد عن الفقراء زائدًا

عنہ لکون یدہ کید الفقیر فان زاد لا یجوز لاحد دفع الزکاۃ ونحوھا الی ھذا الوکیل بعد صرح بہ فی الشامیۃ ج ۲ - ص ۱۷ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

یکم جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ

وارث کے متعلق وصیت اور اس سے متعلق امانت کا ایک ضمنی سوال

السوال ۱۰: مجھ مسماۃ اللہ دی کے خاوند کی حقیقی پھوپھی مسماۃ عصمت نے بندی کو اپنی حیات میں وصیت کی کہ میرا زیور، برتن اور کپڑے جب میرا لڑکا امیر محمد بالغ ہو جاوے گا، کو دیدینا۔ اور میری لڑکی مسماۃ سیدی کو نتھ، بلاق، بالے وغیرہ کو فلاں فلاں چیزیں دیدینا مگر بحکم خدائے بزرگ کے بندی بیوہ ہوگئی۔ بندی نے عصمت کی لڑکی سے کہا کہ فلاں فلاں چیزیں تیری والدہ نے بندی کے سپرد کی تھیں کہ میرے لڑکے امیر محمد کو بوقتِ بلوغ دیدینا اور اب تیری والدہ بھی مسماۃ عصمت انتقال کر گئی ہے اور بندی بیوہ ہوگئی۔ جس کی وجہ سے اب میرا ارادہ یہاں قیام کا نہیں۔ اور نہ کوئی سامان لیجا سکتی ہوں جو جو تیری والدہ نے تیرے دینے کو کہا تھا وہ تو اپنے کام میں لا اور باقی اپنے بھائی کو سنِ تمیز کے وقت دیدینا۔ مگر امیر محمد کے حصہ کی اشیاء بہن نے قبول نہ کیں اور کہا کہ توہی دیدینا بعدہ مسماۃ عصمت کے انتقال کے دس سال بعد بندی بحالتِ بیوگی اپنے میکہ چلی آئی۔ اس وقت اس لڑکے کی عمر یعنی امیر محمد کی تقریباً ۱۸ سال کی تھی۔ بندی کو اس کے بلوغ کا علم اس وقت نہ تھا اور وصیت بھی یہی تھی کہ جب میرے لڑکے کا بیاہ ہو جائے اور زوجہ گھر پر رہنے لگے تو اس وقت دیدینا۔ میرے میکہ آنے کے دو سال بعد میری نند مسماۃ عصمت کی حقیقی بھتیجی میرے میکہ میں میرے ملنے کو خود آئی تو بندی نے کنجی اس کو دیکر وہ تمام چیزیں بتلا کر کہدیا کہ امیر محمد کو دیدینا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے کپڑے برتن خود رکھ کر اور لڑکے امیر محمد کو نا معلوم کس قدر اشیاء ملیں، تمام ملیں یا کم۔ دریافت کرنے سے تو میری نند یہ کہتی ہے کہ میں نے کچھ نہیں لیا تو ایسی حالت میں بندی گناہ گار ہے یا مال وصیت کے بوجھ اور امانت کے ذمہ سے بری ہوگئی، بندی کو بہت فکر ہے۔

ع۲ عورتوں کو اوپر سے یا نیچے کی جانب سے سر گوندوانا جائز ہے یا نہیں بعض کہتی ہیں صرف چوٹی بنوالے ویسے ہی کھلے بالوں کی مینڈھیاں بنوا کر سر نہ گندھوائے اس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب

ع۱ اول تو یہ وصیت باطل ہے، جو کچھ مرحومہ نے کہا اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔ بلکہ سب مال کُل ورثاء میں مشترک رہے گا۔ وہ آپس میں باقاعدہ خود تقسیم کرنے کے مختار ہیں اس لیے دونوں بہن بھائی کو مسئلہ کی اطلاع کردو۔ دوسرے جس طریقہ سے تم نے امانت پہنچائی ہے اسی طریقہ سے تم بَری نہیں ہوئیں بلکہ لازم ہے کہ اپنی نند اور عصمت کے لڑکے سے خوب تحقیق کرو۔ اگر پہنچانا ثابت ہو جائے تو خیر ورنہ اپنی نند سے وصول کر کے دلوانا تمہارے ذمہ ہے اگر وہ نہ دے تو تمہارے ذمہ تاوان ادا کرنا لازم ہے۔ یا عصمت کے کل ورثاء سے معاف کروالو۔

فی العالمگیریہ: ولو قال رددتها بيد اجنبي وصل اليك وانكر ذلك صاحب المال فهو ضامن الا ان يقر به رب الوديعة او يقيم المودع بينة على ذلك -كذا في المحيط - والله اعلم - ج ۵ - ص ۲۱۶

ع۲ خواہ صرف چوٹی بناویں یا مینڈھیاں ہی دونوں جائز ہیں۔ البتہ کفار اور فسّاق کی مشابہت نہ ہو۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۴ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

وصیت للوارث والاجنبی کی ایک صورت

السؤال: ایک شخص نے اپنی زوجہ کے واسطے نصف متروکہ اور ایک اجنبی کے واسطے نصف متروکہ کی وصیت کی۔ زوجہ کے علاوہ دیگر وارث بھی موجود ہیں۔ وہ اس وصیت کو جائز نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں وصیت ثلث میں نافذ ہوگی اور اجنبی کو ثلث سالم ملے گا یا چھٹا حصہ ملے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ اجنبی کو سدس ملے گا۔ اور عالمگیریہ کے اس جزئیہ سے استدلال کرتے ہیں:

اذا اوصٰی لاجنبی و وارثه كان للاجنبی نصف الوصية الخ

مولوی محمد فاروق
شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور

الجواب

قال فی البدائع ج ۷ - ص ۳۳۲ ولو اوصی بالثلث لرجلین ومات الموصی فرد احدهما وقبل الآخر کان للآخر حصته من الوصیة لانه اضاف الثلث الیهما وقد صحت الاضافة فانصرف الی کل واحد منهما نصف الثلث فاذا رد احدهما الوصیة ارتد فی نصفه وبقی النصف الآخر لصاحبه الذی قبل ـ کمن اقر بألف لرجلین فرد احدهما اقراره ارتد فی نصیبه خاصة وکان للآخر نصف الاقرار کذا ههنا بخلاف ما اذا اوصی بالثلث لهذا والثلث لهذا فرد احدهما وقبل الآخر ان کل الثلث للذی قبل الا انه اذا قبل صاحبه یقسم الثلث لضرورة المزاحمة اذ لیس احدهما اولی من الآخر فاذا رد احدهما زالت المزاحمة فکان جمیع الثلث له.

ع۱ قلت : ولا یخفی ان رد الشارع الوصیة لاحدهما کرد الموصی له الوصیة بل فوقه یدل علی ذلک ان صاحب البدائع ذکر بعد ذلک مسئلة الوصیة لبعض ورثته و لأجنبی ثم مثله بمسئلة الرد اھ ج ۷ ص ۳۳۸

ع۲ ثبت بقول البدائع ان المزاحمة انما تکون اذا کان اوصی بالثلث لاثنین و اما اذا اوصی بالثلث لواحد وبالثلث لآخر لم تقع المزاحمة الا اذا استحقا جمیعًا وھو ظاھر.

ع۳ وکذلک اذا اوصی بالنصف لواحد وبالنصف لآخر کما لا یخفی ـ فما فی العالمگیریة اذا اوصی لاجنبی ووارثه کان للاجنبی نصف الوصیة الخ فمحمول علی ما اذا اوصی لهما بالثلث لثبوت المزاحمة فی الثلث فافهم ـ

پس صورتِ مسئولہ میں زوجہ کے لیے وصیت باطل ہے اور اجنبی کے لیے ثلث میں نافذ ہے اور ورثاء جائز رکھیں تو زائد میں بھی صحیح ہے بشرطیکہ سب بالغ ہوں ۔ اور اگر کوئی نابالغ ہو تو اس کی اجازت معتبر نہیں صرف بالغین کے حصے میں ہی اجازت صحیح ہوگی ۔ ھذا واللہ اعلم وعلمہ احکم .

کتاب الفرائض

اپنی بیٹی کو میراث سے عاق کردینے کا حکم

السوال: علیم الدین حسین کا ایک لڑکا دو لڑکیاں ہیں اُس نے ایک لڑکی کو بوجہ اس کی بے عنوانی و بداخلاقی کے ناخوش ہوکر عاق کردیا ہے جسے عرصہ دراز گزرا اور بارہا وصیت کی کہ اس کا حق نامبردہ نے اس کی لڑکی کو دیا ہے جس کی شادی کی اپنے پاس رکھا اب نامبردہ مرگیا ہے تو ایسی صورت میں عاق شدہ لڑکی مستحق پانیوالی شرعی کے برابر ہے یا بموجب وصیت عملدرامد کے عاق شدہ لڑکی کی حصہ پاویگی۔

الجواب

صورتِ مسئولہ میں میراث لڑکی ہی کو ملے گی۔ لڑکی کی لڑکی کو کچھ نہ ملے گا۔ نہ وراثۃً نہ وصیۃً کیونکہ وارث تو وہ ہے ہی نہیں۔ اور وصیت مذکورہ بھی باطل ہے۔

فی العالمگیریۃ: فان اوصی لہ بنصیب ابنہ او ابنتہ ولہ ابن او بنت فانہ لا تصح الوصیۃ ولو اوصی بنصیب ابنہ او ابنتہ ولیس لہ ابن او بنت فانہ تجوز الوصیۃ ولو اوصی بمثل نصیب ابنہ او ابنتہ ولہ ابن او بنت تجوز لان مثل الشیٔ غیرہ لا عینہ الخ۔ (ج ۷، ص ۷۰) واللہ اعلم۔

ظفر احمد
۹ صفر ۱۳۴۰ھ

نافرمان اولاد کو عاق کرنے کا حکم

السوال: عمر زید کا بیٹا ہے اور زید ضرورتمند ہے کہ عمرو اس کے خورد و پوش کی خبر لے مگر عمرو بوجہ اپنی زوجہ کے اغواء کے زید کی خبر نہیں لیتا بلکہ شرارت سے پیش آتا ہے۔ اور زوجہ سے زدوکوب بھی کرادیتا ہے اور کہتا ہے کہ زید اگر میرے مکان پر آیا تو اس کے گھٹنوں سے

پیر کاٹ لوں گا اور جو کچھ اس نے اس کے باپ زید پر اور اس کی بہن پر صرف کیا ہے بذریعہ اپنی زوجہ کے قرضہ بتلا کر طلب کرتا ہے۔ زید مجبور ہے۔ اور اگر زید کہتا ہے کہ میں تجھ کو ایسے وجوہات سے عاق کردوں گا تو کہتا ہے کہ میں نے علماء سے دریافت کر لیا ہے عاق کر دینے سے میرا کوئی نقصان دینی نہیں ہے تو ایسا باپ اگر بیٹے کو عاق کر دے تو حسب مضمون حدیث شریف گناہ گار تو نہیں۔ یعنی مستحق دوزخ کا تو نہیں بنا بلاحساب جنت میں داخل ہوگا۔

الجواب

جو لڑکا اپنے باپ سے اسطرح پیش آتا ہو وہ عاق ہو گیا باپ کے عاق کرنے کی ضرورت نہیں مگر شریعت میں عاق لڑکے کو میراث سے محرومی نہیں ہوتی بلکہ جہنم کا سخت عذاب ہوتا ہے اگر باپ ایسے بیٹے کو میراث سے محروم کرنا چاہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی حیات میں زمین، جائیداد دوسرے ورثاء کے نام کردے اور اُن کو قبضہ بھی دلا دے۔ اور کچھ اپنے گذر کے واسطے رکھ کر اس کو وقف کر دے اور تاحیات اس کی آمدنی اپنے صرف میں لانے کی شرط کر دے واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی

مسئلہ میراث کی دو صورتیں	السوال: مسئلہ ذیل کے متعلق ارشادِ شرعی

فرمادیں۔ زید، عمر، بکر تینوں ایک شخص کے بیٹے ہیں۔ عمر اور بکر سگے یعنی حقیقی بھائی ہیں۔ یعنی ان کی والدہ ایک ہے۔ زید جو اُن سے عمر میں بڑا ہے سوتیلا بھائی یعنی اس کی والدہ جدا ہے۔ عمر منجھلا بھائی (درمیانی عمر کا) اس وقت فوت ہو گیا ہے۔ زید عمر بکر کی جائیداد جدی زمین و کوٹھ اس وقت مشترک ہے اور مشترک بحصہ برابر درج کا غذات ہے البتہ حاصل زمین کو بحصہ برابر تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ خرچ کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ عمر کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کسطرح تقسیم ہوگی۔ زید کو اس سے کسقدر حصہ ملے گا اور بکر کو کسقدر ملے گا عمر کے ورثاء زید اور بکر ہی ہیں اور والد یا والدہ وغیرہ کوئی نہیں البتہ

اس کے ماموں اور نانا ہیں۔

السوال ۲: مسماۃ صاحب نور لاولد مرگئی ہے اس کے ورثہ یہ ہیں۔ جمال خان اس کا خاوند۔ عیسیٰ، موسیٰ، یحیٰ اس کے بھائی۔ آزاد مسماۃ صاحب نور کا سوتیلا بیٹا ہے۔ اور کوئی وارث زندہ نہیں ہے۔ مسماۃ صاحب نور کی وصیت کی نسبت یہ ہے کہ اس نے کہا تھا کہ میرے مبلغ یک صد روپیہ مہر والے سے ۵۰ اس کے خاوند کو دیا جائے اور باقی پچاس روپیہ مہر والا اور باقی نقد روپیہ قریباً ۱۲۰ ایکسو بیس اور زیور مالیت ۶۰ روپیہ اور کپڑے وغیرہ مسماۃ مذکور کے پیچھے تجہیز و تکفین و خیرات مابعد موت کیجاوے۔ اب اس وقت یعنی مسماۃ صاحب نور کے مرنے کے بعد اس کا خاوند تین ماہ زندہ رہ کر فوت ہوگیا ہے مگر اس کا بیٹا آزاد جو مسماۃ متوفیہ کے شکم سے نہیں ہے وہ زندہ ہے۔ اب سوال شرعی یہ ہے کہ مسماۃ مذکورہ کی جائیداد کسطرح تقسیم کی جاوے کس کس وارث کو کس قدر حصہ یا روپیہ پہنچے گا تاکہ اس کے مطابق عمل درآمد ہو۔ بینوا توجروا

غلام یحیٰ سیکنڈ ماسٹر
بفہ ضلع ہزارہ صوبہ سرحد

الجواب

۱: صورت مسئولہ میں عمر متوفی کا وارث شرعی اوسکا حقیقی بھائی بکر ہے علاتی بھائی یعنی زید وارث نہیں ہے اسیطرح ماموں اور نانا بھی محروم الارث ہیں پس عمر کی تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ بکر کو ملے گی واللہ اعلم

مسئلہ ۱
عمر

بھائی حقیقی	بھائی علاتی	ماموں	نانا
بکر	زید	م	م
۱	م		

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۸ رجمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ

۲: مسماۃ صاحب نور نے اپنے شوہر کے واسطے جو وصیت کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وارث کیلئے وصیت باطل ہے اور خیرات کی وصیت مسماۃ کے

ترکہ میں سے تجہیز وتکفین کے بعد جو مال بچے اس کی ایک تہائی میں جاری کی جائے اس کے بعد جو مال باقی بچے جس میں مسماۃ کا مہر بھی داخل ہے اس کے چھ سہام کرکے تین سہام یعنی نصف خاوند کا ہے اور باقی نصف میں سے ایک ایک سہام اس کے علاتی بھائی کی اولاد کو ملے گا۔ اور سوتیلا بیٹا محروم ہے۔ اور جمال خان کا حصہ اس کے شرعی وارثوں کو دیا جاوے جس کا استفتاء علیحدہ کرنا چاہیئے۔ واللہ اعلم

مسئلہ ۲

مسماۃ نور

شوہر	ابن الاخ لاب	ابن الاخ لاب	ابن الاخ لاب	متبنی
جمال خان	عیسیٰ	موسیٰ	یحیٰ	آزاد
۱/۲	۱	۱	۱	

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۸ ربجمادی الاول سنہ ۱۳۴۰ھ

ایک عورت مرگئی اس نے شوہر، ایک لڑکی، والدہ، والد اور ایک ہمشیرہ چھوڑی بعد میں شوہر کا بھی انتقال ہوگیا۔ کا حکم؟

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ بندی کا انتقال ہوگیا اس نے ایک شوہر اور ایک لڑکی عنایت فاطمہ اور والدہ اور والد اور ایک ہمشیرہ چھوڑی بعدہ اس کے شوہر کا بھی انتقال ہوگیا اس نے ایک لڑکی عنایت فاطمہ مذکورہ اور ایک بھائی اور ایک چچا چھوڑا اب موافق شرع شریف مسماۃ بندی مرحومہ کی ملک کسطرح منقسم ہونی چاہیئے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

بعد تقدیم ما حقہ ان یقدم علی تقسیم الترکۃ کصرف التجہیز والتکفین واداء الدین عن المیت ان کان علیہ وانفاذ الوصیۃ من الثلث ان کان اوصیٰ بشیٔ۔

مسماۃ بندی کے تمام ترکہ کو چھ ۲ سہام پر منقسم کرکے ۱۵ سہام مسماۃ

عنایت فاطمہ کو اور چار چار سہام بندی کے باپ، ماں کو، تین سہام شوہر مسماۃ بندی کے بھائی کو دیئے جائیں گے۔ اگر مسماۃ بندی نے اپنے شوہر کو مہر معاف نہ کیا ہو یا مرض الموت میں معاف کیا ہو بہر صورت وہ مہر بھی ترکہ میں شمار ہوگا۔ ہاں اگر صحت میں معاف کر دیا ہو تو شمار نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

۲۶

مسئلہ ۱۲ عـ ۱۳ مسماۃ بندی

زوج	بنت	ام	اب	اخت
۳	عنایت فاطمہ	۲/۴	۲/۴	م
	۶/۱۲			

مسئلہ ۲ زوج مسماۃ بندی

بنت	اخ	عم
عنایت فاطمہ	۱/۲	م
۱/۲		

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الثانی ۴۰ھ

مناسخہ کی ایک صورت اور زوجہ اگر مرض وفات میں مہر معاف کرے تو اسکا حکم

السوال: یہاں بابت ایک متروکہ کے نزاع ہے اس کا مناسخہ کرنا ہے جس کی صورت ذیل میں درج ہے گو مناسخہ کیا گیا ہے مگر ممکن ہے کہ اس کی تصحیح وغیرہ میں غلطی ہو آپ اس کو ملاحظہ فرما کر اور اس کی صحت فرما کر حضرت مولانا مولوی حافظ قاری شاہ محمد اشرف علی صاحب قبلہ دام فیوضہم سے بھی تصحیح فرما کر جس قدر جلد ممکن ہو سکے واپس فرمائیں۔ واپسی کا پتہ حسب ذیل ہے

السائل

مولوی سید احمد صاحب وکیل بھوکردن ضلع اورنگ آباد دکن

۵۳۷۶۰
۱۳۴۴۰
۶۷۲
۴۲

مسئلہ ۷ محمد حنیف مرحوم

ابن بدیع الدین	ابن کریم الدین	بنت نعمت بی	بنت رحمت بی	بنت کمال النساء بیگم
۲/۱۲	۲/۱۲ ۱۹۲ ۳۸۴۰	۱/۶ ۹۶ ۱۹۲۰	۱	۱/۶ ۹۶

مسئلہ ۶ — رحمت بی مرحومہ — مع ۱

اخ بدیع الدین ۔ اخ کریم الدین ۔ اخت نعمت بی ۔ اخت کمال النساء بیگم

اخ بدیع الدین	اخ کریم الدین	اخت نعمت بی	اخت کمال النساء بیگم
۲	۲ / ۳۶ / ۶۴۰ / ۲۵۶۰	۱ / ۱۶ / ۳۲۰	۱ / ۱۶

مسئلہ ۸ / ۳۲ — بدیع الدین مرحوم — مع ۱۴

زوج حمید النساء بیگم ۔ بنت از بطن بشارت بیگم ۔ اخ کریم الدین ۔ اخت نعمت بی ۔ نعمت کمال النساء بیگم

زوج حمید النساء بیگم	بنت از بطن بشارت بیگم	اخ کریم الدین	اخت نعمت بی	کمال النساء بیگم
۱ / ۴ / ۲۸ / ۵۶۰ / ۲۲۴۰	۴ / ۱۶ / ۱۱۲ / ۲۲۴۰	۶ / ۴۲ / ۸۴۰ / ۳۳۶۰	۳ / ۲۱ / ۴۲۰	۳ / ۲۱

مسئلہ ۴ / ۲۰ — کمال النساء بیگم مرحومہ — مع ۱۳۳

زوج فصیح الدین ۔ ابن اکرام الدین ۔ بنت زاھدہ بیگم ۔ بنت فرید بیگم ۔ بنت بسم اللہ بیگم

زوج فصیح الدین	ابن اکرام الدین	بنت زاھدہ بیگم	بنت فرید بیگم	بنت بسم اللہ بیگم
۱ / ۵ / ۶۶۵ / ۲۶۶۰	۶ / ۷۹۸ / ۳۱۹۲	۳ / ۳۹۹ [۳]	۳ / ۳۹۹ / ۱۵۹۶	۳ / ۳۹۹ / ۱۵۹۶

مسئلہ ۴ — امیر النساء بیگم مرحومہ — مع ۲۲۴۰

زوج رحیم الدین	ابن جمال الدین
۱ / ۵۶۰ / ۲۲۴۰	۳ / ۱۶۸۰ / ۶۷۲۰

مسئلہ ۲ — نعمت بی مرحومہ — مع ۳۶۶۰

ابن رحیم الدین	ابن شرف الدین
۱ / ۱۳۳۰ / ۵۳۲۰	۱ / ۱۳۳۰ / ۵۳۲۰

مسئلہ — زاھدہ بیگم — مع ۳۹۹

زوج شریف الدین	ابن محمد ندیم اللہ
۱ / ۳۹۹	۳ / ۱۱۹۷

۵۳۷۶۰

الاحیاء

کریم الدین ـــ ۲۱۲۸۰	فرید بیگم ـــ ۱۵۹۶
فصیح الدین ـــ ۲۶۶۰	بسم اللہ بیگم ـــ ۱۵۹۶
رحیم الدین ـــ ۷۵۶۰	حمید النساء بیگم ـــ ۲۲۴۰
جمال الدین ـــ ۶۷۱۰	محمد ندیم اللہ ـــ ۱۱۹۷
شرف الدین ـــ ۵۷۱۹	اکرام الدین ـــ ۳۱۹۲

یہ مناسخہ صحیح ہے اور سہام صحیح ہیں

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۔

۱۵ ذی قعدہ ۵۴ھ

اس کے بعد اس قدر اور عرض کر دینے کی ضرورت ہے کہ اصل نزاع حمید النساء بیگم زوجہ بدیع الدین مرحوم اور دیگر ورثہ میں ہے اور بمقابلہ دیگر ورثہ حمید النساء بیگم کا حصّہ معلوم کرنا ہے جو اس صورتِ مسئلہ میں اُن کو مل سکتا ہے ۔

دوسرے یہ امر کہ یہاں ریاست حیدرآباد میں بعض الناس کو منصب ملتا ہے جو عطیۂ شاہی کہلاتا ہے اور اس میں یہاں کے قانون کے لحاظ سے توریث نافذ نہیں ہوتی ، بدیع الدین مرحوم بھی صاحبِ منصب تھے تو آیا شرعًا ان کے حصّے منصب میں توریث ہوگی یا نہیں اور زوجہ بھی مستحق ہے یا نہ ؟

تیسرے مہر کے متعلق یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ اگر زوجہ اپنی مرض الموت میں جب کہ وہ شدید بیمار ہو ایسی حالت میں اگر مہر معاف کرے تو وہ معاف ہو جاتا ہے یا نہیں ۔ اور اگر اسطرح زوجہ مہر معاف کر دے تو پھر اس کے ورثاء اس مہر کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں ۔ اور اگر زوجہ کی زندگی میں زوج مر جائے اور زوجہ یہاں کے رواج کے مطابق جبکہ زوج کا جنازہ تیار ہو جائے ۔ تو مہر معاف ہو جائے گا یا نہیں ۔

چوتھے :۔ اس صورت مسئولہ میں مسماۃ حمید النساء بیگم اپنے شوہر بدیع الدین مرحوم کے ورثاء سے مہر کی اس طریق پر طالب ہے کہ کل متروکہ محمد حنیف مرحوم سے اوّلاً مہر ادا کر دیا جائے ۔ اس کے بعد تعین سہام یا تقسیم متروکہ ہو ۔ کیا یہ مطالبہ شرعًا صحیح ہے یا بعد تعین سہام وہ صرف اپنے شوہر کے سہام اور متروکہ سے مہر کی طالب ہو سکتی ہے ۔

پانچویں: میت ثالث (بدیع الدین مرحوم) یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ مرحوم بدیع الدین کی دو زوجہ ہیں ایک بشارت بیگم اور دوسری حمید النساء بیگم۔ بشارت بیگم بحیاتِ زوج ہی فوت ہوگئیں اور حمید النساء بقیدِ حیات اب تک زندہ ہیں۔ بشارت بیگم زوجۂ اولی تھیں ان کے ورثاء میں دو بھائی ایک بہن ایک بیٹی اور باپ ہے۔ بشارت بیگم کے انتقال کے بعد اُن کی بیٹی و والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب دونوں بھائی، اور بیٹی کا نواسہ طالب ہیں کہ بشارت بیگم کا مہر جو بذمہ بدیع الدین مرحوم واجب الاداء ہے وہ دلایا جائے۔ تواب سوال یہ ہے کہ کیا دونوں بیویوں کے مہر میں تقدم و تاخر کا لحاظ ہوگا یا دونوں دَین مہر یکساں واجب الاداء ہوں گے۔

یہ امر بھی تصفیہ طلب ہے کہ پہلی بی بی بشارت بیگم کا مہر زیادہ ہے اور بعد کی دوسری بیوی حمید النساء بیگم کا مہر کم ہے ایسی حالت میں متروکہ بدیع الدین سے بلحاظِ مناسبت تعداد مہر ادا ہوگی یا مساوی۔

حبیب احمد طالب علم جامع العلوم

(اجوبۃ الاسئلۃ)

۱: اگر بدیع الدین مرحوم کا ترکہ وہی ہے جو ان کو محمد حنیف مرحوم کے ترکہ میں پہونچا تو حمید النساء کو بحیثیت میراث کے ۲۲۴۰ سہام منجملہ ۵۳۷۶۰ سہام کے ملیں گے اور اگر بدیع الدین مرحوم کا ترکہ پدری ترکہ کے علاوہ اور بھی ہے تو اس کا بھی آٹھواں حصہ مسماۃ موصوفہ کو میراث میں ملے گا۔ اور دین مہر کا حکم آگے آوے گا۔

۲: اگر منصب صاحبِ منصب کی مِلک کر دیا جاتا ہے در اں حالیکہ وہ مِلکیت کے قابل بھی ہے مثلاً منصب میں بطورِ جاگیر کے زمین ملے تو اس میں توریث کا نفاذ ہوگا۔ اور اگر وہ صاحبِ منصب کی مِلک نہیں کیا جاتا یا وہ ملکیت کے قابل ہی نہیں مثلاً ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا گیا ان دونوں صورتوں میں بعد موت کے منصب میں توریث کا نفاذ نہ ہوگا۔ ریاست کو حق ہے کہ اس کے ورثاء جس کو چاہے عطاء کر دے۔

۳: اگر زوجہ مرض الموت میں جس میں زندگی سے مایوس ہو جائے مہر معاف کر دے تو مہر بالکل معاف نہ ہوگا اس میں زوجہ کے تمام وارثوں کو سہام میراث کے موافق حصہ ملے گا جن میں شوہر بھی ایک وارث ہے اور اگر زوج پہلے مرجائے اور زوجہ جنازہ تیار ہونے کے وقت

مہر معاف کر دے تو مہر معاف ہوگیا اب اس کو شرعاً مہر لینے کا حق نہیں۔

۴: حمید النساء کا محمد حنیف کے ترکہ میں یہ مطالبہ کرنا درست نہیں اوّلاً محمد حنیف کے تمام ورثاء کا حصّہ نکال کر جسقدر بدیع الدین مرحوم کا حصہ اس میں ہے اس میں دین مہر حمید النساء بیگم اور بشارت بیگم کو مقدم کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر اور کسی کا قرض ہو اس کو بھی تقسیم ترکہ سے مقدم کیا جائے گا۔ علیٰ ہذا تجہیز وتکفین بھی تقسیم ترکہ سے مقدم ہوگی اس کے بعد جو بچے اس میں توریث نافذ ہوگی البتہ اگر بدیع الدین مرحوم کے ترکہ میں محمد حنیف کے ترکہ سے علاوہ بھی کچھ سامان وغیرہ ہو تو اس میں حمید النساء کا یہ مطالبہ درست ہے۔

۵: دونوں بیویوں کے مہر لزوم میں مساوی ہیں۔کسی کو مقدم ومؤخر نہ کیا جاوے گا اگر دونوں کے مہر کم وبیش ہیں تو باہم اُن کی نسبت معلوم کر کے ترکہ کو اس نسبت پر تقسیم کیا جاوے گا جبکہ مجموعہ ترکہ ہر دو مہر سے زیادہ نہ ہو اور اگر زیادہ ہو تو دونوں مہر دینے کے بعد جو بچے گا وہ ورثہ پر تقسیم ہوگا۔ واللہ اعلم

التخریج والاجوبۃ صحیح — حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

اشرف علی۔ ۱۶؍ ذیقعدہ ۱۳۴۰ھ — ۱۵؍ ذی قعدہ ۱۳۴۰ھ

ایک میت کے ورثاء میں صرف ایک لڑکی اور ایک عینی خالہ ہے

السوال:۔ ایک میت کے ورثاء میں صرف ایک لڑکی اور ایک عینی خالہ ہے اور اعزہ دُور کے رشتہ کے ہیں اور وہ بھی ننہالی رشتہ دار ہیں دادھیالی رشتہ کا کوئی بھی نہیں ہے اس صورتِ مذکورہ میں اس کا متروکہ سامان کیونکر تقسیم ہوگا۔

الجواب

کل ترکہ لڑکی کو ملے گا۔

۱۹؍ رمضان ۴۳ھ

دَین مہر ترکہ میں داخل ہے اور اس کے تقسیم کی ایک صورت

السوال: ایک شخص مسمّٰی زید نے اپنی دختر کا نکاح مثلاً بعوض پانچسو۵۰۰ روپیہ مہر کے کر دیا اتفاقاً دختر بقضاء الٰہی فوت ہوگئی، باپ اور شوہر موجود ہیں اور ایک لڑکا بھی ہے، ہر دو صورتوں میں مہر میں سے علیحدہ علیحدہ شرعاً کیا حق ہے۔

الجواب:۔ حامدًا ومصلیاً: دین مہر مثل دیگر اموالِ متروکہ ترکہ میں داخل ہے

پس کل ترکہ درصورت باپ وشوہر ولڑکا وارثہ ہونے کے بارہ سہام پر منقسم ہوکہ تین سہام شوہر کے ذمہ سے ساقط ہوجائیں گے اور دو سہام باپ کو ملیں گے۔ باقی سات سہام متوفیہ کے لڑکے کو اور اگر اولاد نہیں ہے تو کل ترکہ دو سہام ہوکر نصفی یعنی ایک سہام شوہر کا اور بقیہ ایک سہام باپ کا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
عنایت اللہ عفی عنہ
مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

احقر عبداللطیف عفا اللہ عنہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
الجواب صحیح
احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ ۸ شوال سنہ ۴۱ھ

اس عورت کے ترکہ کا حکم جس کا شوہر مجنون پہلے ڈوب کر مرگیا اور پھر یہ خود گم ہوگئی!

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کو جنون ہوگیا اور جنون ہی کی حالت میں کہیں چلا گیا بعد جستجو زید کی نعش چار روز کے بعد دریا سے برآمد ہوئی نعش سڑگل گئی تھی۔ زید کو جب جنون ہوا تو اکثر اپنی زوجہ سے کہا کرتا تھا کہ میں دریا میں ڈوب کر مر جاؤں گا مجھکو تیرا خیال ہے کہ تیری کیا حالت ہوگی۔ اور میاں بیوی میں اخلاص ومحبت غایت درجہ کی تھی۔ زید کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ وہ گھر سے نکل کر فوراً دریا میں ڈوبا ہے کیونکہ زید کا مکان تقریباً دو سو قدم دریا کے کنارہ پر واقع ہے مرد کے چلے جانے کے بعد دو گھنٹہ کے عورت بھی چلی گئی جستجو کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ زید کی عورت کو دریا کے کنارے پر چند آدمیوں نے دیکھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تقریباً آدھ پون گھنٹہ تک عورت نے دریا کے کنارہ پر چکر لگائے مگر ڈوبتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، مگر اندازہ لگاتے ہوئے یقین کیا جاسکتا ہے کہ عورت بھی مرد کے فراق میں ڈوب کر مری ہے اور آج ۲۴ یوم ہوئے مفقود الخبر ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ مرد وعورت کے پاس جو کچھ زر وزیور تھا سب چھوڑ گئے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کی ترکہ کا عورت مستحق ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہوسکتی ہے تو عورت کے ورثاء پر تقسیم کرسکتے ہیں یا نہیں، اور عورت کے ورثاء مہر طلب کرسکتے ہیں یا نہیں۔ جواب مع حوالہ کتب تحریر فرماکر عنداللہ ماجور ہوں وعند الناس مشکور ہوں۔

❁ ❁ ❁

الجواب

صورتِ مسؤلہ میں یہ واقعہ کسی حاکم مسلم کی اجلاس میں پیش کیا جائے۔ اگر وہ اپنی رائے سے یہ سمجھے کہ بظاہر عورت ہلاک ہو چکی ہے اور عورت کی موت کا حکم کر دے تو وقت حکم حاکم کے اس کو میت مان کر جتنے ورثہ عورت کے موجود ہوں اُن میں اس کا ترکہ تقسیم ہوگا اور ترکہ میں مہر بھی داخل ہے۔ اگر وصول یا معاف نہ کیا ہو۔

قال فی الدر المختار: وعند احمد ان کان یغلب علی حالة الهلاك کمن فقد بین الصفین او فی مرکب قد انکسر او خروج الحاجة قریبة فلم یرجع ولم یعلم خبره فهذا بعد اربع سنین یقسم ماله الخ

(ج ۳، ص ۵۱۰)

وفیه ایضاً: واختیار الزیلعی تفویضة للامام قال فی الفتح فای وقت رای المصلحة حکم بموته وفی الینابیع قیل نفوّض الی رای القاضی ولا تقدیر فیه فی ظاهر الروایة وفی القنیة جعل هٰذا روایة عن الامام اھ ج ۳، ص ۵۱۱)

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ ۲۴ شوال ۴۱ھ

میراث ذوی الارحام کے متعلق ایک صورت | السوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ اللہ دی نے انتقال کیا ایک بھائی ماموں زاد مسمی شیخ محمد اور ایک بھائی خالہ زاد مسمی شیخ میتا اور تایا زاد بہن کی دو لڑکیاں وحیدن و مجیدن اور دوسری تایا زاد بہن کے دو لڑکے حبیب احمد و مشتاق احمد اور شوہر مرحوم کا ایک بھتیجا مسمّی مہدی حسن وارث چھوڑا ہے ترکہ شرعاً کس طرح تقسیم ہوگا۔ بینوا توجروا۔

المستفتی

نور محمد پسر الشیخ محمد قوم شیخ ساکن تھانہ بھون

الجواب

بعد تقدیم حقوق مقدمہ علی المیراث کے کل ترکہ مسماۃ الٰہہ دی کا تین حصوں پر تقسیم کر کے ماموں زاد بھائی شیخ محمد کو دو حصے اور خالہ زاد بھائی شیخ میتا کو ایک حصہ دیا جائے

باقی سب محروم ہیں ۔ فقط

وفی العالمگیریة: اعلم بان الاقرب من الاولاد العمات والاخوال و الخالات تقدم علی الابعد فی الاستحقاق سواء اتحدت الجهة او اختلفت والتفاوت بالقرب بالثقاوت فی البطون ممن یکون ذو بطنین اھ

قال: فان استووا فی القرابة فالقسمة بینهم علی الابدان فی قول ابی یوسفؒ الآخر وعلی اول من یقع الخلاف الخ (ج ۷، ص ۲۹۸، ۲۹۹) ایضاً قال وقول محمدؒ: اشهر الروایتین عن ابی حنیفة فی جمیع ذوی الارحام وعلیه الفتوٰی اھ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۱ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ

نابالغ ورثا کو دین میت سے بری الذمہ کرنا اور بعد میں کسی بالغ وارث کے اس کہنے کا حکم کہ میں نے بقصد رجوع کے ادائیگی کی تھی

السوال: - زید کا انتقال ہوا اس کے وارث حسب ذیل ہیں:-

زوجہ - بنت - ابن بالغ - ابن نابالغ - متوفی نے کچھ جائیداد چھوڑی اور کچھ قرضہ بھی اپنے ذمہ چھوڑا - وارثوں نے قبل ادائے دین کے جائیداد کو سہام شرعیہ پر تقسیم کرلیا - اور دین کو ورثاء بالغین نے اپنے حصہ سے ادا کیا اور میت کے ذمہ کو دین سے بری کردیا - نابالغ کی جائیداد پر دین کا کچھ حصہ نہیں ڈالا اور ہمیں شرعاً و قانوناً مجبور نہ تھے اگر چاہتے تو سرٹیفکیٹ حاصل کرکے نابالغ کے حصہ پر بھی دین ڈال سکتے تھے مگر بایں ہمہ بالغین نے کل دین کو اپنی طرف منتقل کرکے اپنی اپنی زمین محصول کرکے ادا کردیا اب ورثاء بالغین میں اختلاف ہے بعض ورثاء تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سب نے نابالغ کو دین سے بری الذمہ کرنے کا باہم فیصلہ کیا تھا اور اس نیت سے کل دین ادا کیا اور ایک وارث کہتا ہے کہ مجھے یہ فیصلہ یاد نہیں - میں نے تو اس نیت سے نابالغ کے حصۂ دین کی ضمانت و ادائگی تھی کہ بعد بلوغ کے اس سے رجوع کردوں گا، اب نابالغ بلوغ کو پہنچ گیا ہے تو کیا اس وارث کو جو ضمانت بقصد رجوع کا مدعی ہے نابالغ سے بعد بلوغ کے اسی قدر دین کے مطالبہ کا حق ہے جو اس نے نابالغ کی طرف سے ادا کیا ہے - بینوا توجروا۔

الجواب

جب کسی میت پر دین ہو اور اس کا ترکہ قبل ادائے دین کے ورثہ میں باہم اسطرح تقسیم کیاجائے کہ ایک وارث یا چند وارث کل دین کے ضامن ہو جائیں اور میت کو دین سے بری الذمہ کر کے کل دین کو اپنی ذمہ کی طرف منتقل کر کے ادا کر دیں تو اس صورت میں تقسیم ترکہ صحیح ہے اور ترکہ دین سے خالی ہو جائے گا۔ لہٰذا نابالغ مذکور کے حصہ پر شرعاً یہ دین باقی نہیں رہا۔ رہا یہ کہ اس کے ذمہ بھی دَین باقی ہے یا نہیں، سو قاعدۂ شرعی یہ ہے کہ اگر کوئی بالغ دوسرے بالغ کا بھی دَین بدون اس کے امر کے ادا کر دے تو وہ تبرع ہوتا ہے۔ اور نابالغ میں تو بدرجۂ اولیٰ یہی حکم ہوگا۔ پس ورثہ بالغین میں سے کسی کو نابالغ مذکور سے بعد بلوغ کے مطالبۂ دین کا حق نہیں۔ نہ اُن کو جو براءت یتیم کے مدعی ہیں اور نہ اُن کو جو ضمانت وادا بدون ضرورت اور بدون امر و اذن کے کی ہے جو تبرع محض ہے۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ: اجاز الغریم قسمۃ الترکۃ قبل قضاء الدین له (ای الغریم) نقضها وکذا اذا ضمن بعض الورثۃ دین المیت برضاء الغریم إلا ان یکون بشرط براءۃ المیت لانها تصیر حوالۃ فینتقل الدین علیه وتخلو الترکۃ عنه وهی الحیلۃ لقسمۃ ترکته فیها دین کما بسط فی البزازیۃ وغیرها اھ (ج ۲، ص ۱۷۹)

وفیه ایضاً عن الحمادیۃ: المتبرع لا یرجع بما تبرع به علی غیره کما لو قضی دین غیره بغیر امره اھ (ج ۱، ص ۲۸۸)

وفی الهدایۃ: وتجوز الکفالۃ بامر المکفول عنه وبغیر امره فان کفل بامره رجع بما ادی علیه وان کفل بغیر امره لم یرجع بما یؤدیه لانه متبرع اھ (ج ۳، ص ۱۰۲)

وفی العالمگیریۃ: واذا کان الدین علی المیت واقتسموها علی ان ضمن احدهم سائر الدیون فان کان الضمان مشروطاً القسمۃ فقسمته فاسدۃ وان لم یکن الضمان مشروطاً فی القسمۃ ضمن قبل القسمۃ بغیر شرط الخ (ج ۶، ص ۱۵۰)

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

توریث ذوی الارحام کی ایک صورت السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ سوندھے خان کا انتقال ہوا۔ اس کا ترکہ اس کے بیٹے فرض اللہ خان کو ملا، پھر فرض اللہ خان کا انتقال ہوا اس کا ترکہ اس کے فرزند مقصود علی خان و صادق علی خان کو ملا۔ مقصود علی خان نے لاولد انتقال کیا۔ صادق علی خان نے ایک دختر چھوڑی جسکا نام رفیقہ ہے، یہ دختر نابالغ فوت ہوگئی۔ اس نے کچھ نہیں چھوڑا۔ دختر کا صرف ایک ماموں زندہ ہے جو اس کے ترکہ کا حقدار بننا چاہتا ہے اور میں مسمی عطا محمد خان اس کا پھوپی زاد بھائی ہوں مجھے اس ترکہ میں سے کچھ حصہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ اور کل ترکہ کا حقدار کون ہوگا۔

السائل

عطا محمد خان - ۳ صفر ۴۵ھ

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر مسماۃ رفیقہ کا کوئی عصبہ قریب یا بعید زندہ نہیں اور یہ جب معلوم ہو سکتا ہے کہ مسماۃ رفیقہ کے باپ دادا، پردادا وغیرہ کی اولاد کو اوپر تک خوب تفتیش کر لیا جاوے تو اس وقت بھی اگر کوئی عصبہ نہ ملے اور صرف ماموں اور پھوپی زاد بھائی ہی وارث ہوں تو کل ترکہ کا مستحق ماموں ہوگا اگر وہ ماموں حقیقی ہے۔ کیونکہ اس کی قرابت قریب ہے۔ وہ میت کی ماں کا بھائی ہے اور پھوپی زاد بھائی باپ کی بہن کا لڑکا ہے اس کی قرابت بعید ہوگئی۔ ماموں ذوی الارحام کی قسم رابع میں نمبر اوّل ہے اور پھوپی زاد بھائی نمبر دوم ہے۔ اور نمبر اوّل کے سامنے نمبر دوم محروم رہتے ہیں۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ صفر ۴۵ھ

تتمہ سوال بالا

مسماۃ مذکورہ کی پھوپی اور چچی حقیقی بھی زندہ ہے اور ماموں بھی حقیقی ہے اب یہ تحریر کیجئے کہ اُن دونوں میں سے کسی کو حق پہنچتا ہے یا نہیں۔ اور پھوپی حق لینا چاہتی ہے اور چچی یہاں موجود نہیں صرف پھوپی کے متعلق تحریر فرما دیجئے فقط

عطا محمد خان

نانوتہ ملازم پوسٹ آفس نانوتہ

الجواب

اس صورت میں مسماۃ مذکورہ کا ترکہ تین سہام میں کر کے دو سہام پھوپی کو اور ایک حصہ ماموں کو ملے گا۔ اور چچی کو محض چچا کی بیوی ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں مل سکتا ہاں اگر اس کو مسماۃ مرحومہ کے ساتھ خود بھی کچھ قرابت ہو تو اس کو بیان کر کے سوال دوبارہ کریں۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ بقلم خود

از تھانہ بھون۔ ۹ر صفر ۴۵ھ

شوہر کی ماہانہ تنخواہ اور اولیاء کے عطیات سے خریدی ہوئی زوجہ کی اشیاء کا حکم اور اس کے متعلق مزید چند سوالات کے جوابات

السوال: معروض یہ ہے کہ پہلے ایک عریضہ سے اہلیہ کے انتقال کی خبر حضرت کو کر چکا ہوں۔ انتقال اس مرحومہ کا قریب قریب اچانک ہوا۔ کل دو روز بیمار رہیں۔ مرجانے کا مجھ کو ایسا احساس نہ ہوا اگرچہ اور دیکھنے والوں کو ہو گیا تھا اس وجہ سے خانگی سامان و اثاث کے بارے میں نہ اس مرحومہ نے کچھ کہا اور نہ میں دریافت کر سکا اس مرحومہ نے اپنے کپڑوں کی تو وصیت کی کہ کچھ استثناء کر کے سب خیرات کر دینا اور امانت کے دینے کے متعلق کہا۔ اور اپنے ذمہ بعض رشتہ داروں کا قرض بتلا دیا لیکن خانگی سامان مبہم رہ گیا اور کچھ ابہام امانت و قرض میں رہ گیا اس لئے اس کے متعلق دریافت کرنا ہے۔ اور تجہیز و تکفین اور دوا میں روپیہ صرف ہوا ہے اس میں کچھ تردد ہے ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی قابلِ دریافت کرنے کے ہیں ان سب کو ذرا تفصیل سے حضرت کی خدمت میں عرض کروں گا۔

حضرت اس صدمہ سے قلب بیحد کمزور ہو گیا ہے، بلکہ طاقت جسمی پر بھی اثر ہے۔ معمولی سے معمولی شبہ اور خلجان جو ان امور میں ہو رہا ہے خود اس کو حل نہیں کر سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد یہ باتیں صاف ہو جائیں اور ہر ایک امر کا حکم شرعی معلوم ہو جائے تاکہ قلب کو یکسوئی ہو۔ اور حکم شرعی کے مطابق آئندہ عمل کرتا رہوں و باللہ التوفیق۔

سوال (۱): خانگی سامان میں مرحومہ کا جہیز ہے اس میں تو کچھ تردد نہیں کہ ان کا مملوک ہے اور بعض کتابیں اور کچھ (۲) سامان ایسا ہے کہ رخصتی کے قریب ہی خود خریدا ہے یا مجھکو اپنے پاس سے روپیہ دے کر منگوایا ہے۔ اس کے متعلق میرا گمان غالب یہ ہے کہ یہ اُن کا

ذاتی روپیہ تھا لہذا وہ بھی اس کا مملوک ہے اور اس وقت سے لے کر اب تک ان کا مملوک سمجھتا رہا گو تصرف میں میرے بھی آتا رہا۔

۳: اور کچھ سامان ایسا ہے کہ میں حسبِ ضرورت ذاتی روپیہ سے خریدتا رہا اور وہ مرحومہ بھی میرے روپیہ سے خریدتی رہی۔ اُن کی خریداری کی دو صورتیں ہیں۔ میری موجودگی میں تو مجھ سے اجازت لیکر اور مطلع کر کے اور جب میں باہر ملازم رہا اور اُن کے خرچہ کے لئے روپیہ ماہ بماہ دیتا رہا تو بے اطلاع۔ اگر چہ ضرورت کی خریداری کی مجملاً اجازت تھی، اس دوسری صورت میں احتمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی روپیہ سے خریدا ہو۔ لیکن چونکہ بظاہر اُن کی آمدنی ذاتی ایسی نہیں تھی اس لئے بظن غالب میرے روپیہ سے خریدا ہے۔ کچھ سامان ایسا بھی ہے کہ بالفعل اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اور زندگی میں مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ بلکہ مرنے کے بعد معلوم ہوا۔

۴: اور کچھ سامان ایسا ہے کہ ماقبل کی تینوں قسموں سے ایک قسم کا یقیناً معلوم نہیں ہوتا۔ ۵: بعض اشیاء ایسی ہیں کہ مرحومہ نے صحت میں کہا تھا کہ میرے عشیروں نے دی ہیں مرنے کے بعد بعض واقعات سے شبہ ہوا کہ انہوں نے خریدی ہیں لیکن کسی مصلحت سے یہ کہدیا ہے اور خریداری ظاہر نہ کی۔ چنانچہ ایک عشیرہ سے دریافت مجملاً کیا تو اُس نے انکار کر دیا کہ مجھ سے کوئی چیز مفت نہیں لی۔ قیمت میں کچھ تخفیف کر دی ہو یا کوئی پینے کی چیز ہو تو یہ دوسری بات ہے۔

اب اگر اس بارے میں عشیرہ کا انکار معتبر ہو تو دونوں عشیروں سے تفصیلاً تحقیق کر لوں اور یہ شبہ اُن اشیاء کے متعلق ہے جو ذرا قیمتی ہیں اور جو معمولی ہیں یا خوردنی یا ایسی کہ ان کا لین دین آپس میں مروج ہے مثلاً ٹکیہ صابون اس کے متعلق نہیں۔ ہاں اشیاء خوردنی و ٹکیہ صابون اور جو شئی ایسی ہو کہ اس کا استعمال استہلاک العین کے ساتھ ہوتا ہے اور گھر میں سب استعمال کرتے ہیں کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی خواہ زوج کے خاندان سے آئی ہو یا زوجہ کے خاندان سے ایسی اشیاء جو باقی ہیں ان میں تردد ہے کہ آیا وہ سب ورثہ کا حق سمجھا جاوے گا یا نہیں۔ اور ایک نابالغ بچی گھر میں ہے ان میں سے کوئی استعمال کرے باقی ورثہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے بعد گزارش یہ ہے کہ عموماً دستور یہ ہے اور میرا بھی یہی معمول رہا ہے کہ

عورت کو کوئی خاص شئ یا معین رقم ماہواری یا ششش ماہی اس طور سے نہیں دی جاتی کہ وہ اس کی مالک سمجھی جاوے بلکہ لباس وطعام سب خاوند کا مملوک سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو کچھ کھایا پہنا وہ کھانا پہننا اور جو کچھ بچا سب کا مالک خاوند حتی کہ رخصتی کے وقت جو کپڑے وغیرہ خاوند کی طرف سے بنائے جاتے ہیں ان کا بھی خاوند مالک سمجھا جاتا ہے پس اباحۃ استعمال کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

دوسرا دستور یہ ہے (اس کا مبنی اوّل دستور ہی سمجھ میں آتا ہے) کہ عورت کچھ پس انداز کرتی ہے اور بالا بالا لڑکے لڑکی کی شادی کے لئے سامان خریدتی رہتی ہے۔ خاوند سے اخفاء کرنے میں پوری کوشش کرتی ہے شادی یا کسی اور تقریب میں وہ سامان نکلتا ہے اور خاوند کے روبرو سرخروئی حاصل کی جاتی ہے اور خاوند بھی شکر گزار ہوتا ہے اور اس کو سچا خیر خواہ خیال کرتا ہے۔ اور سب خاندان والے اس کی تعریف کرتے ہیں۔

سوال ۲: ان دونوں دستوروں کو پیشِ نظر رکھ کر ما قبل کے ۳ کے متعلق سوال یہ ہے کہ آیا اس سامان کا مالک سمجھا جاؤں گا یا نہیں اس مرحومہ نے زندگی میں معلوم نہ ہونے دیا انتقال کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ضرور پس انداز کرتی تھیں۔ کچھ روپے زیور کی تھیلی سے برآمد ہوئے۔ اور کچھ زیور اور کچھ سامان ایک عزیزہ کا کچھ روپیہ میں رہن نکلا۔ مرنے کے قریب اس عزیزہ نے دریافت کیا کہ وہ زیور اور سامان کس کے پاس ہے تو میری والدہ صاحبہ اور اس عزیزہ کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی بڑی ہمشیرہ کے پاس بتلایا۔ بڑی ہمشیرہ نے انکار کر دیا۔ وہ زیور ان کی تھیلی سے برآمد ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یقیناً اس عزیزہ کو انہوں نے اپنے پاس سے روپے دیئے ہیں۔

نیز ایک رضائی تیار شدہ جدید اور ایک پلنگ کی نولڈ اور کچھ سوف نکلی۔ جو پیشتر مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے بھائی کی شادی میں کچھ نقد اور جوڑے دیئے ان وجوہات سے ظن غالب یہ ہے کہ یہ سب پس انداز ہے کیونکہ میری تنخواہ کے علاوہ ان کی آمدنی ایسی نہیں تھی یہ دوسری بات ہے کہ عید البقر میں کسی بھائی نے ۸ر ۱۴ر دیدیئے یہ سب تنخواہ اس کے ہاتھ میں رہتی تھی حساب کتاب کوئی باقاعدہ نہ تھا۔ اس ۳ میں سامان مختلف اقسام کا ہے ایک وہ کہ جو میرے خاص استعمال کا ہے اور ایک وہ کہ مشترک الاستعمال ہے اور ایک وہ جو خاص ان مرحومہ کے استعمال کا تھا تو اگر وہ مرحومہ شرعاً اس میں مالک تصور

ہوں گی تو دونوں قسمیں اخیرین میں سے کسی ضرورت کے سامان کی۔

سوال ۳، ۴: میں اپنے ظن غالب یا کسی رشتہ دار وارث غیر وارث وغیرہ کی شہادت کا اعتبار ہوگا یا نہیں اور اگر یہ صورت نہ ہو یا شرعاً معتبر نہ ہو تو پھر شرعاً رفع اشتباہ کا سہل طریقہ کیا ہے۔

سوال ۷: وصیت میں تو مرحومہ نے کہا کہ علاوہ تین مخصوص دو بیٹوں کے میرے سب کپڑے خیرات کر دینا۔ قیمت ان کپڑوں کی ثلث ترکہ سے بہت کم ہے تو آیا اس وصیت میں دی جائے نماز، لحاف، توشک، ہلکی رضائی، روئی کی کمری، صدری، دستی رومال، وغیرہ داخل سمجھے جائیں گے یا صرف دوپٹہ، کرتی، پاجامہ، دولائی، چادر اور برقعہ وغیرہ داخل ہیں۔

سوال ۸: غیر منقولات میں سے اس بچی کے ماموں کے قبضہ میں بھی ہے اور اُن کا حصہ اس طرف نکلے گا آیا تبادلہ بچی کے حصہ کے ساتھ شرعاً جائز ہے اور کسی صورت سے ان سب امور کا ایک دستور العمل جامع مانع تحریر فرمایا جاوے تاکہ احقر اطمینان سے آئندہ اس پر عمل کرتا رہے۔ فقط

سراج احمد از سوہار۔ ۲۹ محرم

الجواب

۱: سامان نمبر ا، ۲ تو یقیناً ترکہ میں شمار کیا جاوے اور حسبِ فرائض تقسیم کیا جاوے اور سامان ۳ میں جب ظن غالب یہ ہے کہ زوج کے روپیہ سے خریدا گیا ہے اور زوج نے یہ روپیہ ان کو تملیکاً نہ دیا تھا جیسا کہ آگے طرف ظاہر ہے تو مرحومہ اس کے خریدنے میں وکیل زوج تھیں اور یہ سامان مِلک زوج ہے۔ اور سامان ۴ کو ترکہ میں شمار کر کے حسبِ فرائض تقسیم کرنا چاہیئے کیونکہ اس میں ظن غالب کسی قرینہ پر مبنی نہ ہوگا۔ اور قبضہ دلیل مِلک ہے اور سامان ۵ میں مرحومہ کے قول پر عمل کر کے اس کو بھی ترکہ میں شمار کرنا چاہیئے کیونکہ مرنے کے بعد اس کے قول کی تکذیب کی کوئی صورت نہیں بینہ سے اس کے قول کی تکذیب کرنا قضاء علی المیت الغائب ہے وھو باطل۔ اور عدم بینہ کی صورت میں حلف کس سے لیا جائے۔ پس یہ سامان مملوک زوج شمار نہیں ہوسکتا۔ اور جو اشیاء استہلاکِ عین کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں ایسے ہی جملہ منقولات ان کا استعمال اشتراکاً اس وقت جائز ہے جبکہ سب ورثاء بالغ ہوں اور سب راضی ہوں۔ اور اگر نابالغ ہے تو ہر چیز تقسیم کر کے ہر حصہ والا اپنے حصہ کو استعمال کرے۔

جواب سوال دوم

۳ کے متعلق ظنِ غالب کا اعتبار ہے۔ بشرطیکہ ظنِ غالب میں عراضِ نفس کو دخل نہ ہو محض آثار و قرائن و عُرف سے ظن پیدا ہوا ہو۔ پس جو نقد روپیہ مرحومہ کے پاس سے نکلا وہ بظاہر اسی کی خاص آمدنی سے بچا ہوا نہیں ہے۔ یا گھریلو سامان جس قدر نکلا یہ سب بظاہر زوج کی مِلک ہے ترکہ میں داخل نہیں۔

جواب سوال سوم

۴ میں حکم یہ ہے کہ جو چیز کسی دلیل شرعی سے مِلک غیر ثابت ہو جائے۔ مثلاً ملکِ زوج ہونا معلوم ہو جاوے تو ترکہ نہ ہوگی۔ باقی سب ترکہ ہوگی۔ اور دلیل مُبیّنہ ہونی چاہیئے ایک کا قول کافی نہیں۔ کیونکہ نابالغ ورثاء کا حق فوت ہوتا ہے۔

جواب سوال چہارم

عورتوں کا عرف معلوم کیا جاوے کہ وہ وصیت میں کپڑوں سے روزانہ پہننے کے کپڑے مراد لیا کرتے ہیں یا ہر قسم کے کپڑے۔ اگر عرف سے کسی خاص قسم (نوع) کو ترجیح ہو تو وصیت کو اسی پر محمول کیا جاوے۔ اگر عرف مشتبہ ہو تو سب کپڑے مراد ہوں گے جتنے کہ ثلث میں آسکیں۔

جواب سوال ہشتم

یتیم کی جائیداد کا تبادلہ دوسری جائیداد سے اب، یا جد یا اُن کا وصی کر سکتا ہے بشرطیکہ خیر ہو۔ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم

وکل ما کتبہ اکثرہ بالقواعد العامۃ = حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۱ صفر ۱۳۴۵ھ

تقسیم ترکہ کی ایک صورت

السوال: زید کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور جائیداد ۶۰/- ہزار کی ملکیت چھوڑی۔ دفن کے بعد ۹ حصّوں میں تقسیم ہوئی۔ تیس ہزار قرض خواہوں کو۔ ۱۰ ہزار والدہ کو۔ اور ۵۰۰۰ - ۵۰۰۰ ہزار دو بھائیوں کو اور دو۔ دو ہزار پانچ بہنوں کو۔ اس وقت مرحوم کے ایک بھائی عمرو نے ۵۰۰۰/- ہزار نقد لے لیا۔ اور دستاویز لکھا کہ ہم نے اپنے مرحوم برادر کے حصص سے ۵۰۰۰/- ہزار بخوشی لے لیا۔ اور کورٹ میں بھی رجسٹر کیا گیا۔ بقایا والدہ اور ایک بھائی اور ۵ بہنوں نے تقسیم مال کو جُدا نہیں کیا بلکہ اس نے یوں عرض کیا کہ ہمارے برادر مرحوم

کا قرض ادا ہو جائے گا اس وقت ہم لوگ لیں گے۔ بعد عرصہ نو ۹ سال کے وہی مرحوم کے برادر عمرو نے پہلے جو پانچ ہزار روپیہ لیا تھا۔ وہ برابر ہے۔ مگر زائد ملنا تھا۔ ہماری بیماری کے سبب سے لینا ہوا۔ اور ہم کو ملنا چاہیئے۔

جناب مولوی صاحب برائے خدا بہت جلد حکم شریعت صادر فرمادیں۔ نوٹ:

جس وقت ۵۰۰۰/- ہزار عمرو نے لیا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے لوگوں نے تقسیم کردی تھی۔ جب بھی عمرو نے ہر طرف سے زبردستی کر کے نوٹس وغیرہ دیا کہ مجھے پانچ ہزار ملنا تو ہے ورنہ کورٹ سے لے لیں گے۔ اب پھر زبردستی کر رہا ہے۔ اور پہلے بھی اس کی زبردستی کی بنا پر اس کو دیئے گئے۔

الجواب

مسئلہ ۶ / ۵۴

زید۔

والدہ	بھائی	بھائی	بہن	بہن	بہن	بہن	بہن
$\frac{1}{9}$	۱۰	۱۰	۵	۵	۵	۵	۵

صورت مسئولہ میں بعد ادائے دین و تجہیز و تکفین وغیرہ کے خرچ کرنے کے چوبیس ۲۴۰۰۰ ہزار روپیہ بچا ہے اس کو چون ۵۴ سہام پر تقسیم کرکے۔ والدہ کو ۹ سہام دیئے جائیں جس کی مقدار ۴۰۰۰/- تین پائی۔ ہوتی ہے اور ہر بھائی کو ۱۰ دس سہام دیئے جائیں۔ جس کی مقدار ۵۵۵۵ ہے ۸ ایک پائی۔ اور پانچ پانچ سہام ہر بہن کو دیدیئے جائیں یعنی ہر بہن کو دو ہزار سات سو ستتر روپے (۲۷۷۷ ۱۲ / ۲ پائی)

ہمارے حساب میں یوں ہی نکلتا ہے۔ کسی محاسب سے دوبارہ حساب درست کرا لیا جائے۔ بس عمرو نے جو پانچ ہزار روپیہ جو لیا ہے وہ اس کے علاوہ شرعاً (۵۵۵ روپے ۸/ ایک پائی) کا مستحق ہے۔ والدہ کو جو دس ہزار روپے دیئے گئے ہیں وہ اس کے حق شرعی سے زیادہ دیئے گئے ہیں۔ اور بھائی بہنوں کو حق شرعی سے کم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب موافق تقسیم شرعی کے تیس ہزار کی رقم کو چون ۵۴ سہام پر تقسیم کرکے بانٹنا چاہیئے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔
۵ شعبان ۴۳ھ

مرض الموت کی تعریف اور اس کے متعلق چند سوالات

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین بیچ ان مسائل کے۔ کہ زید کو بیس۲۰ برس کی عمر سے قرحہ شانہ ہوا مگر وہ اپنا کاروبار برابر انجام دیتا رہا۔ اور اس کے علاج معالجے سے بھی غافل نہیں رہا۔ پچاس سال کی عمر میں اس کو دنبل زیر خوطہ پیدا ہو گیا۔ اور اس نے اس قدر ترقی کہ بالآخر دنبل نکلنے کے دو ماہ بعد انتقال ہو گیا۔ دو ہفتہ قبل از انتقال زید نے ایک تحریر اس مضمون کی اسٹامپ پر اپنی زوجہ کے نام لکھ دی۔ کہ تم میری قانوناً زوجہ ہو اور تمہارا مہر ایک لاکھ اسی ہزار اشرفی دہ دینار سرخ مقرر ہوا تھا۔ اور اس کا ادا کرنا میرے اوپر ضروری ہے۔ اس لئے میں نے اپنی کل جائیداد بعوض نصف مہر کے تجھے دے دی۔ اور یہ تحریر اپنی عین حیات بہ ثبات عقیل و نقل لکھی ہے۔ واضح ہو کہ زید انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اور یہ تحریر انگریزی میں اسٹامپ پر کسی دوسرے شخص سے لکھوا کر اس پر دستخط ثبت کر دیئے۔ اور اس کاغذ پر چھ۶ گواہوں کے بھی دستخط ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ زید ایسی جائیداد کا مالک ہے جو شاہان مغلیہ نے بعوض قضاۃ عطاء فرمائی ہے۔ جب برطانیہ کا تسلط ہوا۔ تو اس نے منجملہ اختیارات شرعی صرف اقامتِ جمعہ و عیدین بحال رکھے۔ اور دیگر اختیارات سماعت دیوانی وغیرہ اپنے اختیار میں رکھے اور اس نے اپنے انتظام کی وجہ سے ہم رکی جمع معالی بھی لے لے اور بقیہ ۱۲؍ استمرار اس خاندان کے لئے بخدمت عہدۂ قضاۃ یعنی خدمت اقامت جمعہ و عیدین مندرجہ ذیل شرائط پر جاری رکھے۔

۱؎ یہ جائیداد منتقل نہیں کی جا سکتی۔

۲؎ جب تک خدمت کی ضرورت ہے اور بحالتِ وفاداری سرکار برطانیہ بحال رکھی جائیگی خاندان میں یہ طریقہ اب تک جاری ہے کہ اولاد کو جائیداد علی السویہ تقسیم کی جاتی ہے، اور اناث میں نہ کبھی تقسیم ہوئی اور نہ کبھی انہوں نے مطالبہ کیا۔

۱؎ کیا مرضِ مذکور مرض الموت میں شمار ہو سکتی ہے۔

۲؎ کیا مذکورہ تحریر نامہ جائز ہے۔ جبکہ زید ایک دوسرے شخص کا بھی مقروض ہے۔

۳؎ کیا جائیدادِ مذکور ایسے قرض میں دینِ مہر میں زوجہ کو منتقل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ جائیداد منتقل ہو سکتی ہے تو بعد انتقالِ زوجۂ زید اس جائیداد کے پانے کا کون مستحق ہے۔

۴؎ اگر مرض الموت ہے تو زوجہ کو کتنا مہر مل سکتا ہے۔ جبکہ دوسرے ورثار موجود ہیں اگرچہ

زید لاولد فوت ہوا۔

۵ مہر اگر حیثیت سے بہت زیادہ ہو تو کیا شرعاً جائز ہے۔ اور قابلِ ادائیگی ہے یا نہیں۔ اگر قابلِ ادائیگی ہے تو کس مقدار میں۔ اُمید ہے کہ پانچوں امور کا جواب مع نام ہر کتاب۔ بحوالۂ عبارت و ترجمہ اردو مرحمت فرمادیں۔ اور عنداللہ ماجور ہوں۔ فقط

مشیر الحسن مکان قاضی محب الرحمٰن

سب رجسٹرار برہان پور ضلع تھانہ

الجواب

قال فی الدر وشرحه الغرر فی تعریف المریض بمرض الموت ما نصه من غالبه الهلاك كمريض عجز عن اقامة مصالحة خارج البيت فمن يقضيها فی خارج البيت وهو يشتكی لا يكون فاراً لان الانسان قلما يخلو عنه هو الصحيح اه وفی حاشية الشرنبلالی عليه قال الزيلعی وهو الصحيح اه۔ ويخالفه ما قال الكمال: اذا امكنه القيام بها فی البيت لا فی خارجه فالصحيح انه صحيح اه هذا فی حق الرجال اما فی حق المرأة۔ فقال فی النهر عن البزازية فبان تعجز عن المصالح الداخلة اھ (ج ۱، ص ۳۸۰)

پس اس صورتِ مذکورہ میں اگر زید اس تحریر کے وقت گھر سے باہر آنے جانے اور اپنی ضرورت کے امور کو بجالانے پر قادر تھا تو وہ مریض مرض الموت نہ تھا۔ اور اگر عاجز تھا تو وہ مریض مرضِ موت تھا۔

وفی الدر: تجب العشرة ان سماها او دونها ويجب الاكثر منها ان سمی الاكثر۔ قال الشامی: ای بالغاً ما بلغ فالتقدير بالعشرة لمنع النقصان اھ۔ وتتاكد عند وطأ او خلوة صحت من الزوج او موت احدهما اھ۔ وفی كشف الغمة للشعرانی وفی المقاصد للسخاوی: وكان عمر ابن الخطاب رضی الله عنه كثيراً ما يقول لا تغلوا صدق النساء فانها لو كانت مكرمة فی الدنيا او تقوی فی الآخرة كان اولاكم بها رسول الله صلی الله عليه وسلم وصعد مرة علی المنبر فقال لا تزيدوا فی صداق علی اربعمائة درهم فاعترضته امرأة من قريش فقالت تنهی الناس عن شیئ اباحه الله لهم فقال كيف فقالت اما سمعت قول الله

تبارك وتعالیٰ وآتیتم احداهن قنطارًا فلاتأخذوا الخ - فقال اللهم عفوًا کل الناس افقه من عمر قال ثم رجع فرکب المنبر فقال ایها الناس انی کنت نهیتُ ان تزیدوا النساء فی صدقتهن علی اربعمائة درهم فمن شاء ان یعطی من ماله ما احب قال ابویعلی واظنه قال فمن طابت نفسه فلیفعل اه۔ (مقاصد ۱۵۰) قال السخاوی وسنده جید قوی اه وفی الدر (ج ۲، ص ۳۶۷) دین صحة مطلقًا ودین مرض موته بسبب فیه معروف یقدمان علی ما اقر به فیه والکل علی الارث ولم یجز تخصیص غریم بقضاء دینه اه۔

ان نصوص کے بعد جواب سوالات معروض ہے۔ جب خاندان میں اُس کی جائیداد کا ذکور پر تقسیم ہونا متعارف ہے۔ تو یہ علامت ملکِ مورث کی ہے۔ اناث پر منقسم نہ ہونا۔ مانع ملکیت سے نہیں۔ کیونکہ جہالت کی وجہ سے عمومًا ہندوستان میں لڑکیوں کو حصّہ نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا یہ رواج قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

سا : اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے ملاحظہ ہو۔

سٖ۲ : اگر زید اس تحریر کے وقت گھر کے اندر باہر اپنے کام کر سکتا تھا تو یہ تحریر درست ہے اور دوسرے قرض خواہوں کے قرض خواہوں کے قرض ادا نہ کرنے کا گناہ زید کے ذمّہ رہا مگر اسٹامپ کے حجت ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کی اس پر گواہی درج ہے وہ زبانی کہیں کہ زید نے اس کو ہمارے سامنے سُن کر اقرار کیا ہے۔ یا اُس نے ہمارے سامنے املار کرایا ہے۔ اور املار کے موافق ہی اسٹامپ میں لکھا گیا ہے۔ اور اگر ورثار زید اور اسٹامپ کے گواہوں میں اختلاف ہو تو یہ گواہی بدونِ مجلسِ حاکم میں پیش ہونے کے معتبر نہ ہوگی۔

وقال فی الحامدیة : ومنها مجلس القضاء فلا تسمع هی ای الدعوی والشهادة الا بین یدی الحاکم اه۔ ج ۲، ص ۷)

اور اگر زید اس تحریر کے وقت باہر آنے جانے سے عاجز تھا تو یہ تحریر درست نہیں ہے۔ بلکہ سب قرض خواہوں کو جن میں عورت بھی داخل ہے۔ جائیداد مذکور تقسیم کرلیں۔

سٖ۳ : جائیدادِ مذکور دینِ مہر زوجہ میں منتقل ہوسکتی ہے۔ اور اس کے مالک بعد وفاتِ زوجہ کے وارثانِ زوجہ ہوں گے۔

سٖ۴ : زوجہ اپنے پورے مہر ایک لاکھ ۸۰ ہزار دہ دینار سرخ کی مستحق ہے۔ اگر اس سے

کچھ بچے گا تو ورثاء کو ملے گا ۔ ورنہ نہیں ۔

۵ : مہر جتنا باندھ دیا جائے وہی معتبر ہے ۔ چاہے حیثیت سے کتنا ہی زیادہ ہو ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۔ از تھانہ بھون

۲۹ ؍ شعبان ۱۳۴۳ھ

عصبات کی انتہاء اولادِ عم الجد پر ہوتی ہے یا اوپر کے رشتے بھی اس میں داخل ہیں؟

السوال :۔ عصبات کی انتہاء اولادِ عم پر ہو جاتی ہے یا اس سے اوپر کے رشتہ دار بھی عصبہ ہوتے ہیں ۔

الجواب

ذکر الطحاوی فی مشکل الآثار بسندہ عن عبد اللہ بن بریدۃ عن ابیہ قال جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل فقال عندی میراث رجل من الازد ولا اجد ازدیا ادفعہ الیہ قال تربص بہ حولا قال ففعل ثم اتاہ فقال اذھب فادفعہ الی اکبر خزاعۃ وذکر لہ طرقا عدیدۃ ثم قال ورواہ شریک وزاد فقال اطلبوا لہ وارثا فلم یجدوا فقال اطلبوا لہ ذا رحم فطلبوا فلم یجدوا فقال ادفعوا مالہ الی اکبر خزاعۃ اھ ۔

قال الطحاوی فکان ما رواہ سوای شریک اولی عندنا فما رواہ شریک لعددھم ولان ثلثۃ اولی بالحفظ من واحد ولاستحالۃ بعض ما فی حدیث شریک مما ذکر فیہ من قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اطلبوا لہ ذا رحم وھذا لایجوز فی العرب لان العرب لا تورث بالارحام وانما تورث بالعصبات الاحیث ورث اللہ تعالیٰ ذوی الفرائض المسماۃ منھم لانہ اذا لم توجد عصباتھم من افخاذھم وجدت من افخاذ التی تتلوا افخاذھم کما یعقل فی عقول جنایاتھم افخاذھم الذین یحملون اروش الجنایات فان قصر عددھم عن احتمال اروشھا رد ذلک الی من یلونھم من الافخاذ وانما یکون التوارث بالارحام المخالفۃ لما ذکرنا فی غیر العرب من العجم الذین لایرجعون الی شعوب ولاقبائل وانما یرجعون الی بلدان لا الی سواھا قال ابو جعفر فالعرب ترجع الی الشعوب والی القبائل والی

والی الاتخاذ و بھا یتوارثون والعجم لا ترجع الی ذلك و انما یجمعھم بلد انھم لا ماسواء ھا وکذلك کان ابو یوسف یقول فی التوارث بالارحام التی لیست عصبات انما یکون فی العجم لا فی العرب اھ (من ص۱۳۶ الی ص۱۵۱ ج ۳ -)

قلت ویلحق بالعرب شیوخ العجم الذین انسابھم محفوظة وکذالك الاقوام التی تراعی حفظ انسابھا من اھل العجم۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ فلا یتوارث ارحامھم مادام یوجد احد من عصباتھم من الجد الادنی او الابعد فالابعد۔

۷ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ

مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا اور اس کے متعلق مزید دو سوالات

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین رحمکم اللہ اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) زید ایک ہندو مشرک باپ کا بیٹا مسلمان ہوا ہے۔ اس کا باپ ہندو ایک کثیر جائیداد کا مالک ہے۔ کیا زید اپنے باپ کے بعد اسکی جائیداد کا وارث شرعًا ہوسکتا ہے یا نہیں۔ بحالیکہ زید از روئے قانون گورنمنٹ بنا بر جائیداد جدی ہونے کے (یعنی زید کے دادا ہندو کی جائیداد ہونے کے باعث) وارث ہوسکتا ہے اور اگر زید از روئے راجح مذہب شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جس کی بناء اس امر پر ہے کہ اختلافات دینین موانع ارث ہے وارث نہ ہوسکے تو بنا بر مرجوح مذہب جو کہ حدیث الاسلام یعلو ولا یعلی سے بعض صحابہ مثل حضرت معاذ بن جبل و معاویہ بن ابی سفیان۔ محمد بن الحنفیہ، محمد بن علی بن الحسین و مسروق رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کہتے ہیں کہ مسلم اپنے باپ کافر کا وارث ہوسکتا ہے کافر اپنے باپ مسلم کا وارث نہیں ہوسکتا اگر اپنا ورثہ لے تو کیا اس کا یہ ورثہ لینا جائز ہے یا نہ اور اسکا یہ حاصل کردہ مال حلال ہوگا یا حرام یا مشتبہ۔

(۲) چونکہ ضلع ہذا میں بعض نو مسلموں نے اپنے ہندو باپ کی جائیداد سے از روئے قانون سرکاری ورثہ حاصل کرلیا۔ لہٰذا زید مذکور اپنے باپ ہندو (جو کہ اس وقت زندہ ہے اور اپنے ہندو بیٹے کو اپنی جائیداد تملیک کرنا چاہتا ہے) پھر یہ دباؤ ڈال کر کہ میں آپ کی وفات کے بعد از روئے قانون سرکاری ضرور ہی وارث ہوجاؤں گا۔ تو آپ مجھے پورا حصہ نہ دیں۔ ادھورا حصہ دیں مثلاً بجائے نصف حصہ کے ثلث دیں۔ تو کیا یہ مصالحت جائز ہے اس لئے کہ اس میں ایک گونہ دباؤ ہے اور کیا ایسا دباؤ جائز ہے چونکہ کافر کسی مسلم کو کچھ مال تملیک کردے تو شرعًا مسلم کو اس مال کا حاصل کرنا جائز ہے۔

لہذا صورت مذکورہ بالا میں جو کہ ایک گونہ دباؤ کی صورت سے بطورِ مصالحت مال حاصل کرنا جائز ہے یا نہ یہ دوسری صورت یعنی بطورِ مصالحت کے زید مال حاصل کرے اسلئے اختیار کرتا ہے کہ اگر بنا بر مذہب راجح بطور ورثہ مال حاصل کرتے ہیں حلت مال میں کچھ شبہ ہو۔ تو بطورِ مصالحت مذکورہ مال حاصل کرے۔

(۳) عمرو ایک نو مسلم شخص از ہندو مذہب ہے اس نے ایک کثیر جائیداد جدی بموجب قانون گورنمنٹ اپنے ہندو باپ کے ورثہ سے حاصل کی ہے اب اس کی اولاد جو قبل از اسلام تھی یعنی ہندو اولاد بھی از روئے قانون سرکاری عمر کے مرنے کے بعد ضروری ہے وارث ہوگی چونکہ عمر کی ہندو اولاد آریہ ہے جو کہ سخت ترین دشمنانِ اسلام سے ہے۔ لہٰذا کیا عمرو کو اس امر کی کوشش کرنا کہ کسی طرح اس کی ہندو اولاد اس کے مرنے کے بعد وارث نہ ہو واجب نہیں ہے۔ جبکہ شرعاً کافر مسلم کا کسی صورت میں وارث نہیں ہوسکتا۔ اور اس عدم کوشش سے کیا عمرو گناہ گار نہیں ہے۔ واضح رہے کہ عمرو کی اس وقت دو مسلمان بیویاں، دو مسلم بیٹے اور دو مسلم لڑکیاں صاحبِ اولاد ہیں۔ عمرو کی ہندو اولاد نے عمرو کے ساتھ مقدمہ کیا۔ حتیٰ کہ نوبت چیف کورٹ تک پہنچی۔ قانوناً سرکاری یہ ہے کہ مورث کی جدی جائیداد یعنی وارث کے دادا کی جائیداد سے مسلم کافر کا اور کافر مسلم کا وارث ہوسکتا ہے اگرچہ مورث اپنے حین حیات میں اسے محروم کرنے کی وصیت بھی کر جائے۔ یعنی اختلاف دینین موانع ارث نہیں۔

بینوا توجروا

غلام محمد عفی عنہ۔ ضلع ڈیرہ غازی خان
محلہ سگران

الجواب

(۱) مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا۔ کما ھو مصرح فی کتب الفقہ والفرائض۔ اور جب بدونِ استحقاق کافر کے ورثہ لیا تو حلال کیسے ہوگا۔

(۲) کافر اگر اپنی خوشی سے کسی کو دیدے تو حلال ہوجاتا ہے لیکن جب اس پر دباؤ ڈالا تو رضامندی کہاں رہی۔ پس یہ مصالحت معتبر نہیں ہے پس صورتِ جواز یہ ہے کہ ہندو باپ سے صاف صاف کہدے کہ گو قانوناً میں آپ کا وارث ہوسکتا ہوں مگر میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں آپ کا وارث بنوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے جو کچھ دینا چاہیں

اپنی زندگی میں دیدیں۔ اور مجھے وارث نہ بنائیں۔ بلکہ یہ کہدو کہ میں نے اپنے نومسلم بیٹے کو اپنی زندگی میں حصہ دیدیا ہے۔ لہٰذا میرے بعد وارث نہ ہوگا اور ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ یہ دنیا اپنی خوشی پر ہے۔ اگر آپ نہ دیں تو نہ میں قانونی چارہ جوئی کروں گا اور نہ ناخوش ہوں گا

(۳) سے معلوم ہوا کہ خود عمرو ہی کو اس جائیداد میں سے میراث نہیں ملتی تو اس میں وہ تصرف کیسے کرے گا۔ فقط واللہ اعلم

عبدالکریم عفی عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

۱۶ رجادی الاول ۱۳۴۴ھ

صرف عاق لکھ دینے سے وارث محروم نہیں ہوگا اور فاسق بیٹے کو جائیداد سے محروم کرنے کا طریقہ

السوال: علماء دین مسئلہ ذیل میں بموجب حکم اللہ اور اس کے رسول کے کیا فرماتے ہیں۔ سائل اپنی جائیداد ذیل کا مالک ہے۔ دو منزلہ مکانات اور کچھ اسباب خانہ داری ظروف رکھتا ہے ایک مکان خود پیدا کردہ سائل ہے۔ دوسرا مکان جدی جس میں بذریعہ وارث سائل منجملہ پانچ سہام سے دو سہام کا مالک ہوا۔ باقی ماندہ تین سہام اور حصہ داران شرعی سے بیع خرید کرے۔ اب سائل کو کچھ قرضہ بھی ادا کرنا ہے۔ اولاد موجودہ حسب ذیل ہے۔ پسر۔ ایک بیوہ دختر زوجۂ اوّل سے۔ چار پسر منجملہ چھ پسران۔ تین پسران کی شادی ہوچکی ہے۔ تین پسران کا عقد نہیں ہوا ہے۔ ایک پسر سب سے بڑا جس کا نام ...... ہے وہ عرصہ سے خلافِ شرع کے نشہ وغیرہ کرتا ہے۔ اور میری فرمانبرداری نہیں کرتا اور ناشائستہ جو حرام شرع شریف نے کیا ہے وہ نہیں چھوڑتا ہے۔ سائل کو شرعاً اختیار ہے کہ ایسے نافرمان پسر کو جو خلافِ شرع کام کرتا ہے اپنی جائیداد اور مال سے محروم کرسکتا ہے یا نہیں۔ فقط

الراقم

محمد حفیظ خلف شیخ محمد رحیم بخش کرنال

۲۵ رجادی الثانی ۱۳۴۴ھ

الجواب

عاق اور محروم الارث کرنے کا جو دستور ہے مثلاً والد کہہ دیتا ہے کہ میرے فلاں بیٹے کو میرے ترکہ میں سے کچھ حصہ نہ ملے اس کی شرع میں کوئی اصل نہیں۔ اس طرح کہنے کے بعد بھی

وہ وارث ہوگا۔ اگر عاق کر دینے کی وجہ سے دوسرے ورثاء نے اس کا حصہ نہ دیا تو وہ گناہ گار ہوں گے۔ اس لئے محروم الارث کرنا بالکل فضول ہے۔

البتہ اگر اپنے نیک بخت بچوں کی زندگی میں ہبۃً دیدے اور ہبہ تمام شرائط کے ساتھ پورا کر دے پھر اس فاسق کو کوئی حق نہ ہوگا۔ اور اس ہبہ میں کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ بہتر ہے۔

فی العالمگیریۃ: (ص ۱۰۶۴، ۱۰۶۵۔ ج ۳) ، ولوکان ولدہ فاسقاواراد ان یصرف مالہ الی وجوہ الخیر ویحرمہ عن المیراث ھذا خیر من ترکہ کذا فی الخلاصۃ (فتاوی امدادیۃ ص ۱۰۰ ج ۳)

وفی الدر المختار: ولوکان ولدہ مسیئاً دون البعض لزیادۃ اشدہ لاباس بہ ولو کانا سواء یجوز فی القضاء ولکن ھو آثم (مجموعۃ الفتاوی مع خلاصۃ الفتاوی ص ۳۹۳۔ ج ۴)۔ فقط

الجواب صحیح — واللہ اعلم

ظفر احمد غفرلہ — عبدالکریم عفی عنہ

۱۱ شعبان ۴۴ھ

مسئلہ میراث و حکم المیراث من القادیانی وغیرہ

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مسمی کرم علی خان کا انتقال ہوا اور اس نے اپنی وفات پر ایک زوجہ ذی مہر مسماۃ جیمًا اور ایک بھائی حقیقی مسمی فخرن علی خان کو وارث چھوڑا۔ متروکہ کرم علی خان پر جیمًا بعوض اپنے دین مہر پر قابض ہوگئی۔ اور اس کے بعد مسماۃ جیمًا کا انتقال ہوگیا اس نے اپنی وفات پر دو حقیقی بھانجے مسمی الطاف علی خان، یوسف علی خان چھوڑے۔ اور ایک لڑکی نابالغ مسماۃ کنیز اجو جیمًا کے حقیقی بھتیجے کی لڑکی ہے چھوڑی۔ بھتیجے کا نام ابرار خان تھا۔ اور ابرار خان اور اس کے والد عبداللہ خان حیات مسماۃ جیمًا میں فوت ہوگئے۔ فخرن خان زندہ ہیں اور کل متروکہ کرم علی خان کو لینا چاہتے ہیں۔ دریافت طلب امور حسب ذیل ہیں۔

۱: آیا فخرن خان اور حصے میں سے جو مسماۃ جیمًا کو شرعًا بعد وفات کرم علی خان پہنچا۔ کچھ بعد وفات جیمًا کے بمقابلہ الطاف علی خان و یوسف خان پر پاسکتے ہیں یا نہیں؟

۲: اگر مسماۃ جیمًا کل متروکہ کرم علی خان پر بعوض اپنے دین مہر کے قابض تھی، تو یوسف علی خان اور الطاف علی خان متروکہ جیمًا مسماۃ کا بشمول اس کے دین مہر غیر موادی

کے مالک ہیں۔ متروکہ مذکورہ بعض متروکہ کرم علی خان پر تا ادائیگی دین مہر مسماۃ جیماً قابض رہے گی یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

بعد کو معلوم ہوا کہ مسمی کرم علی خان مورثِ اعلیٰ قادیانی تھا۔

الجواب

مسئلہ ۴ ب ۸

کرم علی خان

زوجہ	ام
جیماً	مخزن خان
۱	۳
	۶

مسئلہ ۲ جیماً مو ۱

ابن الاخت	ابن الاخت	بنت ابن الاخ
الطاف علی خان	یوسف علی خان	کنیز
۱	۱	م

بصورتِ مذکورہ سوال بعد ادائے حقوق متقدمہ علی الارث تجہیز وتکفین وادائیگی دین، مہر دین مال متروکہ کے آٹھ سہام میں سے چھ سہام مخزن خان کو اور ایک ایک سہام الطاف علی خان اور یوسف علی خان کو ملے گا۔ کنیز محروم ہے جیماً کے حصے میں سے۔ مخزن خان کچھ نہیں پا سکتے۔ واللہ اعلم

یہ تقسیم اس صورت میں ہے کہ ادائیگی دین مہر وغیرہ کے بعد متروکہ کرم علی خان باقی رہے۔ ورنہ دین مہر میں جیماً کل متروکہ کی مالک ہوگی۔ مخزن خان محروم ہوں گے۔ پھر جیماً کے بعد جائیداد دو سہام پر منقسم ہو کہ ایک ایک سہام الطاف علی خان اور یوسف علی خان کو ملے گا۔ اور وہ بجائے جیماً متروکہ پر قابض ہوں گے۔

سوال ۲: سوال دوم کا جواب صاف نہیں ہے۔ سوال پھر پڑھ لیا جائے۔ اگر مسماۃ جیماً کل متروکہ کرم علی خان پر بعوض اپنے دین مہر کے قابض تھی تو کیا یہ قبضہ بمنزلہ ملکیت ہے جو بعد اس کے الطاف علی خان و یوسف علی خان کو مالک بنائے گا۔

یا یہ صورت ہے کہ قبضہ مذکورہ ملک نہیں بناتا اور صرف ایسے وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک دین مہر ادا نہ ہو اور بعد وفات مسماۃ جیمًا تا ادائیگی دین مہر الطاف علی خان و یوسف علی خان صرف قابض ہی رہ سکتے ہیں۔

از علی خان صاحب محلہ علی پورہ

الجواب

مسماۃ جیمًا اپنے دین مہر متروکہ کرم علی خان صاحب سے وصول کرے گی۔ اگر ترکہ دین مہر فاضل نہ بچے تو جیمًا متروکہ کی بلا شرکت غیر مالک ہو گی۔ اور اس کا قبضہ مالکانہ سمجھا جائے گا پھر مسماۃ کی انتقال کے بعد اس کے متروکہ کے اس کے وارث مالک ہوں گے۔ اور اس پر اس کے ورثاء کا قبضہ بھی جائز ہو گا۔ واللہ اعلم۔

محمد کفایت اللہ مدرس مدرسہ جامع مسجد

شاہ جہاں پور

تنقیح الجواب: جب مسمی کرم علی خان قادیانی تھا تو اس کا بھائی اور اس کی زوجہ متروکہ کرم علی خان میں حق میراث کے مستحق نہیں جبکہ یہ دونوں مسلمان ہیں۔ کیونکہ قادیانی فرقہ مرتد و کافر ہیں۔ اور کافر و مسلم میں توارث جاری نہیں ہو سکتا۔

قال فی السراجیة: فی الموانع: واختلاف الدینین اھ وقال المحشی فلایرث الکافر من المسلم اجماعًا ولا المسلم من الکافر علی قول علی و زید وعامة الصحابة لقوله علیه السلام ولا یتوارث اهل ملتین شتی اھ (ص ۵)

البتہ کرم علی خان کی زوجہ جیمًا اپنے دین مہر کی مستحق ہے۔ کیونکہ دین مہر میراث نہیں بلکہ قرض ہے اور مسلمان کا کافر اور مرتد پر دین ہو تو وہ ردت سے ساقط نہ ہو گا۔ پس اگر مسمی کرم علی خان پر کسی اور کا دین نہیں تھا صرف زوجہ کا دین مہر تھا اور متروکہ دین مہر سے فاضل نہیں تھا تو مسماۃ مذکورہ اس متروکہ پر قبضہ مالکانہ کی مستحق ہے۔

اور سب متروکہ اس کی ملک ہو گیا۔

قال فی الشامیة: عن الطحطاوی: ان الدین تعلق بعین الترکة بعد ما تعلق بذمة المیت اھ (ص ۲۶۰، ج ۵)

البتہ اگر مسمی کرم علی خان قادیانی نہ ہوتا اور اس کا بھائی اس کا وارث ہوتا

تو اس صورت میں بھائی کو یہ حق ہوتا کہ مسماۃ کا دین مہر نقد کی صورت میں ادا کرتا اور جائیداد دین مہر میں نہ دیتا۔ بشرطیکہ وہ اس وقت دین مہر یکمشت ادا کرتا اور تاخیر نہ کرتا اور اگر تاخیر کے ساتھ ادا کرنا چاہتا تو اس صورت میں اس کو تقسیم جائیداد کا بدون رضائے زوجہ کے حق نہ ہوتا بلکہ عورت کو اپنا مہر جائیداد سے وصول کرنے کا حق تھا۔

قال فی الدر: ظهر الدين فی التركة المقسومة تفسخ القسمة الا اذا قضوه ای الدين او ابراء الغرماء الورثة او يبقى منها ای من التركة ما يفی به لزوال المانع الی ان قال لتعلق الدين بالمعنى اه۔ قال الشامی: وهو مالية التركة ولذا كان لهم ان يقضوا الغريم ويستقلوا بها كما مر الخ (ص مذکور)

مگر جب بوجہ ارتداد کے توارث نہیں ہے تو بھائی کا حق جائیداد میں پختہ نہیں۔ بلکہ اب قرض خواہ کا حق عین ترکہ سے متعلق ہوگیا ہے اور مسماۃ جیمًا متروکہ کی اپنے دین مہر کے عوض میں مالک ہوگئی اور مسماۃ جیمًا کے بعد اس کے بھانجے حسب تفصیل مسئلہ ثانی فرائض کے اس متروکہ پر نصفًا نصف مالک ہوگئے اب مسمی کرم علی خان کا بھائی اس سے اس متروکہ کو نہیں لے سکتا۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفرلہ

از تھانہ بھون - ۱۵/ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ

ایک عورت نے مہر معاف کیا جبکہ گواہ موجود نہیں تو عورت کے انتقال کے بعد بحق وراثت عورت کے ورثا مہر کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟	السوال: مندرجہ مسائل میں حکم شرع شریف علماء دین و مفتیانِ عظام کیا فرماتے ہیں؟ ۱: ایک عورت کا مہر بوقت نکاح پانچ

ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت مقرر ہوا تھا۔ جس میں سے اس نے اپنی خوشی اور رغبت سے بغیر کسی دباؤ کے بحالت صحت و ثباتِ عقل خود زبانی اپنے خاوند کو دو ہزار روپے معاف کر دیئے جس پر کوئی گواہ شاہد نہیں۔ کیونکہ سوائے خاوند اور بیوی کے کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا کیا یہ معافی از روئے شرع برقرار رہے گی یا کالعدم ہو جائے گی۔

۲: اس عورت کے خاوند نے مقررہ مہر میں سے دو ہزار کی معافی تصور کر کے بقیہ تین ہزار کی رقم اپنی بیوی کو اس طور پر پوری کر دی کہ علاوہ اُن زیورات کے کہ بوقتِ نکاح بطور ہدیہ دیئے جاتے ہیں۔ زائد ایک ہزار روپیہ کے زیورات ایک ایک دو، دو کر کے بنوا دیئے۔

اور دو ہزار روپیہ نقد بہ ایماء اپنی بیوی کے اس عورت کے بھائی کو بغرض خریداری مکان اس عورت کے لئے دیدیئے۔ بعد میں کیا عورت دعویٰ مہر کر سکتی ہے یا مہر یا اس کی کچھ جزو کی نسبت وصیت کر سکتی ہے یا نہیں؟۔

س۳: وہ عورت اپنی نازک حالت میں قریب ۳۶ گھنٹے قبل اپنی موت کے اپنے بھائیوں کے دباؤ سے بغیر اطلاع دیئے خاوند اور خسر کے حالانکہ وہ اس وقت موجود تھے مگر اس وقت مکان سے باہر تھے۔ یہ وصیت کرتی ہے کہ اس کے مہر کا ایک ثلث بمد خیرات بعد اس کی وفات کے دلایا جاوے۔

کیا اس کی یہ وصیت جبکہ اس کا مہر پورا ہو چکا جائز ہو سکتی ہے اور کیا ایسی حالت کی وصیت جبکہ ہوش و حواس مختل ہو چکے ہیں۔ جائز ہے اور نیز کسی دباؤ سے وصیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

ج۱: یہ معافی عورت پر تو حجت ہے کہ اس کو ان دو ہزار کا پھر لینا جائز نہیں، لیکن جب کوئی گواہ نہیں تو دوسرے ورثار کے سامنے محض شوہر کا دعویٰ ہے جس کو وہ یہ کہہ کر رد کر سکتے ہیں کہ اس دعویٰ پر شاہد پیش کرو۔

ج۲: ہاں اس صورت میں اگر شوہر نے تصریح کر دی تھی کہ یہ سب زیورات اور نقد روپیہ تیرے مہر میں دیا جاتا ہے تو شوہر مہر سے بری الذمہ ہو جائے گا (بشرطیکہ زیورات میں سے کچھ زیور سونے کا بھی ہو۔ ورنہ سوال دوبارہ کیا جائے) یعنی عنداللہ باقی عورت کے ورثار یہاں بھی اس سے شہادت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ کہ شوہر نے یہ زیور جو بعد میں بنانا بیان کیا ہے یہ وہی نہیں جو جہیز میں آیا تھا۔ اور اس نے عورت کے بھائی کو دو ہزار روپیہ مکان بنانے کے لئے دیئے یا نہیں۔ اگر وہ شہادت سے ان امور کو ثابت نہ کر سکے تو ورثہ کو مہر لینے کا حق باقی ہے۔

ج۳: جب شوہر عنداللہ مہر ادا کر چکا ہے تو اس کے ذمہ اس وصیت کا ادا کرنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ۔ ۱۶ر جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ

ابن قاتل قاتل کی موجودگی میں محروم نہیں ہوگا | **السوال:** فرائض میں ہے القاتل محروم عن الارث آیا ابن القاتل باوجود قاتل موجود ہونے کے محروم ہے یا نہیں۔ اسکی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا اب اس مقتول کی ایک زوجہ اور ایک ابن الاخ ہے جو قاتل کا بیٹا ہے اب یہ ابن الاخ کو وراثت ملے گی یا نہیں۔

عرضگذار

محمد عبدالمجید غفرلہٗ۔ دولت خان ہائی اسکول بریسال

الجواب

صورتِ مسئولہ میں زوجہ کو ربع اور ابن الاخ کو مابقی ملے گا کیونکہ قاتل محروم عن الارث ہوکر بحکم عدم ہوگیا اب اس کا بیٹا جو بوجہ قاتل کے محجوب تھا وارث ہوجائے گا۔

قال فی السراجیة فی باب الحجب والمحروم لایحجب عندنا وعند ابن مسعود یحجب حجب النقصان کالکافر والقاتل والرقیق۔ قال المحشی: والفرق بین المحروم والمحجوب ان المحروم لا یکون فیه صلاحیة الارث لکنه حجب عنها بسبب الحاجب والمحروم بفرض کالمیت ولا المحجوب کذالک اھ ص۱۷۔

قلت فکان ابن الاخ محجوبًا بسبب الحاجب وهو ابوہ فلما حرم ابوہ عن المیراث لکونه وصار کالمیت زال الحجب وصار ابن الاخ وارثاً۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنه

۲۲ رجب ۱۳۴۶ھ

استفتاء متعلق فرائض و مال مفقود وغیرہ | **السوال:** دادا صاحب کے پاس جو جائیداد ہے اس کے متعلق بڑے دادا صاحب (دادا صاحب کے بھائی) سے دریافت کیا گیا کہ ترکہ شرعی طور پر کب سے تقسیم نہیں ہوا۔ تو فرمایا کہ ان اطراف میں تو مدت سے رواج لڑکیوں کو حصہ میراث نہ دینے کا ہے مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ ہمارے دادا صاحب تین بھائی تھے جن میں تو ایک صاحب گھر وغیرہ چھوڑ کر مفقود الخبر ہوگئے تھے باقی دو بھائیوں کو ہمارے پردادا کی جائیداد میں سے ترکہ ملا اور ہمارے دادا صاحب کی کوئی بہن نہ تھی بعد وادا صاحب کے اُن کی جائیداد

ہمارے والد صاحب دو بھائی تھے اُن دونوں کو ملی والد صاحب کی بھی کوئی بہن نہ تھی، بعد والد صاحب کے اُن کی جائیداد ہم دو بھائیوں کو ملی۔ اور ہماری تین بہنیں بھی تھیں جن کو حصۂ میراث نہیں دیا گیا۔ لہٰذا صورت مذکورہ بالا میں جو حکمِ شرعی ہو مطلع کیا جائے تاکہ والد صاحب کو اطلاع کردیں۔ دادا صاحب کی تین بہنوں سے دو کا انتقال ہو چکا ہے البتہ اُن کی اولاد موجود ہے اور ایک ابھی زندہ ہے۔

سائل

احقر عبدالجلیل پسر مولوی عنایت اللہ

الجواب

اگر مفقود وقت مفقود ہونے کے کسی چیز کا مالک تھا اور اس کے فقدان کو ابھی اتنی مدت نہیں گزری جس میں اقران مر جائیں تو مفقود کی ملکیت کو اس کے ورثہ میں تقسیم نہ کیا جاوے بلکہ محفوظ رکھا جاوے بشرطیکہ اس کے مفقود ہونے پر سب ورثہ متفق ہوں۔ کوئی مدعی موت کا نہ ہو۔ ورنہ اس دعوٰی کے ثبوت بدلیل شرعی کے بعد اس کا ترکہ حسبِ فرائض تقسیم ہو جائے گا۔ یہ حکم تو مفقود کی ملکیت کا ہے۔

قال فی الدر: لومات عن بنتین و ابن مفقود و للمفقود بنتان و ابناء و الترکۃ فی ید البنتین و الکل مقرون بفقد الدین و اختصموا للقاضی لا ینبغی له ان یحرك المال عن موضعه الی لاینزعه من ید البنتین اھ ج۳ ص۵۱۱۔

پس اگر پردادا کی جائیداد سے مفقود کو حصہ مل چکا تھا مثلاً وہ پردادا کے انتقال کے بعد مفقود ہوا تب تو پردادا کی جائیداد تین سہام پر منقسم ہو کر ایک حصہ مفقود کا محفوظ کیا جاوے اور بقیہ دو حصے دو تہائی میں تقسیم کئے جائیں۔ اور اگر وہ پردادا کی حیات میں ہی مفقود ہو گیا تو اب پھر پردادا کی جائیداد کا یہ وارث نہیں ہے لانه میت فی غیرہ لیکن اس کا حصہ محفوظ رکھنا پھر بھی ضروری ہے حتی یتبین الامر فی الدر ایضاً۔ اس کے بعد پھر دو بھائی بہن ان کو ان کے باپ کا حصہ مساوی دیا جائے۔ اس کے بعد سائل کے بڑے دادا صاحب کا بیان ہے کہ ہم دو بھائی تھے ہم کو والد صاحب کی زمین ملی اور ان دونوں کی تین بہنیں بھی تھیں جن کو حصہ نہیں دیا گیا تو اب سائل کے پردادا کی زمین وغیرہ اس طرح تقسیم کیا جائے کہ:

مسئلہ مورث زید

ابن	ابن	بنت	بنت	بنت
۲	۲	۱	۱	۱

سائل کے پر دادا کی ملکیت کو سات سہام پر تقسیم کیا جائے جس میں سے دو، دو سہام ہر لڑکے کو ملیں گے اور ایک، ایک سہام (حصہ) ہر لڑکی کو۔ جو بہن دادا کی موجود ہے اس کو حصہ اس کا دیا جائے اور جو مر گئی ہے اُس کا حصہ اُن کے ورثاء کو دیدیا جائے۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت نے یہی وارث چھوڑے ہوں یعنی لڑکے اور لڑکیاں۔ اور اگر زوجہ بھی چھوڑی تھی اور ماں بھی۔ تو سوال دوبارہ کیا جائے جبکہ زوجہ اور والدہ کے ورثہ علاوہ اِن لڑکے اور لڑکیوں کے اور بھی کوئی ہوں۔ ورنہ ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۸ رشعبان ۱۳۴۶ھ

مسئلہ فرائض | السوال: ایک شخص کی پہلی شادی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر اس کی بیوی فوت ہو گئی۔ بعد میں دوسری شادی کی اس سے بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اور پھر وہ شخص مر گیا۔ اس کے بعد وہ دوسری بیوی بھی فوت ہو گئی۔ اور اس شخص کی چاروں اولاد علیحدہ علیحدہ ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ اب تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ پہلے بیوی سے جو لڑکا تھا اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور پھر ایک ہفتہ کے بعد اس کا بھی پھر پہلی بیوی کے لڑکے کا اور اس کی کوئی اولاد نہیں، لہذا اُمید ہے بملاحظہ عریضہ ہذا تحریر فرمائیے گا کہ اس آدمی کی چیزوں میں مال وغیرہ کا کون حقدار ہے آیا اس کی حقیقی بہن ہے یا سوتیلے بھائی، بہن ہیں۔ اور اگر بہن ہے تو حصہ کس کس کا ہوتا ہے۔ فقط والسلام

احقر مبارک علی

۱۲/ اپریل ۱۹۲۸ء

الجواب

م ۲ ــــــلہ / ۶

زید جو شخص مذکور کی پہلی بیوی کا لڑکا ہے

اخت لاب وام	اخ لاب	اخت لاب
۱/۳	۲	۱

صورت مسئولہ میں شخص مذکور کی پہلی بیوی کے لڑکے کا ترکہ چھ سہام پر تقسیم ہو کر اس کی حقیقی بہن کو نصف، پھر تین سہام دیئے جائیں۔ اور نصف باقی کو۔ علاوہ بھائی بہن پر للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق تقسیم کیا جاوے کہ علاتی بھائی کو دو سہام دیئے جائیں اور علاتی بہن کو ایک سہام اور یہ تقسیم بعد ادا، حقوقِ متقدمہ علی المیراث کے ہوگی یعنی تجہیز وتکفین واداء دیون (جس میں مہر بھی داخل ہے) اگر ادا یا ابراء نہ ہوا ہو انفاذِ وصیت من الثلث کے بعد اگر وصیت کی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون
۲۴ر شوال ۱۳۴۶ھ

مسئلہ فرائض | السوال ۱؎ : کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حاجی نور محمد نے انتقال کیا اس نے اپنے ورثاء میں ایک زوجہ، ایک لڑکی، ایک علاتی بھائی (مگر علاتی بھائی کو حاجی نور محمد نے اپنی زندگی میں دو مکان دیدیا تھا اور یہ اقرار نامہ لکھوالیا تھا کہ شریعت کے مطابق میں نے تیرا حصہ تجھ کو دیدیا ہے اور اگر تو اب دوبارہ حصہ طلب کرے تو از روئے قانون باطل ہوگا) دو نواسے بنام احمد رضا و محمد (یہ دونوں لڑکے حاجی نور محمد کی اس لڑکی سے ہیں جو اُن کی حیات میں ہی انتقال کر گئی تھی) پانچ نواسے اور چار نواسیاں (یہ نواسے اور نواسیاں حاجی نور محمد صاحب کی اس بیٹی سے ہیں جو فی الحال زندہ ہے) شرعًا ان لوگوں کا کیا حصہ بنتا ہے۔

(۲) اور حاجی نور محمد کی طرف آٹھ سو روپیہ قرض بھی ہے کیا قرض ادا کرنے

کے بعد حصہ تقسیم ہوگا یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی

عبدالسلام محلہ اسلام پورہ شہر مالیگاؤں

الجواب

قال فی الشرح السیر الکبیر ان المریض متی اعطی عینا لبعض ورثته لیکون وذلک حصته من المیراث او اوصی بان یدفع ذلک الیه بحصته من المیراث ان ذلک باطل لا یجوز البتته اھ ص۴۲۰ ج ۴۔

مسئلہ ۸ — مرحوم نور محمد

زوجہ	بنت	اخ علاتی
۱	۴	۳

صورت مسئولہ میں حاجی نور محمد کے ترکہ میں سے اول تجہیز وتکفین کا خرچ نکالا جاوے اس کے بعد دَین کو ادا کیا جائے اگر اس کے ذمہ ہو جسمیں زوجہ کا دین مہر بھی داخل ہے اگر اس نے وصول یا معاف نہ کیا ہو۔ اس کے ثلثین سے وصیت کو نافذ کیا جاوے۔ اگر اس نے اللہ واسطے کچھ وصیت کی ہو۔ اس کے بعد کل ترکہ کے آٹھ/۸ حصے کر کے بیوی کو ایک حصہ، بیٹی کو چار حصے اور علاتی بھائی کو تین حصے دیئے جائیں۔ اور حاجی نور محمد نے جو اپنے علاتی بھائی کو اپنی زندگی میں دو مکان دیئے ہیں اور یہ اقرار نامہ لکھوایا تھا کہ شریعت کے مطابق میں نے تیرا حصہ تجھ کو دیدیا الخ۔ اس اقرار نامے کے لکھنے سے علاتی بھائی کا حق میراث باطل نہیں ہوا۔ اس کا ایسا لکھوانا لغو ہے بلکہ وہ بدستور وارث شرعی ہے۔ اور وہ مکان جو نور محمد کی حیات میں اس کو مل چکے ہیں وہ بھی ترکہ میں شمار ہوں گے۔ وہ خالص علاتی بھائی کا حق نہیں بلکہ سب ورثہ کا حق ہے جو موافق سہام مذکورہ کے تقسیم کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

اور نواسے اور نواسی سب محروم ہیں کیونکہ ذو الفروض وعصبات کے سامنے ذوالارحام کو میراث نہیں مل سکتی۔ فقط

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ از تھانہ بھون ۲۲ ذی قعدہ ۴۶ھ

حکم کسب حرام برائے ورثہ | **السوال:** بعد از سلام مسنون معروض یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک سود خور نے انتقال کیا ہے اس کے وارث بھی ہیں بعض ان میں سے بالغ ہیں اور بعض اُن میں نابالغ۔ بالغوں کو خبر ہے کہ باپ سود خور تھا اور یہ بھی واضح ہے کہ اکثر مال سود کا ہے۔ اب بعض مولوی فتویٰ دیتے ہیں کہ وارثان کے یہ مال حلال ہے کیونکہ اولاً تبدیل ملک ہے ثانیاً خود بخود مالک ہوا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حلال نہیں کیونکہ تبدلِ مِلک سے تبدل عین جو ہوتا ہے اگر فی نفسہ حلال ہو مثلاً صدقہ اور اس میں چونکہ سود کا مال حلال نہیں لہٰذا یہ حلال نہیں اب جناب والا سے یہ مدعا ہے کہ جناب والا جو فرمادیں بر آں خاطر جمع کردں۔

عبد القادر۔ نواکھالی سوناپور

الجواب

جب ورثہ زید کو معلوم ہے کہ اُن کا مورث سود خور تھا اور غالب کسب سود کا ہے تو اُن کو واجب ہے کہ اس ترکہ میں سے اوّلاً اُن لوگوں کا روپیہ واپس کریں جن سے زید نے سود لیا ہے اگر وہ لوگ معلوم ہوں اور سود کا مال حلال سے مخلوط نہ ہو۔ اور اگر سود کا مال مخلوط ہے تو خلط استہلاک ہے اس لئے یہ سب روپیہ زید کی ملک ہوگیا ہے اور جس نے سود لیا ہے ان کا حق زید کے ذمّہ رہا ورثاء کو یہ ترکہ مخلوط بالحرام باہم تقسیم کرلینا جائز ہے لیکن بعد تقسیم کے بطور ورع کے لازم ہے کہ اگر وہ لوگ معلوم ہوں جن سے سود لیا ہے تو ورثہ بالغین اپنے اپنے حصّہ میں سے ان کا روپیہ ان کو واپس کریں۔ اگر وہ لوگ معلوم نہوں تو ان کی نیت سے فقراء پر اس مال کا تصدق کریں اور جو وارث خود فقیر ہو وہ اپنے نابالغ بیٹے یا بیوی پر تصدق کرکے بھی اس سے بری ہوسکتا ہے بشرطیکہ بیوی اور بیٹا فقیر ہو اور جو ورثاء نابالغ ہیں ان کے حصّہ میں سے نہ اُن لوگوں کو ابھی دیا جاوے جن سے مورث نے سود لیا تھا اور نہ تصدق کیا جاوے۔ بلکہ یہ نابالغ بعد بلوغ کے خود اُن لوگوں کا روپیہ واپس کریں یا صدقہ کریں کیونکہ یہ روپیہ اور صدقہ تورع ہے فتویٰ سے لازم نہیں۔

قال فی الهندية: وان كان كسبه من حيث لايحل وابنه يعلم ذلك ومات الاب ولا يعلم الدين ذلك بعينه فهو حلال له فی الشرع والورع ان يتصدق به بنية الخصماء كذا فی الينابيع اهـ۔

وفيه ايضًا: قبله واذا مات الرجل وكسبه خبيث فالاولىٰ لورثته ان يرد

و المال الیٰ اربابھا فان لم یوفوا اربابھا تصدقوا بھا اھ۔ قلت وھٰذا کلہ اذا کان کسبہ الحرام مخلوطا بالحلال حیث لا یعرف الحرام بعینہ ولذا قال فالاولیٰ الخ و ان کا معلوما بعینہ فالرد واجب کما لا یخفی و دلیلہ قولہ ولا یعلم الا بن ذلک لعینہ اھ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۸ محرم الحرام ۱۳۴۷ھ

مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے یا نہیں

السوال ۱: زید ایک ہندو خاندان سے مسلمان ہوا ہے۔ چونکہ زید اپنے ہندو باپ کی میراث سے شرعاً وارث نہیں ہوسکتا لیکن قانوناً بناء بر جائیداد جدی ہونے کے وارث ہوسکتا ہے۔ تو وہ اپنے باپ کی جائیداد سے قانوناً اپنا حصہ لیکر کسی مدرسہ اسلامی یا کسی اور اسلامی کام میں تصدق کر دے یا رفاہِ عام کے کاموں مثلاً ضرورت کے مقاموں پر کنواں نکلوا دے تو کیا وہ مثاب ہوگا۔ جبکہ اس کے باقی شرکاء یعنی جائیداد سے حصہ لینے والے آریہ جو کہ سخت ترین اعداء دین ہیں۔

الجواب

زید کو اپنے باپ کی جائیداد سے حصۂ میراث لینا جائز نہیں بلکہ اس جائیداد کو مورث کے کافر ورثہ پر رد کرنا لازم ہے اور بدون اس کے زید بھی اس میں تصرف کرنے سے گنہگار ہے۔ اور جو مدرسہ و مسجد والے اس واقعہ کو جانتے ہوئے اس جائیداد کی رقم لیں، وہ بھی گناہ گار ہیں۔

السوال ۲: عمرو اپنے ہندو باپ کے حین حیات میں مسلمان ہوا۔ اس کے ہندو باپ نے اس اپنے بیٹے عمرو کی شادی مسلمانوں میں اپنے خرچ سے کرائی۔ عمرو حج کو تیار ہوا تو اس کو زادِ راہ دیا۔ علاقہ کے ایک مسلمان رئیس کے کہنے پر اپنی جائیداد کا چوتھا حصہ (کیونکہ اس ہندو باپ کے چار بیٹے تھے) اپنے بیٹے عمرو کو ایک دستاویز لکھ کر دیا کہ میرے بعد ¼ حصہ کا یہ وارث ہوگا۔ کچھ عرصہ بعد عمرو کا دوسرا بھائی بکر بھی بمعہ ایک بیوی و بال بچوں سمیت مسلمان ہوگیا۔ اُسے بھی نان نفقہ اس کا اور اس کے اہل و عیال کا خرچ دیتا رہا بلکہ سواری کے لئے گھوڑے اور دودھ کے لئے گائے بکری بمع گھاس چارہ کے دیتا رہا لیکن اپنے پاس بیٹے بکر کو جائیداد وغیرہ سے ¼ حصہ نہ لکھ کر دیا۔ کیونکہ کسی مسلمان رئیس نے

اس کے لئے اُسے نہ کہا۔ ہندو باپ کے مرنے کے بعد عمرو، بکر کے دو ہندو بھائیوں نے اور بکر کے دو ہندو بیٹوں نے (کیونکہ بکر کی دو ہندو بیویاں تھیں اور دونوں صاحب اولاد تھیں جن میں سے ایک تو بمعہ بال بچوں کے بکر کے ساتھ مسلمان ہوگئی اور دوسری بال بچوں سمیت بدستور ہندو رہی) مقدمہ دائر کیا کہ عمرو و بکر کو جائیداد نہ ملنی چاہیئے۔ کیونکہ انہوں نے مذہب تبدیل کیا ہے۔ لیکن ہندوؤں کا دعویٰ خارج ہوا۔ اور جائیداد نومسلموں کو مل گئی۔ ہندو بھائیوں نے اور بیٹوں نے چیف کورٹ میں اپیل دائر کی۔ تو پھر بھی خارج ہوئے۔ اب وہ دونوں نومسلم عمرو و بکر اپنی جائیداد پر قابض ہیں لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ:

سا: ان دونوں نومسلموں کا اس طرح سے حاصل کردہ مال مشتبہ تو نہیں ہے؟ جبکہ وہ شرعاً اپنے ہندو باپ کی وفات کے بعد وارث نہیں ہو سکتے تھے اس بناء پر کہ اختلاف دین مانع ارث ہے۔

سٹ: بکر کی اس وقت میں تین بیویاں ہیں۔ دو مسلمان بیویاں اور ایک ہندو بیوی۔ تینوں صاحبِ اولاد ہیں۔ چونکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا لہٰذا کیا بکر پر یہ امر واجب نہیں کہ وہ اپنے ہندو ورثاء آریہ کو جو کہ قانوناً وارث ہوسکتے ہیں بناء بر جائیداد جدی کے کس طرح محروم کرے۔

الجواب

سا: مشتبہ کا معنی یہ مال حرام ہے لکونہ مغصوباً۔

سٹ: جب یہ جائیداد وہی ہے جو بکر نے اپنے ہندو باپ کے ترکہ سے حاصل کی ہے تو اس کا ہندو ورثہ پر واپس کرنا بکر کے ذمہ لازم ہے اور اس جائیداد سے وہ ہندو ورثہ کو محروم نہیں کرسکتا۔ ہاں جو جائیداد بکر کی خود حاصل کردہ ہے اس سے ہندو ورثہ کا حق قانونی منقطع کر دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

تتمّہ

یہ فتویٰ احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے اول لکھا پھر حضرت حکیم الامت کو دیکھایا، تو حضرت نے فرمایا کہ ہندوستان میں بحالتِ موجودہ مسلمان کو کافر کی میراث لینا جائز ہے لہٰذا میں اپنے فتویٰ سابقہ سے رجوع کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ صورتِ مسئولہ میں زید کو اپنے ہندو باپ کی جائیداد سے حصہ میراث لینا جائز ہے۔ اور اس میں کچھ شبہ بھی نہیں جس کی وجہ سے

زید کے ذمہ نہ ذیا تصدق واجب ہو بلکہ وہ اس حصۂ میراث کو اپنے تصرف میں بلا تکلف لاسکتا ہے اسی طرح عمرو وبکر کو اپنے ہندو باپ کی جائیداد سے حصہ لینا جائز ہے اور وہ اس میں بلا تکلف تصرف مالکانہ کر سکتے ہیں اور ان کا اس طرح کا حاصل کردہ مال مشتبہ نہیں۔

والدلیل ما فی الشریفیۃ: والثالث اختلاف الدینین فلا یرث الکافر من مسلم اجماعًا ولا المسلم من الکافر علی قول علیؓ وزید وعامۃ الصحابۃ والیہ ذہب علماءنا والشافعی لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یتوارث اھل ملتین شتی (اخرجہ الدارمی وابوداؤد والشافعی وسندہ صحیح) والقیاس ان یرث لقولہ علیہ السلام یعلو ولا یعلی والیہ ذھب معاذ بن جبل ومعاویۃ بن ابی سفیان والحسن ومحمد بن الحنفیۃ ومحمد بن علی بن الحسین ومسروق رحمھم اللہ اھ۔ ص، ۱۴۔

قلت روی الشافعی ذلک عن اکثر ھؤلاء المذکورین فی الام تعلیقًا ونقلہ حجۃ فان قیل ھؤلاء کلھم مقدمون علی الائمۃ الاربعۃ المقتدی باقوالھم والاربعۃ کلھم متفقون علی عدم ارث المسلم من الکافر ولم نعلم احدًا خالفھم من معاصریھم ومن بعدھم والاجماع اللاحق یرفع الخلاف السابق قلنا کلام الامام الشافعی فی الام مشعر بخلاف بعض اھل عصرہ فی المسئلۃ واخذہ بقول معاویۃ وعلی ومعاذ بن جبل رضی اللہ عنھم وان سلمنا عدم الخلاف فیما بعدھم فنقول لیس مدار الافتاء علی ذلک بل یجوز للمسلم ان یرث من الکافر بسبب استیلاء الحکومۃ الکافرۃ علی مال الکافر اولا ثم دفعھا إلی المسلم بقانونھا واستیلاء الکافر سبب للملک عندنا واللہ اعلم۔ اویقال استولی المسلم علی مال الکافرۃ بقوۃ سلطان اھل الحرب وصار تملکًا لہ بالاستیلاء ودلیل التملک بقوۃ سلطان اھل الحرب ما ذکر فی شرح السیر اھ۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ صفر ۱۳۴۷ھ

مورث کے انتقال کے وقت کسی وارث کے زندہ ہونے میں شک ہوتو وراثت کی تقسیم کس طور پر کی جاوے گی۔

السوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ امیرن کے صرف ایک شوہر اور دو بھائی تھے شوہر اور ایک بھائی کا وقت وفات زندہ ہونا متحقق ہے۔ دوسرے بھائی کے زندہ ہونے میں شک ہے تقسیم ترکہ کس طور پر ہوگی۔

الجواب

صورتِ مسئولہ میں مسماۃ امیرن کا ترکہ دو سہام پر تقسیم ہوگا۔ ایک سہم یعنی نصف شوہر کو دیا جائے اور دوسرا سہم اس کے بھائی کو دیا جائے جس کا زندہ ہونا بوقت وفات امیرن کے متحقق ہے اور جس بھائی کے زندہ ہونے میں اس وقت شک ہے اس کو اس میں سے کچھ نہ ملے گا۔ اور نہ امیرن کو اس کے ترکہ سے دیا جائے۔ اور یہ جواب اس وقت ہے جب کہ اس کے زندہ ہونے میں شک ہی ہو۔ جیسا کہ سوال میں ہے۔ اور اگر غالب گمان زندہ ہونے کا ہو مرنے میں شک ہو تو سوال دوبارہ کیا جاوے۔

قال في السراجية: اذا ماتت جماعة ولا ادرى ايهم مات اولا جعلوا كانهم ماتوا معاً فمال كل واحد منهم لورثته الاحياء ولا يرث بعضهم من بعض هذا هو المختار وقال علىؓ وابن مسعود يرث بعضهم من بعض إلا فيما ورث كل واحد منهما من صاحبه اهـ۔

قال المحشي: والوجه في ذلك اى في قول ابن مسعودؓ وعلىؓ ان شرط استحقاق كل واحد منهما ميراث صاحبه هو حيوته بعد موت صاحبه وقد عرف حيوته يقيناً فيجب التملك به وسبب الحرمان موته قبله او معه وذلك مشكوك فيه ولا يثبت الحرمان بالشك وهذا الذى ذكر من ان اليقين لا يزول بالشك اصل كبير في الفقه ونحن نقول ان الشرط المذكور غير معلوم يقيناً ومالم يتيقن به لا يثبت الاستحقاق اذ لا توريث بالشك، وتفصيله ان الشرط ههنا بقاؤه حيا بعد موت مورثه وانما علم ذلك بطريق الظاهر و استصحاب الحال دون اليقين فان الظاهر بقاء ما كان على ما كان عليه وهذا البقاء لا لعدام الدليل المزيل لا لوجود الدليل المبقى فيعتبر به فى ابقاء ما كان لا فى اثبات مالم يكن كحيوة المفقود تجعل ثابتة فى نفى التوريث

عنه لا فی استحقاق المیراث من مورثه - واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الاوّل ۱۳۴۷ھ

تحقیق مسئلہ عصبات | **السوال :-** امداد الفتاویٰ ج ۳، ص ۱۱۸، اور ص ۱۱۹ میں ایک معترض کا اعتراض لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی میت کے عصبہ نہ ہوں تب اس کے ذوالارحام ترکہ پا سکتے ہیں حالانکہ دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہوگا کہ اس کے کسی درجہ کے کسی جد اعلیٰ کی کوئی اولاد موجود نہ ہو جسے باصطلاح شرع عصبہ کہا جاوے۔ تو لازم آیا کہ ذوی الارحام کا حصہ کسی وقت بھی مقصود نہیں اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد ہوا اسکے حاصل اور جواب کا اصل مدار اس پر ہے کہ حسبِ تصریح علماء معلوم ہوا کہ عصبات کی تعمیم اتنی نہیں ہے جتنا کہ معترض نے سمجھا ہے بلکہ سلسلۂ اعمام، عم الجد تک چل کر ختم ہو جاتا ہے اور عم الجد کے اولاد ذکور تو عصبات بن سکتے نہیں اس کے اوپر کسی عم یا اس کی اولاد ذکور کا مرتبہ عصبہ ہونے کا نہیں ہے۔ مثلاً عم اب الجد وابنہ وان سفل کو عصبہ نہیں کہیں گے۔ یہ خاکسار عرض کرتا ہے کہ امداد الفتاویٰ میں یہ مسئلہ دیکھ کر شامی و عالمگیری، مبسوط امام سرخسی، مجمع الانہر وغیرہ دیکھ کر تو واقعی عم الجد کے اور سلسلۂ اعمام کو کوئی نہیں بڑھاتا مگر فتاویٰ بزازیہ[ع] میں مصرح لکھا ہے کہ سلسلۂ اعمام عم الجد کے اوپر بھی ممتد ہو سکتا ہے۔

جب بزازیہ میں یہ تصریح ملی تو پھر تردد بڑھا کہ آخر معترض کے اعتراض مذکور کا جواب بھی کچھ ہونا چاہیئے۔ کتب مذکورہ میں جہاں تک دیکھا جواب کا کوئی سامان نہ ملا مگر بزازیہ[س] ہی میں موانع ارث کے تحت میں ملا کہ جہالت وارث مانع ارث ہے اور جہالت کی چند صورتیں لکھی ہیں۔ اب اعتراض کا جواب یوں سمجھ میں آتا ہے کہ بے شک دنیا میں ہر میت کے عصبہ کا موجود ہونا تو ممکن ہے مگر وہ مجہول ہے یعنی وہ سلسلۂ نسب کو ثابت نہیں کر سکتا ہے۔ ہاں اگر سلسلۂ نسب کو ثابت کر دے کہ وہ میت سے فلاں پشت میں ملتا ہے تو پھر وہ

ع فتاویٰ بزازیہ کی اسی عبارت کو دیکھ کر امداد الفتاویٰ کے جواب سابق سے رجوع کر لیا گیا تھا جو ترجیح الراجح میں شائع ہو چکا ہے ۱۲ منہ۔

س ان موانع خمسہ کو تو شامی نے بھی ذکر کیا ہے اور در مختار میں ان کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ۱۲ ظفر۔

بلا تکلف وارث ہے اور اگر ثابت نہ کر سکے تو محض اس لئے کہ وہ شیخ ہے یا سید ہے یا صدیقی ہے یا عثمانی ہے مستحق ارث نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے تو سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ جبتک کہ ترتیب وار سلسلۂ نسب معلوم نہ ہو تو کوئی حاجب اور کوئی محجوب معلوم نہ ہو سکے گا اور اس سبب سے اقرب اور احق عصبات مجہول رہے گا پس مستحق ارث نہ ہو سکے گا۔ جب وہ وارث نہ ہو سکا تو اب ذوی الارحام وارث بنیں گے۔ خدام بارگاہِ عالی کو تکلیف دیتا ہوں کہ ارشاد ہو کہ اعمام کی تعمیم مصرح مان لینے کی تقدیر پر اعتراض کا جواب یہ درست ہوا کہ نہیں بزازیہ کی عبارت ہوتے ہوئے اعمام کی تعمیم نہ ماننے کی کوئی وجہ ہو تو وہ بھی ارشاد ہو۔ بزازیہ کی عبارت تعمیم اعمام کی نسبت اور جہالت وارث کے مانع ارث ہونے کی نسبت علی الترتیب درج ہے:۔

(الثانی فی عصبات المحضة) اقربهم الابن ثم ابن الابن و ان سفل ثم الاب ثم الجد و ان علا علی اختلاف قد مضی ثم الاخ لاب و ام ثم الاخ لاب ثم ابن الاخ لاب و ام ثم ابن الاخ لاب وکذا بنوهما و ان سفلوا ثم عم الاب لاب و ام ثم عم الاب لاب ثم ابن عم الاب لاب و ام ثم ابن عم الاب لاب وکذا بنوهما و ان سفلوا و هکذا عمومة الجد و ان علوا و اولادهم الذکران و ان سفلوا فتاوی بزازیة ج ۳ برحاشیه عالمگیری مصری ج ۶، ص ۴۰۶۔

وفی الفصل الخامس فی موانع الارث من الفتاوی البزازیة المطبوعة المصرح ۳ ۔علی هامش الفتاوی العالمگیریة ج ۶، ص ۴۷۴۔

و منها جهالة الوارث و ذلك فی خمس مسائل او اکثر احدها رجل وضع ولده فی فناء المسجد لیلا ثم ندم صباحا ثم رجع لیرفعه ما ذا فیه ولدان ولا یعرف ولده من غیره و مات قبل الظهور لا یرث واحد منهما و یوضع ماله فی بیت المال و نفقتهما علی بیت المال ولا یرث احدهما من صاحبه و ثانیهما ارضعت صبیاً مع ولدها و ماتت ولا یعلم ولدها من غیره لا یرثها واحد منهما ولا من صاحبه۔

و ثالثها حرة و امة ولدت کل واحد ولداً فی بیت مظلم ولا یعرف ولد الحرة من ولد الامة لا یرث واحد منهما یسعی کل واحد منهما فی نصف قیمته

المولی الامة۔

ورابعها: استاجر نصرانی ومسلم ظئرا واحدًا لولديهما فكبر لا يعرف ولد النصرانی من ولد المسلم فالولدان مسلمان لا يرثان من ابويهما ولاكل من صاحبه۔

وخامسها: رجل له ابن من حرة وابن من امة لانسان ارضعتهما ظئرحتی كبر ولا يعرف ولد الحرة من ولد الامة فهما حران ويسعی كل واحد منهما فی نصف قيمته لمولی الامة ولا يرثان زيادة حد ادب۔

بندهٔ نیازمند

۲۸/۱۰/۱۲ھ نذیرالدین غفرلہ

الجواب

قلت اخرج الطحاوی فی مشكله حدثنا فهد بن سليمان حدثنا ابو غنان مالك بن اسمٰعيل النقدی قال حدثنا موسٰی بن محمد الانصاری قال انا جبرائيل بن احمد عن عبد الله بن بريدة عن ابيه قال جاء الی النبی صلی الله عليه وسلم رجل فقال عندی ميراث رجل من الازد ولا اجد ازديا ادفعه اليه قال تربص به حولاً قال ففعل ثم اتاه فقال اذهب فادفعه الی اكبر خزاعة قال الطحاوی ومعنی اكبر خزاعة عندنا والله اعلم اكبرها فی النسب منه قالو الولاء للكبير قال ابوجعفر فتاملنا هذا الحديث فوجدنا ما امر به رسول الله صلی الله عليه وسلم فيه من ابتغاء ازدی حولا قد امر فی ذلك كمثل ما امر به فی اللقطة فی ابتغاء صاحبها حولا ثم تصرف فيما يجب صرفها فيه بعد الحول ومن رد ذلك الميراث ان لم يجده حتی يمضی الحول الی الاكبر من خزاعة لانهم الازد قال ومعنی قول السائل لم اجد ازديا ای ازديا مسلما وكان ذلك قبل اسلام قبائل الازد والنبی صلی الله عليه وسلم بمكة وكان اسلام خزاعة والنبی صلی الله عليه وسلم بها وفی ذلك ما قد دل ان ذلك المتوفی كان ممن قد اسلم فرد رسول الله صلی الله عليه وسلم ميراثه الی الاقرب من مسلمی خزاعة قال الطحاوی ورواه شريك عن جبرئيل بن احمد بلفظ الی النبی

صلى الله عليه وسلم بميراث رجل من خزاعة فقال اطلبوا له وارثا فلم يجدوا
فقال اطلبوا له ذا رحم فطلبوا فلم يجدوا فقال ادفعوه الى اكبر خزاعة فقال
وما رواه سوى شريك اولى عندنا مما رواه شريك لعددهم ولان ثلثة اولى
بالحفظ من واحد ولاستحالة بعض ما فى حديث شريك مما ذكر فيه من قول
النبى صلى الله عليه وسلم اطلبوا له ذا رحم وهذا لا يجوز فى العرب لان العرب
لا تورث بالارحام وانما تورث بالعصبات الاحيث ورث الله تعالى ذوى الفرائض
المسماة منهم لانه اذلم توجد عصباتهم من افخاذهم وجدت من الافخاذ
التى تتلوا افخاذهم كما يعقل فى عقول جناياتهم افخاذهم الذين يحملون
اروش الجنايات فان قصر عددهم عن احتمال اروشها او ذلك الى من يلونهم
من الافخاذ وانما يكون التوارث بالارحام المخالفة لما ذكرنا فى غير العرب من
العجم الذين لا يرجعون الى شعوب وقبائل وانما يرجعون الى بلدان لا الى
ما سواها كما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم مما قد حمله من رواه من
اصحابه من ذلك ثم سرد الآثار فى تفسير قول الله عزوجل وجعلناكم شعوبا
وقبائل لتعارفوا ثم قال فالعرب ترجع الى شعوب والى القبائل والى الافخاذ
وبها يتوارثون والعجم لا ترجع إلى ذلك وانما يجمعهم بلدانهم لا ما سواها
وكذلك كان ابو يوسفؒ يقول فى التوارث بالارحام التى ليست عصبات انما يكون
فى العجم لا فى العرب فاستحال بذلك ما فى حديث شريك مما اضافه الى
النبى صلى الله عليه وسلم من طلب ذى الرحم ليدفع اليه ميراث الاسلامى
الذى نسبه شريك إلى خزاعة والله سبحانه وتعالى اعلم اھ ج ۳، ص ۱۴۶ تا ۱۵۰۔

اس کلام سے چند امور مستفاد ہوئے۔

① توارث بالارحام غالباً عرب میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان میں قبائل و شعوب و
افخاذ عادۃً موجود ہوتے ہیں پس اہلِ عرب میں عصبات مفقود نہیں ہوسکتے الّا نادراً۔

② جس شخص کا عصبہ اس کے خاندان قریب میں موجود نہ ہو اس کے عصبہ کی تلاش
سال بھر تک کرنی چاہیئے تقسیم ترکہ میں عجلت نہ کی جاوے۔

③ اگر سال بھر تلاش و انتظار کے بعد بھی خاندانِ قریب میں کوئی عصبہ نہ

ملے تو اس کے خاندان کی دوسری شاخ میں جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہوگا اس کو اور اسکے شقیق کو اس کا ترکہ دیدیا جائے کیونکہ جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہوگا وہ ظاہراً ان پر چھوٹوں کی نسبت سے اقرب الی المیت ہوگا۔ والاصغرون ابناء الاعمام والاکبر بمنزلۃ العم مثلاً الا ان یثبت خلافہ۔

(۴) عجم میں جو قبائلِ عرب موجود ہیں ان میں جن کا سید اور صدیقی و فاروقی و عثمانی و علوی وغیرہ سے ہونا متواتر ہے اُن کا بھی وہی حکم ہے جو اہلِ عرب کا ہے۔ لاشتراک العلۃ وھی رجوعھم الی قبائل وشعوب وافخاذ۔

(۵) پس ان خاندانوں میں اگر کسی کا عصبہ قریب موجود نہ ہو تو اس صورت کو جہالت وارث میں داخل کر کے ذوی الارحام کو وارث نہیں کر سکتے کیونکہ جب عصبات کا وجود متیقن ہے اور ترجیح کی صورت بھی حدیث سے معلوم ہے تو پھر جہالت کہاں رہی۔ فقہاء نے جو صورتیں جہالت وارث کی بیان کی ہیں اُن سب کا مرجع اس طرف ہے کہ ترجیح کی کوئی صورت موجود نہ ہو اور صورتِ مسئولہ میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ مثلاً ایک شخص فاروقی ہے اور اس کا عصبہ موجود نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ اس شہر میں خاندان فاروقی کے بہت آدمی ہیں پس اول تو شجرات سے (اور یہ درجہ تائید میں ہیں) اور لوگوں کی روایات سے (اور یہ درجہ دلیل میں ہوں گے جب رواۃ رواۃ میں تواتر ہو یا عدالت وعدد و مشاہدہ منذ اسس صفت کی ہو) تحقیق کرنا لازم ہے کہ میت سے ساتھ زیادہ قرب کس کو ہے اور مدت معلومہ تک اس کی تحقیق کرنی چاہیئے اگر کوئی اقرب معلوم ہو جائے فبہا ورنہ اس شخص کے شہر میں جتنے فاروقی ہیں ان میں جو عمر میں سب سے بڑا ہو اس کو اور جو اس کا شقیق ہو گو عمر میں کم ہو اس کو ترکہ دے دیا جائے۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ اس شہر کے فاروقی دوسرے شہروں کے فاروقیوں سے اقرب الی المیت ہے۔ اور جو ان میں سب سے بڑا ہے وہ چھوٹوں کے لئے حاجب ہے۔ کما قال الطحاوی وھو مذکور فی الحدیث۔ ایضاً واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۳ جمادی الاول ۴۷ھ

مورث کے انتقال کے بعد اگر کوئی وارث مرتد ہو جائے تو اس کو ترکہ مورث سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل

ذیل میں کہ ایک مسلمان بھائی گزر گیا۔ اور اس مرحوم کے تین لڑکے لڑکیاں نابالغ موجود ہیں اور عورت بھی مسلمان تھی اور زندہ ہے۔ مگر اب وہ عورت برہما مشرک قوم میں چلی گئی ہے اور اب وہ عورت شوہر کے حصۂ ترکہ کی خواستگار ہے حصہ ملنا چاہئے یا نہیں۔ عورت مذکورہ کو لوگ آمادہ کرتے ہیں کہ عدالت میں عورت دعوی کرے کہ اُسے حصۂ شوہر سے ملے۔ تو کیا اُسے ترکہ ملے گا۔ اور شرعی حکم اس بارے میں کیا ہے؟

مستفتی

بندہ جمال الدین

الجواب

قال فی الدر: ویبطل منه اتفاقا ما یعتمد الملة وهی خمس النکاح و الذبح والصید والشهادة والارث اھ

قال الشامی: فلا یرث احداً ولا یرثه احد مما اکتسبه فی ردته بخلاف کسب اسلامه فانه یرثه ورثته (ای لان ارتداد المسلم کموته فکانه مات المورث المسلم فیرثه وارثه المسلم فی کسب اسلامه)۔ (ج ۳، ص ۴۶۶)

وفی البدائع: واما المرتدة فلا یزول ملکها عن امورلها بلا خلاف فیجوز تصرفاتها فی مالها بالاجماع لانها لاتقتل فلم تکن ردتها سببا لزوال ملکها عن امورلها بلا خلاف اھ ج ۷، ص ۱۳۷۔

واما حکم المیراث فنقول لا خلاف بین اصحابنا رضی الله عنهم فی المال الذی اکتسبه فی حالة الاسلام یکون میراثا لورثته المسلمین اذا مات اوقتل اولحق وقضی باللحاق وقال الشافعی وهو فئ الی ان قال وعلی هذا الاختلاف المرتدة اذا لحقت بدار الحرب لان المعنی لایوجب الفصل اھ

(ج ۳، ص ۱۳۹)

قلت واما ما قاله الفقهاء ان المرتد لا یرث احداً فمعناه اذا کان مرتدا وقت موت مورثه واما اذا کان مسلمًا وقت موته فیرثه وان ارتد بعد موته لان المانع لم یوجد وقت الارث۔

صورتِ مسئولہ میں یہ عورت اپنے شوہر سے میراث کا حق پانے کی مستحق ہے کیونکہ

اس کی موت کے وقت یہ مسلمان تھی اور عورت کی ملک ارتداد سے زائل نہیں ہوتی۔ لہذا اس کا حقِ میراث اس کی ملک میں باقی ہے اسی طرح اگر اس نے دینِ مہر وصول و معاف نہیں کیا تو وہ دینِ مہر کی بھی مستحق ہے۔

قلت واما علة اللحاق فلم توجد لانها ما انتقلت من دار الاسلام إلى دار الحرب بل هی مسلمة فی دار الحرب قد ارتدت فیها واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر

ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون

۲ رجادی الثانی ۱۳۴۷ھ

امانت کی رقم سب ورثاء میں حسبِ سہام تقسیم کرنا ضروری ہے یا کسی ایک وارث کو دینا بھی درست ہے اور اسکے متعلق مزید چند سوالات کے جوابات

السوال: (۱) زید نے وفات پائی اس کا روپیہ بکر کے پاس امانت تھا۔ اور زید نے ایک بیوی۔ ایک نابالغ لڑکا ایک نابالغہ لڑکی۔ اور باپ کو وارث چھوڑا ہے۔ اب زید کا باپ چاہتا ہے کہ بکر کے پاس جو روپیہ امانت ہے ہم کو ملے اور زید کی بیوی چاہتی ہے کہ ہم کو ملے اس صورت میں مطابق حصہ شرعی فرائض ہر ایک کو دیدیا جائے یا کیا حکم ہے؟۔

(۲) بر تقدیر تقسیم مطابق حصہ شرعی زید کے نابالغ لڑکے اور لڑکی کا حصہ ماں کو دیا جاوے یا باپ کو۔

(۳) زید مرحوم کا باپ کہتا ہے کہ کل روپیہ ہم کو ملے اور اس کے عوض میں ہم کچھ زمین پوتے کے نام لکھ دیتے ہیں۔ جائز ہے یا نہیں؟۔

(۴) زید کی بیوی کی مملوک چیزوں میں سے کچھ اپنے میکے لے گئی ہے اس کے عوض میں زید کا باپ جتنا اس کا اس چیز میں سے حصہ ہوگا اس روپیہ میں سے لے سکتا ہے یا نہیں۔ اور بکر جو کہ امانت دار ہے دے یا نہیں؟۔

الجواب

(۱) بکر پر لازم ہے کہ امانت کو زید کے سب ورثاء پر حسب سہامِ شرعیہ تقسیم کر دے کل رقم کسی کو نہ دے۔

(۲) چونکہ حق حضانت و پرورش ماں کو حاصل ہے اس لئے نابالغ بچوں کا روپیہ

ماں ہی کو دیا جائے۔ اور اگر اس پر اطمینان نہ ہو تو دادا کو دیا جاوے۔ اور جس کو بھی دیا جائے اس سے باقاعدہ تحریر مع گواہوں کے لے لی جاوے۔ جو اپنے پاس بھی رکھی جاوے تاکہ بالغ ہونے کے بعد اُن بچوں کے حوالہ کر دی جائے کہ اگر ولی نے ان کو روپیہ نہ دیا ہو تو وہ وصول کر سکیں۔

③ سب روپیہ دینا تو اس طرح جائز نہیں کیونکہ اس میں زید کی بیوی اور لڑکی کا بھی حق ہے اور پوتے کے نام زمین کرنے سے ان کا حق ادا نہ ہوگا ہاں پوتے کی رقم زید کے باپ کو اس طرح دی جاسکتی ہے کہ وہ اوّل اس کے نام زمین لکھدے اور رجسٹری کے وقت روپیہ لے لے۔

④ بکر کو جائز نہیں کہ زید کی بیوی کا حصّہ امانت کی رقم میں سے کم کرے بلکہ اسکو پورا حق دیدے۔ اس کے بعد زید کا باپ اپنا حق خود اس سے وصول کرے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔

از تھانہ بھون۔ ۷ا محرم الحرام ۴۸ھ

مسئلہ فرائض | السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ بکر لاولد فوت ہوگیا ہے اور اس نے اپنے تین سوتیلے بھائی جن کا باپ ایک ہے، اور دو زوجہ وارثان چھوڑے ہیں۔ متوفی مذکور کے ذمہ قرضہ متفرقات اور ہر دو زوجہ کا دینِ مہر باقی ہے۔ ترکہ کے تقسیم کی شرعًا کیا صورت ہوگی اور کس کس قدر حصّہ ہر ایک وارث کو شرعًا ملے گا۔ دینِ مہر و قرضہ کی ادائیگی کی کیا سبیل ہوگی۔ جواب جلد مرحمت فرمائیں۔

الجواب

مسئلہ ۴ ت ۸

مورث بکر

زوجہ	زوجہ	اخ علاتی	اخ علاتی	اخ علاتی
۱	۱	۲	۲	۲

اوّل بکر کا سب قرضہ ادا کیا جاوے۔ مہر بھی دونوں بیویوں کا اور متفرق قرض بھی اور سب قرض ادا کرنے کے بعد جو ترکہ باقی رہے اس کو اس طرح تقسیم کیا جائے

کہ ۸ سہام کرکے ایک ایک سہام پر $\frac{1}{8}$ زوجہ کو اور $\frac{2}{8}$ $\frac{2}{8}$ سہام پرستہ بھائیوں کو دیا جاوے اور اگر ترکہ نقد نہیں ہے اور ورثہ یہ چاہتے ہیں کہ جائیداد ہم رکھیں اور قرضہ اپنے پاس سے پھر ادا کردیں گے۔ تب بھی مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ قرضخواہ اس پر راضی ہوں۔ اور اگر قرضخواہ تاخیر پر راضی نہ ہوں تو ان کا قرضہ ابھی ادا کردیا جاوے۔ خواہ جائیداد فروخت کرکے یا اور کہیں سے انتظام کرکے۔ غرض یہ کہ بدون رضامندی قرضخواہ کے ترکہ ورثاء میں تقسیم نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر ورثاء قرضہ ادا کرنے پر اس وقت تیار ہوں تو قرضخواہوں کو جائیداد لینے یا فروخت کرانے کا حق نہیں کیونکہ ان کا حق عینِ ترکہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ مالیت سے متعلق ہے۔

قال فی الدر المختار: (ظهر دين فی التركة المقسومة تفسخ) القسمة (الا اذا قضوه) ای الدين او ابرأ الغرماء (الورثة او يبقى منها) ای من التركة (ما يفی به) لزوال المانع۔

وفی الشامية: و (قوله ذمم الورثة) كذا فی الدر قال ط فيه أن الدين تعلق بعين التركة بعد تعلقه بذمة الميت اھ تتمة اجاز الغريم قسمة الورثة قبل قضاء الدين له الخ۔ ج ۵، ص ۲۶۰۔

وفيه ايضاً بعد قليل (قوله تعلق الدين بالمعنى) وهو مالية التركة ولذا كان لهم ان يقضوا الغريم ويستقلوا بها كما مر اھ۔

قلت ولعل المراد مما مر قول الدر المذكور آنفا تفسخ القسمة الا أن قضوه۔ والله اعلم۔

كتبه الاحقر عبد الكريم عفی عنه	الجواب صحيح
از تھانہ بھون۔ خانقاہ امدادیہ	ظفر احمد عفا الله عنه
۲۸ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ	۲۸ / ۲ ج ۴۵ھ

الافحام فی بعض احكام ذوی الارحام

السوال:۔

مسئلہ ۸ ج ۳۲

زوجہ۔ بنت۔ اخت شقیقہ۔ وابن۔ وابن۔ وابن۔ اخت شقیقہ اخری۔ بنت وبنت للاخ الشقیق

$\frac{1}{8}$ ۳ ۳ ۳ ۳ ۶ ۶

درصورت مسطورہ بعض چنیں تخریج میکنند و بعضے برخلاف ۔ فریق اول ایں چنیں ۔

مسئلہ ۸ ج ۲۳۲ ح ۲۲۴

زوجہ	بنت اخت شقیقہ	ابن	وابن	وابن لاخت شقیقہ اخری	بنت	وبنت الاخ الشقیق
$\frac{1}{8}$ ۵۶	۱۲	۲۴	۲۴	۲۴	$\frac{6}{142}$	$\frac{6}{142}$

سوال آن ست کہ ازیں ہر دو فریق قول کدام صحیح ست ۔

اقول و باللہ التوفیق ۔ درصورتِ مذکورہ تخریج اول صحیح ست آنچہ مخرج ثانی دراولا اخوات للذکر مثل حظ الانثیین کردہ وجہے ندارد چراکہ ایں تقسیم باولاد دوکس فقط ۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح — کتبہ عزیز الرحمٰن مفتی دارالعلوم دیوبند

مسعود احمد دارالعلوم دیوبند — ۲۲ ؍ جمادی الاوّل ۳۵ھ

۲۲ ؍ جمادی الاوّل ۳۵ھ

الجواب الملقب بالافحام فی بعض احکام ذوی الارحام

ہمارے نزدیک تخریجِ ثانی صحیح ہے کیونکہ اختین کو ایک طائفہ بنایا جاوے گا ۔ اور پھر ان کے کل سہام کو ان کی اولاد میں للذکر مثل حظ الانثیین کے موافق تقسیم کیا جاوے گا ۔ سراجی میں ہے :۔

وعند محمد رحمہ اللہ یقسم المال علی الاخوۃ و الاخوات مع اعتبار عدد الفروع و الجہات فی الاصول فما اصاب کل فریق یقسم بین فروعہم کما فی الصنف الاول ۔ اور صنفِ اول میں جو صورت چھ بطون کی فرض کی ہے اس سے پیشتر لکھا ہے ۔

وعند محمد رحمہ اللہ تعالیٰ : المال بین الاصول اعنی فی البطن الثانی اثلاثا ثلثاہ لبنت ابن البنت نصیب ابیہا و ثلثہ لابن بنت البنت نصیب امہ وکذلک عند محمد رحمہ اللہ اذا کان فی اولاد البنات بطون مختلفۃ

يقسم المال على اول بطن اختلف فى الاصول ثم يجعل الذكور طائفة و الاناث طائفة بعد القسمة فما اصاب الذكور يقسم على اعلى الخلاف الذى وقع فى اولادهم وكذلك ما اصاب الاناث وهكذا يعمل الى ان ينتهى بهذه الصورة

اس کے بعد صورت درج کی ہے جس میں ہر موقع اختلاف کو ذکور کو ایک طائفہ اور اناث کو ایک طائفہ بنایا گیا ہے۔ اور طائفہ اناث کی اولاد میں للذکر مثل حظ الانثیین پر عمل کیا گیا ہے۔ اور ایسا ہی طائفہ ذکور کی اولاد میں۔ حالانکہ وہ اولاد ایک شخص کی نہیں ہے چنانچہ بطن سادس کے شروع ہی میں بنت و ابن ہے اور ان کے اصول بطن خامس میں بنت و بنت ہے۔ اور اس بطن سادس والے ابن کو ۲ دو سہام اور بنت کو ایک سہام دیا گیا حاشیہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

فوجدنا باذاء البنتين فى البطن السادس ابنا وبنتا فقسمنا الثلاثة (اى التى وصل الى البنتين فى الخامس) بينهما فاصاب الابن اثنان والبنت واحد الخ۔

پس تخریج ثانی کے متعلق "وجہے ندارد" کہنا سمجھ میں نہیں آیا اور اسی طرح اس دلیل میں "چرا کہ تقسیم باولاد یک کس الخ)" کہنا بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

۴ رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

میں نے بھی دیکھتے ہی تخریج ثانی کو صحیح سمجھا تھا۔ اور اسی کے موافق میرا عمل تھا۔ مفتی صاحب کی تحریر سے کچھ تردد ہوا تھا جو اس توضیح سے رفع ہو گیا۔ اب بلا تردد تخریج ثانی میرے نزدیک صحیح ہے۔

فقط ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ از تھانہ بھون

۴ رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

اعتراض بر جواب مذکور از سائل

آنکہ تخریج ثانی را تصحیح می فرمایند خلاصۂ دلیلِ ایشان آنست کہ در ما نحن فیہ بعد تقسیم علی الاصول اخوات را طائفہ واخ را باعتبار عدد فرع طائفہ و دیگر اعتبار کردہ آنچہ باخوات میرسد در اولادِ آن لِلذَّکَرِ مِثلُ حَظِّ الاُنثَیَینِ کردہ شود۔

چنانچہ در سراجیہ در صنف اول در صورتِ فرض شش بطون کردہ شدہ۔ لیکن معلوم است کہ حکم ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ در آنان صورت است کہ در چند بطون از اصول اختلاف صفت واقع گردد۔ امّا در ما نحن فیہ کہ در یک بطن از اصول اختلافِ صفت واقع شدہ حکم ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ جاری کردن خلافِ ظاہر است۔ بلکہ در ما نحن فیہ اعنی صورت اختلاف صنف یک بطن از اصول بعد تقسیم علی الاصول حکم ویجعل ما اصاب کل اصل بفرعہ جاری کردہ شود۔

الحاصل آنکہ فرق است در بیانِ آنکہ یک بطن از اصول در صنفہ مختلف شود و در بیان آنان کہ چند بطن از اصول در صنف مختلف شود۔ و در بیان آنکہ چند بطن از اصول در صنف مختلف شود کہ در صورتِ اولیٰ حکم ویجعل ما اصاب کل اصل بفرعہ کردہ شود و در صورت ثانیہ بعد تقسیم علی اعلی الخلاف ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ کردہ شود۔ تصریح این تفصیل در کتاب حاشیۂ درمختار اعنی ردّ المحتار موجود است۔ چنانچہ قدرے از عبارتِ او نقل میکنم:

فان توحدت ولیس فیھم ذوجھتین کبنت ابن بنت بنت فابو یوسف قسم المال علی ابدان الفروع الی قولہ ومحمد یقسم علی اعلی بطن اختلف وھو البطن الثانی ھنا ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ ان لم یقع بعدہ اختلاف کما فی المثال المذکور الی قولہ اما اذا وقع بعدہ اختلاف بالذکورۃ والانوثۃ فی بطن آخر او اکثر۔ فان محمدًا بعد ما قسم علی اعلی بطن اختلف جعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ اھ

(باب توریث ذوی الارحام ۔ رد المحتار)

قولہ ویجعل ما اصاب کل اصل بفرعہ ان لم یقع بعدہ اختلاف کما فی المثال المذکور۔ الی قولہ اما اذا وقع بعدہ اختلاف الی قولہ جعل الذکور طائفۃ اھ نص است درین کہ اگر در یک بطن اصول اختلاف صنف واقع شود درآن صورت بعد تقسیم علی الاصول جعل ما اصاب کل اصل بفرعہ کردہ شود۔ ودر آنجا کہ چند بطن از اصول در صنفہ مختلف شود درآنہا بعد تقسیم علی اعلی الخلاف یجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ کردہ شود۔ در ما نحن فیہ چونکہ یک بطن از اصول مختلف است درآن بعد تقسیم علی الاصول آنچہ بہر یک اصول رسد بفروع او منتقل کردہ شود۔ مثلاً بعد از اخراج فرضِ زوجہ از تصحیح اول کہ ۳۲ را است ۲۸ باخت می رسد پس آن سہ بہ بنت منتقل گردد۔ بر این تقدیر احتیاج بر تصحیح دیگر نیست۔ وآنچہ مخرجِ ثانی در اولاد اخوات لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کردہ خلاف تصریح ویجعل ما اصاب کل اصل بفرعہ است۔ ظاہر قولِ سراجی کہ مخرجِ ثانی تصحیح کنندگان تخریج نقل می فرمایند مؤید تحقیقِ مذکور است چنانچہ از شریفیہ واضح می گردد۔ قال فی السراجیۃ: وعند محمد یکون المال بین الاصول اعنی فی البطن الثانی اثلاثا۔

قال فی الشریفیۃ: وحینئذ یکون ثلثاہ لبنت ابن البنت لان ذلک نصیب ابیہا قد انتقل الیہ و ثلثہ لابن بنت البنت فانہ نصیب امہ فانتقل الیہ الی قولہ وکذلک عند محمد رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ای کما اعتبر عندہ حال الاصول فی البطن الثانی علی ما عرفت کذلک یعتبر عندہ حال الاصل فی البطون المتعددہ اذا کانت فی اولاد البنات المتساویۃ فی الدرجۃ بطون مختلفۃ وحینئذ یقسم المال الی ثم یجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ اھ

پس صاحبِ سراجیہ در صورتِ اولی (ولو ترک بنت ابن بنت وابن بنت بنت) کہ در صورت اختلاف صنفہ در یک بطن از اصول است بحکم یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ اھ تقسیم فرمودہ چنانچہ از قول شریفیہ لان ذلک نصیب ابیہا قد انتقل الیہا ظاہر است و در صورتِ ثانیہ کذلک عند محمد اذا کانت فی اولاد البنات بطون مختلفۃ اھ کہ صورت اختلاف صنفہ در چند بطن از اصول

است بعد تقسیم علی اعلی الخلاف بطریق ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ تقسیم فرمودہ ومعنی وکذلک الخ حسب تصریح شریفیہ آن است کہ امام محمد چنانکہ در یک بطن از اصول صنفہ اصول را اعتبار می کند۔ ہمچنین در بطونِ مختلفہ از اصول حال اصول را اعتبار می کند پس وجہ شبہ در صورت ہمین قدر است کہ چنانچہ در صورتِ اولی صنفہ اصول اعتبار کردہ می شود، ہمچنین در صورتِ ثانیہ ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ حکم دگر است کہ علی الخصوص بہ صورتِ ثانیہ کہ صورت اختلاف بطون از اصول است تعلق دارد۔ واین حکم در صورت اولی جاری نیست۔ چنانچہ این امر از عبارتِ مذکورہ سراجیہ ظاہر است۔ پس از قولہ کذلک الخ در صورت اولی حکم ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ الخ جاری دانستن خلافِ عقل وعرف است۔ واللہ اعلم

کتبہ الفقیر عبد الخالق الکندیارائی۔

جواب اعتراضِ مذکور

اقول وباللہ التوفیق۔ شامی کی جو عبارت (یعنی ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ) تخریج اول کی تصحیح کے لیے نقل کی گئی ہے وہ صورتِ مسئولہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی کیونکہ صورتِ مسئولہ میں فروع متوحدہ نہیں بلکہ بعض کے فروع متعدد ہیں ونیز فروع میں اختلاف ہے ذکورۃ اور انوثت کا۔ اور عبارتِ مندرجہ میں اس صورت کا حکم ہے جبکہ فروع متوحدہ ہوں یعنی ہر ایک اصل کی ایک ایک فرع ہو اور فرع میں ذکورۃ و انوثۃ کا اختلاف بھی نہ ہو چنانچہ عبارتِ مندرجہ سے پیشتر اس طرح ہے وان اختلفت صفۃ الاصول فی بطن او اکثر فاما ان تتوحّد الفروع بان یکون لکل اصل فرع واحد واما ان تتعدد وعلی کل فاما ان یکون الفروع ذو جھتین اولا فان توحدت الخ

اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ حکم (یجعل ما اصاب کا) اسی صورت میں ہے جبکہ ہر ایک اصل کی ایک ہی فرع ہو اور یجعل ما اصاب کل اصل بفرعہ کے ساتھ ان لم یقع بعدہ اختلاف کی قید خود اشکال میں بھی نقل کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان فروعِ متوحدہ میں اس حکم کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ مختلف فی الذکورۃ والانوثۃ نہ ہوں اور اس توحّد فروع ہی کی مشق میں آگے چل کر علامہ شامی خود کہتے ہیں:

اما اذا وقع بعده اختلاف بالذکورۃ والانوثۃ فی بطن آخر او اکثر فان محمدًا ابعد ما قسم علی اعلی بطن اختلف جعل الذکور والاناث طائفۃ الخ
اس سے معلوم ہو گیا کہ با وجود تعدد فروع بھی فروع میں اختلافِ ذکورۃ وانوثۃ کی وجہ سے اناث وذکور کو الگ الگ طائفہ بنایا جاویگا۔ اور فی بطن آخر او اکثر کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ فقط دو بطون میں اختلاف ہونے کی وجہ سے بھی طائفہ بنایا جاوے گا۔

مثلاً مسئلہ ٦

بنت	بنت	بنت
ابن	بنت	بنت
بنت	ابن	بنت
۳	۲	۱

کی صورت میں بطن ثانی کی بنتین کو طائفہ بنایا جاوے گا اور ان کے سہام ان کی اولاد میں لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کے موافق تقسیم ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بطن کا آخر مصداق کیا ہوگا۔ پس طائفہ بنانے کے واسطے اصول کے کئی بطون میں اختلاف ہونا ضروری نہیں بلکہ جب فروع مختلف فی الصنفہ ہوں تو اصول کے ایک بطن میں اختلاف ہونا ہی طائفہ بنانے کے واسطے کافی ہے اور یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ یہ بنا نہیں ہے کہ اصول کے ایک ہی بطن میں اختلاف ہے زیادہ میں نہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ فروع میں اختلاف نہیں ہے جن کے واسطے طائفہ بنایا جاتا اور کچھ ثمرہ مرتب ہوتا اور ظاہر بات ہے کہ باوجود توحد اور اتفاقِ فروع کے طائفہ بنانے میں کوئی تفاوت نہیں ہے مثلاً صورتِ ذیل میں بطنِ ثانی کی بنتین کو طائفہ بناویں تب وہی حاصل ہے اور نہ بناویں تب۔ وھی کما لا یخفی۔

مسئلہ ۴

بنت	بنت	بنت
بنت	بنت	ابن
بنت	بنت	بنت
۱	۱	۲

یہ تو شامی کی عبارت کے متعلق عرض تھی جس میں ضرورت سے بھی کسی قدر زیادہ

وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہوگیا کہ یہ عبارت سوال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اور نیز اس توضیح سے شریفیہ کی عبارت مندرجہ اشکال کا محمل بھی معلوم ہوگیا اور شریفیہ یہاں موجود نہیں ورنہ ممکن ہے کہ اس کے متعلق بھی کچھ مفصل عرض کیا جاتا۔ اب شامی سے وہ عبارت نقل کرتا ہوں جو صورتِ مسئولہ پر منطبق ہے۔ عبارت مندرجہ اشکال کے بعد بھی جب توجہ فروع کا باعتبار شق حکم بیان کر چکے تو علامہ شامیؒ دوسری شق یعنی تعددِ فروع کی بابت تحریر فرماتے ہیں۔

وان تعددت فروع الاول المختلفین کلھم او بعضھم ولیس فیھم ذو جھتین ایضًا وذلك كابنی بنت بنت بنت وبنت ابن بنت بنت وبنتی بنت ابن بنت الی قوله ثم جعلنا الذکور طائفة والاناث طائفة الخ

اور گو اس مثال میں اصول کے دو بطون میں اختلاف ہے لیکن اس پر مدار نہیں مدار تو فقط تعددِ فروع مع اختلاف صفت فروع و اصول پر ہے۔ جیسا کہ عبارت سے ظاہر ہے۔ حاصل یہ کہ ہمارے نزدیک تخریج ثانی ہی صحیح ہے۔ اور ان عبارات مذکورہ فی الاشکال سے اس میں کوئی خدشہ نہیں۔ اور آپ نے وکذلك الخ کے جو معنی بحوالہ شریفیہ لکھے ہیں وہ معنی صحیح نہیں اور واقعی اس کذلك سے وجہ شبہ حال اصول کا اعتبار کرنا ہی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آگے ثم یجعل الذکور طائفة الخ بھی موجود ہے جیسا کہ احقر نے پوری عبارت جواب اول میں نقل کی ہے۔ پس جب صنفِ اول کا حکم منقح ہوگیا تو صنف ثالث کا حکم بھی معلوم ہوگیا جس کی بابت اصل سوال ہے۔ کیونکہ سراجی وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم میں صنف ثالث مثل صنف اول کے ہے، جیسا کہ سراجی کی عبارت اصل جواب میں موجود ہے اور شامی میں بھی صنفِ ثالث کے تحت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ قول سراجی سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ صنف اول کے مثل ہے۔ لیکن علامہ شامی نے یہ لکھا ہے ولم ار من تعرض لذلك فلیراجع۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۱ر رجب ۱۳۴۹ھ

الجواب صحیح
بعد التتبع والامعان فی عبارۃ الشامی
ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ۲۱ر رجب ۱۳۴۹ھ

سوال بر جواب مذکور از سائل | مولوی صاحب موصوف برای جاری کردن حکم
ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعه اتفاق صفت فروع شرط قرار می دہند یعنی
اگر فروع متوحدہ باشند و اتفاق در صفت فروع نباشد حکم ویجعل ما اصاب الخ
گاہے جاری کردہ نمی شود۔ چنانچہ میفرمایند۔ اور ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ
کے ساتھ ان لم یقع بعدہ اختلاف کی قید خود اشکال میں بھی نقل کی گئی ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ ان فروع متوحدہ میں اس حکم کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ مختلف
فی الذکورۃ والانوثۃ نہ ہوں۔ قرار دادن این شرط برای اجراء حکم مذکور " ویجعل
ما اصاب الخ " از قید ان لم یقع بعدہ اختلاف افادہ کردہ اند اما مشکل
آن است کہ علامہ شامی برای شق فان توحدت ولیس فیہم ذو جہتین الخ
ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ (کہ ازاں مولوی صاحب موصوف استدلال
برای بودن شرط مذکور برای حکم مذکور می فرمایند) مثالیکہ بیان کردہ ہست در آن
خود اتفاق صفت فروع نیست بلکہ اختلاف در صفت فروع است چنانچہ تمام عبارت شامی
اینست فان توحدت ولیس فیہم ذو جہتین کبنت ابن بنت وابن بنت بنت
فابو یوسف قسم المال علی ابدان الفروع ھنا ایضاً۔ فثلثہ للانثی وثلثاہ
للذکر مثل حظ الانثیین ومحمد یقسم علی اعلی بطن اختلف وھو البطن
الثانی ھنا ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ ان لم یقع بعدہ اختلاف کما فی
المثال المذکور۔ ومثالِ مذکور کہ علامہ شامی در وحکم ویجعل ما اصاب کل
اصل لفرعہ جاری فرماید کبنت ابن بنت وابن بنت بنت است درین مثال
اختلاف صفت فروع بدیہی است چنانچہ از قولہ فثلثہ للانثی وثلثاہ للذکر مثل
فیک واضح است۔ پس اگر تحقیق مولوی صاحب کہ برای حکم ویجعل ما اصاب
اتفاق فروع لازم می دانند صحیح تسلیم کردہ شود۔ مثال آوردنِ علامہ شامی صورت
مذکورہ بنت ابن بنت وابن بنت بنت، جاری کردن بر وحکم ویجعل ما اصاب الخ
صریح غلط خواہد بود۔ ازین جا واضح می گردد کہ برای حکم ویجعل ما اصاب کل اصل
لفرعہ شرط اتفاق صفت فروع کہ موصوف قرار کردہ مبنی بر غفلت است از عبارت
مذکورہ وبہ تفسیر بما لا یرضیٰ قائلہ می ماند۔ وتنہا وحدت را مولوی صاحب موصوف

برای حکم مذکور و یجعل ما اصاب الخ شرط قرار نمی دہد پس حکم جاری نکردن
و یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ درصورت ما نحن فیہ ہنوز جواب طلب است
درحقیقت منشا این غلط فہمی کہ مولوی موصوف را واقع شدہ است قولہ ان لم یقع
بعدہ اختلاف است کہ موصوف ازان عدم وقوع اختلاف درصفۃ فروع می دانند
و این صحیح نیست بلکہ مراد از قولہ ان لم یقع بعدہ اختلاف وقوع اختلاف درصفۃ اصول بعد
از یک بطن است چنانچہ درمثال مذکور است کبمنت ابن بنت و ابن بنت بنت است
علاوہ آنکہ کلام در اختلاف صفت اصول است چنانچہ ازین پیشتر می فرمایند وان
اختلفت صفۃ الاصول فی بطن اواکثر فاما ان تتوحد الفروع الخ پس از
عبارتِ مذکورہ بہ صراحت معلوم شود کہ برای حکم و یجعل ما اصاب الخ نبودن اختلاف
درصفۃ اصول بعد از یک بطن شرط است ۔ و آن شرط در ما نحن فیہ موجود است
پس برصورتِ ما نحن فیہ حکم و یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ جاری لازم آ
درتحقیق مولوی صاحب دیگر اشکالات بخاطر خطور میکند اما از خوفِ طوالت برین اکتفا
می کنم اگر حضرت ایشان بہ نفس نفیس کہ غلط فہمی کہ طرفین را واقع شدہ رفع فرمایند
غایت لطف و کرم رقمہ نیاز مند فقیر عبد الخالق کندیارانی

۸ر شعبان المعظم ۱۳۴۵ھ

مسئلہ ۴ - ۳۲

زوجہ	بنت الاخت	ابن الاخت	ابن الاخت	ابن الاخت	بنت الاخ	بنت الاخ
۱/۸	۳	۳	۳	۳	۶	۶

درخواست تحقیق از حضرت ایشان برای صورت مذکورہ است برصورتِ
مذکورہ وحدتِ فروع عہ نبودن ذوجہتین در آنان و عدم وقوع اختلاف صفت در

عہ اس صورت میں توحّد فرع کہاں ہے ۔ توحدِ فروع کو شامی نے لکھا ہے ۔ یان یکون لکل اصل فرع واحد
اور صورتِ مسئولہ میں ایک ہمشیرہ کی تو ایک دختر ہے لیکن دوسری ہمشیرہ کے تین بیٹے ہیں ۔ نیز بھائی کی دو بیٹیاں
ہیں جیسا کہ بیشتر کے دونوں سوالوں میں اس کی تصریح ہے اب نہ معلوم کہ کس بناء پر یہ اختصار کیا کہ صورت اس
طرح درج کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار اخوات اور دو اخوۃ کی اولاد ہے ۔ اگر پہلا سوال یہاں نقل نہ ہوتا
تو اس اصل صورت کا پتہ کیسے چلتا ۔ اس میں احتیاط ضروری ہے کہ جتنی مرتبہ سوال کیا جائے سوال پورا
اور مفصل نقل کیا جائے ۔ فقط عبد الکریم عفی عنہ

اصول بعد از یک بطن برین همہ امور منطبق است کہ علامہ شامی برای حکم ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ شرائط قرارداده است۔ فقط

الجواب

بعد حمد وصلوٰۃ کے گزارش یہ ہے کہ جو شبہ جواب پر کیا گیا ہے وہ وارد نہیں ہوتا کیونکہ ان لم یقع بعدہ اختلاف، کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ اختلاف کے بعد پھر آئندہ کسی بطن میں بالکل ہی اختلاف نہ ہو۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ ایک مرتبہ اختلاف کے بعد صنفِ واحد کی فروع میں اختلاف نہ ہو۔ اور یہ امر علامہ شامی کی ذکر کی گئی مثال میں موجود ہے کہ بطن ثانی میں اختلاف ہو کر پھر آئندہ نہ بنت کی فروع میں اختلاف ہے نہ ابن کی فروع میں۔ کیونکہ ہر دو کی فرع میں ایک ایک ہے۔ کسی صنف کی فروعِ متعددہ کا ہی تحقق نہیں تا اختلاف چہ رسد۔ پس ان لم یقع بعدہ اختلاف کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اختلاف صنف اصول کے بعد ہر دو اصناف کے یا صنفِ واحد کے فروع متعدد تو ہوں لیکن وہ فروع مختلف فی الصفۃ نہ ہوں۔ مثلاً

بنت	بنت	بنت
ابن	بنت	بنت
بنت	ابن	ابن

کہ اس میں نہ ابناء کے فروع مختلف ہیں نہ بنات کے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہر دو اصناف کی ایک ہی فرع ہے اس وجہ سے اختلافِ صفۃ کا فروع میں تحقق[ع] نہ ہو۔ جیسا کہ شامی کی مثال میں ہے۔

غرض یہ کہ علامہ شامی کی مثال میں ان لم یقع بعدہ اختلاف کی قید ملحوظ ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ اگر تحقیق مولوی صاحب کے برائے حکم یجعلون ما اصاب اتفاق صفت کہ فروع لازم می دانند صحیح تسلیم کرده شود۔ مثال آوردنِ علامہ شامی کی صورتِ مذکورہ بنت ابن بنت وابن بنت بنت را۔ و جاری کردن بر وحکم یجعل ما اصاب الخ صریح غلط خواہد بود۔ اور اگر ان لم یقع بعدہ اختلاف کے وہ معنی مراد لیے جاویں جو اشکال میں ظاہر کئے گئے ہیں تو سراجی اور علامہ شامی کی مثالِ ذیل میں کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

ع یہ صورت ہی ان لم یقع بعدہ اختلاف کا مصداق ہے للقاعدۃ المشہورۃ لا یقتضی وجود الموضوع۔

بنت	بنت	بنت
بنت	بنت	ابن
ابن	بنتی	
۶	۲۲	
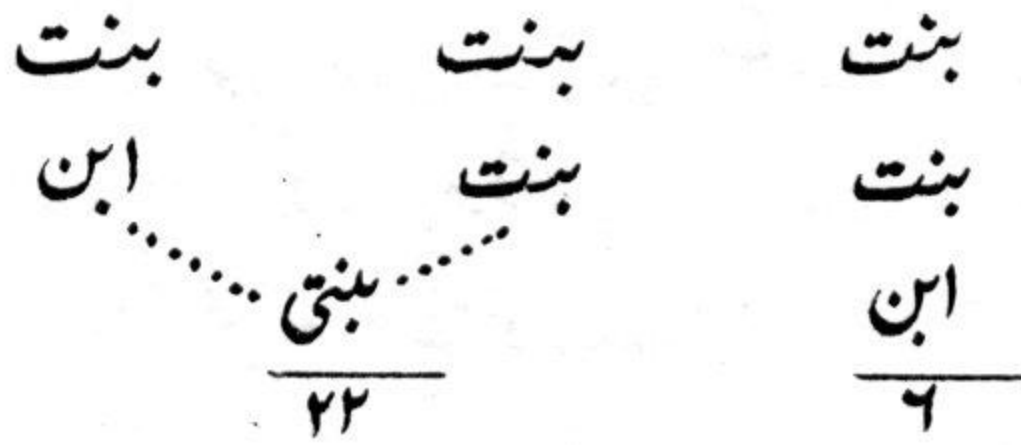
اس مثال میں اناث کو الگ طائفہ بنایا گیا ہے۔ جس کی شامی اور سراجی میں تصریح موجود ہے۔ اگر یہاں یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ پر عمل ہوتا تو ابن بنت بنت کو ۴ سہام ملتے۔ کما لا یحتاج الی البیان۔

خلاصہ یہ کہ ان لم یقع بعدہ اختلاف کے وہ معنی قرار دینا صحیح نہیں جو اشکال میں ان لفظوں سے بیان کیے گئے ہیں۔ مراد از قولہ ان لم یقع بعدہ اختلاف عدم وقوع اختلاف در صفت اصول بعد از یک بطن است۔ یہ تمام تر کی گفتگو ان لم یقع بعدہٗ اختلاف کے متعلق تھی جس سے معلوم ہو گیا کہ صورتِ مسئولہ میں یہ شرائط عدم اختلاف موجود نہیں اور اگر اس معنی کے موافق جو کہ اشکال میں بیان کیے گئے ہیں بالفرض اس شرط کا وجود بھی تسلیم کیا جاوے تو بھی صورت مسئولہ میں یجعل ما اصاب الخ جاری کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ شرط توحدِ فروع کی جس کو صاحب اشکال بھی تسلیم کرتے ہیں اس جگہ موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ جوابِ سابق میں بھی عرض کر چکا ہوں

فقط والسلام

احقر عبدالکریم عفی عنہ

از خانقاہ امدادیہ۔ تھانہ بھون

۱۳ شعبان ۱۳۴۵ھ

مسئلہ فرائض | **السوال:** اللہ دتے متوفی کے ترکہ میں شرعی شریک پانچ ہیں۔ اللہ دتے کی دو بہنیں حقیقی شریفن و سکینہ ایک بہن دوسری ماں سے اللہ دتی ہے۔ زوجہ متوفی کی شریفن چچا حقیقی سلارو مگر ترکہ نامزد صرف چار کے کر دیا گیا۔ مسماۃ اللہ دتی کو تحصیل میں مردہ لکھوا دیا یہ فعل چچا سلارو نے کرایا تھا مسماۃ شریفن زوجہ ۳۷ بیگھ ۸ بوہ

شریفن ہمشیرہ	سکینہ ہمشیرہ	حقیقی چچا سلارو
۲۸ بیگھ ۲ بوہ ۱۰ بوانسی	۲۸ بیگھ ۲ بوہ ۱۰ بوانسی	۵۶ بیگھ ۵ بوہ

کل میزان = ۱۴۹ بیگھ ۱۸ بوہ

پچا سلارو نے متوفی کی دونوں بہنوں شریفن اور سکینہ کو بُلا کر یہ کہا کہ مبلغ ۲۲۰۰ دو ہزار دو سو روپیہ اس ترکہ کے ذمہ قرض ہے ۔ تم سب شرکاء اپنے اپنے حصے کا قرض ادا کرو اور جائیداد تقسیم کرلو۔ تب بہنوں نے کہا کہ ہم نہ قرض دیں اور نہ زمین لیں ہمیں توصرف روٹی کپڑے کی ضرورت ہے ۔ شریفن بہن نے اپنے بچے کی قسم بھی کھائی تھی کہ میں کچھ نہ لوں گی ۔ اور مجھے یعنی مسماۃ شریفن زوجہ متوفی سے بھی قرض دینے کو کہا گیا تھا ۔ بندی نے چچا سے کہا یعنی سلارو سے کہ تم قرض ادا کر دو میں اپنے حصے کی جائیداد تمہارے لڑکوں کے نام کرا دوں گی ۔ بندی ابھی بھی اپنے قول پر ہے جب چاہے مجھے اپنے قول پر پورا کرلو اور ان دونوں بہنوں نے دیکھا کہ قرض ادا کر دیا گیا ہے تب اپنا حصہ طلب کیا کہ ہماری زمین ہمیں واپس دیدو ۔ حالانکہ سلارو نے اپنی بچی زمین اسباب گھر کا بیچ کر قرضہ ادا کیا تھا ۔ قضاءِ الٰہی سے ایک بہن شریفن کا انتقال ہو گیا اور اس کے دو لڑکے ہیں زمین تو اُن کے نام ہو گئی ہے ، مگر کھانا بونا سلارو کے تین لڑکے کر رہے ہیں ۔ ان بچوں کو کوئی دیتا نہیں ۔ اور ایک بہن پیشتر سے اللہ دتی مردہ لکھوائی تھی ، تیسری بہن مسماۃ سکینہ بیوہ ہے وہ انہیں چچا سلارو کی اولاد میں رہتی ہے ۔ اور کبھی ناراضگی میں کہہ دیتی ہے کہ کیوں ؟ میری بھی تو زمین ہے ۔ اب سلارو کے ایک لڑکے مسمی محمد تقی سے بندی کا نکاح ثانی ہوا ہے اور تمام ترکہ اللہ دتہ متوفی کا تینوں بھائی بحصہ مساوی تقسیم کرلیتے ہیں جس میں سے بندی بھی کھاتی پہنتی ہے مگر بندی کے اختیار میں یہ نہیں کہ تقسیم زمین کرا دے ۔ دیگر شرکاء سے معافی چاہتی ہوں ۔ وہ سنکر مضحکہ اڑاتے ہیں مگر اب مجھے میری جائیداد سے بھی کم آمدنی مل رہی ہے ۔ میرے خاوند کی اور میری زمین مل کر تہائی سے زائد ہے مگر آمدنی تہائی کی مل رہی ہے تو کیا بندی عند اللہ گناہ گار اور حق العبد میں گرفتار ہے ۔ بندی کو حق العباد کا فکر ہے ۔

الجواب

مسـ ۱۲

زوجہ	اخت عینیہ	اخت عینیہ	اخت علاتیہ	عم
۳	۴	۴	محروم	۱

شرعاً صحیح حساب یہ ہے

	بوانسی	بوہ	بیگہ
زوجہ	۱۰	۹	۳۷
ہمشیرہ	۶ ۲/۳	۱۹	۴۹
ہمشیرہ	۶ ۲/۳	۱۹	۴۹
چچا	۱۶ ۲/۳	۹	۱۲
		۱۸	۱۴۹

جس بہن کو یعنی سوتیلی بہن مسماۃ اللہ دتی کو جو مردہ لکھوادیا ہے اس سے حصوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر اللہ دتی کو لکھواتے تب بھی وہ محروم رہتی جب سگی دو بہنیں موجود ہیں اور چچا عصبہ ہے تو سوتیلی بہن کو شرعاً کچھ نہیں ملتا۔ لہذا یہ جھوٹ ہے نتیجہ وہی رہا خواہ مخواہ گناہ کمایا

البتہ چار وارثوں میں جو تقسیم کی گئی وہ تقسیم بالکل غلط ہے نہ معلوم کس طرح حساب لگایا گیا ہے۔ اصل مسئلہ کی رو سے ایک تہائی (۳ رسہام) ایک بہن کو ایک تہائی (۴ رسہام) دوسری بہن کو اور چوتھائی (۳ رسہام) بیوی کو ملنے چاہئیں۔ اور باقی ۱/۱۲ سلارو کو پہنچتا ہے۔ کل سہام ۱۲ ہوتے ہیں۔ شرعاً جتنا جتنا ملتا ہے وہ اوپر لکھ دیا ہے۔

اب یہ تو معلوم ہوگیا کہ اللہ دتہ کی بیوہ کو ۳۷ بیگہ ۸ بوہ جو حق ملا ہے اس میں کسی کا حق نہیں ہے بلکہ خود بیوہ کا ۱/۲ ۱ بسوہ اور حق نکلتا ہے جو سلارو کے پاس ہے۔ اسی طرح اللہ دتہ کی بہنوں کا حق بھی سلارو کے پاس نکلتا ہے اور سلارو کا حق شرعی صرف ساڑھے بارہ ۱۲ بیگہ کے قریب ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تم نے جو لکھا ہے کہ میری اور میرے خاوند کی زمین مل کر تہائی سے زیادہ ہے وہ غلط ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ ہوا کہ قرض کل سلارو نے ادا کیا اس سے بھی سلارو دوسروں کے حصہ کا مالک نہیں ہوا۔ ہاں حصہ رسد قرض سب کے ذمہ ہے۔ اب شریفن اور سکینہ اور شریفن مرحومہ کے لڑکے مختار ہیں خواہ اپنا حصہ خود رکھیں اور حصہ رسد قرض سلارو کو دیدیں خواہ قرض کی وجہ سے اپنا حصہ سلارو کے ہاتھ بیچ دیں جو کچھ رکھنا ہے معاملہ صاف

کرلیں فقط وعدہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ گول مول بات ٹھیک نہیں۔ وعدہ کی وجہ سے سلار و مالک نہیں بنا۔ اگر کسی کو منظور ہو کہ اپنا حصہ دے تو باقاعدہ بیع کرنا لازم ہے۔ خوب سمجھ لو۔ حتی الوسع بہت آسان کرکے لکھا ہے۔ وھٰذا کلہ ظاھر۔

اب رہی یہ بات کہ تمہارا خاوند اور خسر تمہاری نہیں مانتے اور ناحق دوسروں کا حصہ دبا رکھا ہے اور اس کی آمدنی تمہیں بھی کھانی پڑتی ہے۔ اس کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنی طاقت کے موافق کوشش کرتی رہو اور حتی الوسع دوسروں کے حق سے بچو باوجود اس کے مجبوراً اگر مشترک جائیداد مذکورہ کی آمدنی میں سے کچھ اپنے حصہ سے زائد تمہارا خاوند تم کو کھلا دے تو اس کا گناہ اس کے ذمہ ہی رہے گا۔ تم بوجہ عذر کے بری الذمہ ہوگی۔ اور تم نے اگر کوشش میں کمی کی تو خدا علام الغیوب ہے، وہ دلوں کے بھید کو جانتا ہے۔

فی الشامیۃ وفی الخانیۃ: امرأۃ زوجہا فی ارض الجور اذا اکلت من طعامہ ولم عینہ غصبا او اشتری طعاماً او کسوۃ من مال اصلہ لیس بطیب فھی فی سعۃ من ذلک والاثم علی الزوج اھ (ج ۵ - ص ۳۸۰)

کتبہ الاحقر عبدالکریم
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۴ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

بیماری میں طلاق دی پھر اچھا ہو کر مرگیا اور عورت عدت میں تھی تو وہ خاوند کے ترکہ سے حصہ پائے گی یا نہیں

السؤال: زید نے اپنی عورت ھندہ کو بیماری میں طلاق دی اور اس بیماری میں نہیں مرا بلکہ اچھا ہوگیا اور پھر بیمار ہوا اور مرگیا اور موت کے وقت زید کی بیوی ھندہ عدت میں ہے تو زید کے مال سے حصہ میراث پائے گی یا نہیں؟

الجواب

اس صورت میں عورت کو میراث سے حصہ نہ ملے گا۔ کما فی الدر المختار: فلو صح ثم مات فی عدتھا لم ترث اھ واللہ اعلم۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۶ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

تحقیق مرض الموت | السؤال : زید کافی عرصہ سے بیمار تھا۔ دمہ اور بھی کچھ کچھ مرض اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ وہ کبھی مرض زیادہ ہونے کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتا تھا اور کبھی مرض کم ہونے کی وجہ سے دل بہلانے کے لیے باہر نکل کر تیس چالیس قدم چل بھی لیتا اور اسی مرض میں گذر گیا۔ اب مرض الموت کب سے شمار ہوگی۔ جب سے زید دل بہلانے کے لیے مکان سے باہر نہیں نکل سکا تب سے یا جب سے کہ وہ بیمار پڑا تھا مرض کے مضمون کو مہربانی فرما کر ذرا تفصیل سے لکھا جائے۔

الجواب

امراضِ مذکورہ میں موت سے قبل اگر زیادتی اور تغیر ہو جائے تو اس تغیر اور زیادتی کے وقت سے مرض الموت شمار کیا جاوے گا کما قال العلامۃ الشامی فی ردالمحتار علی الدر المختار (ج ۲ ص ۸۵۶)

قلت وحاصلہ انہ ان صار قدیماً بان تطاول سنۃ ولم یحصل فیہ ازدیاد فھو صحیح۔ اما لو مات حالۃ الازدیاد الواقع قبل التطاول او بعدہ فھو مریض اھ

پس صورت مسئولہ میں جب اس شخص کو مرض کی زیادتی کا وہ دورہ پڑا جس میں اس کا انتقال ہو گیا ہے اس وقت سے مرض الموت قرار دیا جاویگا۔ و اللہ اعلم۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
ازخانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون
۲۶ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

مسئلہ فرائض | السؤال : ایک عورت دو لڑکے، ماں باپ مردہ کا ۱۶ روپیہ قرض رہ گیا ہے۔ اور ۸ روپیہ خاوند پر قرض ہے۔ تقسیم ترکہ کے وقت خاوند نے کہا کہ ۱۶ روپیہ اور ۸ روپیہ سے ۱۶ روپیہ مجھے آتے ہیں ۸ روپیہ جو میرے قرض ہیں چھ ۶ روپیہ میں نے اپنا حصہ رکھ لیا ہے اور دو ۲ روپیہ لڑکوں کو دوں گا۔ اور ماں باپ دونوں نے کہا کہ ہم کو اس روپیہ میں سے چار چار روپیہ آتے ہیں ہمارے اوپر جو ۱۶ روپیہ ہیں ہم آٹھ روپیہ اپنے دو حصہ رکھ لیے ہیں اور آٹھ روپیہ

لڑکوں کو دیں گے۔ ماں، باپ اور خاوند نے روپیہ لڑکوں کو حاضری دیا نہیں اور اپنے اوپر لازم کر لیا ہے تو کیا حاضری بوقتِ تقسیم نہ دینے کی وجہ سے اس قسمت میں کوئی بطلان یا فساد ہے یا نہیں۔

الجواب

قال فی الدرر کتبها ای القسمة هو الفعل الذی یحصل به الافراز والتمییز بین الانصباء وحکمها تعیین نصیب کل من الشرکاء علی حدة اھ (ج ۵ - ص ۲۴۷)

چونکہ واجب فی الذمہ ہوتا ہے اس کی تقسیم اس طرح بھی درست ہے کہ ہر مدیون جو واجب ہے وہ متعین ہو جاتے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ واجب کس وارث کے حصہ میں لگایا گیا ہے۔ اور یہ بات صورتِ موجودہ میں پائی گئی اس لیے تقسیمِ دین صحیح ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۷؍ ذی الحجہ ۱۳۴۹ھ

بسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم

اجمالی فہرست امداد الاحکام

جلد اوّل تا چہارم

ابواب	صفحہ

فہرست ابواب جلد اوّل

فہرست ابواب جلد دوم

فہرست ابواب جلد سوم

فہرست ابواب جلد چہارم

اِمدادُ الاحکام

امداد الفتاویٰ کا تکملہ جو ۱۳۴۰ئھ کے بعد کے فتاویٰ پر مشتمل ہے

تالیف

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عُثمانی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ نگرانی

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴